

بہنوں کا اپنا ماحنامہ

مئی 2015

# شعاع

**PDFBOOKSFREE.PK**



بہنوں کا اپنا ماہنامہ

# شعاع

بانی و مدیر اعلیٰ محمود ریاض

مدیرِ سیکرٹری — رخصتہ جمیل

مدیرِ تنظیم — اختر ریاض

مدیرِ قارئین — امت الصبور

فنانہ ڈیزائن — شاہین رشید

ادھاریت — خجالت جیلانی

MEMBER  
APNS  
CPNE  
رکن آل پاکستان خواتین و بچوں کی تنظیم  
رکن انٹرنیشنل آف پاکستان خواتین و بچوں کی تنظیم

خط و کتابت نمائندہ

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار، کراچی

زیرِ نگرانی

زیرِ نگرانی بک ایڈیٹر جسٹس

پاکستان (سالانہ) — 700 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ — 5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا — 6000 روپے







- 74 خواب تھا کوئی نگہت سیما  
156 ہے زندگی حسین راشد و رفعت  
224 چاند میری چوکھٹ پر سحرش خان

- 10 رضیہ جمیل پہلی شعاع  
11 تنویر بھول حمد  
11 رحمان خاور (ملک) نعت  
12 ادارہ نبی کی باتیں



- 128 سیاہ حاشیہ فصائمہ اکرم



- 26 غروب شہوار روشنی جیسے لوگ  
24 طلحہ مرزا خوشبو کی صورت



- 58 نوا عین خرم سا بچہ  
66 امیل رضا مرگ سیاہ  
124 حمیرا نوشین بوں بھی ہوتا ہے  
198 دینار سحر سلیم دھول  
259 نوشین ناز دھند

- 17 سمیرا حمید زور و زور  
27 روبینہ اشرف بک رہا  
273 شایین رشید دستک  
32 ادارہ شعاع کے ساتھ



- 265 فراق گود کھلوری غزل  
265 جہانارا اختر غزل  
264 طاہر مسعود نظم  
264 نسیم سحر غزل

- 36 رضا انوار عذراں ایک تھی مثال  
210 نبیلہ عزیز قصہ جمل



انتباہ: ماہنامہ شعاع دو مجلے کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جاسکتا ہے، نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی ٹیلی ویژن سلسلہ اور قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔





287	خالہ جیلانی	موسم کے پھول	276	رضیہ جمیل	خط آپ کے
289	ادار	خوبصورت بنے	266	ادار	مُسکراہٹیں
			285	واصفہ جمیل	ایتنے خالے ہیں
			268	شگفتہ جاہ	بالوں سے خوشبو لائے
			271	خالہ جیلانی	کھٹا کسی پہ

**مئی 2015**  
 چھ 29 تا 9  
 قیمت 60 روپے

علاؤ کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رصدیہ جمیل غلوں حسن پر رشنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: این پی این سی ایچ این سوکائی کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872

Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com





شعاع کا مٹی کا شمار ہیے ماضی میں۔  
 ادب کا زندگی سے گہرا تعلق ہے بلاشبہ ہوا مصوری، تمام فنون لطیفہ زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ ایک  
 نینق کا زندگی کی ہر جہت کیفیات، مشاہدات اور تجربات کو خوبصورت الفاظ کا بیڑا بن عطا کرتا ہے  
 اور کہنے والوں کی ترجمانی کرتا ہے۔  
 ادب کا ایک کام ذہنوں کو انبساط اور تفریح فراہم کرنا بھی ہے تاکہ زندگی کی کرب ناک سہلہوں اور تلون  
 سے نظر بچا کر کچھ دیکھنے کے خواہش کے زیر پرے میں پناہ ملے سکے۔ روشن اور خوش گو اور ہلو بھی تو زندگی کا حصہ  
 ہیں۔ کہانیوں میں مسائل کا تجربہ ہونا چاہیے لیکن امید کے پیغام کے ساتھ۔ ماریوی سے علی کو جنم دیتی ہے اور  
 ایک بلڈ ملنے والی قسمی زندگی گورے علی کی نذر نہیں کیا جاسکتا۔

### محمود ریاض صاحب،

وقت کے ساتھ ساتھ بہت کچھ بدلتا جاتا ہے۔ ہر آنے والا طرہ بہت کچھ ہے۔ محمود ریاض صاحب۔  
 کائنات میں کسی شے کو دو عالم نہیں۔ یہاں آنے والوں کو ایک دن جانا ہی ہوتا ہے۔  
 لیکن کہ لوگ اس حیات مختصر میں ایسے نقش چھوڑ جاتے ہیں جو ان کے ذہن سے رخصت ہونے کے  
 بعد بھی ان کے نام کو زندہ رکھتے ہیں۔  
 ریاض صاحب کا شمار بھی ان ہی خوش نصیب لوگوں میں ہوتا ہے۔ وہ دنیا سے رخصت ہو گئے  
 لیکن علم، تہذیب اور شائستگی کے جو حرار انہوں نے روشن کیے، وہ آج بھی راہ دکھانے کا فریضہ انجام دے  
 رہے ہیں۔  
 خواتین ڈائجسٹ کرن اور شعاع نے خواتین اور نوجوانوں کو صاف ستھری تفریح فراہم کی، ان میں مطالعے  
 کا رجحان پیدا کیا اور نکل اور سچائی کا راستہ دکھایا۔ ایک مثبت، تعمیری سورج عطا کی۔  
 اس کے ساتھ ساتھ خواتین کی تخلیقی صلاحیتیں سامنے لانے میں ایک کام کر دیا اور کیا۔ ادارہ خواتین ڈائجسٹ  
 کے ذریعے سامنے آنے والے بہت سے نام میڈیا، جیشنل پر چلنے لگے ہیں۔  
 محمود ریاض صاحب نے جو سورج متعین کی تھی، ہم آج بھی اس سورج اندازہ کر سکتے دکھ کر کہے بڑھ رہے  
 ہیں۔

### اسٹس شمارے میں،

- ۱۔ رات شدہ رخصت کا مکمل ناول۔ بے زندگی کتنی حسین،
  - ۲۔ سموش خان بھٹو کا مکمل ناول۔ ماند میری چوکھٹ پر،
  - ۳۔ گنہگار سب کا مکمل ناول۔ خواب بھاگونی۔ دوسری ادا آخری قسط،
  - ۴۔ صائر اکرم کا ناول۔ سیما، ماشاء،
  - ۵۔ رخسانہ نگار عدنان اور بیسمل عزیز کے ناول،
  - ۶۔ امیل رضا، قرۃ العین غلامی، حمید انوشین، دیناز محمد سلیم اور فوشین ناز اختر کے افسانے،
  - ۷۔ مقبول فنکارہ درویش شرف اور طارق کا بندھن،
  - ۸۔ معروف فنکاروں سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
  - ۹۔ آپ کے سوال اور میرا جواب۔ دو پرو،
  - ۱۰۔ پیانے نبی علی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستحق سلسلے شامل ہیں۔
- مٹی کا شمار آپ کو کیا لگا، خطوط کے ذریعے آپ کی بات کے منتظر ہیں۔





ہے کون شاہ دوسرا آپ کی طرح  
کوئی نہیں رسولِ خدا، آپ کی طرح



اس واسطے حضور کو بعثت عطا ہوئی  
وُنیا میں کوئی اور نہ تھا آپ کی طرح

اے امتِ حبیبِ خدا، تیرے واسطے  
ملنگے گا اور کون کیسا آپ کی طرح

کیسے کوئی دلوں میں اتارے خدا کی بات  
اوروں کی خامشی نہ صدا، آپ کی طرح

ثابت ہوئی یہ بات بھی قرآنِ پاک سے  
واجب نہیں کسی کی ثنا آپ کی طرح

انسانیت کی راہ دکھانے کے باوجود  
کوئی ہوانہ راہ نما، آپ کی طرح

بندوں کا جو خدا کے رکھے ہر طرح خیال  
خاؤر ہے کون بعید خدا، آپ کی طرح

رحمان خاؤر (ملیگ)

اے خالقِ دو عالم ہے التجا تجھی سے  
ہم کو پہلے یارب بہر گمراہی ہدی سے

تُو ہی ہے سُننے والا بندوں کی سُن دلائیں  
عیسوں کو تُو چھپلے اور بخش دے خطائیں

ستار نام تیرا، غفار نام تیرا  
عیسوں کی پردہ پوشی بے شک ہے کام تیرا

آسان مشکلیں کر، عزت ہمیں عطا کر  
رُسوانہ کر ہمیں تُو، تُو ہی ہے اپنا یاد

ہم ہیں حقیر بندے، بندہ ہوا تُو ہے

ہم پر نظرِ کرم کی، آمرزگار تُو ہے

کہتا ہے پھولِ یارب بہر شر سے تُو پہلے  
ہے کار ساز تُو ہی، سب کچھ ترے حوالے

تنویر پھول



# ایک ہی ایک

## طلاق کی اقسام

### (1) مستنون طلاق

اسے کتاب اللہ کے ساتھ کھیلنا قرار دیا ہے، تاہم اگر کوئی شخص اس طرح بیک وقت تین طلاقیں (زبانی یا تحریری) دے گا تو طلاق واقع ہو جائے گی، لیکن احناف وغیرہ کے نزدیک تینوں طلاقیں واقع ہو جائیں گی اور اہل حدیث کے نزدیک یہ ایک ہی طلاق رجعی ہوگی۔ احناف کے نزدیک اس کے بعد رجوع اور صلح کی کوئی

ایسی طلاق جو بیوی کو ایسے طہر میں دی جائے جس میں خاوند نے اس سے مقاربت نہ کی ہو اور ایک طلاق دے کہ میں تجھے طلاق دیتا ہوں یا تجھے طلاق ہے اس کے بعد بیوی کا نان و نفقہ دیا رہے اور عدت (تین حیض یا تین ماہ) تک اپنے گھر میں رکھے عدت کے بعد جدا ہوں۔ یہ طلاق کاسب سے بہتر طریقہ ہے۔ اس طرح دی گئی طلاق میں بالاتفاق عدت کے اندر رجوع کرنا اور عدت گزرنے کے بعد یہ نکاح مجدد و باطل کرنا جائز ہے۔

عنچائش نہیں ہے، لیکن اہل حدیث کے نزدیک عدت کے اندر رجوع کرنا اور عدت گزرنے کے بعد ان کا باہم نکاح کرنا جائز ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے "ایک مجلس میں تین طلاقیں" از حافظ صلاح الدین یوسف)

### طلاق سے متعلق احکام و مسائل

### (2) غیر مستنون طلاق

ایسی طلاق جو عورت کو ایام حیض میں دی جائے یا اس طہر میں دی جائے جس میں مرد نے عورت سے قربت کی ہو یا ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دی جائیں۔

### (3) باطل طلاق

ایسی طلاق باطل ہوگی جسے مجبوری کی حالت میں دیا جائے یا نکاح سے پہلے ہی طلاق دے دے۔ تابانی ہے، مجنون اور مدہوش کی طلاق بھی باطل ہوگی۔

### (4) ایک ہی مجلس میں بیک وقت تین طلاقیں دینا

### رجوع کرنا

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دی، پھر رجوع فرمایا۔

(ابوداؤد)

فوائد و مسائل : امام العصر شیخ ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ نے ایک روایت بیان کی ہے جس میں یہ وضاحت موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا تھا کہ رجوع فرمائیں اور کہا تھا کہ وہ روزہ رکھنے والی اور عبادت کرنے والی خاتون ہیں اور جنت میں آپ کی بیوی ہیں۔ اس میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت ہے کہ اللہ نے اپنے نبی کو انہیں زوجیت میں رکھنے کا حکم دیا۔

یہ بالاتفاق ناپسندیدہ اور ناجائز ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس پر سخت ناراضی کا اظہار فرمایا اور

1۔ طلاق دینا جائز ہے، لیکن بلاوجہ طلاق دینے سے پرہیز کرنا چاہیے۔  
 2۔ طلاق کے بعد رجوع کر لینے سے بیوی کو وہ تمام حقوق حاصل ہو جاتے ہیں جو طلاق سے پہلے حاصل تھے۔

### ناپسندیدہ کام

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”حلال کاموں میں سے اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند کام طلاق ہے۔“ (حاکم)

### طلاق دینے کا صحیح طریقہ

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

”میں نے اپنی عورت کو طلاق دینے کا وہ ایام حیض میں نہیں دیکھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اسے حکم دو کہ اس سے رجوع کر لے (اور اسے طلاق نہ دے) حتیٰ کہ وہ (حیض سے) پاک ہو جائے پھر اسے حیض آئے پھر وہ پاک ہو پھر اگر چاہے تو اس سے قربت کرنے سے پہلے طلاق دے اور چاہے تو اسے (نکاح میں) روک لے۔ یہ وہ عہد ہے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے۔“

فوائد و مسائل : اللہ تعالیٰ نے نکاح کا تعلق دائمی بنایا ہے، یعنی نکاح اس لیے کیا جاتا ہے کہ پوری زندگی اکٹھے گزارنی ہے۔ اس تعلق کو پائیدار بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بہت سے احکام و آداب نکاح کیے ہیں جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔

نکاح کرتے وقت نیک، دین دار بیوی تلاش کرنے کا حکم دیا گیا۔

نکاح کا تعلق انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی بنایا گیا ہے، یعنی ایک مرد کا ایک عورت سے تعلق نہیں بلکہ ایک

خاندان کا دوسرے خاندان سے تعلق قائم کیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے عورت کے سرپرستوں کی اجازت، گواہوں کی موجودگی اور دعوت و نذر جیسے احکام جاری کیے گئے ہیں۔

عورت کو مرد کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور مرد کو عورت کی غلطیوں اور کوتاہیوں پر برداشت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

عورت کی اصلاح کے لیے فوراً سختی کرنے کے بجائے اصلاح کا مدتہائی طریق کار تجویز کیا گیا ہے، یعنی ”بانی وعظ و نصیحت“ اظہار ناراضی اور بستر میں غلطی اور تنہا میں معمولی جسمانی سزا۔

اگر نکاحات میں بگاڑ اس حد تک پہنچ جائے کہ دوسروں کی مداخلت ضروری ہو جائے تو ثالثی، یعنی بیچایت کے طریق پر مرد اور عورت دونوں کی شکایتیں سن کر جس کی غلطی ہو اسے سمجھایا جائے اور صلح کرا دی جائے۔ (النساء ۳۵:۳)

اگر طلاق دینا ضروری ہو جائے تو ایک ہی بار تعلق ختم کر دینے کے بجائے ایک رجعی طلاق دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ جس کے بعد دوبارہ تعلق بحال کرنے کی گنجائش باقی رہتی ہے۔

ایام حیض میں اور جس طہر میں مقاربت کی گئی ہو، اس طہر میں طلاق دینے سے منع کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ اگر وقتی غصہ ہو تو ختم ہو جائے اور اگر جدائی کا فیصلہ ہو تو غور و فکر کرنے کی مہلت مل جائے اور اس طرح تعلقات بحال رکھنے کے امکانات بڑھ جائیں۔

دوسری طلاق کے بعد بھی رجوع کی اجازت دی گئی ہے۔

تیسری طلاق کے بعد رجوع کا حق نہیں رکھا گیا مگر موافقی طرح سوچ سمجھ کر یہ طلاق دے اور اسے معلوم ہو کہ اس کے بعد تعلقات بحال کرنے کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔

اگر ایام حیض میں یا اس طہر میں جس میں مقاربت



الندین یوسف۔)  
طلاق جس طرح عورت کو براہ راست مخاطب کر کے دی جاسکتی ہے، ایسے ہی کسی قابل اعتماد شخص کے ذریعے سے طلاق کا پیغام بھی بھیجا جاسکتا ہے اور لکھ کر بھی طلاق بھیجی جاسکتی ہے۔ ہر صورت میں طلاق واقع ہو جائے گی۔

### رجوع کرنے کا بیان

حضرت مطرف بن عبد اللہ بن شعیب رحمۃ اللہ علیہ روایت ہے کہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ ایک آدمی اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے اور پھر اس سے قربت کرتا ہے مگر طلاق دینے یا اس سے رجوع کرنے پر گواہ نہیں بناتا۔ (اس کا حکم کیا ہے؟) حضرت عمران رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تو نے سنت کے خلاف طلاق دی اور سنت کے خلاف ہی رجوع کیا۔ اس کی طلاق پر بھی گواہ مقرر کر اور رجوع پر بھی۔  
فائدہ : جس طرح نکاح کے موقع پر گواہوں کا تقرر ہوتا ہے، اسی طرح طلاق اور رجوع بھی گواہوں کی موجودگی میں ہونا چاہیے۔

### کیا تین طلاق والی عورت کو رہائش اور خرچ ملے گا؟

حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ان کے خاوند نے انہیں تین طلاقیں دے دیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں رہائش اور خرچ نہ دلایا۔  
فوائد و مسائل : طلاق بائن کے بعد عدت میں عورت کو خرچ دینا مرد کے ذمے نہیں۔  
بعض علماء نے طلاق بائن کے بعد بھی عدت میں عورت کا خرچ اور رہائش وغیرہ کا انتظام مرد کے ذمے قرار دیا ہے۔ ان کی دلیل سورۃ طلاق کی پہلی آیت ہے ”انہیں ان کے گھروں سے مست نکالو نہ وہ خود نکلیں“

کی گئی ہو، طلاق دی جائے تو یہ طلاق کا غلط طریقہ ہے، جسے علماء کی اصطلاح میں ”بدعی طلاق“ یا ”طلاق بدعت“ کہتے ہیں۔ ایسی طلاق کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ واقعی ہو جائے گی یا نہیں، بہت سے علماء اس کے واقع ہو جانے کے قائل ہیں لیکن اس طرح طلاق دینے والے کو گناہ گار قرار دیتے ہیں۔ دوسرے علماء کہتے ہیں کہ یہ طلاق واقع ہی نہیں ہوگی، کیونکہ سنت کے مطابق نہیں دی گئی۔ امام ابن حزم اور امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ اسی کے قائل ہیں۔ (حاشیہ سنن ابن ماجہ، از نواب وحید الزمان خان)

### ایک مجلس کی تین طلاقیں

حضرت عامر شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: میں نے حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے کہا: مجھے اپنی طلاق کے بارے میں بتائیے، انہوں نے فرمایا: ”میرے خاوند نے مجھے تین طلاقیں دے دیں جب کہ وہ یمن گئے ہوئے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نافذ قرار دے دیا۔“ (مسلم)  
فوائد و مسائل : صحیح مسلم کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کے خاوند حضرت ابو عمرو بن حفص بن مغیرہ مخزومی رضی اللہ عنہ نے دو طلاقیں پہلے دی ہوئی تھیں اور تیسری طلاق یمن سے حضرت عیاش بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہ کے ذریعے سے بھیجی۔ تین طلاقیں اکٹھی نہیں دی تھیں۔ (صحیح مسلم حدیث ۳۸۹۰)  
اسی تفصیل کی رو سے کئی محققین نے اس روایت کو بھی صحیح کہا ہے، کیونکہ اس روایت کا ابہام صحیح مسلم کی روایت سے دور ہو گیا۔ بہر حال صحیح مسئلہ یہی ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک ہی طلاق شمار ہوں گی۔ (اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب ”ایک مجلس میں تین طلاقیں“ تالیف: حافظ صلاح

نے عرض کی۔ ”آپ نے قسم کھائی تھی کہ مسینہ بھر آپ ہمارے

پاس تشریف نہیں لائیں گے۔ (اور ابھی انہیں دن پورے ہوئے ہیں، صبح میسواں دن ہو گا۔) تو آپ نے تین بار انگلیوں کا اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ”مسینہ اتنا ہوتا ہے (تیس دن کا) اور (دوسری بار) ساری انگلیوں سے (دو بار) اشارہ فرما کر تیسری بار ایک انگلی بند کی، اور فرمایا ”اور مسینہ اتنا بھی ہوتا ہے (اتیس دن کا)۔“

کواہم و مسائل 1: اگر خاوند کسی معقول وجہ سے ناراض ہو کر بیوی کے پاس کچھ مدت تک نہ جانے کی قسم کھائے تو یہ جائز ہے اسے ایلاء کہا جاتا ہے۔  
2۔ ایلاء کی زیادہ سے زیادہ مدت چار مہینے ہے۔ اگر غیر معینہ مدت کی قسم کھالی ہو تو چار مہینے گزرنے کے بعد عورت اس کے خلاف رموی دائر کر سکتی ہے اور عدالت اسے حکم دے گی کہ بیوی سے تعلقات قائم کرے یا طلاق دے۔ (مفہوم سورۃ بقرہ آیت ۲۳۶: ۲۳۷)

3۔ اگر خاوند نے چار ماہ یا اس سے کم مدت کے لیے قسم کھائی ہو اور مقررہ مدت ختم ہونے سے پہلے وہ تعلقات قائم کرے تو اسے قسم کا کفارہ دینا پڑے گا۔ اور اگر مقررہ مدت تک اپنی قسم پر قائم رہے تو کفارہ نہیں ہو گا، نہ طلاق پڑے گی۔

4۔ ایلاء طلاق کے حکم میں نہیں۔ اس سے نہ ایک طلاق پڑتی ہے، نہ زیادہ۔

ظہار کرنا (بیوی کو ماں یا بہن کہنا)

”ظہار“ کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی بیوی کو ”تو میرے لیے ایسی ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ“ اس کا مطلب یہ ہے کہ تو مجھ پر اسی طرح حرام ہے جس طرح ماں حرام ہوتی ہے۔

ظہار کرنا گناہ ہے لیکن اس سے نکاح نہیں ٹوٹتا۔

سوائے اس کے کہ وہ کھلی برائی کا ارتکاب کریں۔“ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ آیت رجعی طلاق والی عورت کے بارے میں ہے، کیونکہ اس کے بعد یہ فرمان ہے۔

”تم نہیں جانتے شاید اس کے بعد اللہ تعالیٰ کوئی نئی بات پیدا کر دے۔“ اس آیت میں نئی بات سے مراد یہ ہے کہ ایک گھر میں رہنے سے امید ہے کہ میاں بیوی کے درمیان محبت کے جذبات پیدا ہو کر رجوع ہونے کا امکان ہو گا۔ یا ن طلاق کے بعد یہ امکان نہیں کیونکہ رجوع کا حق باقی نہیں رہتا۔

اگر عورت حمل سے ہو تو عدت کے دوران میں اس کا خرچ مرد کے ذمے ہے، خواہ طلاق یا ن ہی کیوں نہ ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے ”اگر وہ حمل سے ہوں تو بچہ پیدا ہونے تک انہیں خرچ دیتے رہو۔“

اگر آدمی کہے کہ اس نے طلاق نہیں دی

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جب عورت خاوند سے طلاق مل جانے کا دعویٰ کرے اور ایک قابل اعتبار گواہ پیش کر دے تو اس کے خاوند سے قسم اٹھانے کا مطالبہ کیا جائے گا۔ اگر اس نے قسم کھالی (کہ میں نے طلاق نہیں دی) تو گواہ کی گواہی کا عدم ہو جائے گی۔ اور اگر اس نے قسم سے انکار کیا تو اس کا انکار دوسرے گواہ کے مقابلہ میں قائم ہو جائے گا اور اس کی طلاق نافذ کر دی جائے گی۔“

عورت سے مقاربت نہ کرنے کی قسم کھا لینا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھالی کہ آپ ایک مسینہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہم کے پاس تشریف نہیں لے جائیں گے، چنانچہ آپ انہیں دن ٹھہرے رہے۔ جب میسویں دن کی شام ہوئی تو آپ میرے ہاں تشریف لے آئے۔ میں



صرف اس وقت تک مقاربت منع ہو جاتی ہے جب تک کفارہ ادا نہ کر لیا جائے۔

اس گناہ کا کفارہ یہ ہے کہ دوبارہ ازواجی تعلقات قائم کرنے سے پہلے ایک غلام آزاد کیا جائے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو دو ماہ تک مسلسل روزے رکھے۔ اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو ساٹھ مسکینوں کو ایک وقت کھانا کھلا دے۔

جس شخص پر کسی وجہ سے کفارہ واجب ہو جائے اور وہ اتنا غریب ہو کہ ادا نہ کر سکتا ہو تو مسلمانوں کو چاہیے کہ صدقات و زکوٰۃ سے اس کی مدد کریں تاکہ وہ کفارہ ادا کر سکے۔

اگر مقررہ مدت کے لیے ظہار کیا جائے پھر اس مدت میں مقاربت سے پرہیز کیا جائے تو کفارہ واجب نہیں ہوگا۔

اگر ظہار میں مدت کا ذکر نہ ہو تو جب بھی بیوی سے ملاپ کرنا چاہے گا ضروری ہوگا کہ اس سے پہلے کفارہ ادا کرے۔

### ظہار کرنا

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اللہ بڑی برکت والا ہے جو سب کچھ سنتا ہے۔ جب حضرت خولہ بنت اخیوت رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے خالہ زاد بھائی حضرت اوس بن صامت رضی اللہ عنہ کی شکایت کر رہی تھیں تو میں بھی ان کی باتیں سن رہی تھی لیکن کچھ باتیں (قریب ہونے کے باوجود) میری سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

”اے اللہ کے رسول! (میرا خالہ زاد) میری جوانی کھا گیا، میں نے اس کے لیے (بچے جن جن کر) بیٹ خالی کر دیا۔ اب جب کہ میں بوڑھی ہو گئی ہوں اور مجھے اولاد ہونا بند ہو گئی ہے تو اس نے مجھ سے ظہار کر لیا ہے۔ یا اللہ! میں بھی اسے شکایت کرتی ہوں۔ وہ ابھی

وہیں تھیں کہ جبرائیل علیہ السلام یہ آیات لے کر آئے۔ ترجمہ: ”یقیناً اللہ نے اس عورت کی بات سن لی جو تجھ سے اپنے شوہر کے بارے میں ٹکرا کر رہی

تھی اور اللہ کے آگے شکایت کر رہی تھی۔“  
فوائد و مسائل: اللہ تعالیٰ سننے کی صفت سے متصف ہے اور اس کی سماعت بندوں کی طرح محدود نہیں بلکہ لامحدود ہے۔

2۔ حضرت خولہ رضی اللہ عنہا نے اپنے پرہا پے کا ذکر اس لیے کیا کہ اگر وہ جوان ہوتیں تو ان کے لیے دوسرا نکاح کر لینا آسان ہوتا، کوئی نہ کوئی ان کی جوانی کے پیش نظر اولاد کی امید میں ان سے نکاح کر لیتا، اس طرح ان کے لیے بچوں کو دیکھ بھال آسان ہو جاتی۔

3۔ مصیبت میں اللہ ہی سے دعا کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ تمام مشکلات حل کرنے والا ہے۔

4۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے جو نعم نازل ہوتا تھا اسی پر عمل کرتے اور کرواتے تھے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

”کہہ دیجئے: مجھے یہ حق نہیں کہ میں اپنی طرف سے اس (قرآن) میں ترمیم کروں میں تو اسی کی پیروی کروں گا جو کچھ میرے پاس وحی کے ذریعے سے پہنچا ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بھی ایک بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے۔“

### اللہ کا عذاب

حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”میری امت کے کچھ لوگ شراب پیئیں گے وہ اس کا کوئی اور نام رکھ لیں گے۔ ان کو گانے والیاں ساز بجا کر گانے سنائیں گی۔ اللہ تعالیٰ انہیں زمین میں دھنسا دے گا اور ان میں سے بعض کو ہند اور خنزیر بنادے گا۔“



# روبو

سمیرا حمید

کرتے ہوئے آپ کو معلوم ہوتا ہے اینڈ کیا ہو گا۔  
”جب باقاعدہ لکھنے کے لیے قلم اٹھائیں تو کہانی مکمل تصویر میں ڈھل چکی ہوتی ہے۔ کہانی لکھتے ہوئے یہ توقع سے بہتر لکھی جاسکتی ہے، لیکن اصل کہانی اپنی جگہ قائم رہتی ہے اور لکھتے ہوئے وہ مزید مکمل اور جامع ہوتی جاتی ہے۔ چند سینز آگے پیچھے

ہو جاتے ہیں، لیکن ایسے کہ اصل کہانی پر اثر انداز نہ ہوں، بلکہ اور بہتر ہوں۔ کہانی لکھتے ہوئے اختتام معلوم ہوتا ہے، اسی لیے واقعات اس اختتام کی طرف جاتے ہیں۔“

ماہ نور آفتاب گوجرانوالہ سے کہتی ہیں۔ ”آپ کی کہانیاں پڑھ کر لگتا ہے، آپ کے پاس بہت معلومات ہیں، جیسے کہ آپ نے شیلا گائے کے بارے میں بھی لکھا اور اب یارم میں بھی اتنا کچھ لکھا، آپ کے پاس اسی معلومات کیسے آئیں۔“

”زیادہ معلومات نہیں ہیں میرے پاس ماہ نور۔ بلکہ اکثر معمولی چیزوں کے لیے مجھے سرچ، انجین کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی خاص شعبے کو لے کر جو معلومات آپ کے پاس ہوں وہ میرے پاس نہ ہوں۔ ہم سب کے پاس کچھ نہ کچھ ہوتا ہے ایک دوسرے سے مختلف، لیکن کچھ ضرور۔ جیسے جو لوگ گاؤں میں رہتے ہیں، ان کے پاس موسیٰ بیوں، درختوں، فصلوں، زمین، بارشوں، سبز یوں اور موسموں سے متعلق جو معلومات ہوتی ہیں وہ قابل رشک ہوتی ہیں اور جو لوگ پھاٹوں میں رہتے ہیں وہ پھاٹوں، آبشاروں وغیرہ کے بارے میں کسی بھی کتابی انسان سے زیادہ جانتے ہیں۔“

رفیعہ شعیب نے کراچی سے پوچھا ہے کہ ”سمیرا جی آپ نے شروع سے ہی ایڈ کا سوچ رکھا تھا یا فیصلے کے اصرار پر کیا؟“

”آپ کے سوال پر میں نے ایک قلم لگایا ہے۔ شاید اصرار کی جگہ آپ ”ڈر“ کا لفظ لکھنا چاہ رہی تھیں۔ قلم میں اصرار کر رہے تھے، محبت میں کر رہے تھے اور میں ان کی محبت کی قدر دان ہوں۔ صاف گوئی سے جواب دوں تو میں اپنی تخلیقات میں بے انتہا ضدی ہوں۔ میں بنیادی کہانی میں کسی صورت تبدیلی نہیں کرتی۔ کہانی یہ ہی تھی جو آپ نے پڑھی، اس کے مرکزی خیال میں ذرا بھی تبدیلی نہیں کی گئی۔ اگر عالیان اور امرتہ نے مرنا ہوتا تو وہ ہر صورت مرتے۔ چاہے پھر اختتام لکھ کر مجھے کیسے روپوش ہو جائیں۔“

ہمارے دور نے بعد از دعا پوچھا ہے کہ ”یارم کے سبب کون سا سب سے زیادہ پسند ہے۔ ایک قاری نے پوچھا ہے کہ مارگریٹ کی ڈائری جو عالیان ماما سے مانگتا ہے اس ڈائری میں کیا تھا؟“

”ہا! دعا کے لیے بہت شکریہ۔ سب کے سب کردار مجھے بہت پسند ہیں اور یہ حقیقت ہے میں ان سب کرداروں کی کردار نگاری سے مطمئن ہوں۔ مارگریٹ کی اس ڈائری میں کیا ہو سکتا ہے سوائے ولید البشر کی یادوں اور مارگریٹ کی سسکتی ہوئی محبت کے۔ یہ ڈائری محض اس معنی میں تھی کہ وہ ڈائری اتنی دردناک ہے کہ ماما سر عالیان کو اس سے دور رکھنا چاہتی ہیں۔“

معتظمہ طفیل ڈیرہ غازی خان سے پوچھ رہی ہیں کہ ”کیا ناول لکھنے سے پہلے پوری کہانی سوچنی ہے یا صرف تھیم سوچ کر باقی کا اینڈ کرتی جاتی ہیں، کہانی شروع



علیٰ خان چوہدری کا سوال ہے کہ۔ ”آپ کے احساسات کیا تھے جب یہ ٹاول لکھ رہی تھیں۔ کیا سچ میں ایک ایسے ماحول سے نکلی ہوئی لڑکی خود کو اس مقام تک لے جاسکتی ہے؟“

”یاری کی تصویر آہستہ آہستہ مکمل ہو رہی تھی اور میں اس تصویر کی تکمیل پر تشکر کے ساتھ خوش ہوتی تھی۔ امرجہ ہی کیوں؟ کوئی بھی خود کو کسی بھی مقام تک لے جاسکتا ہے، کامیاب ہو سکتا ہے۔ ہم سب باصلاحیت ہیں۔ تمام عظیم شخصیات کی زندگیوں کو کھنگال کر دیکھ لیں۔ انہوں نے کبھی خود کو ٹھکنے یا رکنے نہیں دیا۔ وہ جرات مند اور ہمیشہ مائل بہ عمل رہے ہیں۔ کسی ذریعے سے مجھ تک یہ کہانی آئی کہ گاؤں کی ایک لڑکی کی شادی اپنے رشتے داروں میں جو

لندن میں رہتے تھے ہو گئی اور لڑکی بھی لندن چلی گئی۔ کچھ عوائل کا فرما ہوئے اور لڑکی کو انٹر ڈیپارٹمنٹ کا کورس کرنے کا موقع دیا گیا۔ گاؤں کی سادہ لوح اور کم تعلیم یافتہ لڑکی نے مغربی اور ایسی انداز کو مدغم کر کے انٹر ڈیپارٹمنٹ میں نئے رجحانات متعارف کروا کر سب کو حیران کر دیا تو میں ذاتی طور پر اس پر یقین رکھتی ہوں کہ ہر انسان اپنے اندر بیش بہا صلاحیتیں رکھتا ہے۔ ضرورت ہے تو صرف انہیں ابھار کر سامنے لانے کی۔ آخر انسان کو انٹرف کے لقب سے نوازا گیا ہے اور یہ کوئی معمولی لقب نہیں ہے۔“

”برازیل شہر پاکستان میں کافی مشہور ہو چکا ہے کیا سندری امرجہ بھی برازیل میں مشہور ہو چکی ہیں؟“

نبیلہ قیوم کراچی۔

”سندری امرجہ جب اپنی کہانی بنام یارم سے لکھ کر برازیل جائیں گی تو پھر شاید۔“

حنان بتول فیصل آباد سے پوچھ رہی ہیں کہ۔ ”آپ کا لکھنا قدرتی ہے یا خواہش؟“

”میرا لکھنا قدرتی ہے۔“

”دوستوں کے لیے سائی ہوں۔“

سائی مجھے ”سے اٹ آل“ کے لفظ میں ملا اور اسی لفظ سے میں نے سائی کو بنانا شروع کیا۔ سائی کے کردار کا محرک ”سب کہہ دو“ کا تصور تھا۔

عنبرین انور رحیم یار خان سے پوچھتی ہیں۔

”مارگریٹ کا کردار بہت ترنٹا ہوا تھا کیا کوئی حقیقی کردار ایسا دیکھا ہے؟“

”مارگریٹ حقیقی کردار نہیں ہے، لیکن چند

دورانوں کے دکھوں کی حقیقی تصویر ضرور تھی۔“

”میں شاہ ماچسٹر سے شکوہ بھی کر رہی ہیں اور سوال بھی کہ۔“

”میں واپس پاکستان کب آئی اور ماچسٹر میں میری رہائش کہاں تھی اور میں نے ٹاول کا اینڈ اتنی جلدی کیوں کر دیا۔“

”میں ماچسٹر نہیں گئی تھی اور ٹاول کا اختتام اب

نہیں ہوتا تو کبھی تو ہوتا۔ ایک اچھی قاری ہونے کی حیثیت سے آپ بھی جانتی ہیں کہ ہر کہانی کی ایک حد ہوتی ہے، اگر اسے اس حد سے نکال لیا جائے تو پھر وہ

اپنی اصل شکل کھودیتی ہے۔“

”امرجہ کی سائیکل رئیس کیوں ضروری تھی اور آپ نے کیوں کہانی میں شامل ہوتی رہیں اس کی کوئی خاص وجہ تھی؟“

”میریم منیر لاہور۔“

”تاکہ امرجہ کارل کو ہراسکے اور یہ جان سکے کہ مقابلہ اہم ہے نہ کہ ہار جیت۔ کہانی میں شامل ہونے کی کوئی خاص وجہ نہیں رہی صرف ایک انداز کو لکھتے لکھتے میں خود بھی کہانی کا حصہ بن جاتی تھی اور جہاں میں آئی وہاں میں موجود ہونا چاہتی تھی خاص کر سینئرز کے ٹریبونٹ میں۔“

فیصل آباد سے صاعقہ نور فاطمہ کا کہنا ہے کہ۔

”آپ نے بہت اچھے اور مختلف الفاظ کا چناؤ کیا، لیکن کہیں کہیں اردو سمجھنے میں مجھے مسئلہ ہوا۔ آپ نے مشکل اردو کا استعمال کیوں کیا کہانی میں۔ آپ نے اردو کہاں سے سیکھی ہے؟“

”صائمہ! بادشاہی مسجد میں نکاح کی تقریب کا اسٹیج



دوسرے کیسے سیکھیں گے اردو کے لیے میں نے کافی کوشش کی ہے۔ آپ کے حصے میں تو نسبتاً سہل کام آیا۔ ”پڑھنے کا“ کسی بھی دوسری زبان سے زیادہ میری زبان اردو کا مجھ پر پہلا اور امتیازی حق ہے کہ میں اس پر دسترس حاصل کروں۔ میں اردو کے سلسلے میں اپنی کوشش کو جاری رکھنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔“

کراچی سے شینہ اکرم اپنے پراثر خط اور انداز تحریر کے ساتھ پوچھ رہی ہیں کہ۔ ”امرحہ کا کردار لکھتے ہوئے ذہن میں کیا خیال تھا۔ کیا کارل جیسے کردار دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ آپ کسی خاص موڈ میں لکھتی ہیں یا بے وقت اور موڈ کی قید نہیں کیا اس کا اینڈ کارمین کی آرا کیا لکھا؟“

”محبت من عرم یارم اور ناول کے اختتام پر لکھی مطروحات پر آپ کی رائے پر شکریہ ادا کرتی ہوں۔ کم عقل بے چارگی تلامذہ اور کم ہمتی سے شعور

علم اور بلندی کی طرف سفر کے خیالات ذہن میں تھے۔ امرحہ کو لکھتے ہوئے بے چارگی پیدا نہیں ہوئی، خود ساختہ ہوتی ہے یہ بھی۔ امرحہ کا کردار ایک شاگرد کا کردار ہے وہ ہر نئے موڈ پر نئے واقعات پر سیکھتی چلی جاتی ہے۔ کچھ کم ہوتے ہیں کچھ زیادہ، لیکن کارل جیسے بہت سے کردار ہماری دنیا میں موجود ہیں۔ یارم کا اختتام پہلے سے ہی طے تھا مقارمین کی آرا پر نہیں لکھا۔ یارم کے لیے میں نے موڈ دیکھا ہی وقت بلکہ ہر چیز کو بالائے طاق رکھ کر اسے لکھا۔ ویسے میں موڈ کے زیر اثر آجایا کرتی ہوں۔“

ماریہ عباسی اور مسز سبین اجمل لاہور سے پوچھ رہی ہیں کہ ناول میں لکھا ہے کہ۔ ”میں اسی قلم سے دوبارہ آنے کے لیے جا رہا ہوں، میرا انتظار کیا جائے۔“ کیا کارل آئے گا؟“

”جی کارل دوبارہ آئے گا۔ نئی جگہ، نئے لوگوں میں، نئی کہانی کے ساتھ۔ جہاں وہ انتظار کرنے والوں کا انتظار ختم کرنے جا رہا ہے۔“

بہت اچھا بنایا ہے آپ نے۔ ناول میں سب کے سب جملے بے حد سادہ انداز میں بیان کیے گئے کوئی ایک بھی جملہ ایسی اردو میں نہیں تھا جو اجنبی لگتی۔ زبانیں اس وقت مشکل ہو جاتی ہیں جب وہ رائج نہ ہوں یا جس کے بہت سے حصے یا لفظوں کو استعمال کرنا چھوڑ دیا جائے جیسے لفظ آنخورہ۔ ہم سب نے اب گلاس یا کپ کہنا شروع کر دیا ہے، اس لیے لفظ آنخورہ مشکل لگتا ہے۔ ہم لائٹ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے لفظ قلم یا قلمی مشکل اردو میں جا شامل ہوئے ہیں۔

اسپورٹ کا لفظ آسان ہے اور اس کی اردو جواز السغور کو کوئی جانتا بھی نہیں ہے۔ بینک لفظ آسان ہو گیا ہے، لیکن اس کی اردو ساہوکارا مشکل تر ہے۔ اردو بھی مشکل نہیں ہے بس ہم نے اس کا عام استعمال چھوڑ دیا ہے۔ لکھنا پڑھنا اور بولنا تو زبانیں اس وقت مشکل ہو جاتی ہیں جب ہمیں ترک کرنا شروع کر دیا

جائے۔ جب وہ اپنے ہی زبان والوں کے لیے بولنے والوں کے لیے اجنبی ہو جائیں۔ میں نے تو ناول میں اپنی ہی زبان کو رائج کیا ہے بس۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے کچھ ایسے لفظوں کا استعمال کیا ہے جن کا عام استعمال بالکل ترک کیا جا رہا ہے اور جو پڑھنے والوں کے لیے اجنبی ہیں۔ لیکن یہ لفظ لغت میں قید ہونے کے لیے تو خود میں نہیں آئے؟ اگر انہیں لکھا ہوا یا پڑھا نہیں جائے گا تو ان کے وجود میں آنے کا مقصد کیا ہوگا؟

میری اردو بہت اچھی نہیں ہے، لیکن میں کوشش کر رہی ہوں کہ میں اچھی اردو لکھتا ہوں اور پڑھنا سیکھ لوں۔ کوئی بھی کتاب، رسالہ یا کچھ بھی پڑھتے ہوئے میں نئے لفظ پر نشان لگاتی ہوں اور اسے یاد کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ مجھے اچھا لگتا ہے اپنی زبان اردو کو سیکھنا۔ ناول یا کتاب یا رسالہ یہ تو ایک اچھا ذریعہ ہیں سیکھنے اور سکھانے کا۔ اگر ہم ہماری زبان کو نہیں سیکھیں گے تو کون سیکھے گا۔ اگر ہمارے لیے ہماری ہی زبان اجنبی ہوگی، اس کے لفظ مشکل ہوں گے تو



پاکستان میں ضرور تبدیلی آئے گی، وہ بھی لڑکیوں میں۔  
سہلی جیسے بے غرض انسان ضرور ہونے چاہئیں۔  
رباب کے ساتھ وجہہ انور ہاشمی نے کراچی سے پوچھا  
ہے کہ کارل جیسا کردار تخیل ہے یا ایسا کوئی انسان سچ  
میں موجود ہے؟

”رباب آپ کا ہاتھ سے بنا کر بھیجا تو نو کالج بہت  
خوب صورت ہے۔ سب کرداروں کی تصویریں بہت  
کھوب ہیں۔ کارل کی تصویر آپ نے عین اس کے  
مطابق بنائی ہے۔ کارل کا کردار میرا تخیل  
ہے، لیکن ایسا نہیں ہے کہ اس جیسے انسان دنیا میں  
پائے نہیں جاتے۔ اگر آپ تھوڑا سا غور کریں تو  
مشاہدہ کریں گی کہ آج کل کے بچے بہت زیادہ شرارتی  
ہیں۔ بہت ذہین اور حیران کن حد تک چونکا دینے  
والے۔ ایسے ہی بچوں جیسا کارل ایک بڑا بچہ ہے۔“  
”آپ کا مطالعہ بہت وسیع لگتا ہے۔ اب تک کتنی  
کتابیں پڑھ چکی ہیں؟“ ہانسہ جواد، سرور دعا۔

”میں نے پڑھا زیادہ نہیں، سوچا زیادہ ہے۔ زیادہ  
مشاہدہ کیا ہے، زیادہ پوچھا ہے اور زیادہ پوچھا ہے۔“

”تمہارے رشتہ اسلم کا سوال ہے کہ۔“ گھر والوں  
میں سے کسی نے لکھنے سے روکا؟

”لکھنا ایک مستر عمل ہے اور میرے گھر والے اس  
کے قائل ہیں۔ وہ میرے فیصلوں اور میرے کام کا  
احترام کرتے ہیں۔“

ستارہ آمین پیر محل کا کہنا ہے کہ۔ انہوں نے یارم  
سے انتخاب کر کے ایک شاعری ترتیب دی جسے بہت  
پسند کیا گیا۔ پوچھا ہے برازیل کا واقعہ سچا تھا یا آپ نے  
خود تحریر کیا۔ یارم کو لکھتے وقت کیا مشکلات آئیں؟

برازیل کا واقعہ سچا نہیں ہے۔ اس سے ملتے جلتے  
واقعات فٹ بال کی تاریخ میں بہت ہو چکے ہیں۔ لیکن

یارم کے لیے اسے میں نے خود تخلیق کیا اور اسے  
حکومت مخالف گروپ کے ساتھ منسلک کیا۔ باطنی  
مشکلات کا تعلق کچھ تخلیق اور وارہ ہونے کے عوامل

سے رہا کہ کئی بار مجھ سے میرا مطلوبہ جملہ نہیں لکھا جاتا

گو جراثوالہ سے حمیرا شراونے بعد از دعا کہا ہے  
کہ۔ ”آپ کلاسک ناول مثلاً ”رومیو چولیس“ ہیر  
رائجھا کو اپنے سحر انگیز طرز اسلوب میں ڈھالیں۔“  
”دعاؤں کے لیے شکریہ۔ آپ کا مشورہ قابل قدر  
ہے۔“

ناروال سے شفیقہ اور بس نے پوچھا ہے کہ۔ ”کہانی  
میں کیا ہونا ضروری ہے؟“

”کہانی میں عالمگیریت کا ہونا ضروری ہے کہ وہ دنیا  
کے کسی بھی حصے میں بیٹھ کر لکھی جائے اور اسے دنیا  
کے کسی بھی حصے میں بیٹھ کر کوئی بھی پڑھے تو کہانی اس  
کے لیے اچھی نہ ہو۔ یعنی جو طاقت باوقدسیہ کے قلم  
میں ہے کہ سنگھائی میں بسنے والے اور نیویارک میں  
رہنے والے راجہ گدھ کو پڑھتے قوم کی کیفیات میں  
خود کو بھی جھٹایا پائیں گے اور کسی کے سرہانے سر رکھ کر  
روئیں گے۔“

جراثوالہ سے عظمیٰ شفیق پوچھتی ہیں کہ۔ ”کارل  
سے کب ملو امیں گی؟“

”کارل سے ملنے کے لیے آپ کو تھوڑا انتظار کرنا  
ہوگا۔“

سید والا سے فرحت اشرف گھمن نے پوچھا ہے  
کہ۔ ”میں کہاں رہتی ہوں اور میں نے لکھنے کا آغاز  
کہاں سے شروع کیا؟“

”میں لاہور میں رہتی ہوں اور لکھنے کا باقاعدہ آغاز  
خواتین ڈائجسٹ کے ادارے سے کیا۔ مجھے بھی آپ  
سے مل کر خوشی ہوگی۔ آپ کا خط میرے لیے کسی  
ملاقات سے کم نہیں ہے۔“

”مرحہ ۲ نے لاہور میں برف باری کرادی تھی۔  
اب آپ کے اگلے کسی ناول کی ہیروئن کیا کردائے گی  
لاہور میں؟ کوئل نعمان، میاں چنوں۔“

”شاید وہ لاہور کی سڑکوں پر بل فائنٹک کروا دے  
اور اس پر اصرار کرے کہ بل ہمارا کچھ نہیں بگاڑ  
سکتا۔“

”رباب خلیل کا کہنا ہے کہ ویرا کی ہمدردی کے بعد



والی کارٹی ملنی چاہیے تھی۔ امرجہ اور عالیان پاکستان سے اتنی جلدی کیوں چلے گئے۔ عالیان نے ٹولا ہور کے علاوہ باقی کچھ دیکھا ہی نہیں اور پنڈی سے — سلمیٰ زاہد کا کہنا ہے کہ میں کارل کو پاکستان کیوں نہیں لائی۔

”کارل کیلئے کہاں ہے؟ ساری دنیا ہے نا اس کے پاس اس کا شکار بننے کے لیے۔ عالیان اور امرجہ اس لیے جلدی چلے گئے، کیونکہ انہیں یونیورسٹی جا کر اپنی تعلیم مکمل کرنی تھی۔ عالیان بھی، سمجھی آپ کے خان پور آجائے گا۔ کارل اس لیے پاکستان میں آیا، کیونکہ اس کا تعلق کمانی کا حصہ نہیں تھا۔“ کوئٹہ سے شامل احمر کا سوال ہے: ”کون سا کردار لکھنا مشکل تھا۔“

”وہ کردار تھوڑی مشکل میں ڈال دیتے ہیں جو ارتقا سے گزر رہے ہوں اور کمانی میں امرجہ اور عالیان ارتقا کا شکار رہے۔ خاص طور پر عالیان کیونکہ امرجہ کے انکار کے بعد اس میں گاہے بگاہے تبدیلیاں آرہی تھیں اور اس کی ذہنی رد ہر نئے واقعے اور سانحے کے بعد بدل رہی تھی۔“

سرگودھا سے عائشہ، سائرہ اور مریم مقبول پوچھ رہی ہیں کہ: ”کارل سے پوچھئے نا جب وہ پاکستان آئے کا تو

سرگودھا کا چکر لگائے گا نا؟ آخر ہم بھی دیکھیں جب یہ آفت نازل ہوگی ہمارے شہر کا کیا حال ہو گا۔ آپ کے ناول کا ہر لفظ ہر کردار ہمارے ذہن پہ کبھی نہ مٹنے کے لیے نقش ہو گیا ہے۔ آپ نے اتنے ہیرے موتی، پھول کلیاں کہاں سے اکٹھے کیے؟“

”کیا آپ کو اپنے شہر کا سکون عزیز نہیں ہے؟ سارے ہیرے موتی عطا کرنے والے کی دین ہیں۔“ لیتہ سے سدرہ بھٹی کا سوال ہے کہ: ”ایک کمانی میں بنیادی خصوصیات کیا ہونی چاہئیں۔“

”ہر کمانی اپنے مرکزی خیال کے ساتھ بنیادی خصوصیات کا تعین کرتی ہے۔ لیکن اگر میں عام بات کروں تو کمانی کی روح کو مستحکم اور جامع ہونا چاہیے۔ کردار نگاری عروج پر ہونی چاہیے۔ بیانیہ مستند ہونا

تھا۔ دماغ بالکل خاموش ہو جاتا تھا اور ایک لفظ بھی سوچ کر لکھنے کے قابل نہیں رہتا تھا۔ ظاہری طور پر میں نے یارم لکھتے ہوئے ایک مشکل مسلسل جھپکی۔“ بے خوابی کی ”گہری نیند یا کھل نیند میرے لیے خواب ہو چکی تھی۔ نہیں میں کبھی سندھ گورکھ ہل نہیں گئی، لیکن موقع ملا تو ضرور جاؤں گی۔“

حافظ آباد سے زہب النساء نے افسوس کا اظہار کیا ہے کہ: ”ہمارے معاشرے میں ہر لڑکا عالیان جیسا کیوں نہیں ہے۔ امرجہ اور عالیان کی شادی پر شکریہ ادا کیا ہے اور پوچھا ہے کہ کیا آپ نے اپنے اس پاس ایسا ہوتا دیکھا یا پھر صرف تخلیق کار کے ذہن کا نمائندہ ہے۔“

”اس پاس جو ہوتا ہے وہ مشاہدے میں رہتا ہے۔ سوچہ بوجھ کے بے شمار دماغ ہوتے ہیں۔ مشاہدات، تجربات، سوچہ بوجھ اور اپنے خیال کو تخلیق کار اپنے طرز اور اسلوب پر کمانی کی صورت میں بیان کر کے کمانی کرتا ہے۔“

قصور سے اقصیٰ اور حفصہ کہتی ہیں کہ: ”مجموعی میرا دل کرتا ہے کارل بن جاؤں اور کبھی دل کرتا ہے سائی انسانوں نے پوچھا ہے کہ کیا مارگریٹ کے ساتھ اس کی محبت بھی مرگئی اور ولید البشر کو تھوڑا سا تو بچھتاوا ہونا چاہیے تھا مارگریٹ اور اپنے بیٹے کو چھوڑنے کا۔“

”اقصیٰ میرا خیال ہے آپ سائی بن جائیں اور حفصہ آپ کارل۔ جس محبت کی قدر نہ کی جائے اور کرنے والا اس کے لیے خود کو ختم کر دے، اس کا انجام کم و بیش یہ ہی ہوتا ہے جو مارگریٹ کی محبت کا ہوا۔ ولید البشر کو اگر بچھتاوا ہوتا تو وہ واپس آجاتا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کم ظرف انسانوں کی پہلی نشانی بے حس ہوتی ہے اور وہ بے حس تھا۔“

خان پور سے عائشہ، مریم، سحر، نسرتن، ماریہ، رومیہ، آرتج کے گروپ نے پوچھا ہے کہ: ”کارل کو کیلئے کیوں چھوڑا؟ اس کو بھی اس جیسے شیطانی دماغ



چاہے اور کمائی کے ہر حصے پر گرفت ہونی چاہیے۔“  
خانیوال سے فرداوقار کارل اور عالیان کی کوئی ایک  
خامی پوچھ رہی ہیں۔

”کارل تو ایک معصوم سا انسان ہے اس میں کوئی  
خامی کہاں ہے؟ عالیان کی یہ کہ وہ کافی سخت دل ہو گیا  
تھا۔“

”ہمارے والد سے عشرت طاہرہ کا کہنا ہے۔“ ویرا نے  
اپنی اعلیٰ ظرفی سے پورے روس کی عزت رکھ لی۔  
”انہوں نے پوچھا ہے کہ یہ ناول میرے ذاتی تجربے کا  
نچوڑ ہے یا علم کا؟ کیا میں برطانیہ کی شہری ہوں۔“

”جیسے لیڈی کا خطاب دینے کے لیے شکریہ۔ میں  
برطانوی شہری نہیں ہوں اور یہ ناول میرے ذاتی  
تجربات، علم، مشاہدے، تخیل اور تخلیق کا نچوڑ ہے۔“  
سرگودھا سے رانیہ فائزہ کو راہبہ پوچھتی ہیں کہ۔

”بارشادی مسجد میں دونوں کے نکاح نے حیران کر دیا کہ  
نکاح کا منظر ایسے بھی لکھا جاسکتا ہے۔ شاہی طے کو بھی  
شامل کر دیا آپ نے؟ یہ تار خیال کیسے آیا آپ کو؟“

”مسجد میں نکاح ایک قابل قدر روایت ہے  
’تاریخی شہر کی تاریخی مسجد میں نکاح کا خیال میرے  
لیے بہت خاص تھا۔ اس لیے میں اس میں تارتج کو  
لے آئی۔ راوی کا دل ایسے ہنسنا، شاہی قلعے کا آباہو جانا

اور پانی کا جھانگیر کے دور میں بنائے حوضوں میں واپس  
ہنسنا اسی کی ایک گڑی تھی۔“

گڑیا راجپوت ضلع ننکانہ صاحب سے پوچھ رہی ہیں  
کہ آپ کا بچپن کہاں گزرا اور اگر قلم میں فرمائش  
کریں کہ۔ ”آپ کا اگلا ناول کارل پر ہونا کیا پوری  
کریں گی۔“

”توسیع کی طرح آنکھوں کو میں نے بھی کرنے کی  
کوشش کی، لیکن مجھ سے ہوا نہیں اور آپ کے تھری  
پوزر سوال میں واقع کئی سوالات ہیں۔ میرا بچپن لاہور  
میں ہی گزرا ہے۔ آپ نے جو فرمائش کی ہے اس پر۔

میں آپ سے درخواست کرنا چاہوں گی کہ اگلا ناول  
کارل کا نہیں ہو سکتا اس لیے ابھی سے کارل کا انتظار

نہ کیا جائے۔“

”میرپور خاص سے ماہم حمید نے یارم کے ختم  
ہونے پر دکھ کا اظہار کیا ہے۔ چیچہ وطنی سے عروہ عثمان  
نے اپنی بہنوں، گزنز اور دوستوں کے ساتھ مل کر یارم  
پڑھا ہے اور خط میں یارم کے لیے اپنے جذبات کا  
اظہار کیا ہے۔ لاہور سے مہوش طالب نے کارل کی

بد معاشیوں، لیڈی مہر کی بے غرض محبت، امرتہ کے  
پانچسٹر میں اور یونیورسٹی میں جدوجہد کرنے پر بہت  
اجھڑتے انداز میں رائے دی ہے۔ اوکاڑہ سے حیائے  
خط میں یارم کے لیے اپنے جذبات کا بہت خوب  
صورتی سے اظہار کیا ہے۔ سرگودھا سے گوشہ کلیانہ کا

کہنا ہے کہ اس کی آئی کا نام بھی میرا ہے اور وہ بہت  
بہادر ہیں۔ انہوں نے فرائش کی ہے کہ میں کارل کو  
ضرور کسی اور ناول میں لاؤں۔“

ماہم، مہوش، عروہ اور گروپ آپ کے جذبات اور  
رائے کی قدر دان ہوں ہیں۔ حیائے کی تعریف،  
وعائیں اور طویل خط کے لیے شکریہ۔ مجھ تک آپ کے  
پسند الفاظ نہیں پورا خط ہی آیا ہے۔ گوشہ، کارل آپ نے  
ناول کے ساتھ ان شاء اللہ آئے گا۔

یہ سب سے منیر بٹ کا کہنا ہے کہ کمائی کی جان  
دیر اور کارل اب ان کے بھی دوست بن چکے ہیں۔  
انہوں نے جاپانی تقریر کا ترجمہ پوچھا ہے اور یہ کہ

جاپان سے کیا میرا پرانا تعلق ہے۔ سب کرداروں کے  
نام کیسے سوچ کر رکھے۔“

”جاپانی جملے کا مطلب۔ ”میں خود کو تمہارے  
رنگوں سے سجاتی ہوں۔“ ہے۔ سب کرداروں کے  
نام کرداروں کی شخصیات کو سوچ کر رکھے۔ سائی کا نام وہ  
واحد نام ہے جو میں نے خود بنایا۔ جاپان سے پرانا تعلق

اس طرح سے ہے کہ میں بچپن سے ہی گھر میں  
جاپانیوں کے کام اور مہارت کی مثالیں سنتی رہی ہوں۔  
محنت، کمالیت اور کمال فن کے اولین اصولوں میں  
سے بہت سے میں نے جاپانیوں سے سیکھے ہیں۔ میں  
جاپانیوں کی بہت بڑی مداح ہوں۔“

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

# بیاد محمود گامزن







## خوشی کی صورت

نادیہ مونا

کب کسی کو قلم پکڑا کر کہیں کہ یہ جو سامنے زندہ بیٹھا ہوا شخص ہے اس کی موت کا قطعہ لکھیے۔ تو یقیناً اس کا قلم بے حرکت اور نگاہیں ورطہ حیرت میں پڑ جائیں گی، مجھے بھی سمجھ نہیں آ رہا کہ میں تم پر سی کس سے کروں کہ یہ غم میرا اپنا بھی ہے، بلکہ سب کا یکساں ہے، ہر انسان کا غم ہے۔ (خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔) آمین۔

تسلی و تشفی کا معاملہ بھی خدا کی طرف سے ہی ہوتا ہے۔ انسان جو خود کسی طرح تسلی پاس نہیں کئے تو سوں کو کیا تسلی دے سکتے ہیں۔ ہمارے کھوکھلے الفاظ، ہمارے جملوں کی کم مائیگی کسی کے زخموں پر انگلیاں تو رکھ سکتی ہے، مگر مسیحا کی نہیں کر سکتی۔ اس غم کو سمیٹ نہیں سکتی، جو کلام قدرت کی طرف سے ہوتا ہے، جو بڑا غم دے سکتا ہے۔ وہ اسی غم کا دوا بھی عہدگی سے کرنا جانتا ہے، جو یاسی، کرب اور اطمینان

دیا میں خوشی کی نسبت غم بہت زیادہ ہے مگر یہ صبح تمام شب خندہ میچ دم بھر دنیا کس قدر بے ثبات اس کی رروت کس درجہ عارضی، اس کی خوشیاں پانی کی سطح پر بننے والا بلبلہ اور اس میں قیام کس قدر مختصر ہوتا ہے۔

فلک سے شکوہ جو رو ستم کیا زمیں چکر میں جب خود ہے تو ہم کیا ریاض صاحب سے میری ایک بار ہی ملاقات ہوئی تھی۔ بذلہ منہج خوب صورت جملے بولنے والے اور زندہ دلی کی تصویر نظر آنے والے اس مشفق شخص سے وہ مختصر مگر خوب صورت ملاقات اب بھی میرے حانظے میں محفوظ ہے۔

میرے ذہن میں ان کی آواز، ان کا شفیق، مگر بارعب و لب و لہجہ ان کی ہنسی، ان کی سنجیدگی، ان کے لہجے کی شیرینی اجاگر ہو کر روشنی پیدا کر رہی ہے۔



حوالوں سے وہ شخص مختلف لوگوں کے دلوں میں جگمگاتا  
رہتا ہے۔  
کہیں محبوب جو ہر کے حوالے سے  
کہیں شفیق باب کے  
تو مہمان بھائی کے  
کہیں سچے پر غلوں دوست کے  
کہیں نیک آچھے ہمسائے کے  
کہیں بطور عمرہ انسان کے  
اور ریاض صاحب یقیناً ”ہر حوالے سے دلوں میں  
اپنی جگمگا ہشت چھوڑ گئے ہیں۔“

ڈال سکتا ہے بلکہ ڈالتا ہے اس کی انگلیاں غموں کو  
اس طرح سمیٹ لیتی ہیں جس طرح بانی خشک زمین کی  
پایاں کو ہادل سورج کی تمازت کو۔  
ہم سب کو ہی گزر جانا ہے، کسی کو نہیں ٹھہرنا، آپ

کو، مجھے، ہم سب کو، اس سرائے میں کچھ دیر ٹھہر کر  
چلے جانا ہے، اس کے گھر پر قہار لکھ دی گئی ہے، مگر فنا  
ہو جانے والے لوگ اپنی یادیں مختلف روپ اور  
صورتوں میں دلوں میں چھوڑ جاتے ہیں۔ اپنے پیچھے وہ  
جانے والوں کے اندر زندہ رہ جاتے ہیں۔

کبھی خوشبو کی صورت  
کبھی ٹھنڈے ہادل کی طرح  
بتے بیٹھے چشمے کی صورت  
جس سے آپ انہیں کبھی نہیں بھلاتے، مختلف



# روشنی جیسے لوگ

عروسہ شہوار



رہے ہیں۔  
کتنی ہی رائیڈز ہیں جنہوں نے شعلہ خواتین اور  
کرن سے اپنے تحریری سفر کا آغاز کیا اور جناب محمود  
ریاض نے ان کی حوصلہ افزائی اور راہنمائی کی اور اسی  
دوست ترح کامیابیوں کے سفر گامزن ہیں گو کہ میں  
ان سے کبھی نہیں ملی مگر کچھ لوگ نہ مل کر بھی ہمیں  
بہت یاد رکھ جاتے ہیں ان کے لیے اپنے احساسات  
و اثرات کو الفاظ میں ڈھالنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی  
ہے جتنے پھول محبتوں اور چاہتوں کے انہوں نے بانٹے  
ہیں وہ سارے پھول دعاؤں کے گلدستے کی صورت  
ان کے لیے نچھاور ہیں۔ محمود ریاض صاحب نے علم و  
ادب کی دنیا میں جتنے چراغ روشن کیے ہیں ان کی  
تابکاری سے علم و ادب کا افق روشنیوں سے چمکاتا  
رہے گا قلم کاروں کا یہ کارواں یونہی رواں دواں رہے  
گا۔ جناب محمود ریاض ایسے سفر پر جا چکے ہیں جہاں  
سے ایسی ممکن نہیں مگر کامیاب اور خوش نصیب ہیں  
وہ جو یہاں رہے تو سب ان سے خوش اور چلے گئے تو ان  
کے لیے دعا گو۔

بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں ہم بطور  
خاص یاد کرتے ہیں دعاؤں عقیدتوں کے نذرانے  
پیش کرتے ہیں محمود ریاض صاحب ان خوش نصیب  
لوگوں میں شامل ہیں۔ جنہیں میرے سامنے خواتین  
کرن، شعلہ روشنی بکھیر رہے ہیں ان میں موجود  
موتیوں کی طرح چنے لفظ موت کے بد مقابل کھڑے  
ہیں فنا ایک حقیقت ہی سہی مگر یہ علم و قلم کی روشنی  
ہمیشہ ان پر سایہ ظن رہے گی۔

جناب محمود ریاض صاحب کی مغفرت کے لیے دُعا  
ساری دعا میں اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ  
دے۔ آمین

اواس رات، اواس زندگی، اواس وقت، اواس  
موسم کتنی چیزوں پر الزام لگ جاتے ہیں اک دل کے  
اواس ہونے سے!

ادب نواز شخصیت جناب محمود ریاض کو ہم سے  
چھڑے ایک سال اور بیت کیا مائیکسی شخصیات  
صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں ان کی مثال تو آگ کے  
کوپے کی سی ہے جس کے پھٹنے سے زندگی جلتی ہے  
اور ہوا کوپے سے نکلنے والے نرم و ملائم ریٹے اٹھا کر ہر  
طرف بکھیر دیتی ہے۔ ہر ریٹے کے ساتھ جھج ہوتا ہے جو  
جہاں گرتا ہے وہیں آگ کا ایک اور نیا پودا جنم لیتا ہے  
جناب محمود ریاض کی زندگی بھی اسی کوپے کی طرح تھی  
نہ جانے کتنے لوگ ان سے روشنی اور خوشبو کے بیج  
لے کر اردو ادب کی سرزمین زر خیز و شاداب کرتے



بتلہن

## روبینہ اشرف ہمارے طارق

شاہین رشید

”ایسی ہیں روبینہ اشرف صاحبہ!“  
 ”اللہ کا شکر ہے۔“  
 ”ہمت شکر یہ کہ آپ نے مصروفیات سے غائب رہا،  
 ماشاء اللہ سے کتنے سال ہو گئے شادی کو؟“  
 ”مہماری شادی ہوئی تھی 20 جنوری  
 1987ء میں۔“  
 ”ماشاء اللہ کہتے ہیں کہ اتنے سالوں میں تو شکلیں  
 بھی ملنے لگتی ہیں اور میاں بیوی، بہن بھائی لگنے لگتے  
 ہیں؟“  
 ”یہ تو دوسرے ہی بتا سکتے ہیں۔ جو ساتھ رہتے  
 ہیں، انہیں تو پتا نہیں چلتا، ہاں عادت و اطوار ایک

کچھ فنکار اور گرس ہوتے ہیں جیسے بشری انصاری  
 جیسے صاحبہ اور جیسے روبینہ اشرف جو جب کسی سیریل،  
 کسی ٹیلی سٹے یا سوپ میں آئیں اس عظمت کے ساتھ  
 کہ اس نے کامیاب ہوٹائی ہوتا ہے کیونکہ یہ ہر وقت  
 اسکرین پر رہنے والی فنکارائیں ہیں۔ روبینہ  
 اشرف بہترین پر فارمر، بہترین انسان اور بہترین بیوی  
 اور ماں بھی ہیں۔ بہترین ماں اور بیوی اس لیے کہ وہ  
 ہوں کہ جب ”بندھن“ کے لیے ان کا انٹرویو کیا تو ان  
 کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ انہیں اپنے گھر اپنے شوہر  
 اور اپنے بچوں سے کتنا پیار ہے اور 27 سالہ  
 ازدواجی زندگی اس بات کا ثبوت ہے۔



دوسرے سے ضرور ملنے لگتی ہیں تو واقعی بس بھائی لگنے لگتے ہیں کیونکہ کوئی ایک دوسرے کی طرح ہو جاتا ہے یا دونوں ایک دوسرے کی عادتیں اپنالیتے ہیں۔  
”تبدیل کون ہوتا ہے مرد یا عورت؟“

”دونوں ہی تبدیل ہوتے ہیں تو شادی کامیاب ہوتی ہے۔ ہمارے گیس میں تو ہم دونوں تبدیل ہوئے ہیں۔ کچھ طارق چھینچ ہوئے کچھ میں ہوئی لگتا تھا کہ طارق کو بدلنا مشکل ہو گا۔ کئی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی ہیں کہ جن کے لیے لگتا ہے کہ یہ ممکن نہیں ہو گا مگر ہو جاتا ہے۔ مثلاً مجھے گھر سے باہر کھانا بہت پسند ہے جبکہ طارق کو بالکل بھی پسند نہیں ہے اور بہت سے مردوں کو نہیں ہوتا۔ وہ ایسے آدمی ہیں کہ جو کہتے ہیں مجھے گھر میں کھانا کھانا میں تمہیں باہر کھانا کھانا دوں گا۔ تو میں اپنے میں تبدیلی لاتی۔ میں نے گھر میں پکانا اور کھانا شروع کر دیا۔ تو جہاں ضروری ہوتا ہے ہم دونوں اپنے میں تبدیلیاں لائے۔ اور شادی نام ہی اس کا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو ساتھ لے کر چلیں۔“

”کہتے ہیں کہ پہلے لڑکی خود چھینچ ہوتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ وہ سب کو چھینچ کر لیتی ایسا ہے؟“  
”ہاں بالکل ایسا ہے۔ پہلے دس سال آپ کو دینے پڑتے ہیں مگر جلد کو نئے انسان کو اور ایسے نہیں دینے پڑتے کہ آپ دس سال ان کی مانتے رہو اور دس سال کے بعد کہو کہ اب میری باری ہے۔ پھر کچھ نہیں ہوتا ایسے دینے پڑتے ہیں کہ آپ کو سمجھنا پڑتا ہے اپنا پوائنٹ جہاں آپ ضروری سمجھتی ہیں۔ رخصت کرانا پڑتا ہے وہاں آپ کو بولنا پڑتا ہے جہاں ضرورت نہیں ہے وہاں سوچنا پڑتا ہے کہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے اسے چھوڑا جاسکتا ہے وہاں چھوڑنا پڑتا ہے تو اسٹریجی عورت کو ہی چھینچ کرنا پڑتی ہے اور پھر دس سال بعد آپ ایک مضبوط جگہ بناتی ہیں۔ لیکن دس سال اگر آپ صرف لڑکے گزار دیں گی اور سوچ لیں گی کہ صرف اپنی ہی منوائی ہے تو پھر آپ کے لیے

باقی کی زندگی بھی مشکل ہوگی۔“  
”تو کیا آج کل کی لڑکیوں میں ایسا کرنے کا حوصلہ یا برداشت ہے یا نہیں؟“

”ساری دنیا کے انسان تو ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں تو میں ماں باپ کی برداشت کو تھوڑا الزام دوں گی۔ کیونکہ جو چھینچ آیا ہے وہ ماں باپ میں آیا ہے۔ بچوں میں نہیں آیا۔ بچے خود بخود نہیں بدلے بلکہ ہم ماں باپ بدلے ہیں۔ ہم نے اپنا ٹرینڈ بدلا ہے۔ اپنا رویہ بدلا۔ ہمارے ماں باپ نے جس طرح ہمیں ٹرینڈ کیا تھا ہمیں جس طرح پالا تھا ہم نے اس سے ہٹ کر اپنے بچوں کو پالا ہے تو چھینچ بچے سے شروع نہیں ہوا۔ ایک بچے کو اگر آپ بچپن سے کہہ دیں گی کہ تم نے میرے آگے جواب نہیں دینا تو اسے تو کوئی دوسری بات بتا ہی نہیں ہوتی اور ایک بچہ ہے کہ جس کو ہم کہتے ہیں کہ ہم آپ کے دوست ہیں آپ ہر بات کہہ دیں۔ تو چھینچ ہمیں سے آتا ہے۔“  
”آپ کی پسند سے ہوئی شادی؟ اور آپ بچوں کے لیے دی کریں گی کہ جو آپ نے کیا؟“

”میری ارنج میج ہے اور یہ کوئی رول نہیں ہے کہ میری ارنج ہے تو میرے بچوں کی بھی ارنج ہو۔ یہ تو بچوں پر مشتمل ہے اگر وہ اپنی پسند سے کرنا چاہیں گے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا اور اگر وہ ارنج کرنا چاہیں گے تو ظاہر ہے کہ مجھے ارنج کرنا پڑے گا۔ میں بہت لبرل ہوں اور میری امی بھی بہت لبرل تھیں اور وہ کہتی تھیں کہ کوئی پسند آئے تو ضرور بتانا۔ مگر میں نے تو زندگی میں اس طرف کبھی دھیان ہی نہیں دیا تھا۔“  
”رشتے داروں میں شادی ہو تو لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو جانتے ہیں لیکن اگر غیر برادری میں ہو تو دونوں ایک دوسرے سے ناواقف ہوتے ہیں تو آپ کو کوئی مسئلہ ہوا؟“

”ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ میرے حساب سے تو یہ بات اور یہ سوچ ہی غلط ہے۔ کیونکہ جب کسی کو پسند کرتے ہیں یا کسی کو جانتے ہو تب بھی آپ اس کے



بارے میں بہت تھوڑا جانتے ہیں۔ ایسے ہی جیسے ہم اسکول و کالج میں ایک ساتھ پڑھتے ہیں تو زیادہ نہیں جانتے۔ تو شادی بھی ایسا ہی سلسلہ ہے جب تک ایک دوسرے کے ساتھ وقت نہیں گزارتے، ہمیں ایک دوسرے کے مزاجوں کا اور دیگر باتوں کا علم نہیں ہوتا۔

”آج کل میں نے دیکھا ہے اور گزرے زمانے میں بھی ایسا ہی تھا کہ ادھر لڑکی کی شادی ہوئی، ادھر باپ کی جگہ شوہر نے لے لی۔ نیا شناختی کارڈ، نیا پاسپورٹ، مگر آپ نے ایسا کچھ نہیں کیا کیوں؟“

”مستے ہوئے۔۔۔“ کچھ لوگوں کا دماغ زیادہ کام کرتا ہے، دیگر لوگوں سے تو شاید میرا دماغ بھی ایسا ہی تھا۔ مجھے لگا کہ یہ کیا بکواس ہے۔ میری اپنی ایک پہچان ہے، اور مجھے یہ پہچان پسند تھی اور زندگی میں مجھے اپنی پہچان

کسی سے چھپانی نہ ہو تو میں نے کبھی کسی سے نہیں کہا کہ میں ”مسز فلاں“ بول رہی ہوں۔ دیکھیں دنیا میں ہر کوئی اپنی ایک پہچان لے کر آیا ہے۔ میری پہچان ”روینہ“ ہے۔ اس کے آگے کیا لگا ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑا اور معذرت کے ساتھ کہ چاہے اشرف ہو چاہے طارق ہو، دونوں ہی اہمیت نہیں رکھتے۔ ہو سکتا ہے کہ بہت سے لوگوں کو یہ بات بری لگی ہو، مگر میری یہ ہی سوچ ہے اور مجھے کبھی مشکل پیش نہیں آئی کسی بھی جگہ پر۔“

”اتنے سالوں میں کبھی خیال آیا کہ نہیں شادی نہیں ہونی چاہیے تھی یا خیال آیا کہ بہت اچھا ہوا کہ میری شادی ہو گئی ہے؟“

”بہت دفعہ دونوں باتیں سوچیں، بعض دفعہ سوچا کہ بہت برا ہوا جو شادی ہو گئی اور بعض دفعہ سوچا کہ شکر ہے اللہ کا کہ میں اپنے گھر والی ہوں۔ شادی شدہ ہوں۔ ایک بات اگر ہم ”پلو“ سے باندھ لیں، خواہ وہ مرد ہو عورت ہو، تو جوان ہو یا بچہ ہو، کہ ہم اپنی خوشیوں کے لیے اور پریشانیوں کے لیے خود ذمہ دار ہیں، دنیا میں کوئی دوسرا ہے اور نہ ہی ہم اسے شکر سکتے ہیں نہ ماں کو نہ

باپ کو اور نہ ہی کسی اور کو۔ اگر ہم کسی اور کی وجہ سے خوش یا ناخوش ہو رہے ہیں تو یہ بہت غلط بات ہے۔ اگر میں غلط کر رہی ہوں تو مجھے اپنی غلطی کو خود درست کرنا ہے اور اگر میں خوش ہوں تو اس کا مطلب ہے کہ میں اچھا کر رہی ہوں۔“

”شادی کے نقصانات زیادہ ہیں یا فائدے زیادہ ہیں؟“

”شادی کے فوائد ہی فائدے ہیں۔ نقصانات نہیں ہیں اور یہ بھی آپ ہی متکھریے۔ اگر آپ نے ایک انسان کو برا بنادیا ہے تو یہ آپ کا قصور ہے اور اگر اسے اچھا بنادیا ہے تو وہ آپ کا بہت بڑا محافظ ہے۔ آپ ایک سے دو ہو جاتے ہو، پھر دنیا کی سب سے بڑی نعمت آپ کو اولاد کی صورت میں مل جاتی ہے جو کہ شادی کے بغیر ناممکن ہے، تو ویسے بھی زندگی میں ایک کا نڈھا چاہیے ہوتا ہے تو ایک انسان کے ساتھ جو اور بہت سے پیارے لوگ آجاتے ہیں آپ کی زندگی میں، وہ بہت پیارے ہو جاتے ہیں۔ پھر شادی کو کیسے غلط کہہ



”سچ بتاؤں۔ میں بیویوں کو مورد الزام ٹھہرائوں گی۔“

معذرت کے ساتھ، جب میں ارد گرد ایسے کیس دیکھتی ہوں اور بہت سوچتی ہوں اس بارے میں، اور لوگوں کی مثالیں اپنے دماغ میں رکھ کر جب تجزیہ کرتی ہوں تو

میں عورت کو ہی غلط پاتی ہوں۔ حالانکہ میں خود عورت ہوں، مگر میں انصاف کی بات کروں گی، مرد بھی غلط ہوتے ہیں، مگر زیادہ تر عورتیں غلط ہوتی ہیں۔ لڑکیاں ہوتی ہیں اور اس کی سب سے بڑی وجہ والدین کی غلط تربیت ہے۔ اور جب لڑکیاں رخصت ہوئے لگیں تو

پچھلے زمانے والے سخت جملے استعمال نہ کریں، بلکہ یہ ضرور ہنس کر ”بیٹا یہاں تک کی ذمہ داری میری تھی۔“

اب آپ اپنا گھر خود بنائیں، اپنی ذمہ داریاں خود اٹھائیں۔ ”خیر ایک لحاظ سے ہم انہیں خدا حافظ کہہ دیتے ہیں۔ اب جن لڑکیوں کی سمجھ میں یہ بات نہ

آئے تو ایسی کوڑھ مغفرت لیں گے کہ لیے پھر یہ ہی جملے ٹھیک رہتے ہیں کہ اب سسرال سے تمہارا جتناڑہ ہی

نکلے۔ بے چارے ماں باپ کو سانس لینے دو، زندگی تم سے نہیں چل رہی تو خود کام کرو۔ ماں باپ کہاں سے

آگئے بیچ میں۔ کیوں اپنی پریشانیاں بتا کر ماں باپ کو پریشان کرتی ہیں۔ پریشانی کی وجہ تلاش کریں۔“

”اور ماسوں کے بارے میں کیا کہیں گی وہ بدنام ہیں یا حق نہیں بری ہوتی ہیں؟“

”ایک زمانے میں کچھ سائیں بری ہوتی بھی تھیں، اور آپ یہ سوچ لیں کہ بوجھ بھی ہوگی تو سانس کتنی بھی

بری ہوگی وہ جو آپ کا شریک سفر ہے اسے بھی تو سب کچھ نظر آ رہا ہے اور بھی تو لوگ ہیں جو سب کچھ دیکھ

رہے ہوں گے کہ زیادتی کس کی ہے۔ شادی کر کے آپ کسی پلانٹ پہ تو نہیں چلے گئے نا۔“

”آپ نے شادی کے بعد بھی کام کو جاری رکھا۔ تو جوائنٹ فیملی کام آئی یا سب کچھ خود منیج کیا؟“

”سب کام آئے، جوائنٹ فیملی بھی کام آئی اور میرے اپنے بھی کام آئے۔ اور ہم نے خود بھی کیا، آج سے

27، 28 سال پہلے یہ تصور بالکل بھی نہیں تھا کہ ہم اپنے بچے بے نی سسٹر میں چھوڑ دیتے اور ہمیں

کہتے ہیں۔“

”لیکن جب تنگ دستی ہوتی ہے۔ غربت ہوتی ہے۔ ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں، تب تو انسان سوچتا ہی ہے کہ شادی نہ ہی کی ہوتی تو اچھا تھا کیسا ہے؟“

”مگر آپ کم ہمت انسان ہیں اور ہمیشہ اپنے سے اوپر والوں کو دیکھیں گے تو پھر آپ ایسا سوچ سکتے ہیں۔“

آپ کو کم ہمت اللہ نے پیدا نہیں کیا اور آپ اپنی ضرورت میں مست برہائیں، خوشی چیزوں میں نہیں ہے۔

دو وقت کی روٹی تو اللہ کا وعدہ ہے اور چرند پرند بھی اس کی گواہی دیتے ہیں۔ وہ تو نہیں سوچتے کہ اگلے دن کے

لیے کیا کرنا ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ متوسط طبقے کے بچے بہت سوچ رہے ہیں، بہت ترقی کرتے ہیں۔“

”مجھے اس بات سے اختلاف ہے کہ چرند پرند کل کی۔ فکر نہیں کرنے، انسانوں اور چرند پرند میں فرق

ہے۔ انسان کو اچھی زندگی، ایک معیاری زندگی چاہیے، دو وقت کی روٹی تو کسی بھی انسان کا مسئلہ نہیں

ہے۔ وہ تو مل ہی جاتی ہے۔“ آپ یہ دیکھیں کہ یہ معیار کس نے بنایا؟ یہ ہم نے بنایا ہے اور برہایا ہے اور برہایا ہے اور برہایا

ہے۔ ہمیں بیٹھ کر سوچنا چاہیے کہ کتنا برہاتا ہے اور کہاں پر لوگ رہتا ہے اور آپ کہتی ہیں کہ پرندوں کی

مثال غلط ہے تو انسان نہیں ہے۔ عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ زندگی گزارنے کا طریقہ ہمیں پرندوں سے سیکھنا

چاہیے۔ آپ یہ دیکھیں کہ چڑیا کو پتا ہوتا ہے کہ کتنے دن تک اپنے بچے کے منہ میں دانہ دینا ہے اور کب

مجھے اسے گھونسلے کے باہر ہلکا سا دھکا دینا ہے کہ یہ لڑکھڑائے گا اور پھر اڑنے کی کوشش کرے گا۔ اور پھر

اڑنے لگے گا اور دنیا میں لوگ یہ ہی کر رہے ہیں کہ جب بچے سولہ سے اٹھارہ سال کے ہوتے ہیں تو

والدین ان پر ذمہ داریوں کا احساس ڈال دیتے ہیں تو اگر ہم نہیں غلط کر رہے ہوتے ہیں تو پھر بھگتے بھی تو ہم

خود ہی ہیں۔“

”شادیاں جو ٹوٹ جاتی ہیں ان میں قصور کس کا ہوتا ہے۔ میاں بیوی کا یا کسی تیسرے فرد کا؟“



عادت بھی نہیں تھی، تو میرے سسرال والوں نے بہت ساتھ دیا میرا۔“

”عموماً“ سسرال میں ہوتا ہے کہ لوجی ہم تو بچے سنبھالیں اور یہ صبح ہی صبح کام پہ نکل جائیں؟“

”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ ہوتا ہے ایسا۔۔۔ لیکن میرے ساتھ اس کا الٹ ہوا تھا۔ شادی کے بعد مجھے ایک کمرشل کی آفر آئی تو مجھے لگ رہا تھا کہ پتا نہیں میں کر سکوں گی کہ نہیں، تو میرے سسرال میں میری نندوں نے خاص طور پر کہا تھا کہ آپ کام کریں۔ آپ گھر کی فکر نہ کریں۔ اور میری نندیں اچھی بھی ایسی ہی ہیں۔ میرا پورا پورا ساتھ دیتی ہیں۔ سسرال میں جب بھی کوئی تقریب ہونی ہوتی ہے تو سب سے پہلے مجھے کال آتی ہے کہ ہم سنے یہ تقریب کرنی ہے۔ آپ کون سا ٹائم ہمیں دے سکتی ہیں یا اس ٹائم میں آپ آسکیں گی؟ ایسا ہو سکتا ہے اور میں نے کبھی بھی ایسا نہیں کہا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ میرا اتنا خیال رکھتی ہیں تو میرا بھی دل چاہتا ہے کہ میں ان کا خیال رکھوں۔“

”بچوں کی تربیت میں کس کا ہاتھ ہوتا ہے؟ کیا بچے بچوں کے لیے شو ہیریوی پہ برس رہے ہوتے ہیں کہ تم نے نکاڑا ہے؟“

”بہت سی ذمہ داری تو ماں پر ہی عائد ہوتی ہے اور یہ بہت زیادہ ذمہ داری کا کام ہے اور مرد ذرا کم ہی یہ ذمہ داری لیتے ہیں اور جو لیتے ہیں ان میں سمجھتی ہوں کہ وہ بہت ہی ہمارے ہوتے ہیں۔ تو اچھی تربیت ہو تو ماں کو ہی شاباش ملتی ہے اور خراب ہو تو انعام بھی ماں پر ہی آتا ہے۔ مگر ذمہ داری یہ دونوں کی ہے۔“

”بچے ماشاء اللہ دو ہیں آپ کے ماں کے بارے میں بتائیں۔“

”جی جی منی طارق۔ جس نے فلم میکسٹک میں گرینجویشن کیا ہے اور بیٹا ہے۔ نوال جس نے بزنس میں ڈگری حاصل کی ہے۔“

”تو ابھی ٹالی داوی یا ساس بننے کے ارادے نہیں ہیں آپ کے؟“

”میرا ارادہ تو ج سے دس سال پہلے ہی

شروع ہو گیا تھا۔ مجھے بچے بہت ہی پیارے لگتے ہیں، بہت ہی پسند ہیں اور پانچ دس سال پہلے تو میرا جی چاہا تھا کہ میں کوئی بچہ گوولے لوں۔ اپنے بچے اس لیے دو ہی کیے کہ میں کام میں مصروف ہوئی اور اب میری زندگی کا مقصد یہ ہی ہے کہ کچھ تبدیلی آئی چاہیے۔“

”تو پھر لے آئیے ایک عدد سو اور ایک عدد وانا؟“

”بالکل۔۔۔ ضرور۔۔۔ ان شاء اللہ بہت جلد یہ خواب شرمندہ تعبیر کروں گی۔ ان شاء اللہ ویری سون۔ میں تیار ہوں اس کے لیے۔“

”کھانا گھر میں ہی پکاتا ہو گا۔ تو آپ پکاتی ہیں؟“

”ہاں۔۔۔ یہاں گھر میں کھانا پکاتا ہے اور ایک ہیں ہمارے یہاں جو بہت اچھا کھانا پکاتی ہیں، وہ ہماری زندگی ہیں ان کے بغیر ہم چل نہیں سکتے، لیکن گھراں میری ہوتی ہے تو میں نے ان کی زندگی مشکل بنائی ہوئی ہے۔ ہم سب کا ٹیسٹ بہت الگ سا ہے اور ہم سب کھانے میں بہت نخرے کرتے ہیں اور ایک وقت میں ہم سب ٹیبل پہ ہوتے ہیں۔ وہ سارا رات دونوں میں سے ایک وقت ایسا ضرور ہوتا ہے کہ ہم سب ساتھ مل کر کھانا کھاتے ہیں۔“

”جس لڑکیوں اور لڑکوں کی شادی نہیں ہوئی ان کے لیے آپ کیا کہنا چاہیں گی کہ کس طرح زندگی گزاریں؟“

”میرے نزدیک کامیاب زندگی کا جو گڑ ہے اور جو ہم سب کو سمجھ لینا چاہیے کہ اپنی خوشی کے لیے آپ خود ذمہ دار (Responsible) بن لیں۔ اور نہیں۔ اب اس بات کا کوئی غلط مطلب لے لے تو کچھ نہیں کہہ سکتی۔ محبت ہر بات کا حل ہے۔ یہ نہ کہیں کہ جب میں ہو بھی تو ساس اچھی نہیں ملی اور جب میں ساس بنی تو ہوا اچھی نہیں ملی۔ میرے نزدیک محبت ہی مسئلہ کا حل ہے۔“

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے روینہ اشرف صاحبہ سے اجازت چاہی، اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں ٹائم دیا۔



# شعاع کے ساتھ ارکارہ

نوشین فاطمہ کراچی

1۔ جہاں تک شعاع سے وابستگی کا تعلق ہے تو یہ کم از کم بیس سالوں پر محیط ہے 'رسالے پڑھنے کا شوق مجھے میرے ابو سے ملا جو پہلے خود مجھے 'بچوں کی دنیا' لا کر دیتے اور اس میں سے کہانیاں پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ ان کہانیوں کے شوق نے مجھے سرت ہی چھوٹی عمر میں اردو پڑھنا سکھا دیا۔ گریڈ ون یا ٹو سے ہی میں خود مطالعہ کرنے لگی۔ نوٹس، تعلیم و تربیت اور بچوں کی دنیا کے علاوہ ہر ماہ میں بے شمار اسٹوری بکس خریدتی اور یہی شوق میں نے اپنے بچوں میں منتقل کیا۔ آج میں ان کے لیے بے شمار اسٹوری بکس خریدتی ہوں۔

جہاں تک سب سے پہلے شعاع خریدنے کا تعلق ہے تو میں گریڈ فور میں ایک بک شاپ پر نوٹس کا خاص شمارہ خریدنے گئی تو وہاں میں نے شعاع دیکھا۔ دونوں رسالے پندرہ روپے کے تھے۔ وہ ابتدا میں میری ان رسالوں سے تعارف کی۔ اس وقت میں صرف انٹرویوز پڑھا کرتی تھی یا اینڈ میں جو چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہوتی ہیں وہ پڑھا کرتی تھی۔ اس کے بعد سے باقاعدگی سے تو ہمیں 'آلسو وٹا' 'نوٹی' 'کبھی خواتین تو کبھی شعاع' خرید لیتی اور اس طرح چاہی نہیں چلا کہ کس طرح اور کب یہ رسالے میری زندگی کا لازمی جز بن گئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ رسالوں سے پریشانی متاثر ہوتی ہے۔ جبکہ میں نوٹس اور دوسری جماعت میں ہر ماہ ماہانہ ٹیسٹوں اور امتحانات میں ٹاپ آف داکلاس رہی۔ ڈائجسٹ بھی خوب پڑھے اور ٹی وی بھی خوب دیکھا۔ اس زمانے میں ہمارا کوئٹہ شازیہ چوہدری 'غزالہ' نگار اور نکیت عبد اللہ کو بہت شوق سے پڑھتی تھی اور آج کل فرحت اشتیاق اور نموا احمد کے ٹیبلز کا شدت

سے انتظار رہتا ہے۔

2۔ میری صبح تقریباً سو اچھ بجے ہوتی ہے۔ سب سے پہلے بچوں کے لٹچ یا کنسر ہٹاتی ہوں۔ بیک و غیر سوئیٹ کرتی ہوں، پھر نو سالہ بیٹی بخٹور کو جگا کر تیار کرتی

ہوں۔ سات بجے اس کی دین آجاتی ہے۔ پھر ایک صبر آزما مرحلہ شروع ہوتا ہے پانچ سالہ کشملا کو جگانے کا۔ جب بھی اس کو اٹھاتی ہوں وہ 'تھوڑی دیر اور سونے دو' کہہ کر پھر سو جاتی ہے۔ آخر کار آٹھ بجے گھنٹے کی محنت کے بعد میں اس کو جگانے میں کامیاب ہو جاتی ہوں۔ اس کو واش روم بھیج کر اس کا ناشتا تیار کرتی ہوں، پھر اس کو آج کے ٹیسٹ کا ریو اس کروانے کے دوران ناشتا کرواتی ہوں۔ آٹھ بجے تک وہ اسکول چلی جاتی ہے۔ پھر ناشتا تیار کرتی ہوں اور خود ناشتا کرتی ہوں۔

پھر کام والی ماسیوں کی آمد شروع ہو جاتی ہے۔ ان سے کام کروانے کے دوران کمرہ سمیٹی ہوں جو کہ بچوں کی بکھری چیزوں کی وجہ سے میدان جنگ کا منظر پیش کر رہا ہوتا ہے۔ اکثر اس دوران کھانا بھی بن جاتا ہے۔ ٹی وی پر مارنگ شو دیکھنے کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ گیارہ سے ایک بجے تک کا ٹائم فاسٹ ہوتا ہے۔ اس دوران کبھی ٹی وی تو کبھی بچوں کے کپڑوں کی ڈیزائننگ چلتی رہتی ہے۔ پھر چکن کے برتن وغیرہ سمیٹی ہوں۔ نماز ظہر ادا کرتی ہوں۔ چھوٹی کشملا اسکول سے آجاتی ہے اور آتے ہی اس کا فرمائشی پروگرام شروع ہو جاتا ہے۔ چاکلیٹ، کینڈیز یا بسکٹس وغیرہ سے وہ بسلتی ہے۔ پھر اس کا اسکول بیک چیک کرتی ہوں۔ سلا کر کپڑے چھیچ کرتی ہوں۔ روٹیاں پکاتی ہوں۔ تین بجے بخٹور کے آنے پر دونوں کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی ہوں۔ دونوں آتے ہی کارٹونز میں مگن ہو جاتی ہیں۔ پھر دونوں کو ساڑھے تین بجے مدر سے چھوڑ کر آتی ہوں۔ ایک گھنٹے بعد لینے جاتی ہوں۔ واپسی پر دونوں دکان سے چیزیں خریدتی ہیں۔ لہذا پانچ منٹ کی مسافت آٹھ گھنٹے میں طے



ہوتی ہے۔ پھر بچے کھیتے ہیں۔ میں غسل لے کر عصر کی نماز ادا کرتی ہوں۔ اگر بخلاور کے میسٹ ہو رہے ہوں تو پھر رات تک کا ٹائم اس کو پرہیز میں صرف ہوتا ہے ورنہ سات سے آٹھ کشمالہ کو پرہیزاتی ہوں۔ پھر رات کا کھانا لورہلی بوی ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

رات کو بچوں کو سنانے کے بعد میں ہوتی ہوں اور میرے ڈائجسٹ۔ عموماً ڈائجسٹ شام کو آتا ہے اور ایک ہی رات میں دو بچے تک جاگ کر میں ڈائجسٹ پورا بڑھ لیتی ہوں۔ بلی مسینہ پرانے ڈائجسٹوں سے گزارا کرتا پڑتا ہے۔ نیا ڈائجسٹ ہاتھ میں آتے ہی آج بھی سویٹ سنکسٹین کی طرح ڈائجسٹ میں اس طرح مگن ہوتی ہوں کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتی ہوں۔ میری کوئی ٹی بی بیڈ روم سے جاگ کر باہر بھی آجائے تو اسے اے سی کے بشیر ڈرائنگ روم میں ہی سلا لیتی ہوں لیکن کہانی اور موری چھوڑ کر جانا مجھے منظور نہیں ہوتا۔ بخلاور کو اسے سی کے بغیر نیند نہیں آتی۔ وہ ہر تھوڑی دیر بعد پوچھتی ہے کہ ماما کتنے بج رہ گئے ہیں۔ لیکن میں جب تک رسالہ پورا ختم نہ کر لوں، مجھے چین نہیں آتا۔

3 شعاع کی ایسی بہت سی تحریریں ہیں جو ذہن پر آج بھی نقش ہیں۔

جہاں تک تعلق ہے کسی کردار میں اپنے کردار کی جھلک کا تو ایسا پارہا ہوا لیکن انسانہ ذہن میں محفوظ نہیں۔ البتہ فرحت اشتیاق کی محبتوں سے گندمی کمائیوں میں ہیرو جس طرح کیئرنگ اور ٹوٹ کر چاہنے والے ہوتے ہیں وہ بہت متاثر کرتے ہیں۔

4 خامیوں میں سرفہرست خانی یہ ہے کہ میرے لیے کسی کی زیادتی کو بھلا دینا اور اس کو معاف کر دینا ایک دشوار ترین عمل ہے۔ میرے ساتھ جس جس نے زیادتی یا حق تلفی کی میں آج تک اس کو بھلا نہیں سکی۔ حتیٰ کہ مجھ پر ظلم کرنے والے کا روٹنگٹے کھڑے کر دینے والا انجام بھی مجھے اس کی زیادتیاں بھلا

دینے کا سبب نہیں بن سکا۔ (افسوس محبت کی کمائیاں پسند کرنے والی اس قدر مستقیم مزاج اور سخت؟) مجھے اپنے اندر سب سے بڑی خوبی یہ لگتی ہے کہ اب مجھ میں برداشت، صبر اور ہمت بہت آگئی ہے۔ اب اگر میں پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ میں نے اپنی زندگی کا یہ کٹھن ترین دور جو آٹھ سال پر مبنی تھا کیسے گزارا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ دور مجھ میں شکر گزاری کی خوبی بھی پیدا کر گیا۔ آج مجھے وقت میں، میں ہر لمحہ خدا کا شکر ادا کرتا نہیں بھولتی کہ مجھے اس دردناک سائنسی سے نجات مل گئی۔

اپنے بچوں کی میں ایک کیئرنگ ماما ہوں۔ دونوں بچے میرے بڑے بڑے ایک لمحہ نہیں رہ سکتے۔ نیند سے جاگنے کے بعد وہ دونوں مجھے ہی پکارتے ہیں اور اگر میں کبھی شاپنگ پر چلی جاؤں تو دونوں گھروالوں کے لاکھ اصرار کے باوجود بھوک پیٹھی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ میں اور میری بہن ایک دوسرے کی بہترین ہمارا ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور خوبی یہ کہ میں بہت زندہ دل خاتون ہوں۔ 5 سلون کا موسم آج بھی مجھے دیوانہ کر دیتا ہے۔ شادی سے پہلے بھی میں چھت پر جی بھر کر بارش میں نہاتی تھی اور آج بھی اکثر دونوں بیٹیوں کے ساتھ برسات کے پکوان کھاتے ہوئے بارش انجوائے کرتی ہوں۔ برسات میں مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو مجھے آج بھی مدھوش کر دیتی ہے۔ برسات کے بعد ٹکھرا ٹکھرا سبز نہایت حسین لگتا ہے۔

6 پسندیدہ اقتباس عموماً احمد کے ایک ناول سے

”جو لوگ دوسروں کے دلوں کو کانٹوں سے زخمی کرتے ہیں۔ ان کے اپنے اندر کیکر اگے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ چاہیں یا نہ چاہیں ان کے وجود کو کانٹا ہی بنتا ہوتا ہے۔ وہ بھول نہیں بن سکتے۔“

پسندیدہ کتاب ابو یحییٰ کی ”جب زندگی شروع ہوگی“



## نور آمنسہ رحیم یار خان

میتے ہیں۔ وہ بھی میرے ہاتھ کی بنی ہوئی۔ اس لیے ایک نہیں چلتی شعلع رکھ کے کچن میں جاتی ہوں۔ سب کو چائے بنا کر دیتی ہوں۔ اپنا کپ لیتی ہوں کہ پھر شعلع، اس کے بعد کا سارا وقت میرا اپنا ہوتا ہے۔ ہمارے گھر میں ٹی وی نہیں ہے۔ سو سب جلدی عشاء کے بعد سو جاتے ہیں۔

3۔ شعلع میں ہر تحریر ہی اچھی ہوتی ہے۔ لیکن کچھ تحریریں ایسی ہوتی ہیں۔ بھلائے نہیں بھولتیں۔ ان میں نمرو احمد کی ”بیلی راجپوتوں کی ملکہ“ مصحفِ جنت کے تھے، ایسی تحریریں ہیں جنہوں نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس کے بعد میں نمرو احمد کی ہر تحریر کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی۔ اس کے بعد عمل کبھی ملتی ہے؟ کبھی نہیں کیونکہ میں شعلع لیتی ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ میں پڑھ رہی ہوں۔ وقت کم ملتا ہے۔ اس کے علاوہ ”زمین کے آنسو“ جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو، بلو مون، چراغِ آخری شب“ یہ تحریریں کبھی نہیں بھولیں گی۔

4۔ جہاں تک بات ہے میری خوبیوں، خامیوں کی تو جی مجھے دوستوں کی محفل میں جانا ہوگا۔ موش کہتی ہے کہ آنتہ تم کبھی فنکشن میں نہیں جاتیں تم لوگوں سے نہیں ملتیں۔ تم بہت معصوم ہو۔ رضیہ نے کہا کہ میں بہت ضدی اور انا پرست ہوں۔ کوئی دوست ناراض ہو جائے تو وہ ہی پسل کرتی ہیں، میں نہیں کرتی۔ مجھے لگتا ہے کہ میں مناؤں کی تو اور ناراض ہو جائیں گی۔ اتراکشتی ہے۔ یونی آئی ہو تو اپنے اندر اعتماد پیدا کرو۔ اس لیے میرے ساتھ ہوتی ہے۔ لیکچر ختم ہوا پکڑ کے باہر لے گئی۔ ارم کہتی ہے تم بہت پیاری ہو۔ امی کہتی ہیں کہ جلد باز ہوں۔ اس وجہ سے وہ مجھے جلد باز اور بے چین روح کہتی ہیں۔ اس کے علاوہ میں بہت حساس ہوں کوئی مر جائے تو کئی دن میں اس کیفیت میں رہتی ہوں، ہائے مجھے بھی مرنا ہے۔ مجھے مرنے سے بہت ڈر لگتا ہے۔ بہر حال مرنا تو اہل ہے۔ خامیاں، خوبیاں علیحدہ کرنے کا کام آپ کی مرضی پر چھوڑتی ہوں۔ آپ خود ہی حساب کر لیجئے گا۔ میں حساب کتاب سے بہت بھاگتی ہوں۔ بابا بابا۔

1۔ شعلع 2005ء میں پڑھنا شروع کیا۔ جب بابا ابو نے تعلیم اسلام ختم کروائی تو پڑھنے کا شوق شروع ہوا۔ اخبار بچوں کا رسالہ مجھ سے کچھ نہیں بچتا تھا۔ ہماری امی اور آئیوں نے دینی و دنیاوی تعلیم بابا ابو سے ہی حاصل کی ہے، ہمارے ہاں لڑکیوں کو گھر سے باہر بھیجنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ سوائی پڑھتی تھیں شعلع۔ میں بھی جب نین سال کی ہوئی تو اسکول کے بجائے مسجد بھیجا گیا۔ یوں میں حفظ قرآن کے ساتھ اردو لکھنا پڑھنا بھی جان گئی تھی۔ شعلع تب پڑھنا شروع کیا۔ جب پتا نہیں ہوا تھا کہ کیا پڑھ رہی ہوں۔ مجھے تو اسٹوری پڑھنی ہوتی تھی، ایک دن میں مدرسے سے آئی تو بڑا اچھا موسم تھا۔ امی شعلع پڑھ رہی تھیں۔ وہ میری فطرت سے واقف تھیں کہا۔

”بیٹا! یہ بچوں کا رسالہ نہیں ہے۔“

مجھے تو ناخوش لگتا پسند آیا۔ تب سے اب تک پڑھ رہی ہوں۔ دس سال کی عمر ہی کیا ہوئی ہے، بس جی میرے شوق شروع سے زائل تھے۔

2۔ میری صبح کا آغاز ابو کی کال سے ہوتا ہے جو جگاتے ہیں کہ اٹھ جاؤ، جانا بھی ہے۔ نماز پڑھ کے بالی ملکوت قرآن پاک بھی جاری رہتی ہے اور ناشتا بنانا بھی سب کو ناشتا دے کر جلدی جلدی تیاری کر کے اسٹاپ تک جاتی ہوں۔ پوائنٹ سے یونی وہاں لیکچرز لے لے کے بڑا چال ہو جاتا ہے۔ گھر واپس آ کے جس دن شعلع ہو یونی فارم پیچنیج اور کھانا بھول کے

شعلع میں غم ہی آتیں گی۔ رسالہ تم سوتی بن جاؤں گی وہ گئیں رسالہ شروع یوں رات تک رسالہ ختم کر کے میں ٹینشن فری ہو کر گھر والے بھی کیونکہ مہینے کی پہلی دو سری تاریخ میں معمولات تبدیل ہو جاتے ہیں شعلع پڑھتے ہوئے مدرسے میں قرآن پاک پڑھانا بہت مشکل ہے۔ اس لیے اس وقت بند کر دیتی ہوں۔ اسکول اور مدرسے کے بچوں کو چھٹی دے کے شعلع میں کم رات کا کھانا چھوٹی نین بناتی ہے۔ نمازیں میں ساتھ ساتھ پڑھتی ہوں۔ مغرب کے بعد سب چائے



بڑی پریشانی کا آسمان مل



میں نے سوچا کہ اگر میں اس کا جواب دے دوں تو میری زندگی ختم ہو جائے گی۔  
میں نے سوچا کہ اگر میں اس کا جواب دے دوں تو میری زندگی ختم ہو جائے گی۔  
میں نے سوچا کہ اگر میں اس کا جواب دے دوں تو میری زندگی ختم ہو جائے گی۔

اس طرح ہمارے دل سے ہر قسم کے غم، غصہ اور کینہ نکال دیا جائے گا۔



رخسانہ نگار عدنان

## ایک تھپی مٹلا

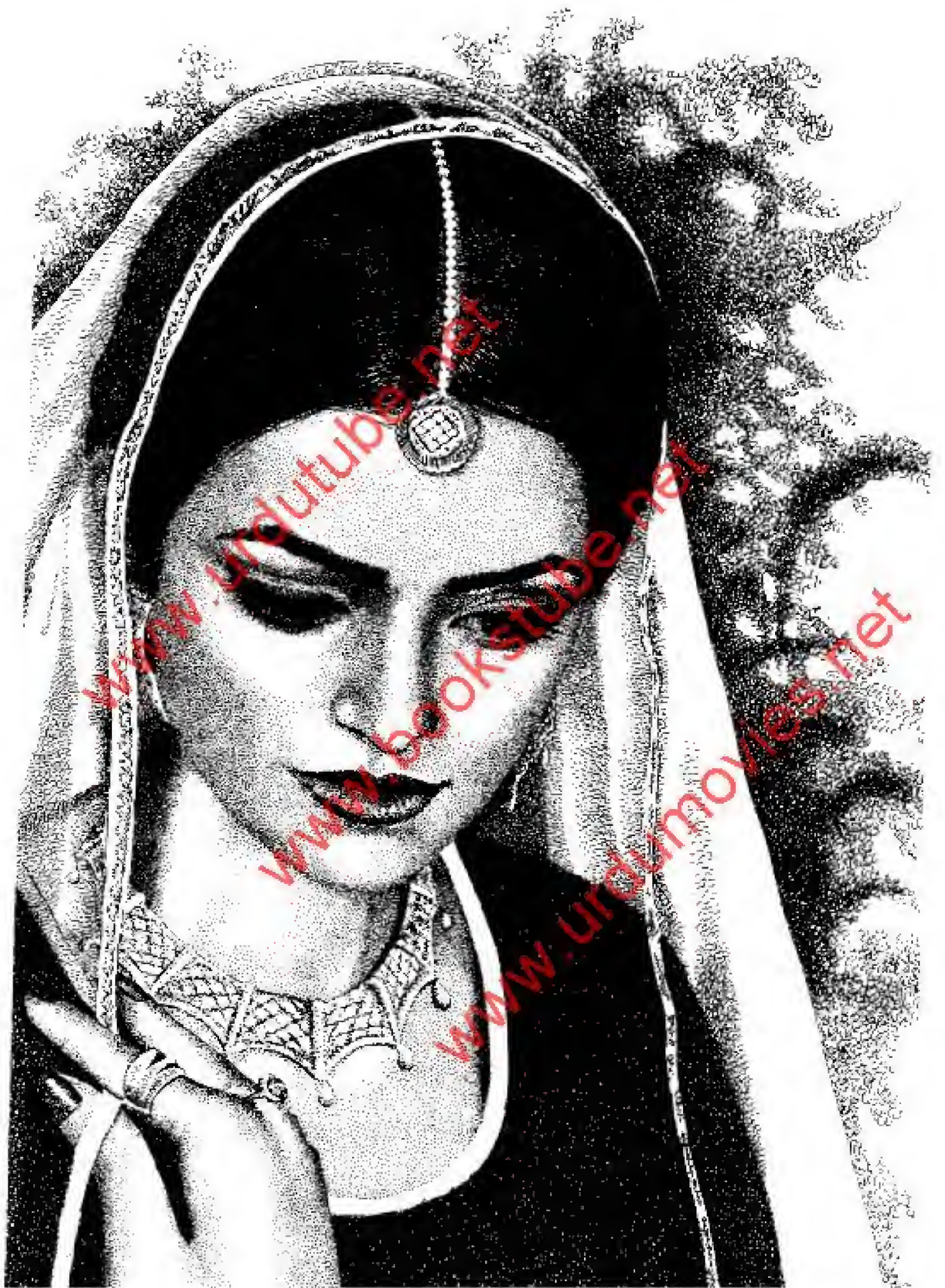
عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشری ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشری کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نوای اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشری اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ سائچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشری کی منذ فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا گیا ہے۔ نکاح والے روز بشری دو لہما ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔ عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشری کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن فوزیہ کی ساس زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بعد ازاں عدیل کو بھی پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشری اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشری کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹ اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہوتے ہیں کہ ذکیہ کی وراثت میں قتل ہو جاتے ہیں۔ عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹ سے سات لاکھ روپے وصول کر پاتی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔

اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں مقتولین کو دیکھتا ہے۔ زاہدہ نسیم بیگم سے تین لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل بشری سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔ عاصمہ کی بھجوری ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں۔ اس کا بیٹا ابھی پھونسا ہے اور سارے کام اس نے خود کرنے ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زبیر کسی مفتی سے قوی لے کر آ جاتا ہے کہ دوران عدالت انتہائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آ جائے۔ سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے









جاتا ہے۔ اور موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے اور دیرانے میں چھوڑ کر فرار ہو جاتا ہے۔ وہاں سے وہ عدیل کی مدد سے گھر پہنچ جاتی ہے۔

رقم مہمانہ ہونے کی صورت میں فوزیہ کو طلاق ہو جاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہو کر سوا اور اس کے گھر والوں کو مورد الزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشری کے درمیان خوب جھگڑا ہوتا ہے۔ عدیل طیش میں بشری کو دھکا دیتا ہے۔ اس کا ابا رشن ہو جاتا ہے۔ عدیل شرمندہ ہو کر معافی مانگتا ہے مگر وہ هنوز ناراض رہتی ہے اور اسپتال سے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔ اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دیکھتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔ عاصمہ اپنے حالات سے ٹک اگر خود کشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ نو سال بعد عاصمہ کا بھائی ہاشم پریشان ہو کر پاکستان آ جاتا ہے۔ عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے ہاشم کو پتا چلتا ہے کہ زیر نے ہر جگہ فراڈ کر کے اس کے سارے راستے بند کر دیے ہیں اور اب مغرور ہے۔ بہت کوششوں کے بعد ہاشم عاصمہ کو ایک مکان دلایا جاتا ہے۔

بشری اپنی واپسی الگ گھر سے مشروط کر دیتی ہے۔ دوسری صورت میں وہ علیحدگی کے لیے تیار ہے۔ عدیل مکان کا اور والا پور رشن بشری کے لیے سیٹ گروا دیتا ہے بشری کے آنے کے بعد بشری کو مجبور کرتا ہے کہ وہ فوزیہ کے لیے عمران کا رشتہ لائے۔ نسیم بیگم اور عمران کسی طور نہیں مانتے۔ عدیل اپنی بات نہ مانے جانے پر بشری سے جھگڑتا ہے۔ بشری بھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ عدیل طیش میں بشری کو طلاق دے دیتا ہے اور مثال کو چھین لیتا ہے۔ مثال بیمار پڑ جاتی ہے۔ بشری بھی حواس کھو دیتی ہے۔ عمران بہن کی حالت دیکھ کر مثال کو عدیل سے چھین کر لے آتا ہے۔ عدیل عمران پر اغوا کا پرچا کھاتا ہے۔

عاصمہ اسکول میں ملازمت کر لیتی ہے مگر گھریلو مسائل کی وجہ سے آئے دن چھٹیاں کرنے کی وجہ سے ملازمت چلی جاتی ہے۔

انسپکٹر طارق دونوں فریقین کو سمجھا کر مصالحت پر آمادہ کرتے ہیں۔ ذکیہ بیگم کی خواہش ہے کہ عدیل مثال کو لے جائے تاکہ وہ بشری کی کہیں اور شادی کر سکیں۔ دوسری طرف نسیم بیگم بھی ایسا ہی سوچے بیٹھی ہیں۔ فوزیہ کی اچانک شادی کے بعد نسیم بیگم کو اپنی جلد بازی پر پچھتاوا ہونے لگتا ہے۔ انسپکٹر طارق ذکیہ بیگم سے بشری کا رشتہ مانتے ہیں۔ ذکیہ بیگم خوش ہو جاتی ہیں مگر بشری کو یہ بات پسند نہیں آتی۔

وہ لوہین کلرڈ کے لاج میں بشری سے ملتی تو ذکر نازیہ بھٹی سے شادی کر لیتا ہے پھر شادی کے ناکام ہو جانے پر ایک بیٹی سیفی کے ساتھ ایک طویل عرصے بعد دوبارہ اپنی چچی ذکیہ بیگم کے پاس آ جاتا ہے اور ایک بار پھر بشری سے شادی کا خواہش مند ہوتا ہے۔ بشری عصبانیت کا شکار ہو جاتی ہے۔

بشری اور احسن کمال کی شادی کے بعد عدیل مستقل طور پر مثال کو اپنے ساتھ رکھنے کا عزم کرتا ہے مگر بشری اقسعی نہیں مانتی پھر احسن کمال کے شوہر نے رد دونوں بمشکل راضی ہو جاتے ہیں کہ مہینے کے ابتدائی چند دنوں میں مثال بشری کے پاس رہے گی اور بقیہ پندرہ دن عدیل کے پاس۔ گھر کے حالات اور نسیم بیگم کے اصرار پر بالآخر عدیل عفت سے شادی کر لیتا ہے۔ والدین کی شادی کے بعد مثال دونوں گھروں کے درمیان گھمن چکرن جاتی ہے۔ بشری کے گھر میں سیفی اور احسن اس کے ساتھ کچھ اچھا برتاؤ نہیں کرتے اور عدیل کے گھر میں اس کی دوسری بیوی عفت۔ مثال کے لیے مزید زمین تنگ بشری اور عدیل کے نئے بچوں کی پیدائش کے بعد پڑ جاتی ہے۔ مثال اپنا اعتماد کھو بیٹھتی ہے۔ احسن کمال اپنی فیملی کو لے کر ٹائیپیا چلا جاتا ہے اور مثال کو تاریخ سے پہلے عدیل کے گھر چلا دیتا ہے۔ دوسری طرف عدیل اپنی بیوی بچوں کے مجبور کرنے پر مثال کے آنے سے قبل اسلام آباد چلا جاتا ہے۔ مثال مشکل میں گھر جاتی ہے۔ پریشانی کی حالت میں اسے ایک نشینی تنگ کرنے لگتا ہے تو عاصمہ آ کر اسے بچاتی ہے۔ پھر اپنے گھر لے جاتی ہے۔ جہاں سے مثال اپنے ماموں عمران کو فون کر کے بلواتی ہے اور اس کے گھر چلی جاتی ہے۔

عاصمہ کے حالات بہتر ہو جاتے ہیں۔ وہ نسبنا "پوش امیریا میں گھر لے لیتی ہے۔ اس کا کوچنگ سینٹر خوب ترقی کر جاتا



ہے۔ مثال 'واثق' کی نظروں میں آچکی ہے تاہم دونوں ایک دوسرے سے واقف نہیں ہیں۔  
عاصمہ کا بھائی ہاشم ایک طویل عرصے بعد پاکستان لوٹ آتا ہے اور آتے ہی عاصمہ کی بیٹیوں اربیتہ اور اریبہ کو اپنے بیٹوں وقار و قاسم کے لیے مانگ لیتا ہے۔ عاصمہ اور وثیق بہت خوش ہوتے ہیں۔

سیفی 'مثال' پر ہری نیت سے حملہ کرتا ہے تاہم مثال کی چیخوں سے سب وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ سیفی الٹا مثال پر الزام لگاتا ہے کہ وہ اسے سکا رہی تھی۔ حسن کمال بیٹے کی بات پر یقین کر لیتا ہے۔ مثال اور بشری مجبور اور بے بسی سے کچھ کہہ نہیں پاتیں۔ احسن کمال پوری فیملی سمیت دوسرے ملک میں شفٹ ہو جاتا ہے۔ بشری مثال کو مستقل عدیل کے گھر چھوڑ جاتی ہے۔ جہاں عفت اور پریشے اسے خاطر میں نہیں لاتیں۔ وثیق کو بہت اچھی نوکری مل جاتی ہے۔ مثال اور وثیق کے درمیان ان کما سوا تعلق بن جاتا ہے۔ مگر مثال کی طرف سے دوستی اور محبت کا کوئی واضح اظہار نہیں ہے۔ وثیق البتہ محل کر اپنے جذبات کا اظہار کر چکا ہے۔ وثیق 'عاصمہ' سے اپنی کیفیت بیان کر دیتا ہے۔ عاصمہ خوش ہو جاتی ہے مگر غائبانہ ذکر پر بھی مثال کو پہچان نہیں پاتی۔ وثیق عاصمہ کو لے کر مثال کے گھر ملنے جاتا ہے۔ مگر دروازے پر عدیل کو دیکھ کر عاصمہ کو برسوں پرانی رات یاد آ جاتی ہے۔ جب زبیر نے عاصمہ کی عصمت دری کر کے اسے ویرانے میں چھوڑ دیا تھا اور عدیل نے عاصمہ کو گھر پہنچایا تھا۔ اگرچہ عدیل نے اس وقت بھی نہیں سمجھا تھا کہ عاصمہ پر کیا ہوتی ہے اور اب بھی اس نے عاصمہ کو نہیں پہچانا تھا، مگر عاصمہ کو عدیل بھی یاد تھا اور اپنے ساتھ ہونے والا وہ بھیا تک حادثہ بھی۔ شرمندگی اور ذلت کے احساس سے عاصمہ کو انجانا کا ایک ہو جاتا ہے۔ وثیق دروازے سے ہی ماں کو اجتال لے جاتا ہے۔ مثال اس کا انتظار کرتی رہ جاتی ہے۔ پھر بہت سارے دن یوں ہی گزر جاتے ہیں۔ ان ہی دنوں عدیل اپنے دوست کے بیٹے فہد سے مثال کا رشتہ طے کر دیتا ہے۔ عفت مثال کے لیے اتنا بہترین رشتہ دیکھ کر بری طرح جل جاتی ہے۔ اس کی دلی خواہش ہے کہ کسی طرح یہ رشتہ پریشے سے طے ہو جائے۔ مثال بھی اس رشتے بدل سے خوش نہیں ہے۔ مگر اپنی کیفیت سمجھ نہیں پاری۔ عاصمہ کی طبیعت ذرا سنبھلتی ہے تو وہ مثال کی طرف جانے کا ارادہ کرتا ہے۔ اتفاق سے اسی دن مثال کی فہد سے شکلی کی تقریب ہو رہی ہوتی ہے۔ وہیں کھڑے کھڑے وثیق کی ملاقات پریشے سے ہو جاتی ہے جو کافی ناگوار ہے۔ وثیق سے بات کرتی ہے اور اس بات سے بے خبر ہوتی ہے کہ اس کی کلاس فیلو درودہ جو اسے بہت پسند کرتی ہے 'واثق' کی بہن ہے۔ شکلی کے بعد مثال ایک دم شادی سے انکار کر دیتی ہے۔ عفت خوش ہو جاتی ہے۔ عدیل بہت غصہ کرتا ہے اور بشری کو ان کے رشتے مثال کو بھیجنے کی بات کرتا ہے۔ گھر میں ٹینشن پھیل جاتی ہے۔ اسی ٹینشن میں مثال کالج کی لائبریری میں وثیق سے ملتی ہے۔ واپسی میں عفت اسے وثیق کے ساتھ دیکھ لیتی ہے اور عدیل کو بتا دیتی ہے۔ عدیل از حد پریشان ہو جاتا ہے۔ پریشے درودہ سے ملنے اس کے گھر جاتی ہے تو وثیق سے ملاقات ہو جاتی ہے۔

## پھبیسویں قسط

مثال کے قدم وہیں جیسے زمین میں جکڑے رہ گئے اس نے تو یہ بات خواب میں بھی نہیں سوچی تھی کہ یوں وہ وثیق کے ساتھ چل رہی ہو اور پاپا آجا میں گئے وہ وہیں قدم روکے گم صم کھڑی رہی۔  
عدیل اسے تیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وثیق غمناک اور ادنی طور پر تھوڑا سا مثال سے ہٹ کر کھڑا ہو چکا تھا۔  
”اسلام علیکم سر! کیسے ہیں آپ؟“ وہ وثیق کی اس حرکت پر کچھ حیران و پریشان سی کھڑی رہ گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر عدیل کے آگے مصافحہ کرنے کے لیے ہاتھ بڑھا کر باقاعدہ سلام کیا تھا۔  
جواب میں عدیل کچھ حیران اور خاموش سا کھڑا رہا۔  
”شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں وثیق عفان ہوں گا سٹ منٹھ ہماری اسے آر سنز کی سائٹ پر ملاقات ہوئی تھی۔ بریفنگ تھی آپ اپنے آفس کی طرف سے آئے تھے۔“



”اوہ ایس آئی وی فیجر۔ واثق۔ مجھے آپ یاد رہے تھے! اچھی طرح سے کیونکہ آپ نے جس طرح وہ ساری بریفنگ دی تھی۔ میں امپریس ہوا تھا آپ کے اعتماد اور آپ کی معلومات سے۔“ عدیل غیر متوقع طور پر خوش ہوا تھا۔

”تھینکس سر۔ تھینک یو دیری میچ۔“ واثق گرم جوشی سے بولا۔

”نود ٹیم سرا“ عدیل کا انداز بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

”یہ شخص بھی دوسرے کو گھیرنے کی خوب صلاحیت رکھتا ہے۔“ مثال نے کن اکھیوں سے واثق کو دیکھتے ہوئے دل میں سوچا۔ کاش واثق کا تعارف پیلا سے کسی اور طرح سے ہوتا تو میں اپنی زندگی کے سارے دکھ ساری محرومیاں بھول جاتی مگر ہر خواہش پر دعا کب قبول ہوتی ہے۔

وہ دونوں ساتھ چلتے ہوئے اب آپس میں کچھ بات کر رہے تھے۔ مثال آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ان کے پیچھے چلتی جا رہی تھی جہاں رستہ دو سڑکوں میں تقسیم ہوا تھا۔ واثق الوداعی مصافحہ کر کے اپنی سڑک کی طرف مڑ گیا تھا۔ عدیل نے سڑک مثال کی طرف دیکھا جو سر جھکائے اس کے پیچھے چند قدم پر کھڑی تھی۔

”آجاؤ۔ ضروری نہیں تھا کہ اب یوں باہر نکلو۔ میں اس لیے جلدی کر رہا تھا کہ گھر میں بہت کام ہوں گے۔“ عدیل کے لہجے میں بہت کچھ جتانے والا تھا۔

”سوری بابا! لیکن مجھے لائبریری کی کچھ بکس واپس کرنی تھیں اس لیے مجھے آنا پڑا۔“ وہ معذرت خواہ لہجے میں سر جھکا کر آہستگی سے بولی۔

”اب تو کچھ ایسا نہیں ہے نا تمہارا پاس جو پھر سے لوٹانے کے لیے جانا پڑے؟“ وہ کچھ جتا کر بولا تو اس نے خفیف سانفلی میں سر ہلا دیا۔

”بہت کچھ تو ایسا ہے جو دل ہی میں رہ گیا۔ واثق کی محبت اس کی توجہ بہت سی۔ ان کی باتیں تشنہ خواہشیں۔“

وہ حسی سے سوچتی چلی گئی۔

عدیل کے قدم تیز ہو چکے تھے وہ بھی رفتار بڑھا کر اس کے ساتھ قدم ملانے کی کوشش کرنے لگی۔

\*\*\*

”عدیل! عفت کچھ پریشانی سے اسے دیکھ گئی۔

”مجھے خود فوریہ کی یہ بات اچھی نہیں لگی جس طرح اس نے فون کر کے مجھے کہا کہ اگر دانی وہاں اسٹڈیز میں دلچسپی نہیں لے رہا تو آپ اسے میرے پاس بھجوا دیں۔ مجھے لگا کہیں تم نے تو اسے فون کر کے یہ سب کچھ نہیں

کہا۔“ وہ کچھ ناراض لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”عدیل! میں ایسا کیوں کہنے لگی۔ پھر آپ جانتے ہیں۔ میں دانی کے لیے تو ایسا کبھی بھی نہیں کہہ سکتی۔“ وہ مدہم لہجے میں بولی۔

”جانتا ہوں دانی تمہاری کمزوری ہے۔ تم اسے خود سے دور کرنے کا تو کبھی بھی نہیں سوچو گی۔“ وہ طعنہ نہیں دے رہا تھا مگر عفت کو کچھ ایسا ہی لگا۔

”تو کیا دانی آپ کی کمزوری نہیں۔ اکلوتا بیٹا ہے وہ آپ کا۔“ وہ بھی کہے بغیر رہ نہ سکی۔

”کمزوری ہی تو بن گیا ہے وہ میری“ وہ منہ میں کچھ کوفت سے بڑبڑا کر بولا۔ تو عفت کو بالکل اچھا نہیں لگا۔

”آج اس کے اسکول بھی گیا تھا وہی بات جس کی میں امید کر رہا تھا اس کے پرنسپل نے اسکول سے فراغت کا نوٹس میرے ہاتھ میں تھمایا اور میں نے بھی ذرا اصرار نہیں کیا کہ وہ اسے رکھ لیں اسکول میں اچھا ہے جان چھٹی وہاں سے تو۔“ وہ اسے تفصیل بتاتے ہوئے خود کو ہلکا پھلکا سا محسوس کر رہا تھا۔

عفت کچھ پریشان سی ہو گئی۔

”لیکن عدیل اس کا سال ضائع ہو گا اس طرح تو۔“

”وہ تو ہو چکا آل ریڈی۔“ وہ کچھ لاپرواہی سے بولا۔

”صرف تین چار ماہ تو ہیں ایگز ام میں وہ دے لیتا پھر آپ اس کا اسکول بدل دیتے۔“ وہ پریشانی سے بولی۔

”تمہارا کیا خیال ہے اس نے ایگز امز میں نکل جانا ہے تین چار ماہ ہوں یا کچھ دن عفت! وہ پڑھائی کے خیال

سے بالکل ہٹ چکا ہے کچھ فائدہ نہیں بیکار میں اسکول ڈیلز بھرنے کا۔“ وہ جیسے طے کر چکا تھا کہ اب دانی سے کچھ بھی امید نہیں لگانی۔

”تو کیا کرے گا پھر وہ ہیو نی آوارہ ہی تو پھرے گا گھر میں تو وہ نکلتا نہیں عفت کو وہ ہری پریشانی نے گھیر لیا۔

”نہیں! میں کل جا رہا ہوں۔ بہت اچھا اسکول ہے۔ اس کا پرنسپل میرا کلاس فیلو بھی رہ چکا ہے میں اس سے

دانی کا کیس ڈسکس کر چکا ہوں۔ اس نے اسپیشل کیس کے طور پر لیتے ہوئے مجھ سے وعدہ بھی کیا ہے کہ وہ دانی کو

ان شاء اللہ سدھارے میں ہماری مدد کرے گا ہمیں بھی اب اس پر نظر رکھنی ہوگی۔ مجھے امید ہے چند مہینوں میں

ہی ہمیں دانی کی طرف سے اچھے رزلٹ ملنا شروع ہو جائیں گے۔“ وہ امید بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”سچ میں عدیل۔ اگر ایسا ہو جائے میں سمجھوں گی۔ اللہ نے میری ہر دعا قبول کر لی۔“ عفت جذباتی ہو کر رونے

ہی لگی۔

”ان شاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔ میں بھی اس پر تو یہ دلیں گا۔ تم بھی اس کا خیال رکھو۔ اسے غیر محسوس طور پر گھر کی

مصروفیات میں الجھاؤ۔ کچھ کام اس کے ذمے لگاؤ۔ وہ ضرور بہتر ہو گا۔ اس عمر میں لڑکے ضرور پریشان کرتے ہیں

ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا وہ۔“

عدیل نے ہلکا پھلکا ہو رہا تھا جیسے بہت بھاری بوجھ اس کے سر سے اُترا ہو۔ عفت نے بہت دنوں بعد اسے

یوں مطمئن سا لگتا تھا۔

”پھر تو آپ نے بھی نسیم آنٹی کو خوب پریشان کیا ہو گا۔“ عفت اس کے موڈ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ شوخی

سے بولی۔

”نہیں بھئی۔ میں تو شروع سے اچھا بچہ تھا۔ بہت دل لگا کر پڑھنے اور محنت کرنے والا پھر جواب ملی تو بھی میں

نے اس میں بہت دل سے کام کیا۔ بشری سے شادی کے بعد تو۔“

وہ جو دانی میں بولتا جا رہا تھا۔ اتنے سال ان دونوں کو جدا ہوئے گزر چکے تھے پھر بھی خیالات کے دباؤ اور روانی

میں اکثر وہ عفت کو فراموش کر کے بشری کو اس کی جگہ لے آتا۔

دونوں کچھ لمحوں کے لیے گنگ سے رہ گئے۔

”میں جانتی ہوں آپ شروع سے بہت ذمہ دار اور خیال رکھنے والے تھے۔“ عفت آہستگی سے بولی۔ ”آپ

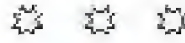
نے فوزیہ کو کیا جواب دیا۔“ وہ موضوع بدلتے ہوئے عدیل کو اس شرمندگی کی کیفیت سے نکال کر بولی۔

”وہی جو مجھے دینا چاہیے تھا ابھی جب تک اس کی اسٹینڈنٹ ملل نہیں ہوتی۔ ایسا کچھ سوچا بھی نہیں

جاسکتا۔“ وہ پھر سے پہلے والے انداز میں بولا تو عفت بھی سہلہ کر رہ گئی۔



”تم نے چیزوں کی لسٹ بنائی تھی مثال کی شادی کے لیے؟“ اس نے اسے وہ کام یاد دلایا وہ جس کام کے لیے جلدی آفس سے اٹھ کر آیا تھا۔  
 ”ہاں۔ کچھ چیزیں میں نے لکھی تو ہیں۔“  
 وہ اٹھ کر الماری سے ڈائری اور پین نکالنے لگی۔  
 ”یہ آپ دیکھ لیں پھر مجھے بتادیں اور کیا کیا لکھنا ہے۔“ وہ اس کو دکھاتے ہوئے بولی۔ عدیل لسٹ دیکھتے ہوئے اسے کچھ اور چیزیں لکھوا سنے لگا۔



”خوش ہوں میں ممّا!“ وہ آہستگی سے بولی۔ بشری اب ہر کال میں اس سے یہ سوال ضرور پوچھتی تھی۔  
 ”اگر میں ناخوش بھی ہوں گی تو آپ کیا کر لیں گی؟ مجھے اپنے پاس بلو الیں گی؟ یا میرے پاس آجائیں گی؟“ وہ افسردہ سی ہو کر دل میں خود سے بولی۔

”میری یہی دعا ہے اب دن رات تمہارے لیے مثال کہ میری زندگی آنے والی زندگی بہت خوش گوار بہت شان دار ہو اسے شوہر کی مسہرال کی بہت محبت ملے، میری بیٹی کے دل میں کوئی دکھ کوئی محرومی باقی نہیں رہے۔“  
 بشری ہولے ہولے کہہ رہی تھی جیسے وہ بولتے ہوئے اپنے آنسو بھی صاف کر رہی ہو۔  
 بشری نے کئی بار اس سے کہا کہ اور اس کا پ پر بات کرے مگر جانے کیوں مثال چاہتی نہیں تھی کہ وہ ماں کے روبرو ہو وہ فون پر آسانی محسوس کرتی۔

”مثال! میں اور عدیل تم سے بہت محبت کرتے تھے لیکن ہم اچھے ماں باپ ثابت نہیں ہوئے، بالکل بھی ہم نے تمہارا اس طرح سے خیال نہیں رکھا کہ تمہارے جھگڑوں میں پرو کر جس طرح ہمیں تمہارا خیال رکھنا چاہیے تھا۔ تمہاری پروا کر لی چاہیے تھی۔ پھر تمہیں ہم دونوں کے ساتھ رہتے ہوئے بھی بہت سی محرومیاں، بیماریاں، بے چینی، جب تک یہ سب سوچتی ہوں تو میرا دل بہت روتا ہے۔“ بشری آج کسی اور ہی دنیا میں تھی۔

”مثال! آپ بے بس ماں کو بیٹا معاف کر دینا میں نے پہلے صاف سوچ کر تمہاری زندگی میں مثبت تبدیلی آئے احسن کمال سے شادی کی مگر پھر بعد میں جو کچھ ہوا اس شادی کو بچانے کے لیے کیونکہ میری ایک شادی پہلے ٹوٹ چکی تھی اور میں تو شاید وہ سری شادی بھی تمہارے لیے ختم کر لیتی مگر یہ دینا غائب نہیں کر لی نہ بھولتی ہے۔ اس نے تمہیں طعنے دے دے کہ تمہارا جینا حرام کر دینا تھا کہ جیسی ماں تھی وہی بیٹی ہوگی جو خدا نخواستہ کبھی گھر نہیں بنا سکے گی۔ تم سن رہی ہونا مثال!“ وہ افسردہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”جی ممّا!“ وہ ہولے سے بولی۔

”میری جان! تمہاری نئی زندگی شروع ہونے جا رہی ہے یقیناً ”فد بہت اچھا لڑکا ہوگا۔ تم اس سے پوری ایمان داری سے محبت کرنا“ اور بیٹا ساتھ میں اپنی ساس سسر کا بہت خیال رکھنا اور مثال بتا ہے میں اس رشتے سے کیوں

خوش ہوں کہ فدا اکلوتا ہے۔ دوسرے بہن بھائی کا کوئی جھنجھٹ نہیں ورنہ بعد میں بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اللہ میری مثال کی نئی زندگی میں کبھی کسی دکھ کی بھی پرچھا میں بھی نہیں ڈالے۔“

وہ اسے دعاؤں دیتی جا رہی تھی۔

”اچھا سنو مجھے بتاؤ۔ تم مجھ سے کیا گفت لوگی۔ اپنے طور پر تو میں کچھ نہ کچھ بھجوا رہی ہوں لیکن تمہیں جو مجھ سے چاہیے وہ بھی تم مجھے بتاؤ۔“ وہ بہت خوش تھی۔

”نہیں نما! مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ کچھ بھی نہیں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”مثال میری جان! ناراض ہو مجھ سے ابھی تک؟“ وہ بے قراری سے بولی۔

”نہیں نما! میں کیوں آپ سے ناراض ہونے لگی۔“ وہ گھبراہٹ سے لے کر بولی۔ ”آپ نے ایسا کچھ نہیں کیا کہ میں آپ سے ناراض ہوں، بلکہ یہ ہے میں میں آپ سے پھر بات کرتی ہوں۔“ اس نے فون بند کر دیا۔ اسے اب بشری کے اس پیار بھرے رویے سے بہت الجھن سی ہوتی تھی۔ اسے ساری محبتیں ہی اب بٹاؤنی لگنے لگی تھیں۔ ”شاید اس لیے بھی خوش ہیں کہ اب بلکہ جو مجھے ان کے پاس بھیجنے کی بات کر رہے تھے، وہ معاملہ بھی ختم ہو جائے گا۔“ وہ یونہی فون ہاتھ میں لیے سوچنے لگی۔

”مما کی شادی ختم ہونے کی بڑی وجہ فوزیہ پھچھو۔ مماس بات پر خوش ہیں کہ میری کوئی منہ نہیں۔ اور فدا اس سے ایمان داری سے محبت کیسے کروں گی۔ میں تو اس کی محبت میں پہلے ہی بے ایمانی کر چکی ہوں۔“ وہ مضطرب سی کمرے میں ٹپکنے لگی۔

”جب بھی فدا کی محبت کا خیال کروں گی۔ اسے چاہئے لگوں گی، کیا واثق کی محبت میرے دل سے ختم ہو جائے گی، یا خدا یہ میرے ساتھ کیا ہوا۔ پہلے بٹی ہوئی تقسیم شدہ زندگی گزار رہی اور اب نئی ہوئی محبت۔ میں بھرتی رہوں گی فدا کے لیے خود کو سمیٹوں گی اور واثق کے لیے پھر سے بھڑکوں گی۔ تاہم میں اسے بھول بھی سکوں گی یا نہیں؟“ اس کی آنکھوں میں نمی سی اتر آئی۔

وہ پل صراط سے مرطے جن کے آنے کا خیال اسے ہر اسماں کیے ہوئے تھا۔ اس کے جانے کے دن بہت قریب آگئے تھے شام رات میں ڈھل رہی تھی اور کل اسے یہاں سے رخصت کرنے کی تاریخ طے ہوئی تھی۔



وہ بہت دیر سے بغیر پلکیں جھپکے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ جو کچھ اس حال میں تھا کہ شاید اسے یہ بھی خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں ہے؟ وہ کون ہے؟ کسی گہری سوچ میں مستغرق۔

کسی ایسے پہلے پردھیان کی ساری سیڑھیاں لگائے وہ کسی اور ہی جہاں میں تھا جس کا حل شاید کہیں بھی نہیں تھا۔

وہ محرزہ چلتی ہوئی اس کے پاس آکر لمحہ بھر کو جھجکی پھر کچھ بے خوف سے انداز میں یوں بیٹھ گئی، اس سے ذرا فاصلے پر جیسے دو دوست بیٹھے ہیں، وہ اسی طرح بے خبر بیٹھا تھا۔

”وہ کون ہے جس سے آپ محبت کرتے ہیں؟“ اس نے پرمروہ سے لہجے میں سرگوشی کے سے انداز میں پوچھا تھا۔

اور واثق یوں اپنی جگہ سے اٹھلا جیسے کسی نے اسے ہزار والٹ کا کرنٹ لگایا ہو، وہ اسے یوں اپنے اتنے قریب بیٹھا دیکھ کر شاک میں آ گیا۔

”کون ہے وہ جسے آپ اتنے دھیان سے سوچ رہے ہیں۔ پلیز بتائیں ناں میں اس خوش نصیب لڑکی کا نام جاننا چاہتی ہوں۔“ پری کے چہرے پر اشتیاق بھی تھا اور امید کا جلتا دیا بھی! جیسے واثق جواب میں اس کا نام لے لے دے گا۔ واثق کے جڑے بچھ گئے۔ وہ مٹھیاں سمیٹتے جیسے خود پر ضبط کر رہا تھا۔

”میں اس کا نام جان سکتی ہوں؟“ پری نے جھجکتے ہوئے بہت آہستگی سے اس کے ماتھ کو چھوا تھا۔



اور واثق یوں اپنی جگہ سے اچھلا جیسے کسی نے اسے اوپر اچھالا ہو اس کا ہاتھ پری کو تھپڑ مارنے کے لیے اٹھا اور شدید برداشت کے مرحلے سے گزرتے ہوئے جیسے ہوائی میں معلق رہ گیا۔

”مارنا چاہتے ہیں پلیز تو مار لیجئے۔ مجھے اچھا لگے گا۔ آپ سے میرا کوئی تو تعلق ہے بھلے دشمنی کا ہو یا دوستی کا۔“ وہ اس بے خوف تہیے میں کہہ رہی تھی جس سے وہ پہلے اس سے بات کرتے ڈرتی تھی۔

”سٹاپ! پوسٹاپ!“ واثق جبرے بھینچے حلق کے بل غرا کر بمشکل ہی بول سکا۔

پری کی آنکھوں میں نا سمجھ سی حیرت اتر آئی تھیں اسے یقین ہی نہ ہو جواب میں اسے یہ کچھ سننا پڑے گا۔

”میں نے کچھ غلط کہہ دیا؟“ وہ مصنوعی انداز میں کچھ ڈرتے ڈرتے پوچھ رہی تھی بہت حیران سی! اور واثق کا جی چاہ رہا تھا اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے دھکے دے کر یہاں سے نکال دے۔

”دورہ گھر پر نہیں ہے اور امی بھی نہیں ہیں جب تمہیں آنا ہو تو پہلے تو انہیں کال کر کے یہاں آیا کرو اور پلیز اب جاؤ یہاں سے کیونکہ میں گھر میں اکیلا ہوں۔“ وہ اس جیسے چرے پر خوفناک سے تاثرات لیے بہت رک رک کر بولا تھا جیسے خود کو تہذیب کے دائرے میں رہے پر مجبور کر رہا ہو۔

وہ اسے دیکھتی رہ گئی اور دوسرے لمحے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ واثق نے اسے سخت ناگوار نظروں سے دیکھا یہ لڑکی خود جتنی بے باک تھی اس کی ہنسی میں بھی بے خوفی تھی۔

پتا نہیں کب کہاں اس نے یہ جملہ پڑھا اور اس کے ذہن پر جیسے نقش ہو گیا تھا۔

”جو لڑکی بے خوف ہنسی ہے وہ اچھی لڑکی نہیں ہوتی۔“ اور وہ ایسی ہی تاپسندیدہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”ارے یہ خوف تو لڑکیوں کو ہوتا ہے کہ وہ گھر میں اکیلی ہیں مگر اس کا کوئی بوائے فرینڈ ملنے کے لیے آجائے تو وہ اس طرح اسے جھٹک کر واپس جانے کو کہتی ہیں چاہے ان کا دل اندر سے اسے گھر کے اندر رہانے کو چاہ رہا ہو۔

جیسے کہ اس وقت آپ کا دل چاہ رہا ہے تاکہ میں نہ جاؤں کہیں بس یہیں رک جاؤں، گھر جاؤں، ہمیشہ کے لیے آپ کے پاس۔ آپ کے گھر میں۔ ہے نا؟“ اس کی صرف اتنی سی بے خوف نہیں تھی اس کی سوچ بھی بے باک تھی۔

واثق کو — اس لڑکی سے جو ابھی اسے تو دوروں کی طرح بالکل لا ابالا سی لگتی تھی۔ پہلی بار ہی اس سے عجیب سی محسوس ہوئی۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا! آپ کا دل کیونکر چاہے گا کہ اتنی اچھی پیاری بلکہ اگر میں صاف آپ کے لفظوں میں بولوں تو ایسی بات لڑکی کیسی تنہائی میں آپ کو اکیلا چھوڑ کر چلی جائے نہیں چاہ رہا ناں آپ کا دل؟“

وہ اس کے بالکل پیچھے آ کر یوں اس کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوئی تھی کہ دونوں کے بیچ میں سے گزرتی ہوا کو بھی رستہ بہت تنگ پڑ رہا تھا۔

وہ اس کے بہت قریب تھی کہ دراصل حرکت خفیف سی آہٹ دونوں کو ایک دوسرے کے بہت قریب کر سکتی تھی۔ واثق کا ضبط جیسے جواب دے گیا۔

”اگر ایسے میں کوئی آگیا امی یا ورہ انہوں نے دونوں کو یوں کھڑے دیکھ لیا تو کون یقین کرے گا اس میں واثق انوالو تھا یا نہیں یہ صرف پری کی کاوش تھی۔“

وہ تیزی سے پلٹا اور اس نے بھیج کر ایک تھپڑ پری کے چہرے پر جڑ دیا۔

”یہ بے تہماری اس بے باک گفتگو کا جواب۔“ وہ دانت پیس کر تنفر سے بولا۔ اور پری کو اس تھپڑ سے اتنی تکلیف نہیں ہوئی جتنی واثق کے اجنبی رویے سے عجیب سا دکھ ہوا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو ٹہرے گئے۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں ٹھہرا پانی لیے اسے دیکھتی جا رہی تھی جس

کی آنکھوں میں حسرت، نفرت، بے زاری اور بیگانگی تھی اور کچھ بھی نہیں۔  
 اس کچھ کی تلاش نے تو اسے بے باک بنایا تھا۔ وہ سمجھی تھی کہ اگر وہ خود سے پہل کرے گی تو بہت کچھ خود بخود آسان ہوتا چلا جائے گا۔ محبت کے رستے بھی اور واثق کی چاہت بھی!  
 ”نکلو یہاں سے اور آئندہ تم میری موجودگی میں اس گھر میں نہیں آؤ گی۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں۔“ یہ ایک دم سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے بیرونی دروازے تک لے آیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ٹھسٹتی ہوئی جا رہی تھی۔  
 ”تم جیسی لڑکیاں عزت کرنے تو کیا کسی بھی قابل نہیں ہوتیں، تمہیں اپنی شکل پر بہت ناز ہے، اپنے حسن پر بہت غور ہے اور تم مجھے ایک عام شکل کی گئی گزری لڑکی سی بھی بری لگی ہو اس میں کم از کم شرم، کچھ حیاء ہوگی۔“

واثق شدید جذباتی پن میں پھولے سانسوں کے درمیان بول رہا تھا۔  
 پری کی تو جیسے حیرت ہی نہیں جا رہی تھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ جو اتنی حسین، اتنی خوب صورت ہے وہ خود سے کسی مرد کی طرف پیش قدمی کرے اور وہ مرد اسے جھٹک کر زور ہٹا دے ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔  
 اس کا دل عجیب طریقے سے دھڑک رہا تھا بہت آہستہ آہستہ ڈونگا اور پھر نیچے ہی نیچے جاتا ہوا۔  
 وہ کمزور دل نہیں تھی مگر اس وقت اسے لگا جیسے اس کے بدن کی پوری طاقت کسی بھرپوری رست کی دیوار کی طرح ڈھکی جا رہی ہے آہستہ آہستہ نیچے گرتی جا رہی ہے۔  
 ”جاؤ یہاں سے اور اگر تم میں تھوڑی غیرت، شرم یا اپنے ماں باپ کی عزت کا لحاظ ہو گا تو آئندہ کسی بھی غیر مرد کے ساتھ اس طرح کی بے ہودہ بکواس کرنے سے پہلے سو بار سوچو گی۔“ نفرت سے کہہ کر اس نے بری کا ہاتھ چھوڑ کر اسے باہر کی طرف دھکا دیا اور وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹتے ہی یوں بے دم ہو کر گری جیسے کسی نے اس کے بدن سے روح ہی کھینچ لی ہو۔

وہ سیدھی جا کر دروازے کی چوکھٹ سے ٹکرائی اور دوسرے لمحے زمین پر گر کر گرہیر ہو گئی۔  
 اس بات تو واثق کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ وہ اس طرح کا ڈرامہ کرے گی بجائے یہاں سے دفعانے کے کہ نہ منہ ہو کر چلے جانے کے وہ یوں دہلیز کے آگے ہی ٹھہر جائے گی۔  
 ”تم نے سنا نہیں۔ اٹھو اور جاؤ یہاں سے اس سے پہلے کہ کوئی یہاں آجائے جاؤ اپنے گھر۔“ وہ وہیں کھڑے کھڑے درشت بے چین پکارا۔

گمراہ بے حس و حرکت وہیں پڑی رہی۔ ایک دو تین چار۔ بہت سارے لمحے خاموشی سے گزر گئے وہ بے حس و حرکت پڑی رہی۔ واثق کو پریشان سی ہوئی۔  
 ”اے کیا مر گئی ہو۔ اٹھو یہاں سے اور جاؤ فوراً“ وہ اس سے کچھ فاصلے پر رک کر تندرے محتاط لہجے میں بولا۔ وہ بالکل نہیں اٹکی۔

”یہ اس کا کوئی فریب بھی ہو سکتا ہے کوئی نالائقی۔ یہ لڑکی کچھ بھی۔۔۔ کچھ بھی کر سکتی ہے مجھے اس پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔“ وہ کچھ پریشان سا خود کو سمجھاتے ہوئے دبا سا آگے بڑھا۔  
 ”یہ تو بے ہوش ہو گئی ہے یوں گٹھڑی کی طرح بے حس و حرکت پڑے دیکھ کر خود سے کہا۔ اب آگے بڑھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

”کیا ہوا ہے تمہیں۔ آریو آل رائسٹ۔“ وہ ذرا سا اس پر جھکا پوچھ رہا تھا۔  
 بہت آہستگی سے اسے چھو کر واثق نے سیدھا کیا۔ اس کے ماتھے سے ذرا سا خون رس رہا تھا اور وہ بے ہوش



تھی۔ وہ کتنی دیر اسے غور سے دیکھتا رہا۔  
اس کے پونے بھی بے حرکت تھے۔ یہ اتنی سی چوٹ سے کیسے بے ہوش ہو سکتی ہے بھلا۔ وہ پریشان سا ہوا۔  
”اے سنو۔ تم ٹھیک ہو۔“ وہ اب اس کے پاس دو زانو ہو کر پوچھ رہا تھا ”اسے ذرا سا ہلایا اور وہ اس کی طرف  
لڑھک گئی۔

”پری!“ وہ پریشان ہو گیا۔  
اس وقت عاصمہ اور وردہ اندر آ گئیں اور دروازے پر ہی یہ منظر دیکھ کر ٹھٹھک کر رہ گئیں۔



عدیل نے الوداعی کلمات بولتے ہوئے فون بند کر دیا۔ عفت منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔  
”اوجھے گھٹنے میں وہ لوگ نکل رہے ہیں گھر سے۔“ اس نے آٹھ لوگ ہوں گے ان کے ساتھ ”زیادہ تر تو فائزہ  
بھابھی کے رشتہ دار ہیں ایک وقار کا بھائی اور اس کی بھابھی ہیں۔ یہاں سب انتظامات مکمل ہیں نا؟“ وہ کچھ بے  
چین سے لہجے میں بولا۔

آج عدیل نے آفس سے چھٹی لی تھی وہ سب کچھ اپنی نگرانی و موجودگی میں کرنا چاہتا تھا۔  
عفت نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ یہ سوال دوپہر کے بعد سے کئی بار پوچھ چکا تھا اور وہ تسلی بھرا جواب بھی دے  
چکی تھی ”لیکن عدیل کے انداز سے لگتا وہ مطمئن نہیں ہو سکا تھا۔

”کچھ چاہیے تو نہیں اگر بازار سے کچھ منگوانا ہو تو؟“ وہ عفت کو جاتے دیکھ کر پھر پیچھے سے پوچھنے لگا۔  
”عدیل! میں نے تقریباً“ سولہ سترہ لوگوں کے لیے ذر اور شام کی چائے کا انتظام کیا ہے اگر وہ آٹھ دس لوگ  
آ رہے ہیں تو سب کچھ ٹھیک ہے کافی ہے“ میرے خیال میں پھر مزید کیا منگواؤں اور میں۔“ آخر میں بولتے ہوئے  
وہ اس بے زاری پر اتر تکی جو اس کے لہجے کا خاصا تھا۔

”ہوں ٹھیک ہے پھر تو میرے خیال میں۔“ وہ اس کے لہجے سے کچھ خائف ہو کر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ عفت نے  
مزید کچھ نہیں کہا اور باہر نکل گئی مگر اسے دروازے کے پاس دو قدم ہی رکنا پڑا۔ عدیل کا فون پھر بج رہا تھا۔  
شاید کچھ اچھوٹا ہو جائے وہ لوگ نہیں آ رہے ہوں ان کا پروگرام کسی وجہ سے کینسل ہو گیا ہو۔

دل کی وہ کمی کسی سی خواہش جو عفت کو قدم قدم پر بھٹکا رہی تھی۔ اس خواہش نے پھر سے اس کے قدم  
جکڑے تھے مگر عدیل کال ریسیو کرنے کے بعد بہت بدھم لہجے میں بات کر رہا تھا یہ چیز عفت کو کچھ اور متحس  
کر گئی۔

اس نے دروازے کی اوٹ سے کال اندر کی جانب لگا دیے۔  
”ہوں مکمل ہے سب کچھ۔ تم پریشان نہیں ہو“ میرا دل اب کافی مطمئن ہے۔ مثال سے میری بات ہو چکی  
ہے۔ وہ دل سے راضی ہے اس رشتے کے لیے اگرچہ میرا وہم تھا واقعی کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔“

وہ رک کر دوسری طرف یقیناً ”بشری ہوگی جس کی بات بہت دھیان سے سننے لگا تھا عفت کے سینے پر جیسے  
سانپ لٹنے لگے۔ ان کی عشق و عاشقی تو شاید مرتے دم تک تمام نہیں ہوگی۔  
”تمنحوں دوسرے شوہر سے طلاق لے کر دوبارہ اس عدیل کے گھر میں کیوں نہیں آتی اپنے مثال اور عدیل  
کے پاس۔“ وہ جی میں جل کر وہ بات سوچنے لگی جس میں سراسر اس کا اپنا نقصان تھا۔

”نہیں پلیز“ میں بات کر چکا ہوں مثال سے اب تم بات کرو گی تو وہ پریشان ہو جائے گی۔ اسے لگے گا کہ ہم

دونوں اس پر اعتبار نہیں کر رہے۔ بشریٰ ہماری مثال واقعی میں ایک مثالی لڑکی ہے، بہت محبت کرنے والی، خیال رکھنے والی، صابر شاکر۔ اور عفت کو معلوم تھا مثال، ایک ایسا ٹاپک ہے عدیل کے پاس جس پر وہ گھنٹوں بغیر تھکے بات کر سکتا ہے۔

”آج وہ ہم سے رخصت ہو رہی ہے تو مجھے یوں لگ رہا ہے میں بالکل اکیلا ہو جاؤں گا۔“ وہ بہت آزرہ تھا۔  
”ہم تو جیسے مرچکے ہیں نایا شاید پیدا ہی نہیں ہوئے۔“ عدیل کے لہجے سے عفت نے جل کر سوچا اور دروازے کی اوٹ چھوڑ دی۔

اس جلن میں اور کتنا خود کو کھولائے جو تقدیر نے اس کی قسمت میں شادی کے دن سے لکھ رکھا ہے۔  
شادی والی رات ہی تو مثال اسے بری میں مل گئی تھی۔ اس نے پہلی رات بھی ایسے ہی چلتے کھولتے کڑھتے گزاری تھی اور پھر آنے والی بہت سی راتیں، جب عدیل اس کے پاس بیٹھا کبھی مثال کی باتیں کرتا اور کبھی مثال کے بہانے بشریٰ کے نام پر انک کر گھنٹوں کے لیے چپ چاپ بیٹھا تھا۔

”جتنا نہیں اللہ نے ان ماں بیٹی کی قسمت کہاں بیٹھ کر ایسی شاندار بنائی اور مجھ جیسی کرموں جلی کی کہاں۔ بیٹا پیدا کر کے بھی میں عدیل کے دل میں وہ جگہ نہیں بنا سکی، جو وہ بشریٰ اس مثال کو پیدا کر کے بنا چکی ہے۔“  
”میرے بچے بھی تو۔“ انہیں بھی مثال کی طرح باپ کو قابو کرنا نہیں آیا۔ والی ایسا نکلے گا۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا اور نہ صرف یہ والی ہی باپ کی کمزوری ہوتا تو آج اس گھر میں حالات بہت مختلف ہوتے۔ میں مثال کے لیے نہیں پری کے لیے آنے والے مسلمانوں کا بڑے جوش اور خوشی سے استقبال کر رہی ہوتی۔“

جانے کیوں اسے یہ رشتہ اپنی پری کے لیے چاہیے تھا۔  
وقار اور فائزہ کو پہلی بار ملنے کے بعد یہ یہ خیال اس کے دل میں گھر کر گیا تھا۔  
”میری بیٹی میں بھلا کس چیز کی کمی تھی؟“ حسان سے اتنی کوئی حور اور یہ مثال ہو نہ معلوم نہیں کیا دیکھا ان دونوں نے اس میں۔ ”وہ بڑ بڑاتی یکن میں چلی گئی۔“



مثال کانس کے گلابی کمر کے ہلکی شکنوں والے سوٹ میں پری تھیں لیکن پیاری لگ رہی تھی۔  
اس کے چہرے اور آنکھوں میں جیسے کوئی بولتی چُپ تھی، جو ٹھہری تھی، انہی کچن کے دروازے پر پہنچ کر وہ چند لمحوں سے دیکھتی رہ گئی۔ کتنا سوز ہے اس کے اس عام سے حسن میں!

وہ سوچ کر رہ گئی، مگر یہ سونہ کیسے آگیا اس کے چہرے پر، کیا اس نے کسی محبت میں محرومی جھیلی ہے۔  
”مجھے کھانا ملے گا یا نہیں میں نے دوبار کہلوا کر بھیجا ہے۔“ والی اندر آ کر مخصوص خیر لہجے میں بولا۔  
مثال کے چہرے پر بڑی پیاری مسکراہٹ ابھری تھی۔

”یہ دیکھو میں نے اپنے پیارے بھیا کے لیے کتنی زبردست ٹرے سجائی ہے، پاشا ہے گرم گرم پلاؤ، پالک پیئر، تورمہ اور نان بھی۔ یہیں آجاؤ یہیں شاباش میں میل پر رکھ رہی ہوں۔“ وہ جو ٹرے میں کچھ برتن رکھ کر کھانا نکال رہی تھی فوراً ہبشاشت سے بولی۔

”نہیں، مجھے اپنے روم میں کھانا ہے، بھجوادیں کسی کے ہاتھ۔“ وہ اپنی مخصوص رکھائی سے کہہ کر جانے لگا۔  
”والی! یہیں کھانا میرے پاس بیٹھ کر، مجھے اچھا لگے گا اور پھر دیکھو مجھے تو کچھ دنوں بعد سناں سے چلے ہی جانا ہے، مگر تم مجھے کچھ ٹائم دو گے تو مجھے اچھا لگے گا۔“ وہ لجاجت بھرے لہجے میں اس کا ہاتھ تھام کر کچھ ایسے بولی کہ



دانی فوری طور پر اس سے اپنا ہاتھ نہیں چھڑا سکا۔ متذبذب سا کھڑا رہ گیا۔ وہ اس کے ہاتھ پکڑے ٹیبل تک لے آئی۔ اور پھر خود جلدی سے بڑے اور دوسرے برتن لاکر اس کے سامنے میز پر رکھنے لگی۔  
 ”کیا لوگ؟ پہلے تمہاری پلیٹ میں کیا نکالوں؟“ وہ جوش سے کہہ رہی تھی۔  
 ”تھینکس میں لے لوں گا خود۔“ وہ قدرے نرم پڑ گیا تھا۔

”میں تمہارے پاس بیٹھ جاؤں گا کچھ دیر کے لیے۔“ وہ دونوں ہاتھوں کے کنوڑے پر اپنا چہرہ سجا کر پیار سے بولی۔  
 دانی نے کچھ چونک کر اسے دیکھا جیسے اس کے چہرے پر اس التفات کی اصل وجہ تلاش کر رہا ہو۔  
 وہاں ایسا کچھ نہیں تھا جس کے بارے میں عفت نے ہمیشہ اسے اور پری کو تار کھا تھا وہ یونہی سر ہلا کر خاموشی سے کھانے لگا۔ مثال اسے دیکھتی جا رہی تھی۔  
 ”جیسا ہے دانی! جب تم چھوٹے تھے تو میں تمہیں گود میں لے کر بہت پیار کرتی تھی تم پیارے ہی بہت تھے۔“ وہ دھیرے سے کہنے لگی۔

”اب پیار نہیں کرتیں یا میں پیارا نہیں رہا؟“ وہ کچھ ناپسندیدہ لہجے میں بولا۔  
 ”تم پیارے تو اب بھی بہت ہو اور میں تمہیں پیار بھی بہت کرتی ہوں، لیکن میں نے تمہارے لیے بہت سے خواب دیکھے تھے۔“ وہ کچھ حسرت سے بولی۔

”مما اور پاپا جیسے“ وہ نے کہا۔ وہ ہنس بھرے لہجے میں بولا۔  
 ”خواب دیکھنے کی بیماری تو نہیں ہے۔ یہ تمہیں کہاں سے لگ گئی۔“  
 باہر کھڑی عفت نے اپنا وزن دوسرے پاؤں پر ڈالا۔

”خواب تو ہر کوئی دیکھتا ہے دانی! تم نے بھی دیکھے ہوں گے کیا سوچا ہے تم نے اپنے بارے میں۔“ وہ بڑے طریقے سے اسے موضوع کی طرف گھیر کر لا رہی تھی۔ دانی کچھ ٹھنکا۔  
 ”کچھ نہیں ابھی۔“ وہ سرد لہجے میں کہہ کر کھانے لگا۔

”بھائی، سنو! کانچر ہوتے ہیں دانی! تم ابھی چھوٹے ہو، لیکن ماشاء اللہ سے تم سمجھ دار بہت ہو تم چیزوں کو بہت اچھی طرح سے سمجھتے ہو۔ میری شادی ہونے والی ہے چند سالوں میں بلکہ ایک دو سالوں میں پری کی بھی ہو جائے گی پھر ماما اور پاپا اکیلے رہ جائیں گے ان کے پاس صرف تم ہی تو ہو گے۔“ دانی نے چونک کر اسے دیکھا۔  
 ”ابھی تمہیں لگتا ہے کہ تمہیں ان کی ضرورت ہے، لیکن دانی صرف دو تین سالوں میں انہیں تمہاری ضرورت ہوگی اس لحاظ سے تم نے بنانا اور چلانا ہے پھر میں اور پری ماما پاپا سے زیادہ تمہارے فون کا انتظار کریں گے کہ کب دانی ہمیں فون کرے گا کہ آئی میں آپ کو لینے کے لیے آ رہا ہوں پلیز کچھ دن ہمارے ساتھ آکر رہیں ایسا کوئی فون مجھے آئے گا نا دانی۔“ وہ بہت یقین سے اس سے پوچھ رہی تھی باہر کھڑی عفت کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ دانی کچھ نہیں بولا۔

”جیسا نا دانی! میں انتظار کروں تمہاری ایسی کسی کال کا؟“ وہ اصرار بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔  
 ”پتا نہیں۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ وہ جانے کی بے بس ہوا تھا۔ کچھ لاچاری سے بولا۔  
 ”دانی تمہارے پیر دن بہت قیمتی ہیں۔ تم بڑے ہو رہے ہو اگر اس وقت کو کھو دو گے تو وقت بھی تم سے ہاتھ چھڑا کر آگے نکل جائے گا۔ تم پیچھے رہ جاؤ گے۔ پتا نہیں تمہیں اس بات سے کوئی فرق پڑے یا نہیں، لیکن دانی ہم سب میں ماما پاپا پری ہم اس نعم سے بہت تکلیف محسوس کریں گے کہ ہمارا دانی زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا ہے تم سمجھ رہے ہو ناں میں کیا کہہ رہی ہوں؟“

دانی پلیز! ہم تمہیں سب سے آگے سب سے کامیاب رکھنا چاہتے ہیں۔ پاپا جو کچھ نہیں کر سکے۔ تم وہ کر کے

دکھاؤ اور تم کر سکتے ہو، تم میں بہت انرجی ہے، بہت جذبہ ہے اور جذبہ سب کچھ کروا سکتا ہے۔ اگر تم نے کامیاب ہونے کا ارادہ کر لیا، اس ارادے پر ڈٹ گئے تو پھر ضرور کامیاب ہو گے۔ ”وہ رک رک کر کہہ رہی تھی۔  
 دانی بہت آہستہ آہستہ کھانا کھا رہا تھا۔ وہ مثال کی باتیں سن رہا تھا یا نہیں، لیکن کچھ سوچ ضرور رہا تھا۔  
 ”ہم سب تمہیں بہت کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں دانی! ماما تم سے بہت محبت کرتی ہیں، ہم سب سے زیادہ وہ صرف تم سے محبت کرتی ہیں۔ بیٹے ماؤں کی کمزوری ہوتے ہیں۔ پلیز تم انہیں باپوس نہیں کرنا۔“  
 اور عفت کا جی چاہا وہ وہیں کھڑے ہو کر وہاں سے مار کر رونے لگے۔ وہ اس لڑکی کو عمر بھر کیا سمجھتی رہی اور وہ جس طرح کی باتیں کر رہی تھی، یہ تو دل کی بہت اچھی ہے۔ عفت برجیسے انکشاف ہوا تھا۔  
 ”تم سوچو گے دانی! میری باتوں کو؟“ وہ اس کو اٹھ کر جاتا دیکھ کر ہنسی لہجے میں پوچھ رہی تھی۔  
 ”ہوں!“ وہ مختصر ”کہہ کر ہر نکل گیا مثال اسے جانا دیکھتی رہی۔“

\*\*\*

وردہ بری کو سارا دے کر گھر کے اندر لائی تو باہر کی طرف آنکھ ملے اختیار ٹھٹھا تھا۔  
 بری کے ماتھے پر چھوٹی سی بینڈیج تھی اور چہرے پر نقاہت سی!  
 ”کیا ہوا ہے تمہیں بری! تم ٹھیک ہو کہاں تھیں تم؟“ وہ کچھ بے چین کچھ خفا لہجے میں آگے بڑھ کر اس سے پوچھ رہا تھا۔  
 ”سوری انکل! یہ میرے گھر آئی تھی۔ ہمیں کچھ نوٹس ایجنسینج کرنے تھے کہ گھر آتے ہوئے ات چکر سا آیا اور یہ گر گئی تو اس کے یہ چوٹ سی لگی ہے۔ بٹ شی از فائن ڈاکٹر نے کہا ہے صرف ویک نہیں لی دج سے یہ گر گئی تھی۔“ وردہ کچھ رک رک کرتا رہی تھی عدیل پری کو دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔  
 اس کے ہاتھ پکڑ کر نرم سے انداز میں اسے اندر لے جانے لگا۔  
 ”اگر طبیعت زیادہ خراب ہے پری! تو میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں۔ کیا فیل ہو رہا ہے؟“ وہ غور سے دیکھتا تھا۔

”بابا! میں ٹھیک ہوں بالکل۔ کچھ دیر ریٹ کروں گی تو کافی بہتر ہو جاؤں گی۔ آپ پریشان نہیں ہوں۔“ وہ باپ سے نظریں نیچے کرتے ہوئے لہجے میں بولی۔  
 ”چلو پھر تم اندر جا کر آرام کرو۔ مثال! اسے اندر لے جاؤ یہ ریٹ کر کے آئی۔“ سامنے سے آتی مثال کو دیکھ کر عدیل نے کہا۔

مثال وردہ کو دیکھ کر ٹھٹھا جو کچھ آؤر ڈسٹا محسوس کرتے ہوئے اب مڑ کر واپس جانے لگی تھی۔  
 ”وردہ پلیز تم آ جاؤ میرے ساتھ میرے روم میں۔“ پری نے اسے مڑ کر پکارا تھا۔ وہ عدیل کی طرف دیکھنے لگی۔  
 ”نہیں پری! شام زیادہ ہو گئی ہے، مجھے اب گھر جانا ہے میری امی انتظار کر رہی ہیں تم ریٹ کرو میں فون پر تمہاری خیریت پوچھ لوں گی۔“ وہ کہہ کر جانے لگی۔  
 ”کچھ دیر بعد چلی جانا۔ ابھی آ جاؤ۔“ پری کے لہجے میں اصرار تھا۔

”وردہ! اگر پری چاہ رہی ہے تو تم پلیز آ جاؤ۔ تھوڑی دیر بعد چلی جانا۔“ مثال نے بھی اسے روکا۔  
 ”بابا! تمہیں چھوڑ آئیں گے تھوڑی دیر بعد۔“ پری نے جیسے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔  
 ”ٹھیک ہے بیٹا، آپ جاؤ ابھی پری کے ساتھ میں آپ کو کچھ دیر میں بھجوا دوں گا آپ کے کمر ڈوٹ وری۔“  
 بیٹی کی خواہش پر عدیل نے بھی اسے تسلی دی وہ کچھ تذبذب سی کھڑی رہی پھر سر ہلا کر پری کے ساتھ اندر کی طرف



بڑھ گئی۔ عدیل کے چہرے پر سوچ تھی وہ اندر چلا گیا۔



”بھئی! ایسا کچھ بھی نہیں ہے وہ بالکل ایک پاگل لڑکی ہے۔“ واثق ماں سے نظریں نہ اٹاتے ہوئے کوفت سے کہہ رہا تھا۔

”مگر اس کی حالت واثق۔۔۔“ عاصمہ کے لہجے میں عجیب شک سا تھا۔ واثق بے اختیار ٹھنکا۔  
”آپ۔۔۔ آپ کیا سمجھ رہی ہیں۔ اسی کیا میں آپ کو اس ٹائپ کا لگتا ہوں کہ۔“ وہ بولتے ہوئے رک گیا اس سے آگے کچھ بولا ہی نہیں گیا تھا۔  
عاصمہ کے لہجے نے اسے دکھ دیا تھا۔

”صرف میں نہیں واثق! اس طرح گھر میں کوئی بھی داخل ہوتا اور وہ جیسے فرش پر پڑی تھی۔“ عاصمہ بولتے بولتے ایک دم سے سر جھٹک کر خاموش ہو گئی۔

”اور تم کہہ رہے ہو وہ پاگل ہے۔ کیوں کس کے لیے؟“ عاصمہ آگے سے بولی تو واثق کو بہت برا لگا۔  
”ایک منٹ اسی! آپ کے دل میں جو بھی بات ہے وہ آپ مجھ سے چاہتے ہوئے بھی کہہ نہیں پا رہیں، پلیز وہ کہہ ڈالیں مجھ سے ہوں مجھے اچھے انداز میں بات نہیں کریں پلیز۔“ وہ دو لوگ لہجے میں ماں سے بولا۔ اس کی عادت ہی ایسی تھی وہ الجھاؤ کے مہستان سے ”شک سے دور بھاگتا تھا۔“  
”وہ کیوں آئی تھی یہاں؟“ عاصمہ اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”مجھے کیا معلوم وہ کیوں آئی تھی۔ میں نے جب اسے دیکھا تو وہ۔۔۔ اندر آچکی تھی دروازہ کھلا تھا مجھے معلوم نہیں تھا۔ دروازہ کا پوچھنے لگی میں نے بتا دیا۔ میں نے ہی اسے جانے کے لیے کہا جبکہ وہ۔۔۔“ وہ بولتے ہوئے رک گیا۔

”کیا وہ جانا نہیں چاہ رہی تھی۔“ عاصمہ نے اس کا دروازہ حائل جیسے پورا کیا۔  
”میں اسے یہاں رکنے سے منع کر رہا تھا۔ یہ مناسب بات نہیں تھی مگر وہ رکنا چاہ رہی تھی۔“ واثق کچھ بھربھرا انداز میں اعتراض کر رہا تھا۔ عاصمہ کو لگا۔ کچھ اچھا نہیں ہوا ہو گا۔ دونوں کے درمیان کچھ ایسی بات ضرور ہوئی ہے جو غلط تھی۔

”میں نے اسے منع کیا اور یہاں سے چلے جانے کو کہا یا ہر جاتے ہوئے اسے بلکے آیا اور وہ دروازے سے ٹکرا کر گر پڑی اور بے ہوش ہو گئی میں اسے ہوش میں لانے کے لیے پکار رہا تھا جب آپ اور وہ گھر میں داخل ہوئے تو۔۔۔“ بھی زندگی میں ایسا موقع نہیں آیا تھا کہ واثق کو یوں اپنے لیے صفائی دینا پڑی ہو۔  
مگر آج اسے یہ بھی کرنا پڑ رہا تھا۔

”اور امی! میں نے اسے سمجھانے کی کوشش بھی کی کہ اسے یوں اکیلے گھر میں نہیں آنا چاہیے۔ ٹھیک طریقہ یہی ہے کہ آدمی فون کرے کسی کے بھی گھر جائے سے پہلے کہ جس سے وہ ملے جا رہا ہے وہ شخص گھر میں موجود بھی ہے یا نہیں۔“ وہ کوفت سے کہہ رہا تھا۔  
عاصمہ کچھ نہیں بولی۔

”میں دیکھوں وہ ابھی تک نہیں آئی۔ میں نے کہا بھی تھا کہ میں ساتھ چلتا ہوں۔“ وہ جھٹلا کر ہر جانے لگا۔  
”واثق!“ عاصمہ نے اسے پیچھے سے پکارا۔ ”تم نے سارہ کے بارے میں کیا سوچا؟ سعدیہ کا فون آیا تھا۔ وہ کل ہماری طرف آ رہی ہے۔ سارہ بھی ساتھ میں ہوگی تم بھی مل لینا اس سے اور میں چاہتی ہوں یہ معاملہ بس اب



# ہر لمحہ ہر بار۔ مرحبا گل بہار

ہر لمحہ ہر بار۔ ہر بار گل بہار کی شربت پینے سے آپ کو تازگی اور صحت مند بنائے گی۔  
ہر بار گل بہار کی شربت پینے سے آپ کو تازگی اور صحت مند بنائے گی۔  
ہر بار گل بہار کی شربت پینے سے آپ کو تازگی اور صحت مند بنائے گی۔





نپٹ جائے ورنہ تو۔“ آخری الفاظ وہ منہ میں بھر مائی تھی۔  
 ”کیا مطلب ہے آپ کا۔ کس وجہ سے جلد سے جلد یہ معاملہ نپٹانا چاہ رہی ہیں آپ؟ کیا خوف ہے آپ کو؟“ وہ  
 تیز لہجے میں بولا۔  
 ”میں کسی کے زبردستی مجبور کرنے پر تو اپنی زندگی کا فیصلہ کروں گا نہیں، جو کوئی کچھ بھی سمجھتا ہے سمجھتا رہے،  
 اتنی ڈونٹ کیسے مجھے کسی سے نہیں ملنا۔“ وہ تیز تیز بولتا ہر نکل گیا عاصمہ سر پکڑ کر رہ گئی۔



درد کے چہرے پر ہوا سیاں اڑ رہی تھیں۔ اس کا منہ لحظہ بھر کے لیے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ پری اس کے چہرے پر  
 نظریں جمائے ہوئے تھی۔  
 ”تمہیں لگ رہا ہے، میں جھوٹ بول رہی ہوں۔“ پری اسی طرح نظریں جمائے ہوئے پر اعتماد لہجے میں پوچھ  
 رہی تھی۔

دردہ صرف ہلکا سا نفی میں سر ہلا سکی۔  
 ”میں نے کچھ نہیں کہا تھا صرف پسندیدگی کا اظہار اور میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس کا کچھ اور  
 مطلب نکالیں گے اور مجھے۔“ اور دھوری بات کے ختم ہونے سے پہلے وہ بے توازن آنسوؤں سے رو پڑی۔  
 اس کی نیلگوں ہلکورے لگی آنکھوں سے گرتے موتوں نے دردہ کے دل کی دنیا ہی بے سکون کر دی۔  
 ”پلیز۔ پلیز یوں مت رو پلیز پری۔ میں بات کرتی ہوں جا کر بھائی نے پوچھتی ہوں ان سے کہ انہوں نے  
 ایسا کیوں کیا؟ اپنی امی کو جاتی ہوں کہ انہوں نے یہ کیسی حرکت کر ڈالی ہے۔“ دردہ سخت جذباتی لہجے میں کہہ رہی  
 تھی۔

پری نے بے اختیار دردہ کے ہونٹوں پر اپنا نازک ہاتھ رکھ دیا۔  
 ”نہیں پلیز، تم کسی سے کچھ نہیں کہو گی۔ کچھ نہیں بولو گی۔ پہلے وعدہ کرو مجھ سے۔“ دردہ اس کی اس فرمائش پر  
 کچھ حیران رہ گئی۔  
 ”پری۔ کیوں۔“ وہ اسے سمجھانا چاہتی تھی۔

پری نے آنکھوں میں آنسو لیے شدت سے نفی میں سر ہلا دیا۔  
 ”پلیز نہیں، تم اس بات کو سمجھ سکتی ہو تم بھی لڑکی ہو۔ تم جانتی ہو۔ اس طرح کی بات اگر کسی لڑکی کے ساتھ  
 لگ جائے تو اس کی پوری زندگی تباہ ہو جاوے گی۔“ وہ شدید خوف زدہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔  
 اور دردہ کا جی چاہ رہا تھا۔ زمین پھٹے اور وہ اس میں غرق ہو جائے اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ  
 اس کا بھائی کچھ ایسا ویسا بھی کہہ سکتا ہے۔  
 وہ بس تم صمیمی پری کو دیکھتے جا رہی تھی۔

”میں نے تمہیں اس لیے روکا کہ میں خود کو سنبھالنا چاہ رہی تھی اگر میں یہ بات کسی سے نہ کرتی تو دردہ، تو یقین  
 کرو، میرا دل پھٹ جاتا اور اگر میں یہ بات کسی اور سے کر دیتی میرے ماما، بابا کو پتا چل جاتا۔ یا میری اسٹیپ سسٹر  
 مثال کو، تمہیں نہیں پتا وہ کتنی گھٹیا، نفی کیمنی ہے۔ اس نے سارے خاندان میں فون کر کے سب کو بتا دیا تھا،  
 وہ بہت خطرناک ہے اور مجھ سے تو اس کو خاص نفرت ہے کیونکہ وہ میرے جیسی حسین نہیں اور اسی وجہ سے وہ  
 مجھے ناقابل تلافی نقصان پہنچانا چاہتی ہے۔ پلیز تم سمجھ رہی ہوں میری زندگی کا دار و مدار تم پر ہے میری اچھی  
 دوست!“ وہ اٹھ کر اس کے کندھے پر سر رکھ کر ہلکے ہلکے کر رونے لگی۔

اور درود تو جیسے پتھر کے بت کی طرح سناکت ہو گئی تھی اس کے اندر غم و غصے کا طوفان اٹھ رہا تھا۔



”یہ کپڑے تم نے پنے نہیں ابھی تک میں نے بھجوائے تھے سلیمہ کے ہاتھوں وہ لوگ آنے والے ہیں مثال ابھی تم نے تیار بھی ہونا ہے۔“ عفت کمرے میں آکر اسے یونسی بیٹھے دیکھ کر کچھ خفا لہجے میں ناراض ہونے لگی۔ مثال کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

”یہ پری کہاں رہ گئی ہے عدل مجھے کہہ رہے تھے وہ اپنی سہیلی کے گھر سے آچکی ہے تو اب کہاں ہے کم از کم آ کر تمہیں تیار تو کر دے اسے میک اپ کرنے کا اچھا ڈھنگ ہے“ میں بھیبتی ہوں اسے۔ ”وہ کہہ کر جانے لگی مثال اسی طرح بیٹھی تھی۔

عفت جانتے ہوئے کچھ سوچ کر رہی۔

”کیا بات ہے مثال! تم اس طرح کیوں بیٹھی ہو۔ کوئی بات ہوئی ہے؟“ ابھی کچھ دیر پہلے جو کچھ اس نے دانی کے ساتھ مثال کی باتیں سنی تھیں۔ اس نے عفت کے دل میں مثال کی قدر بھادی تھی اگر دانی مثال کی وجہ سے کچھ بہتر ہو جائے تو کیا ہی اچھا! اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ خواب مثال سے ملے گی کہ وہ دانی کو کچھ وقت دے۔ ”نہیں کچھ نہیں مانا۔ میں تھیک ہوں۔“ وہ جیسے خود کو کمپوز کرتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

عفت اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”میں سمجھ سکتی ہوں تمہاری اذیت کو مثال! اس وقت ایک لڑکی کو جتنی ایک ماں کی ضرورت ہوتی ہے اور کسی وقت میں نہیں ہوتی۔“

وہ کہتے ہوئے آہستگی سے اس کے پاس بیٹھ گئی۔

”میں واقعی اتنی اچھی نہیں ہوں کہ تمہاری ماں کی جگہ سکوں حالانکہ میں کوشش کرتی ہوں کہ تمہارے ساتھ اچھا سلوک کروں اپنے بچوں جیسا نہ سہی لیکن کچھ بہتر لیکن مثال یقین کرو میں اس معاملے میں خود کو بے بس محسوس کرتی ہوں معلوم نہیں اللہ نے عورت کے دل میں اتنی وسعت کیوں نہیں دی کہ وہ دوسری عورت کو یا اس کی اولاد کو خوش قبول کر سکے اور جو عورتیں ایسا کرتی ہیں وہ بہت عظیم ہوتی ہیں۔ میں ایسی عظیم نہیں۔“

اس کے لہجے میں ملال تھا۔ تاسف اور کوئی گہری کیفیت جیسے وہ یہ سب مثال سے نہیں پری سے کہہ رہی ہو۔

”ماما! آپ بہت اچھی ہیں۔ مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں اور آپ کا دل بھی بہت بڑا ہے“ آپ نے مجھے قبول کیا ہے۔ میں اس کی گواہ ہوں۔ آپ نے مجھے اپنے گھر میں جگہ دی ہے مجھے بہت کچھ سکھایا اور ماما کی محبت ہوتی ہے جو ایک ماں ’ذمے دار ماں اپنی بیٹی کو دیتی ہے‘ آپ نے بہت اچھے طریقے سے میری تربیت کی ہے۔ آئی ریلی تھینک فل ٹو یو ماما۔“ وہ اٹھ کر اس کے گلے لگ گئی۔

”مثال! میری بیٹی! اللہ تمہیں اپنی زندگی میں بہت خوش و خرم رکھے میں اتنی اچھی نہیں ہوں۔ میں جانتی ہوں لیکن تم نے میرا مان رکھا۔“ وہ اسے پیار کر کے بولی۔

اور مثال کو پہلی بار عفت کا پیار بھرپور عجیب بہت اچھا سا لگ رہا تھا کہ بہت سال ہوئے بشریٰ نے بھی اسے کبھی اس طرح سے پیار نہیں کیا تھا۔

اس کے پیار میں بھی ایک خوف ایک ڈر ہوتا تھا کہ کہیں احسن کمال یا سیفی دیکھ نہ لیں کہ وہ مثال کو پیار کر رہی ہے۔

”اور میں تمہارے لیے دل سے دعا کروں گی کہ جیسی اچھی تم خود ہو ویسی تمہیں سسرال ملے۔ تم بہت خوش



رہو اور مثال! کوشش کرنا عدیل کو اب تمہاری طرف سے کوئی دکھ نہیں ملے۔“ اس نے آخر میں جوابات کی مثال لکھ بھر کو سن سی رہ گئی۔

اس نے دانستہ طور پر تو کبھی اپنے باپ کو غم زدہ نہیں کیا تھا۔  
 ”وہ پہلے ہی بہت دکھ جھیل چکے ہیں پہلے تمہاری ماں کی وجہ سے شاید تمہیں برا لگے مگر یہ حقیقت ہے مثال! اور تم سمجھ دار ہو تم سسرال میں اچھی زندگی گزار کر اپنے باپ کو خوشیاں دو گی۔ تم سمجھ رہی ہو ناں انہیں کوئی شکایت نہیں ملنی چاہیے تمہاری طرف سے۔“ اور مثال سر جھکا کر رہ گئی۔



فائزہ نے اسے اپنے بہت قریب کر کے بٹھایا ہوا تھا کہ فائزہ کے قیمتی لباس سے اٹھتی دل فریب محک جیسے مثال کے اپنے وجود سے پھونکنے لگی تھی۔

اس کی گریس غل ساس اسے بہت اعتماد سے ساتھ لگائے کسی ماں کی طرح جیسے سمیٹے ہوئے اسے پیار کر رہی تھی مثال اس کی محبت کے بوجھ سے کچھ اور جھکی جا رہی تھی۔

وقار اور فائزہ کے رشتہ دار خواتین مرد بھی کا تعلق بہت اچھے کھانے پینے گھرانوں سے تھا پری خوب تیار ہو کر کسی پری کی طرح سب کے چمچ میں چلتی پھر رہی تھی۔

عفت اسے فخریہ نظروں سے دیکھ رہی تھی کیونکہ مہمان خواتین میں سے دو تھیں بڑی میں خصوصی دلچسپی لی تھی۔

اور عفت کو یقین ہو چلا تھا کہ چند ہی دنوں میں پری کا بھی کیس بہت اچھا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

عفت کی اپنی شادی بہت دیر میں ہوئی تھی جب اس کے چچا کو اس کی شادی کی امید بھی ختم ہو چکی تھی عدیل کے رشتہ کسی نعمت سے کم نہیں تھا ان کے لیے۔ اسی وقت عفت نے دل میں سوچ لیا تھا کہ اگر اس کی بیٹی ہوئی تو وہ اس کی اولاد میں ہی شادی کر دے گی پہلے اپنے رشتے پر ہاں بول دے گی اور اب اسے اپنے دل کی خواہش بولی ہوئی نظر آرہی تھی۔

”وقار یا راجس دن تو بہت کم ہیں کیوں عفت! کم سے کم پچیس تاریخ تو ہو جائیں دن ٹھیک رہیں گے۔“ عدیل

وقار کی بات پر بولا۔  
 ”میسوں قند آ رہا ہے اس کی کل کی فلائٹ میں سیٹ چانس پر ہے مگر میسوں کی کنفرم ہے۔ وہ یہاں صرف ہیں دنوں کے لیے آ رہا ہے شادی کے بعد صرف آٹھ نو دن بچیں گے۔ مثال اور قند کے پاس ہنی مسون کے لیے۔

حالانکہ میں تو چاہ رہی تھی آپ! میں اسی مہینے کی کوئی تاریخ دے دیں۔“ فائزہ کی بات پر عدیل نے فوراً نفی میں سر

جلایا۔  
 ”نہیں نہیں بھابھی! اس ہفتے تو نہیں۔“ وہ فوراً بولا۔

”تو چلو پھر بارہ تاریخ کو جمعہ بھی ہے اور کچھ وقت باری کو بھی مل رہا ہے اس پر ڈن کرتے ہیں۔“ وقار محبت سے بولا۔

عدیل نے کچھ بے بسی سے عفت کی طرف دیکھا جو ہاں کرنے کا اشارہ کر رہی تھی۔  
 ”چلیں بھابھی جیسے آپ لوگوں کی خوشی۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔“ عدیل نے مسکرا کر کہا۔

”تھینک یو عدیل بھائی! ہمیں آپ کے گھر سے صرف مثال بیٹی چاہیے اور کچھ بھی نہیں۔“ فائزہ مثال کو پیار کرتے ہوئے بولی۔

وہ جب کمرے میں آئی تو بشریٰ کا فون بج بج کر خاموش ہو چکا تھا۔ مثال نے بھاری دھپٹہ سر سے اتار کر ایک طرف رکھا۔

”تو اما کو میرا اتنا خیال تو ہے کہ وہ اپنے گھر میں جہاں اس وقت گہری رات ہوگی۔ اپنے شوہر سے چھپ کر مجھے کال کر رہی ہیں۔“ وہ فون ہاتھ میں لیے سوچنے لگی۔

”اور واثق کیا اسے بھی میرا خیال آیا ہو گا۔“ وہ یونہی سوچنے لگی۔

”لیکن میں اس کے بارے میں کیوں سوچ رہی ہوں، تجھے اب واثق کو بھولنا ہو گا۔“ اس نے خود کو جھڑکتے ہوئے غیر ارادی طور پر کال لوگ میں دیکھنا شروع کر دیا۔

بشریٰ کے فون سے پہلے واثق کی مسئلہ کالز تھیں مثال کا دل بے اختیار دھڑکا۔ وہ اس سے غافل نہیں تھا۔ لیکن اس کی تپ رہا مثال کو مشکلات میں بھی ڈال سکتی ہے۔

اس نے کئی بار سوچا تھا کہ وہ واثق کا نمبر ڈیلیٹ (Delete) کر دے مگر پھر ایسا کرتے ہوئے اس کے ہاتھ رک سے جاتے۔

”میں شادی کی رات ضرور کروں گی“ دل کی فریاد پر اس نے آہستگی سے خود کو تسلی دی۔

بشریٰ کی کال پھر آ رہی تھی اس نے گہرا سانس لے کر کال ریسیو کر لی۔

\*\*\*

”عفت دس دن بست کم ہیں یا ریتاری کے لیے“ عدیل کے چہرے پر بہت دنوں بعد عفت نے سکون اور گہرا اطمینان سا دیکھا تھا ”اور دس دنوں میں تو کوئی اچھا ہوٹل بک کروانا بھی مشکل ہو گا۔“ اسے وہ سرا خیال آیا۔

”اور نہ توں کچھ نہیں ہو گا کہتے ہیں بیٹیوں کے کاموں میں اللہ خود دگر ہوتا ہے۔ ان شاء اللہ آپ دیکھیں گے“ سب کچھ بہت بہترین طریقے سے ہو جائے گا اور آپ کو بتا بھی نہیں چلے گا جیسے آج کالنگکشن ٹھیک ہو گیا بالکل جتنے آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے تھے۔“ عفت نے اسے عینے یاد کرایا۔

”ہوں ٹھیک کما تم نے واقعی میں کچھ پریشان تھا۔ مثال کا بلا کام ہے نا تو شاید اس لیے۔ بس میری بیٹی بہت خوش رہے۔“ زیادہ میرے دل میں اس کے لیے اب صرف دعا ہے عفت! میری مثال نے بہت دکھ دیکھے ہیں بچپن کی مفصوم محرومیاں جو گہرے عم بن جاتی ہیں پھر بھی اس نے بھی کوئی شکوہ نہیں کیا نہ مجھ سے نہ بشریٰ سے بہت صبر کرنے والی لگی ہے مجھے یقین ہے اس کی اگلی زندگی بہت اچھی ہوگی۔“

وہ مثال کے بارے میں بات کرتے ہوئے ہمیشہ کی طرح بھول چکا تھا کہ وہ یہ جذباتی باتیں کرتے ہوئے عفت کے جذبات کو نہیں پہنچا رہا ہے عفت بالکل خاموش تھی۔

\*\*\*

اور پھر دن تو جیسے پر لگا کر اڑنے لگے۔ فمد کی فمد تیسرے دن کی رات کو تھی۔

عفت اور عدیل اسے ایئر پورٹ پر لینے گئے تھے۔

دونوں ہی بہت خوش واپس آئے تھے یقیناً ”فمد ہی ایسا لگا تھا جو مثال کے قابل ہو سکتا تھا۔“

اتنا ہینڈ سم و جبکہ مسجد بردبار سافند عدیل کو دل سے پسند آیا تھا عفت اب کی بار صرف رشک کر سکی تھی۔

مثال اب اس گھر سے جانے والی تھی شاید اس لیے اس کے خیالات مثال کے لیے کافی حد تک بدل چکے تھے۔

پھر مثال نے اب والی کو خود بخود عفت کے کمرے کے بغیر ہی بہت وقت دینا شروع کر دیا تھا۔

وہ اکثر اب مثال سے ارد گرد منڈلاتا نظر آتا تھا۔ گھر میں بھی وقت دینے لگا تھا۔ اس کا دوسرے اسکول میں



ایڈیشن ہو گیا تھا۔ اس نے کوئی بھی اعتراض کیے بغیر اسکول جانا شروع کر دیا تھا۔  
عفت اور عدیل کو لگ رہا تھا اس نے خود کو سدھار لیا ہے۔ وہ اب اچھا خاصا سمجھ دار لگ رہا تھا۔  
عفت مثال کے اس کردار سے خوش تھی اور فمد کو دیکھ کر اس کو بھی خوشی ہی ہوئی۔



”آپ دیکھیں تو کتنی زبردست Pics ہیں فمد بھائی کی۔“ دانی عفت اور عدیل کے ساتھ فمد سے ملاقات کر کے آیا تھا اور اپنے موبائل میں کچھ تصویریں بھی اس کی لے کر آیا تھا۔  
”یہ Pics ہیں۔ آپ کو بھیج رہا ہوں تمہاری میں دیکھیے گا بہت ہینڈ سم ہیں فمد بھائی!“ وہ شرارت سے بولا۔  
مثال صرف مسکرا دی۔

وہ عفت کے ساتھ صرف دو تین بار ہی بازار گئی تھی۔ یہ بہت تھکا دینے والا کام تھا۔ اس نے عفت کو منع کر دیا کہ وہ اب سب کچھ خود خرید لے لگی۔ دانی کا نیا اسکول بے سلیبس بھی مختلف ہے ہمیں اسے کچھ ٹائم دے رہی ہوں۔ یہاں آپ کے ساتھ اتنی شاپنگ کے لیے تو اس کا بہت خرچ ہوتا ہے۔“ اور عفت کو بھلا اور کیا چاہیے تھا۔

وہ مثال کی شادی کے شاپنگ کے بہانے ہر چیز ڈبل خرید رہی تھی پری کی بھی شادی کی ابتدائی شاپنگ تو وہ کر ہی چکی تھی۔

عدیل مثال کی شادی پر دل کھول کر خرچ کر رہا تھا اور عفت اس سے فائدہ اٹھا رہی تھی۔  
”کل کھانے پر بلا یا ہے میں نے فمد کو۔ فائزہ اور وقار کے ساتھ اس کی دعوت بھی ہو جائے گی اور میں چاہتا ہوں مثال اور فمد ایک دوسرے سے مل بھی لیں۔“ عدیل نے رات کے کھانے پر اعلان کیا۔  
”اچھا کیا آپ نے عفت آج کل ہر طرح سے عدیل کی ہمسفر بنی ہوئی تھی فوراً“ تائید کرتے ہوئے بولی۔  
”پاپا! چھ دن تو رہ گئے ہیں شادی میں سب بھلا آئی کیا کریجیوگی فمد صاحب کو دیکھ کر نہ ہاں نہ ناں نہ کری مذاق اڑانے والے انداز میں ہنسی۔

عدیل اور عفت نے اسے تیز نظروں سے دیکھا تو وہ سر جھکا کر کھانا کھانے لگی مثال تو پہلے ہی سر جھکا کر بیٹھی تھی۔



”وردہ کیا کہنا چاہتی ہو کھل کر کہو۔“ عاصمہ کچھ سخت لہجے میں بولی وہ کئی دنوں سے ٹوٹ کر رہی تھی کہ وردہ کچھ پریشان سی عاصمہ سے کچھ کہنا چاہتی ہے مگر کہہ نہیں پا رہی۔ آج عاصمہ نے اس کو پاس بٹھا کر پوچھ ہی لیا تو وہ سرسری بات کر کے خاموش ہو کر بیٹھ گئی۔  
عاصمہ کچھ چونک سی گئی۔

”میں نہیں کہہ سکتی ممما! بات کچھ ایسی ہے کہ میں سوچ بھی نہیں سکتی تو زبان پر کیسے لاؤں۔“ وردہ نظریں جھکا کر ہوئے سے بولی۔ عاصمہ جیسے شک میں آ گئی۔ تو گویا بات بہت سیریس ہے۔  
”اب تمہیں مجھے صاف بتانا ہو گا کیا بات ہے۔“ وہ اس کا رخ اپنی طرف کرتے سختی سے بولی وردہ بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”امی۔“ دانت بھائی نے پری کے ساتھ بہت برا کیا ہے“ اور عاصمہ ششدر سی رہ گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

  
**Goldenpearl**  
Beauty Follows

آپ جاں جدم  
شہر جائے نظر





## قوة العين خرم باغی



اماں کی سوچوں پہ سالوں پہلے کی تحسین طاری  
ہونے لگی تھی۔ ماضی کے ادھ کھلے دروازے میں سے  
بہت سی پرچھائیاں سامنے آکر کبھی چھپ رہی تھیں،  
کبھی ایک دوسرے میں مدغم ہو رہی تھیں۔ اسی لیے  
جب ”مغورت“ بن کر سوچا تو بیٹا بھی ”مرد“ نظر آیا اور  
مرد کی فطرت کے سب رنگوں سے واقف تھی وہ مگر  
یہ کیفیت سوزی دیر ہی رہی۔ دوبارہ سے اپنی جون میں  
واپس آتے ہوئے وہ اب سانس بن کر سوچتی اپنی بسوکی  
چالاکیاں پہ کڑھ رہی تھیں۔

”مہسنی! گھنٹی! جادو کرنی! ابھی شادی کو دو ماہ ہی  
ہوئے ہیں، پہلے میرا پتر مہینے میں ایک بار چند آتا تھا اور  
اب ہر ہفتے دوڑا چلا آتا ہے۔ ضرور تنوید کئے ہوں  
گئے“ اماں نے بڑبڑاتے ہوئے کروٹ لی تھی اور چادر  
سر تک تان کر سونے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ جبکہ  
پھٹ کے اوپر شملتے ہوئے ہونٹوں پہ شرمیلیں  
مسکراہٹ لیے دوہنا کا کونا انگلیوں پہ لپیٹتے وہ گنگنا رہی  
تھی اور اس کے قدم سے قدم ملا کر چاندنی رات کے  
جادو میں کھویا، اس کے چہرے کو چھوٹی شرمیلیں کو  
دیکھتا وہ دھیرے سے مسکرا رہا تھا۔ جو خود میں گنگنا  
رہی تھی۔

تو جو چھوٹے پیار سے

آرام سے مریاؤں

آجائندہ امانوں میں

تجھ میں ہی گم ہو جاؤں میں

تیرے نام پہ کھو جاؤں میں

سیاں۔۔۔

”شرم ہی مک گئی ہے آج کل کی لڑکیوں میں۔“

صدر راہوے بو ہے  
دبے میں تیرے لیے کھولے  
ہوئیں نہ تو کدی آنکھیاں تو اوے  
تیرے نال ترنا تیرے نال ڈینا  
تیرے نال جینا تیرے نال مرنا  
پیار میرا تو نگری تے قول نا  
اک دل سی رہا میرے کول نا  
وے میں لنی گئی  
ڈھولنا وے میں لنی گئی

ہوا کے دوش پہ لہرائی چاندنی رات کے فسون میں  
ڈوبی دل کو چھوٹی آواز پہ، اماں نے کروٹ لی اور چٹ  
لیٹ کر دور آسمان پہ چمکتے ستاروں کو دیکھنے لگی۔ اوپر  
پھٹ سے آتی آواز بہت واضح تھی۔  
لایاں لایاں میں تیرے نال ڈھولنا  
اک دل سی رہا میرے کول ناں  
وے میں لنی گئی ڈھولنا۔

”بک باہ! اپنی آواز کے جادو میں باندھ رہی ہے  
میرے پتر کو۔“

اماں نے چاندنی رات کے فسون اور اس کی آواز  
کے سحر سے نکلے ہوئے خود کھائی کی تھی۔ ہر ماں کی  
طرح اسے بھی اپنا بیٹا بہت معصوم اور سیدھا سادہ سا  
لگتا تھا۔

”سب شروع شروع کے چاہ ہوتے ہیں، جب تک  
مرد کو توجہ اور محبت ملتی رہے۔ وہ اسی طرح چمکی ڈور  
سے بندھا کھینچا چلا آتا ہے اور عورت و چاری یہ جھتی  
رہتی ہے کہ وہ اس کی محبت میں کھینچا چلا آتا ہے۔ بھلا  
مرو نے اپنے آپ سے زیادہ بھی کبھی کسی کو چاہا ہے؟“





اماں نے گانے کے آخری بولوں پہ استغفار پڑھتے  
 ہوئے حسب عادت ہو کو کو سا تھا۔ جو چیز سے بے  
 پروا اپنی محبت کے سنگ ہو میں اڑ رہی تھی۔  
 اختر نے آستین کے بن بند کرتے ہوئے مصروف سے  
 انداز میں صحن میں آکر کہا تھا۔ اماں جو چارہ اٹھائے  
 جانوروں کے باڑے کی طرف جا رہی تھی۔ ایک دم  
 سے ہی ٹھٹک کر رک گئی۔

”اچھا۔۔۔ اسی لیے صبح سے کمرے میں تھسی ہوئی  
 ”اماں! میں بانو کو اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔“



”اماں! فکر مت کر، مجھے آتا ہے، اپنی دوہٹی کو سیدھا کرنا۔ ابھی تو جانے دے، پکے ہی دیر ہو گئی ہے۔“

اختر نے جلدی سے کہا اور بانو کو آواز دینے لگا۔

”آئی جی۔۔۔“ اندر سے جھٹ پٹ سرخ جوڑے میں تیار، بنی سنوری، ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ اور کاجل بھری آنکھوں میں چمک لیے، پراندے کو جھلاتی، بانو کو آتا دیکھ کر اماں کا منہ ایسے بن گیا جیسے راتوں تلے کڑوا بادام آگیا ہو۔

”وے جھلیا، اس شوخی کو شر لے جا کر اتنا خرچا کرنے کی کیا لوڑ (ضرورت) ہے۔ خود تو۔۔۔ تو اپنے پیار دوستوں کے ساتھ رہتا ہے۔ اس باندری کو کہاں رکھے گا وہ دن۔“

اماں کے ”باندری“ کہنے پر بانو سگ کر رہ گئی تھی۔ مگر اختر کے سامنے اماں کو جواب دے کر وہ کوئی تماشہ نہیں لگانا چاہتی تھی۔ اس لیے منہ بنا کر رہ گئی تھی۔ جبکہ اماں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح ہستی مسکراتی، بچی سنوری بانو کو روک لیں۔ ہر سانس کی طرح، اماں کو بھی ہو گندے چیلے میں گدھوں کی طرح دن رات کام کرتی ہی اچھی لگتی تھی۔

اب سرخ جوڑے میں چمکتی دھمکتی، شریاتی بیو، اماں کے اندر کی ساس کو کانٹے کی طرح چبھ رہی تھی اور ایسے کانٹے نکالنے کی کوشش ہر سانس بخوشی کرتی ہے۔ اماں بھی یہی ہی کوشش کر رہی تھی۔

”لوہو اماں! آپ کو کوئی دیکھنا چاہیے تھا۔ ہریات پہ جرح، ہریات پہ تنقید۔ اتنا بے وقوف نہیں ہوں، سب سوچا ہوا ہے۔ وہ دن ہم خالہ رقیہ کے گھر نہیں گئے اور تو کھڑی کیا دیکھ رہی ہے۔ جلدی سے چادر اوڑھ کر آسے۔ یہ نہ سمجھ کہ شہر لے کر جا رہا ہوں تو شہر دانوں کی طرح اپنی عورت کو کھلے منہ اور ننگے سر لیے لیے پھروں گا۔“

اختر نے اماں کا غصہ بانو پر اتارتے ہوئے تکیے لہجے میں کہا تھا تو وہ گھبرائی ہوئی ”جی اچھا“ کہتی تیزی سے

ہے مہسنی۔“

اماں نے بانو کو تصویر میں سامان باندھتے ہوئے دیکھا تھا۔ اماں کے ہاتھوں سے چارہ چھوٹا اور قدموں کے پاس ڈھیر ہو گیا اور اماں بھی وہاں ہی بیٹھ کر سر پہ ہاتھ رکھ کر اونچی آواز میں رونے لگی۔

”ہائے وے لوگوں، دیکھو کیسے میرا کون اک (اکھوتا) معصوم پتر چھین لیا۔ اس گھنی مہسنی، جادو گرئی نے۔ کالی ٹاگن جیسی زلفوں کا جادو ہی لم نہیں تھا۔ اوپر سے میٹھی آواز میں گانے سناتا کرمت ماردی ہے میرے پتر کی جو اس برصا پے میں بوڑھی ماں کو اکیلا چھوڑ کر بیوی کو لے کر ہمیشہ کے لیے شہر جا رہا ہے۔“

”الف اماں! کیا رولڈ مال رہی ہو۔ میں بانو کو شہر دکھانے لے جا رہا ہوں۔ وہ دن کے لیے ہمیشہ کے لیے نہیں جا رہی وہ۔ اب بس بھی لے کر یہ رونا دھونا۔ کیا سارا پنڈ اکٹھا کر دو گی۔“

اختر نے جھنجھلاتے ہوئے کہا تھا۔ وہ غصے کا تیز تو تھا ہی، کچھ اماں کے بے جا لاڈ پیار نے مزید خندی اور خود سر بنا دیا تھا۔ فطرتاً جلد باز، اپنی کہنے اور کرنے والہ، اس لیے ابھی بھی اماں سے اجازت لینے کے بجائے مطلع کرتا ہی کافی سمجھتا تھا۔ اماں بھی اس سے دیتی تھی۔ ابھی بھی اختر کی تیوری چڑھی دیکھ کر اور دو دن کاسن کر دل کو کچھ تسلی ملی تو اماں ایک دم سے چپ کر گئی۔ پھر لہجے میں نرمی سمجھ کر بولی۔

”میں تو تیرے بھلے کے لیے کہہ رہی تھی۔ شہر کی ہوا نکلے ہی اچھی بھلی زنانیوں کے دماغ خراب ہو جاتے ہیں اور تیری دوہٹی تو ویسے ہی ناک پر کبھی نہیں بیٹھتی دیتی، شہر جا کر تو اور دماغ آسمان پہ پڑھ جائے گا۔“

اماں نے ہاتھوں سے بکھرا ہوا چارہ سینے سے ہٹا کر کن اکھیوں سے سفید کلف لگے سوٹ میں تیار کھڑے اختر کو دیکھا تھا۔ جو واپس پلٹتا ہوا ایک دم رک گیا تھا۔



بارے میں سب کو بتانا بھی ضروری تھا نہ۔ یہ سوچ کر  
اماں کے قدموں میں مزید تیزی آگئی تھی۔



جیلہ (اماں) شادی کر کے اس گاؤں میں آئی تھی  
اور تب سے اب تک وقت کی ہر تختی و نرمی کو برداشت

کرتی، خود پہ سستی آج وہ برہمچارے کی دہلیز پر کھڑی تھی۔  
اس گاؤں سے انسیت اور پیار اپنی جگہ تھا۔ مگر گاؤں  
کے لوگوں کے ساتھ بنا محبت اور خلوص کا رشتہ وقت  
گزرنے کے ساتھ ساتھ مزید مضبوط ہوا تھا۔

اماں کی ساری زندگی سخت محنت اور مشقت کی جنگ  
میں رہتے ہوئے گزری تھی۔ شادی کے وقت جہاں  
اس کے گالوں سے قدرتی لالی اور ہونٹوں سے بات  
بے بات ہنسی پھوٹتی تھی۔ گزرتے وقت کے ساتھ  
سب وقت کی دھول میں دنیا گم ہو کر سیاہ صفت  
اور ہر چائی نکلا۔ چار سال کے اختر کو جیلہ کے سرو  
کر کے اپنی نئی دنیا بسائی اور دوسری شادی کرنے کے  
بعد کبھی پیچھے مڑ کر واپس نہیں دیکھا تھا۔ جیلہ کی عمر  
اس کی چاکری کرتے اور طعنے سنتے گزرنے لگی تھی۔  
جیلہ کی ساس کو اپنی بسوہی غلط لگتی تھی۔ جس کی  
کیوں اور خامیوں کی وجہ سے تنگ آکر اس کے بیٹے  
نے دوسری شادی کر لی تھی اور اپنی ماں کو بھی بھول بیٹھا  
تھا۔ جب تک وہ زندہ رہی جیلہ کا جینا حرام سمجھا  
رکھا۔ جیلہ بھی خاموشی سے سر جھکائے اس الزام کو  
سنتی اور برداشت کرتی رہی۔ اختر اماں کا لاڈلا ضرور تھا،  
مگر جہاں جیلہ اپنے غصے یا جلال میں آجاتی وہاں اختر  
بھی دبا کر رہ جاتا تھا۔

اختر کی شادی اماں (جیلہ) کی اپنی پسند ہوئی تھی۔  
اختر شہر کی کی فیکٹری میں ملازم تھا۔ خواہ اتنی نہیں تھی  
کہ الگ سے کرائے پر گھر لے کر اماں یا بیوی کو اپنے  
ساتھ رکھتا۔ اسی لیے پانچ اماں کے ساتھ گاؤں میں ہی  
رہتی تھی اور اختر کے آنے کے دن گنتی تھی۔ اختر بھی  
ہر ہفتے بھاگا چلا آتا۔ اماں دونوں کی بے قراری دیکھ کر

اندر کی طرف بھاگی تھی۔ بیٹے کے سخت لہجے سے اماں  
کے دل کو کافی تسکین ملی۔ جلدی سے پاس آکر بولی۔

”اچھا کیا ہے ابھی سے اس کی اوقات سمجھا دی  
ہے۔ ایسا کرتی ہوں میں بھی تم لوگوں کے ساتھ چلتی  
ہوں۔ بہن رقیہ سے ملے مجھے بھی کافی ٹیم ہو گیا ہے۔“

بڑی یاد آتی ہے نہ مائی۔“

اماں نے چالاکی سے کہتے ہوئے آخر میں لہجے میں  
مصنوعی دکھ سمو لیا تھا۔ رقیہ اماں کی خالہ زاد بہن تھی  
جس سے اماں کی کبھی بھی نہیں بنی تھی۔

”اماں! آپ بھی حد کرتی ہیں۔ پیچھے گھر کی رکھوالی،  
جانوروں کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ اور ویسے بھی خالہ  
رقیہ سے بھی آپ کی بنی نہیں ہے۔ میرے دیاہ پتہ بھی  
خوب تماشے لگائے تھے آپ دونوں نے۔ آج تک  
میرے یار رہتے ہیں مجھ سے۔ اچھا اب ہم چلتے ہیں۔ رب  
راکھا۔“ اختر نے پانو کو آتے دیکھ کر جلدی سے اماں  
سے رخصت چاہی تھی کہ کہیں وہ کوئی اور بات لے کر  
نہ بیٹھ جائے۔

اماں نے برے برے منہ بناتے ہوئے دونوں کو  
جائے ہوئے دیکھا اور بے دلی سے چارہ اٹھائے  
جانوروں کے باڑے میں چلی گئی۔

”بک باہ! ساری حیالی اس کے پو (باپ) سے چھتر  
کھائے ہیں اور اب چر بھی زن مرید نکلا۔ ہائے دے  
سو خیار با میرے نصیب!“

اماں نے بھوریے رنگ کی بھینس کو چارہ ڈالتے  
ہوئے خود کھامی کی تھی۔ جلدی سے اپنی کام پٹائے اور  
چادر اوڑھ کر گھر سے باہر نکل گئی۔ دسپہر کے وقت مائی  
جیراں کے تندور پہ سب عورتیں روٹی لگائے کے  
بہانے اکٹھی ہوتی تھیں اور سولی لگانے کے ساتھ  
ساتھ ساری اندر باہر کی اہم خبریں یہاں ہی ایک سے  
دوسرے تک پہنچائی جاتی تھیں۔ مائی جیراں اس گاؤں  
کی ”وکی لیکس“ تھی۔ ساری اہم اور اندر کی خبروں کو  
دیائے عین وقت پر بھانڈا پھونڈنے میں ماہر۔

اور میسنی، گنتی جاو گرنی بسو کے نئے دار کے



بہت شوق ہے۔ اسی لیے اپنے ساتھ لے کر آیا ہے۔  
سب قلم مار کر ہنس پڑے تھے۔ غفلت سے بانو کا چہرہ  
سرخ پڑ گیا تھا اور اس نے دل میں بے اختیار سوچا تھا۔  
”اس سے اچھی تو میں پنڈ میں ہی تھی، جہاں میری  
اہمیت اور وقعت تو تھی نا، یہاں آکر تو اختر کی نظرس  
نیلو فر سے ہی نہیں ہٹ رہی تھیں جو خود بھی تھلی کی  
طرح اس کے ارد گرد منڈلا رہی تھی۔ بانو نے بہت  
ناگواری سے اس منظر کو دیکھا تھا۔



”تیری نو (سو) تو بہت تیز نکلی۔ شکل سے تو بھولی  
بھالی سی لگتی ہے۔

رشیدہ نے سب سے پہلے تبصرہ کرنا اپنا فرض سمجھا  
تھا، کیونکہ وہ خود بھی شبنم تین بسوؤں کی ستا کی ہوئی  
بظاہر مظلوم ساس تھی۔ مگر درحقیقت اس نے اپنی  
بسوؤں کا جینا حرام کر کے رکھا ہوا تھا اور اسی بات کے  
طعنے اہاں (جیلہ) بہت زور و شور سے مارتی تھی۔ آج  
رشیدہ کو موقع ملا تھا تو وہ بھلا کیسے چھپے رہتی۔  
”شکل سے تو تو بھی بہت مسکین سی لگتی ہے، مگر  
کنوں کی پوری ہے۔ اسی لیے تو تیری نواں (بسو)۔  
”نے روز انکر میسے لگی ہوئی ہیں۔“

اہاں نے حساب برابر کرتے ہوئے کہا تو پاس بیٹھی  
باقی عورتیں ہنس پڑیں۔ رشیدہ کا بارہ چڑھ گیا۔  
”وکیجہ جیلہ! میرے منہ مت لگیو! تیرے سر کن اتنے  
چنگے ہوتے تو تیرا بندہ تجھ پہ موت کیوں لاتا؟ حالانکہ  
بیٹے کی ماں تھی تو مگر اس نے مرتے دم تک اس بانجھ  
عورت کے ساتھ زندگی گزار دی۔ کبھی پلٹ کر نہیں  
آیا اور تو یہاں اکیلی بڑی ساس کی جوتیاں کھاتی رہی۔“  
رشیدہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ہاتھ نہالتے ہوئے  
کہا تو اہاں کا رنگ فق ہو گیا۔ سب جانتے تھے کہ یہ اہاں  
کا کمزور پہلو تھا جس پہ وہ چاہ کر بھی کسی سے بات نہیں  
کرتی تھی۔

”کیا ہو گیا ہے رشیدہ! نواں (بسوؤں) کی باتیں

بھی تو ہنس پڑتی اور کبھی منہ پینا کر رہ جاتی تھی۔ بانو  
جس کی ہر ممکن کوشش ہوتی تھی کہ اختر کے آگے  
پچھے رہے، ایسے میں اسے بات بے بات نوکتی ماں اسے  
بہت بری لگتی تھی۔ اسے ان کا وجود بری طرح کھٹکتا  
تھا۔ دراصل دونوں ہی ساس اور سو کے روایتی رشتوں  
کو بخوبی بھاری تھیں۔

بانو، اختر کے التفات، محبت اور شدتوں پہ اترا لئی

پھرتی تھی اور اہاں کے منہ کے منہ بگڑتے زاویے  
اسے بہت تسکین دیتے تھے۔ اس کے لیے یہ بار جیت  
کا کھیل بن چکا تھا۔ گمراہ یہ نہیں سمجھتی تھی کہ شوہر کی  
ماں سے بار جیت کا نہیں، بلکہ عزت و احترام کا رشتہ بننا  
تھا۔ ان رشتوں میں جیت تو کسی کی نہیں ہوتی ہاں مگر  
بار دونوں کے حصے میں ضرور آتی ہے۔



شہر کی عورتوں کے ننگے اور کھلے جسم پر تنقید کرنے  
والا اختر خالہ رقیہ کی اوا میں دکھاتی، قہقہے لگاتی بیٹیوں  
کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے ہوئے چادر میں سر کی گھسیٹنی  
بیوی کو بھولے بیٹھا ہوا تھا۔ اندرون لاہور کی  
تنگ و تاریک گلیوں میں واقع اس دو منزلہ  
مکان میں خالہ رقیہ اپنی آل اولاد کے ساتھ

— رہائش پذیر تھیں۔ تینوں بیٹے شادی شدہ اور بال  
بچوں والے تھے۔ بڑی بیٹی نیلو فی شادی کے کچھ عرصے  
بعد ہی طلاق لے کر واپس آ گئی تھی۔ اس سے چھوٹی دو  
بہنیں بھی اچھے رشتوں کی تلاش میں بیٹھی ہوئی  
تھیں۔

تنگ و تاریک کمرے اور بھانت بھانت کے لوگ  
اور آوازیں، بانو کچھ دیر میں ہی گھبرا گئی تھی۔ اور یہ  
خالہ رقیہ کی تینوں بیٹیوں کے انداز و اطوار اسے مزید  
پریشان کر رہے تھے۔ خاص کر نیلو فر کی بے تکلفی اور  
التفات اسے ایک آنکھ نہیں بھار رہے تھے۔ بانو کے  
کپڑوں سے لے کر اٹھنے بیٹھنے تک کو مذاق کا نشانہ بنایا  
جا رہا تھا اور اختر کی زبانی یہ سن کر کہ اسے شرم دیکھنے کا



کرتے کرتے ایک دوسرے کی ذات پہ کیوں حملہ کر رہی ہو اور جس کی مثال تو نے دی ہے کیا تو نہیں جانتی کہ ایک نمبر کا ہر چائی تھا وہ نیک اور شریف عورت اسے اس میں آئی تھی۔

صغراں ماسی نے رشیدہ کو بھاڑتے ہوئے کہا تھا وہ گاؤں کی بڑی بوڑھیوں میں شمار ہوتی تھی۔ سب اس کی عزت کرتے تھے۔ صغراں ماسی نے اماں کا اڑانگ اور آنکھوں میں پھیلتی نمی دیکھ لی تھی۔

”آپ۔۔۔ میں بھول گئی۔۔۔ دودھ کڑھنے کے لیے رکھ کر آئی تھی۔ کیس ابل نہ گیا ہو۔ میں چلتی ہوں۔“

ایک دم اماں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے تیزی سے کہا اور بغیر کچھ سنے واپسی کی راہ لی۔

”کر لو گل۔۔۔ ابھی مجھے کمرہ ہی تھی کہ تیرے ہاتھ کا ساگ کھائے کافی وقت گزر گیا ہے۔ میں نے بھی کہا کہ آج میرے ساتھ روٹی کھا۔ میرے نون (سو) نے ساگ بنایا ہے۔ اب و چاری بھوکی ہی چلی گئی۔ نا نہیں گھر میں بھی کچھ بنایا ہو گا یا نہیں۔ پیچھے ہے کون جس کے لیے بنا کر آتی۔ اکیلی جان اپنے لیے کیا تردد کریں بھلا۔ مگر منے کے ہاتھ بھجوا دوں گی۔“

صغراں ماسی نے افسردگی سے خود کھای کی تھی۔

رشیدہ نے شرمندگی سے سر جھکا لیا تھا۔ اماں (جیلہ) کی آنکھوں میں نمی وہ بھی دیکھ چکی تھی۔ اس نے جلدی سے گرم روٹیاں پکڑے میں لپٹیں اور گھر کی راہ لی۔

”مجھے پتا تھا۔ تو نے ابھی تک روٹی نہیں کھائی ہوگی“ آج کل بنایا ہے وہی گھی میں۔ تیرے لیے

خاص طور پر لے کر آئی ہوں۔“

رشیدہ نے چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے کہا تو اماں نے ہوتے چہرے کے ساتھ آہستہ سے بولی۔

”رشیدہ! رہنے دیتی۔ مجھے ویسے بھی بھوک نہیں ہے۔“

”چل نی۔ مخول مت کرا تیرے بغیر میرے حلق سے نوالہ کیسے اتر سکتا ہے۔ تجھے بھوک نہیں ہے تو میرے لیے کھالے۔ چل! بسم اللہ کر روٹی کو انتظار

کروا۔“

رشیدہ نے روٹی کا نوالہ توڑتے ہوئے کہا تو جیلہ نے بھی تقلید کی۔ کچھ دیر بعد دونوں مگن سی ایسے باتیں کر رہی تھیں جیسے کبھی ان میں کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

”تو کر لو گل! میں اماں کی بھوک کا سوچ کر بھاگی بھاگی گھر سے آئی ہوں اور یہاں کھانا کھاتے ہوئے ٹھنھے لگ رہے ہیں۔“

صغراں ماسی لاٹھی کے سہارے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی گھر کے اندر داخل ہوئی تو چارپائی پہ وہاں کو سر جوڑے بیٹھا دیکھ کر بولی۔ اس کا بارہ سالہ پوتا سامنے لے کھائے پیچھے پیچھے تھا۔

”یہ بھی خوب کسی! بھلا اس عمر وچ‘ تسی نس (بھاگ) بھی سکدے ہو۔“

رشیدہ نے جیلہ (اماں) کے ہاتھ پہ ہاتھ مارتے ہوئے ہنس کر کہا تھا۔

”بڑی گھی کھی کر رہی ہو کر بول۔۔۔“ صغراں ماسی نے دوسری چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے کہا تو لفظ ”اکڑیوں“ پہ رشیدہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔

”صغراں ماسی! چھوڑیں‘ رشیدہ کو تو عادت ہے مخول کرنے کی۔“

جیلہ نے اپنی ہنسی کو چھپاتے ہوئے کہا تھا۔

”سب سمجھتی ہوں میں! ارے نہانیوں خوشی‘ سکھ سب کے اپنے اپنے ہو سکتے ہیں‘ مگر دکھوں کی سانچھ سب کی ایک ہی ہوتی ہے۔ اگر ساری زنانیاں اس بات کو سمجھ لیں تو سارے جھگڑے ہی جگ جائیں۔“



تھا۔ مگر جب تو اپنی حالت سے ہی تنگ رہنے لگی، وہ بھی تجھ سے پیچھے ہٹ گیا۔ مرد کی فطرت ہی ایسی ہے۔ اس بات کو سمجھ لے گی تو آئندہ دکھ نہیں اٹھائے گی۔“

اماں نے واپس پلٹتے ہوئے کہا تھا۔ بانو ”اونس۔“ کر کے رہ گئی۔

\*\*\*

چھ مہینے کی فاطمہ چارباٹی پہ بیٹھی اپنے سامنے رکھے کھلونوں سے کھیل رہی تھی۔ فاطمہ میں سب کی جان

تھی۔ اماں کی ملاؤں پوتی تو تھی ہی اختر بھی، بیٹی پہ جان دیتا تھا۔ اماں نے بیڑھی پہ بیٹی گم صم سی بانو کو دکھا تھا۔ جو چادر صاف کرتا بھول گئی تھی اور کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ دو دن کے پسنے گلجے سے کپڑوں میں ملبوس، بالوں کو بغیر کنگھی کے بانڈھے ہوئے وہ بہت ادا اس لگ رہی تھی۔ اختر کی بڑھتی بے انتہائی نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔

”وے بانو! آج کوئی گیت تو سننا۔ پڑھا تم ہو گیا تیری آواز سنے ہوئے۔“ اختر کو تو اکثر سناتی تھی آج سناں کو بھی سناوے۔“

میں غیوں کا ڈربہ صاف کرتی اماں نے اس کی توجہ ہٹانے کے لیے بے ساختہ کہا تھا۔ بانو جو اماں کو پہلے منع کرنے والی تھی۔ کچھ سوچ کر چپ کر گئی۔ پھر اس کی سرکلی اور افسردہ میں ڈوبی آواز سارے صحن میں پھیل گئی۔

کتھے نہیں نہ جوڑیں

میرے جھینلیاں موڑیں

تینوں واسطہ خداوا

واگال و طلال نو موڑیں

آکھے لگدے کسے دے

میرا مان نہ توڑیں

کتھے نہیں نہ جوڑیں

بانو کے دل کا درد زبان تک آچکا تھا۔ ایک اندیشہ جو

صغیراں ہاسی نے اپنی ساری عمر کا نچوڑ بتایا تھا۔  
”ٹھیک کرتی ہیں آپ! اچھا آپ دونوں باتاں کرو“  
میں دودھ پتی بنا کر لانی ہوں۔“  
اماں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔

\*\*\*

”اختر! اب تجھے میری کوئی پروا نہیں ہے۔ پہلے تو میرے آگے پیچھے پھرتا تھا۔ مگر اب وہ دوسرے گھر نہیں آتا ہے اور اگر بھی تیرا منہ بتا رہتا ہے۔ بات، بات“

لڑتا اور چرتا ہے کہاں گئی تیری محبت“

اختر اس بار چھٹی پہ آیا تو اپنے حال سے بے حال ہوتی بانو پھٹ پڑی۔ اس کی زچگی میں کچھ دن ہی باقی رہتے تھے۔

”بھائو میں گئی محبت۔ بندہ گھر کیا آئے؟ تم ساس، بسو کی باتیں، لڑائی جھگڑے، شک، شکایتیں ہی ختم نہیں ہوتیں۔ اوپر سے تیری یہ حالت، ہر وقت بے زار، آنتائی ہوئی رہتی ہے۔ بندہ گھر تیرا کرنے آتا ہے یا بیوی کے غرے اور بیماری دیکھنے کے لیے؟“

اختر سچا کل اور ہی ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ جس کی سن سن بانو کو بھی ملی تھی۔ ایک دم سے ہی بھڑک کر بولا تھا۔ بانو ہانکا اس کی شکل دیکھ کر رہ گئی تھی۔ جبکہ اختر بولتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا تھا۔

”فکر مت کر! ایک دوسرے ہو جائیں گے تو خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ تو یہ دودھ پی لے۔“

اماں نے گم صم سی بیٹھی بانو کے سامنے دودھ کا گلاس رکھتے ہوئے تسلی دی تھی۔

”مت کرو یہ جھوٹی ہمدردیاں! سب آپ کی پڑھائی اور سکھائی ہوئی پٹیاں ہیں۔ آپ جلتی زمین ہماری محبت دیکھ دیکھ کر۔“

بانو نے اندر کی کھولن اُٹھ لی تھی۔ اماں نمس پڑی۔

”پاگل سے تو! شروع شروع کے چاؤ، چوچلے

سارے مرد ہی کرتے ہیں۔ جب تک تو اس کے آگے

پیچھے پھرتی رہتی تھی، وہ بھی تجھ سے خوش اور راضی

اسی کا ساتھ دوں گی۔“  
اماں نے اختر کے سامنے چٹان بن کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا تھا۔

”اماں۔“ اختر تڑپ اٹھا تھا۔ جو بھی تھا وہ اماں سے بہت قریب تھا۔ اختر نے آگے بڑھ کر باپتی ہوئی اماں کو سنبھالنا چاہا۔ اماں نے اس کے ہاتھ جھٹک دیے۔

”کچھ اور نہیں تو کم از کم اپنی پھول سی پچی کے بارے میں ہی سوچ لینا تھا۔ میرے پاس تو بیٹا تھا جو باپ کی نظر سے گیا ہے مگر تیرے آگے تو بیٹی ہے، کل کو کوئی ہرجائی سفت اسے بھی مل گیا تو کیا کرے گا تو۔۔۔“ اماں نے نم لہجے میں ننھی فاطمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو اختر خوف سے کانپ اٹھا۔ آگے بڑھ کر بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھا اور خاموشی سے اندر کمرے میں چلا گیا۔ مرد بن کر جو فیصلہ کیا تھا۔ باپ بن کر اسے بدل چکا تھا۔

اور اس ڈھلتی دوپہر میں صحن میں کھڑی دونوں عورتوں نے دکھوں کی سانجھ کا رشتہ بنالیا تھا۔ وہ رشتہ جو بہت مضبوط تھا۔

اس دن کے بعد سے ان میں کبھی ساس، بہو والے جھگڑے نہیں ہوئے تھے۔ کبھی کبھی تو اختر بھی حیران ہو کر پوچھ بیٹھا تھا۔

”ساس، بہو میں اتنی محبت۔“ تو بانو بے اختیار ہنس کر کہتی تھی۔

”ساس، بہو نہیں، یہ دو عورتوں کے دکھوں کی سانجھ کا رشتہ ہے جسے تم کبھی نہیں سمجھ سکو گے۔“

اور واقعی اختر نا سمجھی سے کندھے اچکا کر رہ جاتا ہے۔ خوشیوں کا سنگی سا بھائی دکھ کی سانجھ کو کیسے سمجھ سکتا تھا۔

سچ ہونے کے قریب تھا۔ اس نے گہری سانس لی اور بانو نے دوپٹے سے آنکھوں کی نمی صاف کی۔ تو چونک گئی۔ سامنے ہاتھ میں بیگ تھا بے اختر کھڑا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے فوراً چاول کا تھاں اٹھایا جب اس کے کانوں میں اختر کی آواز گونجی۔

”میں نیلو فر سے دوپہر شادی کر رہا ہوں۔ تجھے خرچا پانی ملتا رہے گا۔ تو آرام سے یہاں اماں کے پاس رہنا۔ وہ میرے ساتھ شہر میں ہی رہے گی۔“

بانو کے ہاتھ سے تھاں چھٹ گیا۔ سارے چاول

صحن میں بکھر گئے۔ اس کاٹک سج کا روپ لے لے سامنے آچکا تھا۔ وہ کچھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

مرغیوں کے ڈربے کو صاف کرتی اماں نے چونک کر سامنے والا منظر دیکھا تھا۔ بیٹے کی ماں اور باؤ کی ساس بن کر سوچا تو سب ٹھیک لگا۔

”سنت اترانی پھرتی تھی نا۔ مجھے نیچا دکھانا چاہتی تھی۔ دیکھو، یہ اوقات بھی حیرت کی۔“

اندر کی ساس بدے کروفر کے ساتھ بولی تھی۔ مگر نہ جانے پھر کیا ہوا، گھٹوں میں سب بدل گیا۔ بانو کی جگہ جیلہ آکھڑی ہوئی تھی۔ عورت بن کر سوچا تو اس کا دکھ اپنا دکھ لگا۔ دکھوں کی سانجھ دو عورتوں کی ایک ہی ہو گئی تھی۔ اماں انھی اور چیل کی طرح چھٹی تھی اختر پر۔

”بے شرم۔ بے ہدایت! تجھے ذرا لاج نہیں آئی ایسی بات کرتے ہوئے نیک اور شریف بیوی کے ہوتے ہوئے ادھر ادھر منہ مارتا پھرتا ہے۔ اپنے باپ کے نقش قدم چلنے لگا ہے۔“

جو کرتا ہے گھر میری ایک بات یاد رکھنا۔ تیرا ہم سے کوئی رشتہ ناٹا نہیں رہے گا۔ میں سمجھوں گی میرا کوئی بیٹا ہی نہیں تھا۔ صرف ایک بیٹی ہے بانو اور میں



# احمل رضا سنگ سیکہ

پتا نہیں وہ شش بہت ہر سو جھلکاتے آئینوں کا  
منظر کوئی خواب تھا یا حقیقت ہے  
اتنے سال گزر جانے اور قسم کی پروازوں میں اونچی  
اڑائیں بھر لینے کے باوجود بھی قدسیہ اس راز کی  
حقیقت نہ پاسکی تھی کہ بچپن میں مانی کے گھر کی چھت  
سے جو سڑک پہ گلیاں نظر آتا تھا تو اس رات وہاں  
واقعی خوب صورت حور صفت لڑکیوں کے ہجوم نے  
شیشے جڑے گھرے سروں پر ہاتھ رکھ کر دیکھا تھا یا وہ  
سارا منظر محض قدسیہ کا خیال تھا۔ خواب تھا۔ بچپنا  
تھا۔

حالانکہ تب وہ اتنی چھوٹی بھی نہ تھی کہ خواب اور  
حقیقت میں فرق نہ معلوم کر سکتی۔ راتنی بڑی بھی تو  
نہ تھی کہ سیردھیاں اتر کر رات کی تاریکی میں اس باغ  
میں جا کر خود اندازہ لگا سکتی کہ رقص اور کسی انجمنی  
خوشی میں غرق وہ لڑکیں جیتی جاگتی ہیں یا چاندنی راتوں  
میں صحرا میں دیکھتے پانی کی طرح نظر کا دھوکا۔  
آنے والے دنوں میں وہ جب بھی اس رات کو یاد  
کرتی، بڑی کوفت کا شکار ہو جاتی۔ کچھ وہ اپنی بچکانہ  
انجمن کا کسی سے یوں بھی اظہار نہ کر سکتی تھی کہ اس  
رات کو ہی خالہ کا انتقال ہو گیا تھا۔

اب اول کی طرح پتھر اور جلد خالہ نے سب سے  
بہار تھیں۔ قدسیہ سمیت خاندان کے کسی بچے نے  
انہیں کبھی تندرست حالت میں نہ دیکھا تھا۔

خالہ کے شوہر پچھلے انھارہ سال سے لندن میں مقیم  
تھے۔ فون پر ان کی آواز تو پاکستان آجاتی تھی۔ لیکن وہ  
خود اہرام کے راز کی طرح بڑے عرصے سے نظروں

سے اوجھل تھے پلٹ کر کبھی خالہ کی خبر لینے کی  
ضرورت ہی نہ محسوس کی۔ بڑا بلایا گیا، ڈرایا گیا، دھمکایا  
گیا اور سمجھایا بھی گیا۔ لیکن دوسری طرف کا پتھر  
سرسبز رہا۔ پھر خبر آئی کہ موصوف وہاں ہی بیوی  
بچوں والے ہو گئے ہیں اس راز کے کھل جانے تو  
گو یا قصے سمیت رشتہ بھی ختم کر دیا۔  
خالہ کا انتقال ہو گیا۔ نبھانے کس بیماری، کس  
روگ کے کارن۔

شوہر کو خبر دے دی گئی۔ فون کے دوسری طرف  
بڑی دیر خاموشی رہی پھر ”انا للہ وانا علیہ راجعون“ کہہ  
کر یہ باپ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا۔

ہاں تو جس رات خالہ کا انتقال ہوا تھا ہمیں اسی  
وقت یا اس سے ذرا پہلے (قدسیہ کو یاد نہیں اب) اس  
نے باغ میں خالہ کو بھی تو دیکھا تھا۔ ایسی خوشی میں  
مست جو خالہ کے چہرے سے ساری زندگی تو جھلک نہ  
سکی۔ اب اگر قدسیہ بات بٹانا ابو سے یا کسی اور سے  
کہہ دیتی کہ اس نے خالہ کو دیکھا تھا۔ باغ میں۔ محو  
رقص۔ تو کیسی کیسی پٹائی نہیں ہونی تھی اس کی۔  
سیدوں کی لڑکی اور رقص۔

یہ ہی وجہ تھی کہ وہ اس انجمن کو سلجھنے بنانے کے  
لیے کبھی کسی کے آگے پیش نہ کر سکی اور آج چھوٹی  
بہن نمونے بھی تو خواہوں گا ذکر۔ کر کے اسے وہ خواب  
یا حقیقت والی سرگوشیوں بھری رات یاد کروا دی تھی۔  
اور ایک آنسو ٹھک سے اس کی ہتھیلی پر آگرا تھا۔

امریکہ سے نمونے درجن بھر کے مزاور روشن بھیجے  
تھے۔ جسم کو نرم نگہ از بے داغ اور خوشبودار بنانے



ہنس رہی تھی کہ قدسیہ ترکیب سمیت کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔

”اوہ ہو آبی۔۔۔ آپ تو بالکل بدھو ہو۔۔۔“ چھوٹی بہن کی شاید سمجھ میں نہیں آ رہا تھا سات سمندر پار بیٹھی بڑی بہن سے بے تکلفی کیسے پیدا کرے۔

”ساری کریمز اور لوشن آپ کی جلد کو مکمل سا کر دیں گے نرم و ملائم“ نمونے ایسے کما جیسے کوئی جادو کر ڈھیروں منتر پڑھنے کے بعد پھونک مارے۔

والے ساتھ ایک کاسٹیوم بھی تھا میکسی طرز کا۔ بند پارسل کے اوپر ہی نمونے بڑے حروف میں لکھا تھا۔ ”آبی ایچیز استعمال کرنے سے پہلے مجھے فون کر لیجئے گا۔“

چیزیں استعمال کرنا تو دور۔۔۔ قدسیہ نے انہیں ہاتھ لگانے سے بھی پہلے نمونہ کو فون کر لیا۔ پتا نہیں کیا کہنا چاہتی تھی نمونہ گریمرز لگانے کی ترکیب تو سمجھا ہی رہی تھی۔ لیکن ساتھ ساتھ اتنا کھلکھلا کر اور فوڈ معنی ہنسی





”جلد کی ایک بیماری۔ جس میں جلد خشک ہو کر چھلکوں کی شکل میں اترتی ہے۔ ہماری جلد۔ کی سات تہیں ہوتی ہیں اور ساتوں تہیں اس بیماری میں بہت کمزور ہو جاتی ہیں۔“

”یہ ٹھیک تو ہو جائے گی نا ڈاکٹر صاحب۔؟“ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا سیدھا اپنی فکر کا حل پوچھ لیا۔

”ان شاء اللہ کیوں نہیں۔ آپ کو بس احتیاط کرنا ہوگی۔ اور دوائیوں پر مکمل توجہ دینی ہوگی۔“

اس نے دونوں چیزوں پر فوکس کیے رکھا تھا۔ یہ احتیاط کیا کم تھی کہ شیراز اس ساری بات سے مبینوں لا علم رہا تھا۔ لیکن نجانے کیا ہوا میٹل کا ایک قطرہ پورے پانی کو نیلا کر دے گا۔ یہ قطرہ تو اب کنویں میں گر جاتا تو اسے بھی نیلوں نیل کر دیتا۔ قدسیہ کا بھی تن من و ہن نیلوں نیل ہونے لگا اور نار نار راستہ اسے کیس نظر نہ آیا۔ اپنی کمر کو آئینے میں دیکھ کر وہ اب خود ڈرنے لگی تھی۔ بڑے بڑے سرخ اور گہرے چھجی نشان ایسے براجمان تھے جیسے جلے ہوئے گلاب کسی نے وہاں چپکا دیئے ہوں۔

”یہ کیا ہے۔؟“ شیراز اس کی گردن دیکھ کر چونکا تھا۔ گھر آیا بھی تھا۔ قدسیہ کا انجانے میں سر سے دوپٹہ اتر گیا تھا۔ سورنہ وہ تو آج کل گھر میں بھی بہت کس کے چادر لیے لگی تھی۔

”یہ۔۔۔ یہ الکی ہے شیراز۔“ وہ بری طرح سٹیٹائی۔ جیسے اس کی کوئی چوری سب کے سامنے ہی تو آگئی ہو۔

”کب سے ہے۔؟“ وہ قریب ہوا۔ تو قدسیہ بے ہوش گئی۔ پیچھے کو سرکنے لگی۔ نہیں چاہتی تھی کہ وہ بھی اسی طرح دیکھ کر ڈر جائے جس طرح وہ بہت رکھنے کے باوجود بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔

”دو ماہ سے۔“ اس نے ایک مہینہ مزید کم بتایا۔

”اور تم مجھے اب بتا رہی ہو۔“ وہ تیز لہجے میں بولا۔

”توقف کیا۔ خود ہی نرم ہوا۔“ ڈاکٹر کے پاس گئی تھیں۔؟“

”شیراز بھائی رات بھر سونے نہیں دیں گے۔“

اب کے آواز خمار آلود تھی۔

”اور جب سوئیں گی تو بڑے اچھے خواب آئیں گے۔“ نمرو نے بات ختم کر کے بڑا جھن دار قدم لگایا اور فون بند کر دیا۔ قدسیہ جو نمرو کی کسی بات کو سمجھ نہیں پا رہی تھی، آخری بات کو سمجھ کر کھنڈر ہو گئی اور ایک آنسو ٹھک سے اس کی ہتھیلی پر آگرا۔

اس نے میکسی نما ڈریس کو دیکھا مگنڈ پر میسج لکھا تھا۔ ”آپی اپنی سالگرہ والی رات اسے ہی پہنے گا۔“ قدسیہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ یہ تحریر کھینچتے وقت نمرو خود کس طرح اندر ہی اندر مسکرائی ہوگی۔

پورے جہان میں صرف ایک نمرو ہی بچی تھی جو اسے ہر دفعہ۔ جب بھی موقع ملتا یہی احساس دلاتی تھی کہ ”آپی اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ آپ ویسی ہی سندر ہیں۔“

اکثر ہمارے بست سے ریوے نکلتے اور تجربے کسی تعلق داری کے باعث بڑے جھول دار ہو جاتے ہیں۔

قدسیہ اپنے موجودہ مقام سے بہت اچھی طرح آگاہ تھی۔ گروہ پہلے سی ہی سندر ہوتی تو ہر رات انگاروں پر نہ گزارا کرتی۔

مستول ہی ٹوٹ جائے تو نا خدا کس بات پر زعم کرے پھر۔ اس توڑ پھوڑ کی شروعات ایک برچھی سے ہوئی تھی۔ ٹھیک دو سال پہلے۔

پنگلی کی پیدائش پر نجانے کس دوائی کا کیسا کیسا ری ایکشن ہوا کہ قدسیہ کی کمر پر ایک بڑا سا سرخ نشان نمودار ہو گیا۔ پہلے پہل تو وہ نظر انداز کرتی رہی۔ جیسا کہ ہر کوئی ہی کرتا ہے۔ الرجی کی گولیاں کھا کر خود ہی اپنا علاج کرتی رہی۔ لیکن جب گول نشان کسی شکاف کی طرح بوہتا ہی گیا۔ تو وہ ڈاکٹر کے پاس گئی۔

”آپ کو سورائی کس (Psoriasis) ہو گئی ہے۔“ یارعب ڈاکٹر نے سارے ٹیسٹ کرنے کے بعد کہا۔ قدسیہ یہ نام پہلی مرتبہ سن رہی تھی۔

”وہ کیا ہوتی ہے ڈاکٹر صاحب۔؟“



”جی...!“

”کیا کہا اس نے؟“

”احتیاط کرنے کا کہا تھا اور یہ کہ ایک ڈیڑھ ماہ لگے گا اسے جانے میں۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ پریشان مت ہونا۔ ٹھیک ہو جائے گی خود ہی۔“ شیراز نے پیار اور ہمدردی سے کہا تھا۔ قدسیہ کو تھوڑی تسکین ہوئی۔

لیکن وہ جو اسے پریشان نہ ہونے کا کہہ رہا تھا رات میں نجانے کیوں خود کو فٹ کا شکار ہو گیا۔ سارا پیار بھاپ بن کر کچھ اس طرح اڑا کہ نہ تو پھر پائل بن کر برس سکا اور نہ فضا کی شبنم کی طرح گر سکا۔ خاموشی کا ایک لمبا سفر تھا جس میں ست رنگی کلچر دھڑا دھڑ ٹوٹے محبت کو نہ جوش آیا نہ دم اور جلنے کی بو پورے کمرے میں پھیل گئی۔ ساری رات قدسیہ خاموشی سے اپنے ہی آنسو پیتی رہی۔ اس کے دل اس نے ڈاکٹر بدل لیا۔

”مجھے حیرت ہے آپ پر۔ پڑھی کھلی لگتی ہیں آپ پھر ایسی غلطی کیسے کی آپ نے۔ ایو پیٹھک دو انہوں سے تو آپ کو یہ الرتی ہوئی ہے اور آپ وہ ہی دو انہیں لکھا کر علاج کرواتی رہیں۔ بھئی حیرت ہے۔“ مونی تو موندالے ہو میو پیٹھک ڈاکٹر نے ہنس کر کہا تھا ”سورائی سس کا علاج تو ہے ہی ہو میو پیٹھک میں۔ میں تو اب تک نوے کامیاب کیس کر چکا ہوں۔ پچاس لڑکے اور چالیس لڑکیاں۔ بس علاج ذرا مہنگا اور صبر آزما ہے۔“

بیسوں کی قدسیہ کو کمی نہ تھی اور صبر کو۔ کل رات سے اس نے اپنا شعار بتا لیا تھا۔

”میں نے اپنے دوست سے بات کی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ سورائی سس کا علاج ہے ہی نہیں۔ چاہے جو مرضی کر لو یہ زندگی بھر نہیں جاتی۔“ شیراز نے کہا تو وہ جو گرم چائے بنا رہی تھی برف کی طرح سن ہو گئی۔ ایک دو ڈاکٹر نے اسے خود یہی بات کہی تھی اور اس بات کو وہ اپنی ذات سے بھی چھپا کر رکھنا چاہتی تھی۔ ”پرانی باتیں ہیں یہ شیراز۔!“ اس نے ہکلاتے

ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر نے بہت امید دلائی ہے مجھے۔“ ”کل میں بھی چلوں گا ڈاکٹر کے پاس۔“ قدسیہ سمجھی شیراز اس کی بیماری کے بارے میں کچھ زیادہ ہی حساس ہو رہا ہے لیکن۔۔۔

کاش یہ کل آتا ہی نہ۔ ڈاکٹر کے کلینک میں بیٹھی وہ یہ ہی سوچتی رہی۔

”سورائی سس کی صرف ایک۔۔۔ صرف ایک دو خال خال موجود اقسام ایسی ہیں جو بچھوت کے زمرے میں آتی ہیں۔ لیکن سبز قدسیہ کی سورائی سس کسی صورت ان اقسام میں سے نہیں۔“ جینی درگشتگو ہوئی رہی۔ قدسیہ بانک سے کتے گھنے کی طرح کٹ کٹ کر چھوٹے چھوٹے جھصوں میں بکھرتی رہی۔

”تو یہ وجہ تھی اس کے یہاں آنے کی۔“ ڈاکٹر نے شیراز سے ملجھگی میں بھی کچھ باتیں کی تھیں۔

”ازدواجی زندگی میں سورائی سس کسی صورت رکاوٹ نہیں بنتی ہے۔ آپ کی بیوی برے فیر سے گزر رہی ہیں۔ ان کو آپ کی محبت اور توجہ کی ضرورت ہے۔ ان کے ساتھ برخلوص رہیں۔“

شاید ان ہی باتوں کا اثر تھا کہ واپسی پر شیراز نے اسے ہول سے دہز کر دیا تھا۔ خاموشی کے انداز میں ڈوبی ہوئی بڑی بڑی تپلیاں دی تھیں۔ دونوں دونوں بعد بڑے خوشگوار انداز میں میٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔ شاپنگ کے بعد پارک میں واک بھی کی اور گھر آکر وہ شاید تھکن کے مارے جلدی ہو گیا تھا یا اسے ڈاکٹر کی کسی بھی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ نجانے کس ہدایت کے باعث وہ قدسیہ سے دور دور رہنے لگا تھا۔ انتظار اور کوفت کا عالم اس گھر پر آکر ٹھہر گیا۔ قدسیہ کے اندر اتنا اندھیرا جمع ہونے لگا کہ اسے اس اندھیرے کو مٹانے کے لیے سورج کی روشنی بھی کم پڑتی نظر آتی۔

”بھئی کیا کہتا ہے وہ ڈاکٹر؟“ شیراز نے ایک دن بڑے عاجز آکر اس سے پوچھا تھا۔

”وہ تو کہہ رہا تھا کہ صرف تھوڑی دیر کی بات ہے



۔ اور اب تو یہ زخموں کے نشان سامنے کی طرف بھی آنے لگے ہیں۔“

”علاج بہت سست روی سے ہوتا ہے اس کا شیراز ابھی مزید دن لگیں گے۔“

”تمہیں پتا ہے دو ماہ ہو گئے ہیں۔“ اس نے بتایا جس میں جتانے کا عنصر نمایاں تھا۔

سورائی سس کو تو چھ ماہ ہو گئے تھے لیکن شیراز نے نبھانے کس چیز کا حساب کتاب رکھا ہوا تھا۔ احساس جرم اور شرم سے قدسیہ پانی پانی ہو گئی۔ شیراز اپنے لہجے کی بے زاری اور جھنجھلاہٹ کو چھپانے کی اب کوشش بھی نہیں کرتا تھا۔

اگلے دن قدسیہ نے تقریباً ”دو رو کر اپنی بیماری کے بارے میں نمرو کو بتایا تھا۔“

”اوہ گاڈ آلی۔“ تب نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔“ وہ چلائی۔ ”خیر پریشان مت ہوں۔ اتنی اتنی باتوں پر پریشان نہیں ہو جایا کرتے۔ شکر ادا کریں کہ شیراز جیسا شوہر ہے آپ کا۔ کوئی اور ہو ہوتا۔ خیر۔“ قدسیہ نے اس کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

”پہلے صرف کمر پر تھی نمرو۔ اب بازو، ٹانگوں پر بھی آنے لگی ہے۔ اور۔ اور۔“ وہ رونے لگی۔ ”علاج ہو رہا ہے نا آپ کا آلی۔ ڈاکٹر کیا کہتے ہیں۔“ نمرو بسن کی پریشانی پر اداس ہو گئی۔

”اسٹریس۔“

”اسٹریس۔“ نمرو حیران ہوئی۔ وہ تو کچھ اور ہی سمجھی تھی۔

”سورائی سس کی بیماری اسٹریس نامی جگہ سے پانی حاصل کرتی ہے۔ آپ سٹریس نہ لیں۔ دوائی اور خدا کے کرم سے یہ خود بخود سوکھ جائے گی۔ کچھ گئیں نا آپ۔ آپ جتنی زیادہ خوش رہیں گی اتنا ہی فائدہ ہو گا۔ ورنہ تنگی سے تنگی دوائی بھی بے کار ثابت ہوگی۔“ ڈاکٹر نے اسے ساری تفصیل سمجھا دی۔

وہ سمجھ گئی بڑی اچھی طرح لیکن سمجھانہ سکی

۔ بری طرح بھی۔

”تم بیمار ہو مجھے اس چیز کا احساس ہے۔ پرمانند نہ کرنا۔“ بید شیت روز بدل دیا کدوس۔ یہ جو تمہاری جلد کے چھلکے اترتے ہیں، جسم سے بڑی کوفت ہوتی ہے مجھے، سردی میں روز بچ اٹھ کر نہانا پڑتا ہے۔“ شیراز نے ایک دن بتایا جست کے اس سے کہا تھا۔

سورائی سس تو نہیں سوکھ رہی تھی اس کی ازدواجی زندگی کو ضرور زنگ لگتا جا رہا تھا۔ محض ایک نکتے کا ہی فرق رہ گیا تھا ورنہ وہ محرم سے محرم تو نبھانے کی بن چکی تھی۔

شیراز درمیان میں تکیوں کی باڑتا کر سونے لگا تھا۔ رات کی تاریکی میں تکیوں کی یہ باڑ قدسیہ کو جیل کی آہنی سلاخوں کی طرح دکھائی دیتی۔ بچپن کے خیال و خواب کا کھیل شاید پھر سے شروع ہو گیا تھا۔ وہ اٹھ اٹھ کر دیکھتی۔ درمیان میں موجود نرم نرم روئی کے نیچے ہی تھے۔ لیکن اسے نبھانے کیوں بید کے پتوں بچ سلاخیں کبھی نظر آتیں۔ جس کی پانی طرف شیراز کو جیسے پھر بھی قرار نہیں آ رہا تھا۔

”کیسی کرم ہے یہ۔۔۔ کتنی تیز خوشبو ہے اس کی۔“

پورا کمرہ بھر گیا ہے۔ روز لگائی پڑے گی کیا۔۔۔؟“ کرم کی خوشبو واقعی تیز تھی یا کوئی اور وجہ تھی۔ شیراز کے ماتھے پر ہاتھوں کی لائیں لگی ہوئی تھیں۔

”جی۔۔۔! یہ بی ایسے ہی تھا جیسے کوئی برج خوشحال اپنی ہی بنیادوں میں ڈھسے جائے۔“

”کمرے کے آئینوں پر بھی تمہارے کپڑے ڈال دیے ہیں۔“ شکووں کی برداشت اور ضبط کی انتہا کو پہنچا لہجہ۔۔۔

”ڈاکٹر نے کہا تھا ایسا کرنے کو۔“ پنڈلیوں پر کرم لگاتے اس نے گھنٹوں میں منہ دے لیا۔

”تو پھر ایسا کرو، پتلی کو لے کر ساتھ کے کمرے میں شفٹ ہو جاؤ۔ یا میں وہاں چلا جاتا ہوں۔“ وہ اٹھنے لگا۔

”نہیں۔ آپ یہیں رہیں۔“ آنسوؤں کو روک کر اس نے تکیہ اٹھایا اور ساتھ کے کمرے میں شفٹ



نے راتوں رات آنکھوں سے ساری پیلاہٹ ختم کر دی۔“

قدسیہ چادر لپیٹ اگلے دن ملازمہ کے ساتھ نکل کھڑی ہوئی۔

”سمندری سیپ اور زرد کوڑیوں کا ابلا ہوا پانی۔ افساطین اور برہم بولی کے گھڑے میں صاف ستھرے پانی میں حل کرتی ہیں۔ اور برزم خطائی۔“ قدسیہ سمجھتی تھی کہ جڑی بوٹیاں سستی ہوتی ہیں۔ لیکن صرف برزم خطائی ہی سونے کے بھاؤ نکلی۔

”ان جڑی بوٹیوں کے علاج سے فرق تو پڑ جائے گا نا حکیم صاحب۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”کیسی بات کر رہی ہیں آپ۔“ حکیم صاحب تعجب سے بولے۔ ان کی حکمت پر شک۔۔۔ جھریاں تھر تھرائیں۔ اور دائیں بھی ہل چل کر ساکت ہو گئی۔

”برہم بولی تو برس اڑا کر رکھ دی ہے۔ یہ تو پھر سورائی کس ہے۔“ حکیم صاحب پر اعتماد سمجے میں بولے۔

اور دو ماہ بعد قدسیہ کا ان پر سے سارا اعتماد اچھ گیا۔ برہم بولی شاید واقعی برص اڑانے میں کار آمد تھی۔ کیونکہ قدسیہ کی سورائی کس کو اس سے چنداں فرق نہ پڑا۔ سارا سارا دن کچن میں پانی ابلتا رہتا۔ افساطین کی بدبو نے ناک میں دم کر دیا۔ کچھ شاید اس بو کا بھی اثر تھا کہ شیراز مسقا ہونے کے بجائے اندر تک کڑواہٹ کا شکار ہوتا چلا گیا۔ لیکن یہ ساری کڑواہٹ اس کی نظموں میں ہی قید رہی۔ وہ اب کوئی سوال جواب نہیں کرتا تھا۔ کون سا ڈاکٹر؟ کیا علاج؟ مزید کتنے دن لگیں گے؟ ان سوالوں کے اتنے جواب مانگے گئے تھے اور اتنے سنے گئے تھے کہ اب وہ قدسیہ سے بھی پہلے جیسے اس کھست کو تسلیم کر چکا تھا۔ بے اعتنائی کی فضا نے گھر میں اپنے بچے گاڑنے شروع کر دیے تھے۔ قدسیہ کا دم گھٹنے لگا تھا۔

”آپ! آپ میرے پاس امریکہ کیوں نہیں آ جاتیں۔“ نمرو نے ایک دن اسے کہا ”یہاں ایک

ہو گئی۔“ ”آپ! آپ کسی ہرمل ڈاکٹر کے پاس کیوں نہیں جاتیں۔“ نمرو نے وہاں سے ہی مشورہ دیا۔

سارے شہر کے ہو میو، ایلو پیتھک کلینکوں، ڈاکٹروں کو تو وہ ویسے ہی جاننے لگی تھی۔ اب ہرمل کلینک بھی دریافت کرنے لگی۔

”شیر۔۔۔ بھیڑ پیئے۔ سانپ اونٹ، سانڈے کی چربی سے تیار کی جاتی ہیں ہماری ادویات۔ بالکل نیا طریقہ علاج ہے یہ۔۔۔ ہمارے ادارے نے تو سفید سورائی سسی کا کامیاب علاج کیا ہے آپ کی تو پھر ریٹ (سرخ) ہے۔ بے ضرر۔“

قدسیہ نہ مطمئن ہوئی نہ خوش۔ ہرنیا ڈاکٹر اسے یہ ہی کہتا تھا۔ تین ماہ اس کا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ جب کامیاب علاج کے وعوے مار ڈاکٹر نے اپنے ہاتھ اٹھالیے۔

”آپ نے جتنے پیسے دیے ہیں۔ میں سارے واپس کرنے کو تیار ہوں۔ اور آپ سے کہتا ہوں کہ بس اب سب اللہ پر چھوڑ دیں۔“

اس نے تو کب سے سب اللہ پر چھوڑ رکھا تھا۔ اپنی بیماری بھی اور اپنا رشتہ بھی۔ قدرت نے ہی اسے ففٹی ففٹی کی بجائے کون سی آپشن دے رکھی تھی کہ دونوں معاف ہی لگے ہوئے تھے۔

پانچ نمازیں تو وہ پہلے ہی پڑھتی تھی اب اس نے تہجد کے ساتھ ساتھ چاشت اشراق بھی پڑھنا شروع کر دی۔ وضو کرنے سے لے کر نماز ختم ہونے تک وہ اپنے لیے دعا کرتی۔ باقاعدہ ہاتھ اٹھا کر کرنے والی دعا الگ سے۔ دن سے رات کرتی اور رات سے پھر دن۔

”کیوں اتنا ہلکان ہوتی ہیں باجی۔!“ ایک دن کام والی ملازمہ نے اس سے کہا۔

”ہمارے علاقے میں ایک حکیم ہے۔ بہت سچا ہوا۔ پہاڑوں کا بیٹا سمجھ لیں بس۔ نبض دیکھ کر مریض کا جانتا ہے۔ میرے کاکے کو برقان ہو گیا تھا۔ ہم تو صبر کر چکے تھے لیکن اس کی دی تین خوراکیں



۔ ایک نئے جوئے نے۔ جس میں پتا نہیں اب کی بار  
اس کی بار لکھی تھی کہ جیت۔  
”اب کتنی امید ہے ڈاکٹر صاحب۔“ وہ ناامیدی  
سے بولی۔

”اللہ کی رحمت ہے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے  
۔ مس قدسیہ۔ سو فی صد امید رکھیے۔“  
ایک نئے عزم سے اس نے علاج شروع کروادیا۔



فرق بڑی رہا تھا۔ جب ہی تو آج وہ آتے وقت کیک  
کھاتی تھی۔ کھانا بھی اس نے بڑے اہتمام سے بنایا  
تھا۔

ڈاکٹر نکمیل پر اس نے ہنستے ہوئے شیراز کو نموی  
بات بتائی تھی۔ یہ نہیں ایسی تھی جیسے ہسی اپنی لاج  
نبھاتے نبھاتے تھک گئی ہو یا جیسے ہسی کو اپنی چٹک پر  
رونا آگیا ہو۔

”ہوں۔۔۔!“ لمبی چوڑی تمہید کے بعد سنائی جانے  
والی بات کو سن کر شیراز نے صرف اتنی ہی کہا تھا۔ اس  
ہوں میں ساری انجان الما اور سرد مہری قید تھی۔ وہ  
اس کے اہتمام سے بنائے کھانے کو بڑی بے دلی سے  
کھا رہا تھا۔

بعض چیزیں اپنے ٹوٹنے پر بڑا شور پیدا کرتی ہیں۔  
بڑا دواویلا اٹھتا ہے۔ دیال آتا ہے۔ جیسے لکڑی، شیشہ،  
مٹی کا کوئی ظرف۔ بہار، چٹان، مکان، دیوار۔ لیکن  
بعض چیزیں بڑی خاموشی سے اپنی کمی مائیگی کے  
احساس تلے خود پر ہی روتے دھوٹے ہوا رہ تسلیم کر لیتی  
ہیں۔ بغیر کوئی ہنگامہ برپا کیے۔ جیسے دھاکہ، ڈوری،  
بازن پھول، پتا پر اور پتکے۔

اس رات جہاں اور بہت کچھ ہوا وہاں ایک عمل یہ  
بھی ہوا تھا۔ بڑی خاموشی اور رازداری پر تھی گئی تھی۔  
اور ایک ذات حقیقت سے آشنا ہو کر فنا ہو گئی تھی۔

کمرے میں آکر پورے دو گھنٹے لگا کر قدسیہ نے  
درجن بھر کریمز اور لوشن کو استعمال کیا تھا۔ پاری باری  
۔ نموی کی بتائی ہوئی ترکیب کے مطابق۔ چٹنی دیر وہ

سے بڑھ کر ایک ڈاکٹر ہے میوں نہیں ہو گا آپ کا  
علاج۔“  
”نہیں نموی۔! چنگی ابھی چھوٹی ہے۔ میں یہ سفر  
کرنے کی تحمل نہیں ہو سکتی۔“ قدسیہ نے جھوٹا ہوا ز  
گھرا۔

در حقیقت وہ شیراز کے موجودہ رویے سے خوف  
زدہ ہو گئی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ وہ جو چار چھ ماہ کے لیے  
امریکہ چلی گئی تو دور دور رہنے والا شیراز کہیں بالکل ہی  
پر ایسا نہ ہو جائے۔ شیراز کو ویسے بھی شروع سے ہی  
سوتے وقت دو تکیے لینے کی عادت تھی۔ ایسی پوزیشن  
میں اس کے کندھے پر سر رکھے قدسیہ کو وہ اور ہی اوپر  
اٹھتا کوئی دبو تا معلوم ہوتا۔ قدسیہ کو وہ کبھی بھی اپنی  
برابری کی سطح کا نہ لگا۔ اب تو ویسے ہی الگ الگ کمروں  
کی زندگیوں میں دونوں کے درمیان نہ بات سکنے والا  
دریا آگیا تھا۔ ایسا دریا جس پر پی الجھال کوئی پل بننے کی  
امید نہیں تھی۔

”میں نے یہاں پر بہت سے ڈاکٹرز سے بات کی ہے  
اب سورانی سس کے حوالے سے Inflammab  
تھرائی بالکل نئی ایجاد ہے۔ اور اس کے لیے آپ کو  
امریکہ آنے کی بھی ضرورت نہیں۔ پاکستان کے ہر  
بڑے شہر میں اس کا علاج موجود ہے۔ لاہور، کراچی،  
اسلام آباد۔۔۔ مجھے تو حیرت ہے کہ شیراز بھائی کو اب  
تک اس چیز کا علم کیوں نہیں ہو سکا۔ اور آپ بھی  
بے خبر ہیں۔“

ایک نئی امید کے ساتھ اس نے اس حوالے سے  
شیراز سے بات کی تھی۔

”ڈرا سیور کے ساتھ چلی جانا۔ میں آج کل بہت  
مصروف ہوں۔“ وہ آج کل نہیں پچھلے ایک سال سے  
مصروف تھا۔ اتنا کہ دونوں کا رشتہ صرف ڈاکٹر  
نیکمیل کی کرسیوں تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔

”جن لوگوں کو بچپن سے سورانی سس ہوتی ہے  
ان لوگوں کی حالت بھی آپ جیسی نہیں ہوتی۔ یا تو  
آپ نے کوئی علاج ٹھیک سے کروایا نہیں یا پھر آپ  
ذہنی طور پر تھک گئی ہیں۔“ نئے ڈاکٹر نے اس سے کہا



مصروف رہی، نمبر کا ایک فقرہ اس کے کانوں میں رس گھولتا رہا۔

”ساری کریمز کو مل سا کر دیں گی آپ کو۔۔۔ شیراز بھائی سونے نہیں دیں گے۔ بڑے اچھے خواب آئیں گے۔“ وہ یاد کرتی رہی اور مسکراتی رہی۔ نیکاح حیران کن تھے۔ وہ خود کچھ کرشاکڈ رہ گئی۔ واقعی طور پر ہی سہی سارے زخم جیسے جڑوں سے غائب تھے۔ اس نے ایک ایک کر کے ہر شے پر سے کپڑا ہٹا دیا اور کمرے میں موجود پھولوں کے آگے بڑی بڑی موم بتیاں روشن کر دیں۔ اس کا دل کیا آج وہ پورے شہر کی روشنیاں اس کمرے میں بھر لے۔

نمروٹھیک کتنی تھی۔۔۔ وہ کوئل ہو جائے گی۔۔۔ وہ کوئل ہو گئی۔

لیکن شیراز۔۔۔؟ شیراز کیوں نہ عارضی طور پر ہی سہی اس بات کو قبول کر سکا۔

اس کا رویہ ایسا تھا جیسے میلوں پہلے کھیت کی اس نے آج رات ہی رات میں کٹائی کر لی ہو۔ چنانچہ وہ شروع سے ہی ہر کام میں اتنا جلدت پسند تھا یا قد سید کی بیماری نے اس میں یہ پھرتی بھردی تھی۔

چونکہ کوئی تو پھر دہائی بھی نہ دی تھی۔

مستطورات کے چلنے اور بچھنے میں واقعی ایک لمحہ لگا تھا یا یہ قد سید کا خواب تھا۔ خیال تھا۔ درد بھری حقیقت تھی۔

اس نے ہاتھوں کی دسترس تلے اپنے وجود اور سلوٹوں کو ٹوٹا۔ وہاں شیراز تک جانے والا کوئی ٹوٹا ہوا سٹک میل بھی موجود نہیں تھا۔ شیراز کو نے کی کرسی پر بیٹھا سگریٹ بر سگریٹ پی رہا تھا۔ فیصلہ کر لینے اور بتا دینے کی دہائی کی کشمکش میں۔

”سنو قد سید!“ بلا آخر کشمکش ختم ہوئی۔ ”یہ سب

ایسے نہیں چل سکتا یا۔! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ بہت زیادہ۔۔۔ بر میری محبت کا اس طرح امتحان نہ لو۔

ایک بچی کی خاطر ہم اپنی زندگی کیوں جاہ کریں۔ مجھے

اور تمہیں پورا حق ہے اپنی اپنی زندگی اپنی پسند سے

بچنے کا۔ اور میں اس حق سے مزید دست بردار نہیں

رہنا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم اپنی اپنی راہیں جدا کر لیں۔ تمہارا کیا خیال ہے۔؟“

بات جس کے دھیرے دھیرے منطقی انجام تک پہنچنے کا ڈر تھا، وہ ڈر چھن سے کرجی کرجی ہو گیا۔ لیکن نہ کوئی بین ہوا نہ ماتم۔

”بولو قد سید۔۔۔ تم کچھ بولتی کیوں نہیں۔“ بہت لمبی لمبی وضاحتیں دینے کے بعد وہ کوئی پانچویں بار قد سید سے یہ پوچھ رہا تھا۔

”قد سید۔۔۔؟“ اندھیرے اور سناٹے میں پکار گونجی ہے شیراز بیڈ کے قریب آیا جہاں ایک نوحہ بڑی میٹھی اور ابدی نیند سو رہا تھا۔

پھر اس رات ایک اور حقیقت بھی آشکار ہوئی قد سید پر۔ بچپن کے دیکھے گئے خواب اور حقیقت کی سمجھی، خود بخود ہی سلجھ گئی۔ اپنے آپ ہی۔۔۔ جیسے بارش ہونے کے بعد منظر واضح ہو جاتا ہے دور تلک۔ خالہ کے گلے لگ کر قد سید اپنی مسرت میں کھل کر روشن ہو گئی۔

”کیسی عجیب بات ہے نا خالہ۔۔۔ ساری زندگی جسے خواب سمجھتی رہی وہی اصل حقیقت نکلی۔“

اور اصل کہانی اگلے دن ختم ہوئی۔ جب تعزیت کے آئے لوگوں کو نبٹاتے نبٹاتے بوکھلائے شیراز نے ڈاکٹر کی کون کال ریسیو کی تھی۔

”مبارک ہو مسٹر شیراز۔ مسز قد سید کی رپورٹس نے مجھے حیران کر دیا ہے ان شاء اللہ اب جلد ہی یہ پریشانی ختم ہو جائے گی۔“

موبائل شیراز کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ پتا نہیں وہ کسی حقیقت سے چونکا تھا یا کسی بھیا تک پہنچنے میں گم ہو گیا تھا۔





نگہت سیا  
دلچسپیاں

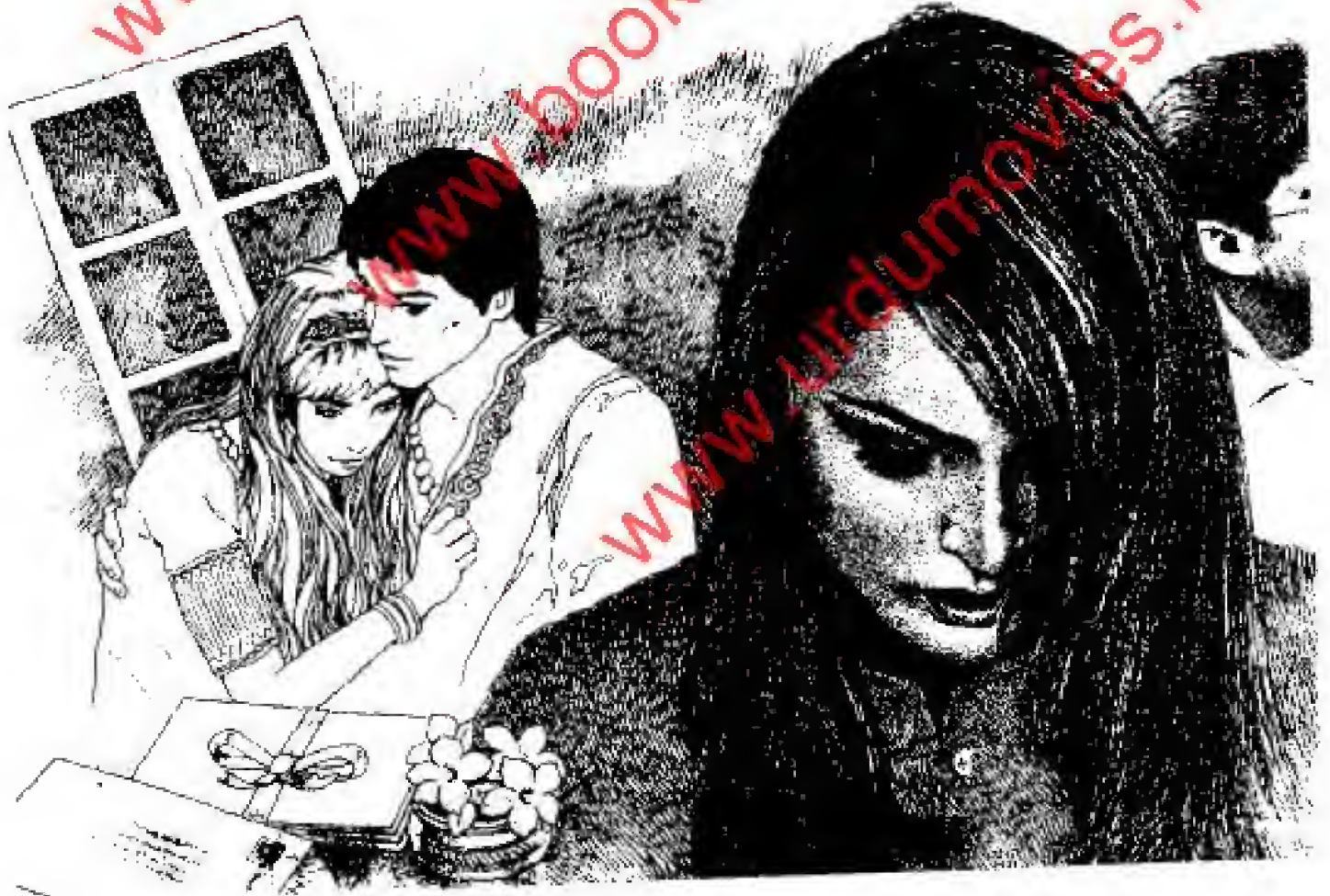




جو زفین اپنی ماں مار تھا اور باپ پال کے ساتھ پاکستان سے مائیکرٹ کر کے آئی ہے۔ اس کی سگی ماں اس کے باپ کو چھوڑ کر کسی مسلمان سے شادی کر چکی ہے۔ مار تھا اس کی سوتیلی ماں ہے۔ اس کا تعلق گوجرانوالہ کے ایک نیچے درجے کے عیسائی خاندان سے ہے۔ مار تھا چاہتی ہے کہ جو زفین شادی کے بغیر ایلن کے ساتھ رہے۔ چونکہ ان کا عام دستور ہے، لیکن اس کا باپ پال اس بات کو پسند نہیں کر رہا کیونکہ وہ ایک پادری کا بیٹا ہے اور اس طرح کے تعلق کو جائز نہیں سمجھتا۔ اس بات کی وجہ سے پال اور مار تھیں اکثر جھگڑا ہوتا ہے۔ مار تھا جو زفین کو برا بھلا کہہ کر گھر سے نکال دیتی ہے۔ جو زفین گھر کے باہر بیٹھی رو رہی رہتی ہے۔ جہاں غلام مصطفیٰ اسے اکثر روتے دیکھتا ہے۔ وہ ان کے گھر کے سامنے رہتا ہے اور فٹ بال کا بستر بن کھڑی ہے۔

ہادی کی ماں کے مرنے کے بعد حبیب الرحمن نے زری سے دوسری شادی کی ہے۔ زری ان کے انٹرن میں کام کرتی تھی۔ زری ہادی سے بے حد نفرت کرتی ہے۔ اس کی پوری کوشش ہے کہ ہادی کو گھر سے نکال دے تاکہ اس کا بیٹا سنی پوری جائیداد کا وارث بن جائے۔ وہ حبیب الرحمن سے ہادی کی جھوٹی شکایتیں کرتی ہے۔ ہادی کو نت نئے طریقوں سے اذیت دیتی ہے۔ حبیب الرحمن غصہ کے تیز ہیں وہ مشتعل ہو کر اس کی چٹائی کرتے ہیں۔ حبیب الرحمن کاروبار کے سلسلے میں دینی جاتے ہیں تو زری ہادی کو مار کر گھر سے نکال دیتی ہے۔ وہ اس پر الزام لگاتی ہے کہ ہادی نے اس کے بیٹے سنی کو مارا ہے۔ وہ حبیب الرحمن سے فون پر شکایت کرتی ہے تو وہ ہادی کو گھر سے نکل جانے کے لیے کہتے ہیں۔ ہادی کی منہ ساجست بھی نہیں سنتے۔ مشاغل جو ہادی کی سوتیلی بہن ہے۔ وہ اس سے بہت ہمدردی رکھتی ہے۔ وہ اس کی مدد کرنے کی کوشش بھی کرتی ہے، لیکن زری اسے گھر سے نکال دیتی ہے۔ وہ گھر کی دیوار کے باہر لکھ کر آجانا ہے کہ میں نے سنی کو نہیں مارا ہے۔ محی الدین ہادی کو اکثر فٹ بال کے میدان میں بیٹھا دیکھ چکے ہیں۔ وہ فٹ بال کلب کے گراؤنڈ میں اسے بے ہوش

## مکمل ناول





دیکھتے ہیں تو اسے گھر لے جاتے ہیں۔ اسے نمونیہ ہو چکا ہے۔ ہادی چھ دن بعد ہوش میں آتا ہے تو محی الدین کو ساری بات بتاتا ہے۔ محی الدین یہ جان کر حیران رہ جاتے ہیں کہ ہادی ان کے دوست عبدالہادی کا بھانجا ہے۔ عبدالہادی فٹ بال کے بہترین کھلاڑی تھے اور جوانی میں ہی دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔

وہ ہادی کو لے کر اس کے گھر جاتے ہیں، لیکن زری اسے گھر میں رکھنے نہیں دیتی۔ وہ کہتی ہے کہ اگر وہ اس گھر میں آیا تو اس کی ٹانگیں توڑ دے گی۔ حبیب الرحمن ابھی تک وہی میں ہیں۔

محی الدین کو واپس لاہور جانا ہوتا ہے۔ وہ مجبوراً واپس آ جاتے ہیں۔ وہ گھر کی ملازمہ کو اپنا فون نمبر دے آتے ہیں کہ حبیب الرحمن آئیں تو انہیں یہ نمبر دے دے، لیکن ان کا انتظار انتظار ہی رہتا ہے۔ حبیب الرحمن نہیں آتے، وہ ہادی کو چھوڑ بھی نہیں سکتے۔ ایک بار اور کوشش کرتے ہیں، لیکن زری اسے اپنے گھر میں رکھنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ وہ انگلیٹنڈ واپس چلے جاتے ہیں۔ وہ خود فٹ بال کے عاشق ہوتے ہیں۔ ان کا بیٹا آٹھ سال کی عمر میں فٹ بال کا بہترین کھلاڑی ہوتا ہے، لیکن ایک منچ کے دور ان گر کر مر چکا ہے۔ وہ ہادی کی پرورش اپنے بیٹے کی طرح کرتے ہیں اور اسے فٹ بال کا بہترین کھلاڑی بنانے کا خواب دیکھتے ہیں۔

لندن آ جاتے کے بعد بھی وہ ایک بار پھر پاکستان جاتے ہیں لیکن ہادی کے گھر جا کر انہیں پتا چلتا ہے کہ حبیب الرحمن اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔

ہادی کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ وہ فٹ بال کا بہترین کھلاڑی بن چکا ہے۔ خوش جمال جو محی الدین کی بیٹی ہے۔ ہادی کی اس سے بہت دوستی ہے۔ خوش جمال کی جو زمین سے بھی دوستی ہو جاتی ہے۔ خوش جمال جو زمین کو اکثر گھر کے باہر روٹا دیکھتی ہے تو اسے بہت افسوس ہوتا ہے۔

## دوسری اور آخری قسط

”کئی راتیں تو نہیں؟“  
”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا اور پوچھا۔  
”میں نے آج کام پر نہیں جانا؟“  
”معلوم نہیں۔“ پال نے کندھے اچکا۔  
جب سے جوزفین نے جاب کی تھی پال کچھ خاموش رہنے لگا تھا۔ وہ خود سے مارتھا سے کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ وہ جوزی کی جاب سے خوش نہیں تھا۔ پچھلے تین ہفتوں سے وہ جاب پر جا رہی تھی اور ہر ہفتے کی اجرت وہ مارتھا کے حوالے کر دیتی تھی، جبکہ پال چاہتا تھا کہ وہ پیسے اکٹھے کر کے اپنی پڑھائی شروع کر دے۔ ایک دفعہ ابتدائی اخراجات کے لیے رقم اکٹھی کر لے تو بعد میں پڑھائی کے ساتھ ساتھ وہ جاب بھی کرتی رہے۔

”آج تمہیں اس ویک کی بے ملے گی جوزی! تو تم اسے مارتھا کو مت دینا۔“ پال نے کافی کا کپ اس کی

پال کچن میں اپنے لیے کافی بنا رہا تھا، جب جوزفین کچن میں آئی تھی اس نے بلیک جینز پر سرخ لاٹک شرٹ پہن رکھی تھی، گور بلیک کوٹ کے ساتھ سر ریڈ اور بلیک ٹوٹی ٹوٹی اور گلے میں سیاہ مفن لٹکا ہوا تھا جس کے سرے اس کے گھٹنوں کو چھو رہے تھے۔ پال نے مڑ کر ایک ستائشی نظر اس پر ڈالا۔  
”تم تیار ہو، تمہارے لیے بھی ایک کپ کافی بنا دوں؟“

”نہیں پلیز!“ وہ کچن میں ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔  
کچن کے ایک کونے میں چھوٹی سی گول میز کے گرد چار کرسیاں بڑی تھیں۔ اکثر وہ تینوں وہاں ہی ناشتہ اور ڈنر وغیرہ کر لیا کرتے تھے۔

”تم خوش تو ہونا جوزی؟“ کافی پھینٹتے ہوئے پال نے اس کی طرف دیکھا۔  
”جی ہاں!“



نہیل پر رکھتے ہوئے کہا۔

جوزفین نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”اپنے لیے کچھ شاپنگ کر لیتا، تمہارے دستانے بہت پرانے ہو گئے ہیں سوہ بھی خرید لیتا۔“

”نہیں تو بابا! اچھے خاصے ہیں۔“ اس نے کوٹ کی جیب سے دستانے نکال کر پال کو دکھائے۔

”وہاں اسٹور پر سب لوگ اچھے ہیں تا؟“ وہ ہر روز ایک یا دو بار یہ سوال ضرور کرتا تھا، مار تھا سنتی تو بہت چڑنی تھی۔

”اس کے منہ میں چوسنی ڈال دو اور جھولے میں ڈال کر ہر وقت جھلاتے رہو۔“

مسئلہ جوزفین کی جاب نہیں تھی۔ وہاں پاکستان میں بھی پال کے خاندان کی لڑکیاں جاب کر رہی تھیں۔ کوئی خیر تھی تو کوئی ڈاکٹر اور کوئی نرس، مسئلہ جوزفین کی بڑھائی تھی سوہ اسے ڈاکٹر بنانا چاہتا تھا، لیکن وہ اسے بڑھا نہیں سکتا تھا۔

”دکاش تمہیں جاب نہ کرنا پڑتی لیکن خیر۔“ پال نے اپنے لیے کپ میں کافی ڈال کر جوزفین کی طرف دیکھا اور وہ بات کہہ دی جو کوئی دنوں سے سوچ رہا تھا۔ ”تم اپنی ساری پے مار تھا کو دینے کے بجائے اپنے پاس جمع کرنا، جب کچھ پیسے جمع ہو جائیں تو اسکول میں ایڈمیشن لے لیتا۔“

پال بہت خوش تھا اور جوزفین اسے اس خوش فہمی سے نکالنا نہیں چاہتی تھی۔

”ٹھیک ہے بابا! جب میرے پاس کچھ رقم اکٹھی ہو جائے گی تو میں ایڈمیشن لے لوں گی۔“

پال خوش ہو گیا اور اپنا کافی کا کپ لے کر اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

”اس سنڈے کو کہیں گھومنے کا پروگرام نہ بنالیں۔“

”نہیں بابا! خواہ مخواہ کی فضول خرچی۔“

”وہ دراصل۔“ پال نے کافی کا کپ منہ سے لگایا وہ جوزفین کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ ”وہ مار تھا کہہ رہی

تھی ایلین نے انوائٹ کیا ہے۔“

”لیکن بابا! اس سنڈے کو تو مجھے خوش جمل کی طرف جانا ہے۔ میں نے اس سے پراس کر رکھا ہے۔“

ان تین ہفتوں میں اس کی خوش جمل سے چار اور

مصطفیٰ سے تین ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ اور تین دن پہلے خوش جمل نے اسے اپنے گھر انوائٹ کیا تھا۔

اپنے اماں اور بابا سے ملوانے اور ڈھیر ساری باتیں کرنے کے لیے۔ خوش جمل ایک بے تکلف اور خوش اخلاق لڑکی تھی اور اسے اچھی لگی تھی۔ ایلین

سے اب اس کی صرف ایک اینڈر رہی ملاقات ہوئی تھی۔ یوں کہ وہ صبح آٹھ بجے تک نکل جاتی تھی اور

شام کو پانچ بجے کے بعد آتی تھی۔ اور ایلین جب ویک اینڈ پر آتا تو وہ اس سے اچھی طرح بات کر سکتی۔ کیوں

کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ خواہ مخواہ مار تھا کاموڈ خراب ہو اور مار تھا اس کے رشتے سے بہت خوش ہوتی۔ اسے

یقین تھا کہ وہ بدل رہی ہے اور بہت جلد جمل کے طور طریقے سیکھ لے گی، پھر اسے ایلین کے ساتھ رہنے میں

اعتراف نہیں ہو گا۔ اور اس نے ایلین کو بھی اطمینان دلایا تھا کہ تھوڑا وقت دو اسے پھر سب ٹھیک ہو جائے

گا۔ ایلین کبھی خالی ہاتھ نہ آتا، پرا، پیس، فنگر فش، جو سبز کچھ نہ کچھ ضرور لاتا تھا۔

”تم پہلی بار جا رہی ہو خوش جمل کے گھر۔“ پال نے ایک ہی سانس میں اپنی ٹھنڈی ہوئی کافی ختم کی۔

”جی بابا! پہلے ساری ملاقاتیں تو گھر سے اسٹاپ تک جاتے ہوئے ہوئی تھیں۔ بہت ہی غیر رسمی سی خوش

جمل مجھے بہت اچھی لگی ہے میں اسے دوست بنانا چاہتی ہوں۔ یہاں میری کوئی بھی دوست نہیں ہے

اور وہاں کراچی میں میری اتنی ساری فرینڈز تھیں۔“

”اوکے!“ پال اٹھ کھڑا ہوا، جوزفین کے لہجے سے جھٹکتی اداسی نے اسے دکھی کر دیا تھا۔

”تمہارے لیے کیا ناشتہ بناؤں۔“

”بابا! میں خود بنا لوں گی۔“ وہ شرمندہ ہوئی۔



”کوئی بات نہیں۔ میں بنانے لگا ہوں۔“  
 ”مارتھا ناراض ہوگی۔ خیر اس کی تو عادت ہے  
 ناراض ہونے کی۔“ پال فریج میں سے انڈے نکال رہا  
 تھا اور اس کی پشت جوزفین کی طرف تھی۔  
 ”پاپا! اگلے سنڈے کا پروگرام رکھ لیتے ہیں۔“  
 گھر میں اتنے دنوں سے سکون تھا اور وہ مارتھا کو  
 ناراض کر کے یہ سکون برپا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“ پال مطمئن ہو گیا۔ بلکہ سٹر  
 ڈے ایوننگ میں چلیں گے پوز بھی باہر ہی کر لیں  
 گے۔ اگلے سنڈے کو مجھے مارشل کی طرف جانا ہے  
 اس نے مجھے ایک اور جاب کے متعلق بتایا ہے، جہاں  
 سیلری اس سے اچھی ہے۔“

وہ سر ہلا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور ٹوسٹر آن کر کے  
 سلاکس گرم کرنے لگی سپال انڈے فرائی کرنے لگا۔  
 جوزفین نے سلاکس ہاٹ پاٹ میں رکھ کر نیپیل پر  
 رکھے عتب ہی مارتھا نے کچن میں قدم رکھا۔ جوزفین  
 نے اس کی طرف دیکھا وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔  
 ”آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں می!“

جوزفین نے سادگی سے تعریف کی پال نے بھی مڑ  
 کر ایک سہانہ نظر اس پر ڈالی۔ مارتھا مسکرائی اور  
 کرسی پر بیٹھ گئی۔ پال نے فرائی انڈے نیپیل پر رکھے  
 اور اس کے مقابل بیٹھ گیا۔ جوزفین نے فریج سے جیم  
 اور مکھن نکال کر رکھا اور خود بھی بیٹھ گئی۔

تینوں خاموشی سے ناشتا کر رہے تھے اور تینوں ہی  
 اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔

پال سوچ رہا تھا مارتھا اگر لڑائی نہ کرے تو مارتھا  
 بہت اچھی ہے اور خوب صورت بھی تو بہت ہے۔  
 مارشل کی اس گوری میم سے زیادہ خوب صورت  
 لیکن جب حلق پھاڑ کر بولتی ہے تو گوجرانوالے کی جوتو  
 بن جاتی ہے۔ اس کی نظریں بار بار مارتھا کی طرف اٹھ  
 رہی تھیں۔ اور بہت دنوں بعد ایسا ہوا تھا۔ ورنہ تو  
 جب سے مارتھا نے جوزفین کو جاب کے لیے کہا تھا وہ  
 دل ہی دل میں اس سے سخت خفا تھا، لیکن مارتھا مال کی

نظروں سے بے نیاز ایلین کے متعلق سوچ رہی تھی۔  
 ایلین بڑا اچھا لڑکا ہے بڑے کھلے دل کا ورنہ یہ گورے تو  
 بڑے ٹھنڈے ہوتے ہیں، کبھی چوس۔ مارشل کی  
 بیوی کی طرح جو چار دن بھی گھر میں رکھ کر کھلا نہیں  
 سکی تھی اور کیسی کینہ بھری نظروں سے دیکھتی تھی  
 جب ہم کھانے بیٹھتے تھے تو ایلے کتنی تھی ہمارے اور  
 یہ ایلین یہ تو بڑا ہی دل والا ہے۔ یہ جو جوزی ہے نا اگر ذرا

سی بھی ٹپک دکھائے تو ایلے تو تحفوں کی بھرمار کھدے۔  
 ”اے ہوا سا کوٹ پن کر پھرتی ہے ڈر پیار سے ایلے سے  
 بات کر لے تو وہ شان دار کوٹ لے دے اسے خیر اب  
 تو جوزی بدل رہی ہے اور کچھ سوشل بھی ہوتی جا رہی  
 ہے۔ اگر جو ایلین جوزی سے شادی کر لے تو دارے  
 نیارے ہو جائیں جوزی کے ویسے پال کہتا تو صحیح ہے نا  
 کہ اوہ پاکستان میں تو شادیاں ہوتی ہیں سب کی مسلم  
 ہوں ہندو ہوں یا کرسچن سب شادیاں کر کے گھر  
 بساتے ہیں، لیکن یہ گورے بڑے ہوسیار ہیں۔ طلاق  
 کی صورت میں نقصان جو ہوتا ہے جس اسی لیے  
 شادی والا حصہ اپنی زندگیوں سے نکال دیا ہے بیوی تو  
 دل ہی جاتی ہے جب دل اکٹا جائے دھکا دے کر نکال دو  
 گورے سڑی لے آؤ، لیکن ہماری جوزی ایسی نہیں ہے  
 کہ ایلین کا دل بھر جائے یوں بھی ایلین کا دل آگیا ہے  
 جوزی پر اسی لیے تو کہتا ہے کہ میں اگر جوزی کو راضی  
 کر لوں تو وہ مجھے خوش کر دے گا۔“

اس نے مسکرائی نظروں سے جوزفین کی طرف  
 دیکھا جو اس کی سوچوں سے بے خبر غلام مصطفیٰ کے  
 متعلق سوچے جا رہی تھی۔ کرسس کی اس رات کے  
 بعد اس نے سینکڑوں بار غلام مصطفیٰ کے متعلق سوچا  
 تھا اور اسے سوچنا اس کے لیے دنیا کا سب سے اہم کام  
 تھا۔ غلام مصطفیٰ۔

گہری سیاہ بھنورا آنکھوں والا غلام مصطفیٰ پہلے  
 جس کی سیاہ آنکھوں نے اسے متاثر کیا تھا پھر وہ پورے  
 کا پورا اس کے دل میں اتر گیا تھا۔ پتا نہیں غلام مصطفیٰ  
 میں ایسا کیا تھا کہ اس کا بی بار بار اسے دیکھنے کو جاتا تھا۔



گئی۔ وہ دونوں چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگے تھے اور پھر مصطفیٰ کی نظریں اس پر پڑی تھیں اب وہ ہولے ہولے چلتا ہوا اس کے قریب آیا۔  
”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام!“ اس کی نظروں نے جیسے غلام مصطفیٰ کو حصار میں لیا تھا۔  
”کیسی ہیں آپ؟“ اس نے پوچھا تو وہ مسکرائی۔  
”خائن! آپ کیسے ہیں؟“

”خائن!“ وہ مسکرایا۔  
”خوش حال کیسی ہیں؟“ اب وہ اردو میں بات کر رہی تھی۔  
”ٹھیک اور خوش۔“ اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

”اور آپ کے پیار اور مہمانداری کیسے ہیں؟“  
”پیارا اور اماں بھی خوش اور گمن۔“  
اور وہ سوچنے لگی کہ اب وہ کیا بات کرے مصطفیٰ سے۔ وہ جو ہر روز اس سے ملنے کی دعا مانگ کر ہوتی تھی۔ آج وہ ملا تھا تو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کیا نہیں اس کے گھر میں ان کے علاوہ بھی کوئی اور ہے یا نہیں۔ خوش جمال نے یا شاید مصطفیٰ نے ہی بتایا تھا کہ ان کے گھر میں دو چاروں ہی ہیں۔

”ہمارے گھر میں ان کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔  
”بچن کی خیریت آپ معلوم کریں۔“

وہ جیسے اس کے دل کو پڑھ رہا تھا وہ جھینپ گئی۔  
”ویسے اچھی لڑکی! جب کسی لڑکے سے اور وہ بھی مجھ جیسے ہینڈ سم لڑکے سے ملتے ہیں تو صرف فیملی کی خیر خیریت نہیں پوچھتے کوئی اور بات بھی کر لیتے ہیں۔“  
اس کی آنکھوں میں گہری شرارت تھی۔ اس کے رخسار گل رنگ ہو گئے تھے۔ تب ہی مارگریٹ اسی طرح بھاگتی ہوئی واپس آئی اور اس نے بازو پھیل کر اپنی کلائی اسے دکھائی۔ جس پر مولے مار کر سے ڈیوڈ نے اپنے دستخط کیے تھے۔

کرسمس کی اس رات کے بعد اس نے سینکڑوں بار جیسنو ز اور پاک مریم سے اس کے دوبارہ ملنے کی دعا کی تھی اور اس روز وہ مارگریٹ کے ساتھ جاب کا پتا کرنے نکلی تھی۔ مارگریٹ اس کی پڑوسن تھی۔ وہ تقریباً اس کی ہم عمر تھی اور ایک اسٹور پر جاب کرتی تھی۔ مارگریٹ کی اہلی رہ رہی تھی۔ کچھ عرصہ قبل ہی اس کی اپنے پار خیر سے علیحدگی ہوئی تھی۔ دونوں قبل ہی پارک میں اس کی مارگریٹ سے ملاقات ہوئی تھی

اور اس نے جاب کے لیے بات کی تھی اور مارگریٹ نے بتایا تھا کہ اس کے اسٹور پر ایک سیلز گرل کی ضرورت ہے۔ سو وہ اس کے ساتھ اس کے اسٹور کے مالک سے ملنے کے لیے نکلی تھی وہ دونوں ٹوب اسٹیشن پر کھڑی تھیں جب اس نے غلام مصطفیٰ کو ڈیوڈ کے ساتھ کھڑے دیکھا تھا وہ نہ جانے کس بات پر ہنس رہا تھا۔ اور ہنستے ہوئے اتنا اچھا لگ رہا تھا کہ وہ میسوت سی ہو کر اسے دیکھنے لگی تھی۔ مارگریٹ نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا اور اسے چٹکی بھری۔

”دونوں ہی زبردست ہیں پر تیری نظریں کس پر ہیں؟“  
”تو وہ دوسرے کو میں اپنے لیے مائل ہوں۔“  
اس نے قہقہہ لگایا۔ تو وہ ہنستا کر اسے دیکھنے لگی۔  
مارگریٹ کی عادت تھی وہ ذرا ذرا سی بات پر اونچے اونچے قہقہے لگاتی تھی اور اکثر پارک میں لوگ چونک کر اسے دیکھنے لگتے تھے۔

”کون سا؟“ وہ پھر پوچھ رہی تھی اس کے ہونٹ ابھی تک تھوڑے کھلے ہوئے تھے۔  
”نہیں۔ نہیں۔“ وہ ہلکائی تھی۔

”وہ دراصل دونوں فٹ بال کے ہلکے ہیں۔ میں نے ان کے مہیچے دیکھے ہیں اور وہ ایک تو ہمارا پڑوسی ہے۔“

”ارے ہاں یہ تو ڈیوڈ ہے۔ ڈیوڈ کیسروں ڈیوی۔“  
آرٹھل کلب کا پرنس ڈیوی۔

مارگریٹ نے وہیں کھڑے کھڑے اسے آواز دی۔  
”ڈیوڈ!“ اور پھر تقریباً بھاگتی ہوئی اس کی طرف چلی



”وہ میں جاب پر جا رہی ہوں آج فرسٹ ڈے ہے  
تا تو اس لیے جلدی میں ہوں کہ کہیں لیٹ نہ  
ہو جاؤں۔“

”اوہ اچھا۔ کیسی جاب ہے آپ کی میرا مطلب  
ہے کہاں جاب ملی ہے آپ کو؟“ وہ اس کے سامنے  
سے ہٹ کر دائیں طرف ہو گیا تھا اور اب ساتھ ساتھ  
چلتے ہوئے اس طرح پوچھ رہا تھا جیسے پرانا واقف کار  
ہو۔

”ایک اسٹور پر سیلز گرل کی جاب ہے۔“ اس نے  
”کیا اس وقت تمہیں اسکول نہیں جانا ہوتا؟“ وہ

پوچھ رہا تھا۔  
”جب پاکستان میں تھی تو پڑھتی تھی وہاں میری  
ایک کزن ڈاکٹر تھی دو سہری سہیل بھائی بھی اس  
لئے پایا کا خیال مجھے بھی ڈاکٹر بنانے کا تھا۔ لیکن پھر ہم  
یہاں آ گئے اور اب مئی کتنی ہیں کہ مجھے بھی جاب کرنا  
چاہیے۔“ اس نے لمحہ بھر کے لیے رک کر مصطفیٰ کی  
طرف دیکھا تھا۔

”ہمارے گھر آج کل زیادہ جھگڑے میرے جاب نہ  
لے رہے ہو رہے ہیں۔“

”تو تمہارا کیا خیال ہے کہ تمہارے جاب کر لینے  
سے تمہاری مائی اور بابا میں لڑائی نہیں ہوگی۔“ وہ آپ  
سے تمہیں شائد نہ ہوں۔“

”پھر ہو سکتا ہے تمہاری مائی کوئی اور وجہ ڈھونڈ لیں  
لڑنے کی۔“ اس نے خیال ظاہر کیا تھا تو اس کے اندر  
اداسی کا غبار سا پھیل گیا۔

”تو کب دس یو ٹو گڈ لگ۔“ وہ اسٹاپ پر پہنچ گئے  
تھے۔

”اپنا خیال رکھنا۔ ہیو آنا اُس ڈے۔“

اس پر ایک نظر ڈال کر وہ واپس پلٹا تھا۔ اور اس کا  
دل خوشگوار انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔ وہ صرف اسے  
اسٹاپ تک چھوڑنے آیا تھا۔ ورنہ وہ تو سامنے جا رہا تھا

”لیکن جب تم ہاتھ لوگی تو یہ آؤ گراف مٹ جائے  
گا۔“

”تو؟“ مارگریٹ نے کندھے اچکائے۔ ”جب تک  
میں تب تک میں سب کو دکھا کر شماروں کی کہ  
مستقبل کے ڈیوڈ کو فوج کا ڈیوڈ ہیکم کہتا ہے۔“  
مصطفیٰ جانے کے لیے مڑ گیا تھا۔

”بے بافت ہار کو۔“ اس نے دوسری کلائی آگے  
برہنائی۔

”میرا نام غلام مصطفیٰ ہے۔“ مصطفیٰ نے مڑ کر کہا

تھا اور پھر تیز تیز چلنا ہوا ڈیوڈ کی طرف بڑھ گیا۔

”ہوں میں تو جیسے مری جا رہی ہوں تا اس کا آؤ  
گراف لینے کے لیے۔“

مارگریٹ نے ناگواری سے کہتے ہوئے بازو نیچے کر لیا  
تھا۔ اور مصطفیٰ کا وہ شرارت بھرا بک لکھی منہ سے  
گد گداتا رہا تھا۔

اور پھر دوسری بار وہ مصطفیٰ سے اسٹاپ پر جاتے  
ہوئے ملی تھی۔ اسے مارگریٹ کے اسٹور پر تو نہیں  
لیکن کسی اور اسٹور پر جاب مل گئی تھی۔ جو زیادہ دور  
نہیں تھا۔

جنوری کی وہ صبح بہت دھند آلود تھی۔ درجہ حرارت  
نقطہ انجماد سے نیچے تھا۔ وہ اپنے سیاہ لاٹک کوٹ کی  
جیبوں میں ہاتھ ڈالنے سر جھکائے تیز تیز چلتی ہوئی  
اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی۔ آج اس کی جاب کا پہلا  
دن تھا اور اسے ڈر تھا کہ وہ پہلے ہی دن لیٹ نہ ہو جائے  
اس لیے سر جھکا رکھا تھا اور اوھر اوھر سے بے نیاز جلی  
جا رہی تھی کہ سامنے سے آتے غلام مصطفیٰ سے  
ٹکرائی۔ اور جب اس نے سر اٹھایا تو بے اختیار اس  
کے لبوں سے نکلا تھا۔

”آپ!“

”جی۔ اور یہ آپ صبح صبح آندھی طوفان کی طرح  
کہاں بھاگی جا رہی ہیں؟“ مصطفیٰ نے اپنی گھور سیاہ  
آنکھیں اس کے چہرے پر جم رکھی تھیں۔

”ہاں اس کے متعلق سوچنا بڑے گک۔“ وہ لبوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ لیے اسے دیکھ رہا تھا۔  
”لیکن اگر تمہیں موسم پر گفتگو کرنا پسند ہے تو میں موسم کے متعلق بھی اچھی گفتگو کر سکتا ہوں مثلاً یہ کہ آج موسم بہت خوشگوار ہے۔ سردی کے باوجود ایسا لگ رہا ہے جیسے سارے میں چمک دار دھوپ پھیلی ہوئی ہو۔“

وہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی جب خوش جمال آتی دکھائی دی۔  
”تم کہاں چلے گئے تھے مصطفیٰ! میں تمہیں ادھر ڈھونڈ رہی تھی۔“  
”بعض اوقات بندے کو چیزیں وہاں نہیں ملتیں ڈیڑ فریڈ! جہاں ہم انہیں ڈھونڈتے ہیں۔“

”کیا بات ہے آج کل بڑی ذمہ داریاں سنبھالنے لگے ہو؟“ خوش جمال نے اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

”ہیلو جوزی کیسی ہو؟“ خوش جمال اس کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ اور مصطفیٰ کو جاگنگ ٹریک پر بوڑھے بھائے دیکھتے ہوئے اس صبح خوش جمال نے اس سے ڈھول باتیں کی تھیں۔ اپنے پیلا کی اماں کی اور مصطفیٰ کی۔ مصطفیٰ کو عظیم فٹ بالر کے روپ میں دیکھنا ہم سب کا خواب ہے۔“

”ہے۔ جوزی۔“ مار تھانے ناشتہ ختم کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لڑایا۔  
”تمہیں بال نے بتایا اس سنڈے کو ہمیں ایلن نے انوائسٹ کیا ہے۔“  
وہ چونک کر بال کی طرف دیکھنے لگی۔ ”پال ہوئے سے کھٹکارا۔“

”بات یہ ہے مار تھاکہ اس سنڈے کو جوزی نے کہیں جانا ہے۔ تو تم ایلن سے کہو اگلے سنڈے کا پروگرام رکھ لے۔“

”کیا بات ہے بھئی؟“ مار تھانے کھڑے ہوتے ہوئے تالی بجائی۔ ”بڑے پر نکل آئے ہیں۔ کس کے

اور وہ رخ موڑے اس وقت تک اسے دیکھتی رہی تھی جب تک وہ نظر آتا رہا تھا۔

اور مصطفیٰ سے تیسری ملاقات پارک میں ہوئی تھی۔ سنڈے تھا وہ گھر میں اکیلی تھی۔ پال اور مار تھاکہ بہت سویرے مارشل کے کمرے چلے گئے تھے۔ کیونکہ مارشل کچھ بیمار تھا۔ اس نے کھڑکی سے مارگریٹ کو پارک کی طرف جانے دیکھا تو خود بھی گھر لاک کر کے پارک میں آگئی تھی۔ مارگریٹ اکثر پارک میں جاگنگ کے لیے جاتی تھی۔

مارگریٹ کو اس نے جاگنگ کرتے دیکھا تو خود بیچ پر پہنچ گئی۔ پارک میں آج سردی کے باوجود کافی رونق تھی۔ زیادہ تر نوجوان اور بوڑھے جاگنگ کر رہے تھے۔

وہ اپنے ہاتھوں کو گرم کرنے کے لیے دونوں ہاتھ آپس میں رگڑ رہی تھی کہ کوئی اس کے پاس بیٹھ کر آکر بیٹھ گیا تھا اس نے چونک کر دیکھا وہ مصطفیٰ تھا۔

”اسلام علیکم!“ اسے اپنی طرف دیکھا پارک مسکرایا تھا۔  
”کیسی ہو مس؟“

”میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے آہستگی سے کہا اور اپنی ٹھنڈی ہوتی ناک کو چٹکی سے پکڑ کر اس کے ہونے کو محسوس کیا۔

”آج بہت سردی ہے۔“  
”ہوں ہے تو۔“ اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

”لیکن موسم کے متعلق گفتگو اجنبیوں میں ہوتی ہے یا پھر وہ بوڑھے جب ملتے ہیں تو عموماً ”گفتگو کا آغاز موسم سے ہوتا ہے“ جبکہ نہ میں بوڑھا ہوں نہ آپ کے لیے اجنبی۔“

اس نے کچھ پریشان سا ہو کر اس کی طرف دیکھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کیا بات کرے۔

”ہماری عمر کے افراد جب آپس میں ملتے ہیں تو بھلا وہ کیا بات کرتے ہوں گے۔“ اس نے بلند آواز سے سوچا۔



تیزی سے باہر نکلی اور ہاتھ نے ٹیبل پر رہ جانے والا چمچ اٹھا کر پال کی طرف پھینکا جسے پال نے پکڑ کر لیا۔  
 ”تم دسی پھسائی۔ ٹلی کے کیڑے۔“ مار تھا فل فارم میں آچکی تھی۔

”اور تم تو جیسے ملکہ وکٹوریہ کے خاندان سے ہو۔“  
 لیڈی ڈیانا کی سگی۔ گوجر انوائے کی بہنو۔

گھر سے نکلتے ہوئے جوزفین نے پال کو کہتے سنا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور پھر یہ آنسو ہماروں پر پھسل آئے۔ وہ سر جھکائے آنسو پونچھتی تیر خیز جاتی ہوئی اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی۔

روڈ کے اس طرف اپنی گاڑی کے پاس کھڑے غلام مصطفیٰ نے اسے گھر سے نکلتے ہوئے آنسو پونچھتے دیکھا۔ وہ روڈ کر اس کر کے اس طرف جانا چاہتا تھا اور پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کیوں رو رہی ہے؟ لیکن پھر اسے یاد آیا کہ جب اس کی ممی اور پیلا میں لڑائی ہوتی ہے تو وہ رو رہی ہے۔ لگتا ہے آج پھر جوزی کے ممی پیلا کی لڑائی ہو گئی ہے۔ اس نے سوچا اور اس وقت تک اسے دیکھتا رہا جب تک وہ نظر آتی رہی۔

اور اب وہ بے وقوف لڑکی اسٹاپ پر کھڑے کھڑے رو رہی ہوگی۔ اس پاس کھڑے لوگ اسے حیرت سے دیکھتے ہوں گے لیکن کوئی اس سے نہیں پوچھے گا کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔ اس نے گھر سے باہر آتی خوش جمال کو دیکھا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

\*\*\*

وہ بالکونی کی ریٹنگ پر دونوں ہاتھ ٹکائے سامنے دیکھ رہا تھا۔ سامنے روڈ کے اس طرف مکان اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ گھروں کے انٹرنس پر مدھم روشنی کے بلب جل رہے تھے۔ کہیں کہیں کسی گھر کی کھڑکیوں کے شیشوں سے ہلکی روشنی آ رہی تھی۔ اس کی نظریں جس گھر پر تھیں وہ مکمل اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں سرسکی سڑک ساکت اور سولی ہوئی لگتی تھی۔ وہ بہت دیر سے یونہی کھڑا تھا اس کی نظریں مکانوں کی کھڑکیوں سے ہونے

ساتھ ڈیٹ بر جا رہی ہو۔“  
 ”نن۔ نہیں۔“ جوزفین نے تھوک نکلی۔ ”وہ مجھے خوش جمال کے گھر جانا ہے۔ اس نے انوائٹ کیا تھا۔ مجھے۔ اور میں نے اس سے وعدہ کر لیا تھا تو۔“  
 ”اچھا!“ مار تھا کا اچھا بہت لمبا تھا۔

”دیکھو پال!“ اس نے تنہا ہی انداز میں انگلی اٹھا کر پال کی طرف دیکھا۔ ”میں نے تمہیں کہا تھا کہ اسے سمجھاؤ۔ وور رکھو اسے مسلمانوں سے۔ وہاں بھی اس کی دوستیاں مسلمانوں سے تھیں اور یہاں بھی اسے مل گئی خوش جمال۔ دیکھ لینا اپنی ماں کی طرح بھاگ کر کسی مسلمانوں سے نکاح پڑھوالے گی۔ اس کا جھکاؤ شروع سے ہی مسلمانوں کی طرف ہے اور اب دیکھ لیا تم نے بھی اس نے دوستی خوش جمال سے۔“  
 جوزفین گھبرائی سی کھڑی دستا نے اتار اور چڑھا رہی تھی۔

”جے سنو جوزی!“ مار تھا نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ ”میں نے بھی ایلن کی دعوت قبول کر کے اس سنوے کو اس کے ساتھ باہر جانے کا وعدہ کیا ہے۔ تم خوش جمال کو منع کرو۔“

جوزفین نے بے بسی سے پال کی طرف دیکھا پال نے اسے جانے کا اشارہ کیا اور ٹیبل سے ناشتے کے برتن اٹھا کر سنک میں رکھے لگا۔

”میں نے کیا کہا ہے جوزی! اس لیا ہے تا تم نے؟“  
 مار تھا اسے گھور رہی تھی۔

”ایلن سے وعدہ تم نے کیا ہے مار تھا؟“ پال سنک میں برتن رکھ کر مڑا۔ ”اس لیے تم ایلن کے ساتھ چلی جانا آؤ سنک پر اور جوزی نے خوش جمال سے وعدہ کیا ہے وہ خوش جمال کے گھر چلی جائے گی۔ دونوں اپنا اپنا وعدہ پورا کر لو۔“

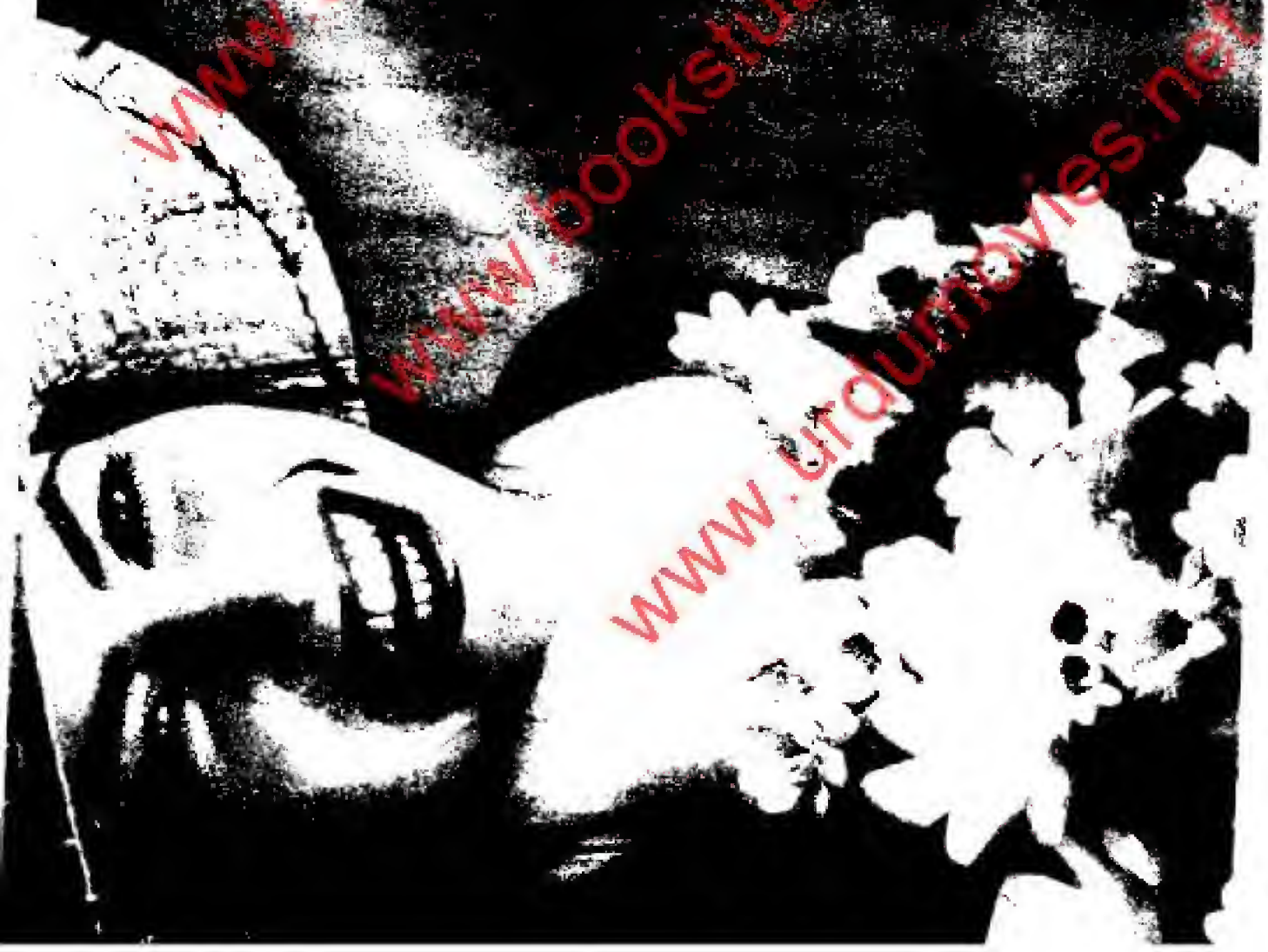
اب وہ کاؤنٹر سے ٹیک لگائے کھڑا تمسخر سے مار تھا کو دیکھ رہا تھا۔

”تم!“ مار تھا نے دانت پیسے۔ پال نے ایک بار پھر جوزفین کو اشارے سے جانے کے لیے کہا۔ جوزفین



# OSÉA

SILKY  
TALCUM POWDER



[www.urdutube.net](http://www.urdutube.net)  
[www.bookstube.net](http://www.bookstube.net)  
[www.urdumovies.net](http://www.urdumovies.net)





اس نے کئی بار ہمت ہار دی تھی۔ ہر بار فاطمہ اور محی الدین اس کی حوصلہ افزائی کرتے تو گڑیا بھی ان کے ہم قدم ہوتی۔ اسے ہاتھ پکڑ کر اٹھانے کا کام تینوں نے کیا۔

”تمہیں زندگی میں بہت سے مشکل مقامات سے گزرنا پڑے گا، لیکن تمہیں ہمت نہیں ہارنی بہت آگے تک جانا ہے۔“ محی الدین اس سے کہتے تھے۔ اپنے ساتھیوں کے رویے اسے ہرٹ کرتے تھے ڈیوڈ وہ واحد لڑکا تھا۔ جس سے اس کی دوستی ہوئی تھی۔ اس کا کلب میں وہ اس سے پہلے سے کھیل رہا تھا اور عمر میں بھی شاید اس سے تھوڑا بڑا تھا اس نے نہ صرف فٹ بال سے اسے خوش آمدید کہا تھا بلکہ دوستی کا ہاتھ بھی بڑھایا تھا۔ جبکہ دوسرے چند لڑکے اسے ناپسندیدگی سے دیکھتے تھے۔ لیکن اس کے کوچ فرگوسن کی وجہ سے کبھی کوئی بد مزگی نہ ہوئی تھی۔ فرگوسن ڈیوڈ اور مصطفیٰ پر بہت محنت کر رہا تھا۔

”میں ڈیوڈ بیکسم ملانی ہوں۔“ ڈیوڈ ایک خوش مزاج لڑکا تھا اور ہمیشہ خوش گمان رہتا تھا۔

”ایک دن آئے گا جب لوگ ڈیوڈ بیکسم کا کھیل بھول جائیں گے انہیں صرف ڈیوڈ کیسٹون یاد رہ جائے گا۔“ اسے یقین تھا۔

نوسالوں میں اس نے بے شمار میچز کھیلے تھے اور بے شمار کامیابیاں کھیلی تھیں اور اب نو سال بعد 2009 میں جب رونالڈو مائچسٹرونائیٹنڈ سے علیحدہ ہو رہا تھا تو وہ سائن کرنے جا رہا تھا۔ مائچسٹرونائیٹنڈ نے اس کے ساتھ چار سال کا معاہدہ کرنا طے کیا تھا۔ اور صبح اسے معاہدہ سائن کرنا تھا۔ لیکن ابھی یہ خبر اخبارات تک نہیں پہنچی تھی۔ لوگ ابھی رونالڈو کے جانے کا غم منارہے تھے۔ فٹ بال کا شہزادہ لندن چھوڑ کر جا رہا تھا اور جوزے نے بڑی ذہانت سے ڈیوڈ اور غلام مصطفیٰ کو امروچ کیا تھا۔ وہ بہت عرصہ سے ان پر نظر رکھ رہے تھے۔

وہ محی الدین کا خواب پورا کرنے جا رہا تھا لیکن پھر

روڈ پر پھیل کر پھر نئے سرے سے کھڑکیوں پر جاکھنیں وہ وہاں کیوں کھڑا تھا؟ نہیں جانتا تھا۔

کیا سوچ رہا تھا؟ شاید کچھ بھی نہیں۔

اتر کرے میں بیٹھے بیٹھے یکایک ہی اس کا دل بے حد گھبرا رہا تھا۔ اور وہ بالکونی کا دروازہ کھول کر سانس لے کر کھڑا ہو گیا تھا۔ لندن کا آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ کھڑے کھڑے اس کے ہاتھ سن ہو چکے تھے۔ اس نے ریٹنگ سے ہاتھ اٹھائے تو اسے لگا جیسے انگلیاں اکڑ گئی ہوں۔ اس نے دونوں ہاتھوں کو زور زور سے رگڑ کر گرم کرنے کی کوشش کی۔ اور پھر ایک نظر سامنے والے مکان پر ڈال کر وہ واپس مڑا اور کمرے میں آکر بالکونی میں کھلنے والا دروازہ بند کر کے آرام کرسی پر گرما گیا۔ کمرے میں خوشگوار سی حدت تھی۔ کچھ دیر بعد اس کا سن ہوا چہرہ اور ہاتھ نارمل ہو گئے۔

بالآخر بابا کا خواب پورا ہو گیا تھا۔ وہ مائچسٹرونائیٹنڈ کی جری بننے والا تھا۔

ایلیکس نے اس کے لیے آٹھ نمبر کی جری سلکٹ کی تھی اور ڈیوڈ کے لیے سات نمبر کی دونوں ہی ٹرائل میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اور اس روز بابا نے اسے گلے لگاتے ہوئے اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا تھا۔

”آج میرا خواب پورا ہوا جو میں نے عبداللہادی کے لیے دیکھا تھا اور جسے تم نے پورا کیا غلام مصطفیٰ! آج یقیناً ہادی کی مدد خوش ہوگی۔ اب میں نور محشر ہادی سے کہہ سکوں گا۔“

”دیکھو عبداللہادی وہ خواب جو۔ ہم تم کو کھا کرتے تھے۔ اسے تمہارے ہادی نے پورا کر دیا۔ نو سال۔ ایک طویل مدت۔“

وہ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس سرد ملک میں آئے نو سال بیت گئے تھے۔ ان نو سالوں میں اس نے محی الدین کا خواب پورا کرنے کے لیے ان تھک محنت کی تھی۔ اور نو سالوں کے اس سفر میں۔



ایسے ہی خیال رکھتی تھی بلکہ پہلے سے بھی زیادہ اس نے مصطفیٰ کا ہر وہ کام بھی اپنے ذمہ لے لیا تھا جو پہلے فاطمہ کرتی تھی۔ دونوں کے درمیان دوستی کا ایک بہت گہرا اور پاکیزہ رشتہ بھی بن گیا تھا۔ اگر کوئی مصطفیٰ سے پوچھتا کہ تمہارا سب سے گہرا دوست کون ہے تو وہ بے دھڑک کہتا۔ ”خوش جمال!“ اور خوش جمال نے بھی غلام مصطفیٰ کے علاوہ کسی اور کو گہرا دوست نہیں بنایا تھا۔ ملنے ملائے اور تعلق والے بہت تھے لیکن دوست صرف غلام مصطفیٰ ہی تھا۔

”تم ایکسائینڈ ہو رہے ہو مصطفیٰ! کیونکہ صبح تمہیں مایوس کرنا بیٹنڈ سے معاہدہ سائن کرتا ہے۔“ اس نے لاؤنج میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

”ہاں شاید!“ مصطفیٰ بھی بیٹھ گیا۔ ”لیکن میں ایکسائینڈ سے زیادہ ادا ہوں پتا نہیں کیوں۔“ خوش جمال نے ایک لمبی نظر اس پر ڈالی۔ اس کی بے حد خوبصورت سیاہ آنکھوں میں ملا کا اضطراب تھا اور وہ بہت بے چین اور مضطرب لگ رہا تھا۔

”تمہیں اپنا گھر اور اپنے پایا یاد آ رہے ہیں مصطفیٰ۔“

ایک افسردہ سی مسکراہٹ مصطفیٰ کے لبوں پر نمودار ہو کر معدوم ہو گئی۔ لیکن اس نے خوش جمال کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔

خوش جمال اٹھ کر لاؤنج سے ملحق کچن میں چلی گئی اور کچھ ہی دیر بعد وہ بھاپ اڑاتی کافی کے دو گک اور ساٹھ میں کاہو اور لیٹنٹ کے چار لے کر آگئی تھی کافی نیپل پر رے رکھ کر اس نے کافی کا کپ مصطفیٰ کو پکڑایا۔

”ہاں تو تم ادا ہو مصطفیٰ اور یہ کوئی ان نیپل بات نہیں ہے ہر خوشی کے موقع پر اپنے یاد آتے ہیں۔ ہر دم ہر دکھ میں ان کا خیال آتا ہے۔ وہ جو پھڑکے انہیں بھلایا تو نہیں جاسکتا مصطفیٰ! اماں! پایا اور میں تمہیں باکر عبد السادی کو تو نہیں بھولے وہ ہر وقت ہر لمحہ تمہیں یاد دلاتا ہے۔“ مصطفیٰ کی آنکھوں کی حیرت واضح

بھی اس کا دل بے طرح ادا تھا۔ بہت دیر تک وہ یونہی بے چین سا ٹانگیں پیارے بیٹھا رہا۔ کبھی وہ آرام کرسی کی پشت پر سر رکھ دیتا اور کبھی سیدھا ہو کر بیٹھ جاتا۔ یونہی بیٹھے بیٹھے اسے جوزی کا خیال آ گیا۔

جوزی جو گھر سے باہر آکر اس لیے روٹی بھی کہ اس کی مٹی اور ڈیڑی میں اس کی وجہ سے لڑائی ہوتی تھی۔ مٹی جو سوتلی تھیں۔ ماں تو ماں ہوتی ہے پھر بتائیں وہ سوتلی کیوں ہوتی ہے اسے مشاغل کی مٹی یاد آ گئیں۔ جو صرف مشاغل اور سنی کی مٹی تھیں۔ حالانکہ پایا نے کہا تھا۔ ”یہ تمہاری مٹی ہیں یاد۔“

لیکن وہ اس کی مٹی نہیں سمجھیں۔ اس کے اندر دور تک گہنی گھلتی چلی گئی پھر اسے پایا یاد آ گئے۔

پایا جنہیں مشاغل کی مٹی سے اس کی شکایتیں سن کر غصہ آتا تھا اور پھر وہ اسے ڈانٹتے تھے ’مارتے تھے۔ لیکن بعد میں شاید انہیں افسوس بھی ہوتا ہو گا۔ تب ہی تو اس راستہ سے ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے اور پایا اس سے ناراض ہی دنیا سے چلے گئے تھے۔

اس کی آنکھیں جلتے لگیں تو وہ اٹھ کر بیڈ پر لیٹ گیا۔ دیر وہ یونہی مضطرب سا کروٹیں بدلتا اور سونے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا اور دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ اور چند لمحوں بعد وہ خوش جمال کے کمرے کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ خوش جمال نے دروازہ کھول کر حیرت سے اسے دیکھا۔ ”سنو خوش جمال مجھے نیند نہیں آ رہی۔ آؤ باتیں کریں۔“

خوش جمال مسکرائی اور مڑ کر بیڈ سے دوڑنا اٹھایا اور باہر نکل آئی۔ وہ ایسی ہی تھی۔ وہ کتنی بھی جھکی ہوئی ہوتی مصطفیٰ کو اس نے بھی کسی کام سے نہ نہیں کہا تھا۔ جب وہ چھوٹی تھی اور گھر بھر کی گڑیا تھی تب بھی وہ مصطفیٰ کا ایسے ہی خیال رکھتی تھی۔ اور جب وہ کلج میں آگئی تو اس نے سب سے کہہ دیا کہ اب کوئی اسے گڑیا نہ کہے وہ بڑی ہو چکی ہے۔ اور اس کا نام بہت خوب صورت ہے۔ خوش جمال۔ تب بھی وہ مصطفیٰ کا



کیونکہ مہی نے میرا روم اسے دے دیا تھا۔ وہ اچھی لڑکی تھی خوش جمال! وہ اپنی مہی جیسی نہیں تھی۔“ پتا نہیں کیوں اسنے سالوں بعد وہ اسے یاد آگئی تھی۔

”اس نے مجھ پر بہت بار احسان کیا تھا۔“  
اب وہ اسے بتا رہا تھا کہ کب کب اور کس کس طرح مشاغل اس کی مدد کرتی تھی۔ اور خوش جمال دونوں باتوں کی انتہیوں پر چڑھ نکائے اسے سن رہی تھی۔ اس کے لیے مصطفیٰ کو سننا شاید دنیا کا سب سے اہم کام تھا اور وہ یہ اہم کام کر رہی تھی۔ اور یہ آج سے نہیں تھا ہمیشہ سے تھا اسے مصطفیٰ سے بات کرنا اسے سننا اچھا لگتا تھا۔ شروع شروع میں جب وہ سوچ سوچ کر ٹھہر کر بات کرتا تھا تب بھی اس کا بولنا اسے اچھا لگتا تھا اور جب وہ روانی سے بات کرنے لگتا تب بھی۔ جب محی الدین چلی بار اس کا ہاتھ پکڑے گھر میں داخل ہوئے تھے تو اس نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

”یہ تمہارا بھائی ہے۔ اور یہ اب یہاں ہی رہے گا۔“

اور اس نے خوشی سے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا تھا اور وہ ہمیشہ اس کا ہاتھ تھامے رکھنا چاہتی تھی یہ اس وقت وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ بہت سہا ہوا اور خوف زدہ لگتا تھا۔ بہت پیارا تھا۔ اور اس کی آنکھیں بہت خوب صورت تھیں۔ گہری سیاہ آنکھیں۔ عبدالمادی کے بعد وہ بہت اکیلی ہو گئی تھی۔ عبدالمادی اس کا بہت خیال رکھتا تھا اور بہت پیارا کرتا تھا۔ حالانکہ وہ خود بہت بڑا نہیں تھا۔ لیکن وہ اس کے ناز بڑے بھائیوں کی طرح ہی اٹھاتا تھا اور وہ اسے بھول ہی نہیں پاتی تھی بھول سکتی بھی نہیں تھی جب اس کی سہیلیاں اپنے بھائیوں کی باتیں کرتیں تو اس کے اندر برسات ہونے لگتی اس کا بھائی نہیں تھا۔ موت نے اسے اس سے جدا کر دیا تھا۔ وہ سر جھکائے اپنی نم پلکیں اپنی سیلیوں سے چھپانے کی کوشش کرتی تھی۔ عبدالمادی سے وہ ہر بات کرتی تھی وہ اس کی ہر بات چھوٹی سے چھوٹی اور

تھی۔  
اس نے ابھی سوچا تھا کہ اگر میں خوش جمال سے کہوں گا کہ مجھے اپنے پاپا اور ماما یاد آرہے ہیں تو شاید اسے برا لگے شاید وہ سوچے کہ مجھے لال اور بابا کی محبت میں کوئی کمی محسوس ہوتی ہے اور یہ۔۔۔ یہ لڑکی کتنی بڑی جاو کر ہے کیسے اس کے دل کی ہر بات جان لیتی ہے اور یہ صرف آج کی بات نہیں تھی ہمیشہ سے ہی وہ اس کے دل کی بات جان لیا کرتی تھی۔

”مگر ہمیں ہمارے اپنے یاد آتے ہیں تو یہ تو بچہ لال ہے۔ وہ تو ہمارے وجود کا حصہ ہوتے ہیں مگر ان کی یاد سے ہماری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں تو ہمیں خود کو رونے سے منع نہیں کرنا چاہیے۔ تم اگر رونا چاہتے ہو تو رولو اچھا ہے تمہارے اندر اس وقت جو ٹھن ہے وہ ختم ہو جائے گی جیسے ہلکی برس جائیں تو آسمان صاف ہو جاتا ہے۔“

اس نے آہستہ سے سر ہلایا اور اس کی آنکھوں میں نمی پھیلنے لگی۔

”ہاں خوش جمال! مجھے پاپا بہت یاد آرہے ہیں اور ماما بھی۔“ اس نے اعتراف کیا۔

”یہ اس کا حق ہے تم پر کہ تم انہیں یاد کرو۔ اگر چند بار وہ تم سے خفا ہوئے تھے تو بہت بار انہوں نے تمہارے لاڈ بھی اٹھائے ہوں گے۔ اگر تم بھی انہوں نے تمہیں بار اٹھا تو بہت بار انہوں نے تمہیں پیار بھی کیا ہوگا۔ تم چاہو تو ان کی یاد میں مجھ سے شیر گز سکتے ہو مصطفیٰ!“

خوش جمال کو بات کرنے کا قرینہ آتا تھا اس نے پھر سر ہلایا اور گھونٹ گھونٹ کافی پیئے ہوئے پانی کی باتیں کرنے لگا۔ ماما کے متعلق اسے بہت کم یاد تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی کوئی بات ذہن میں آجاتی تھی تو وہ اسے خوش جمال کو بتاتا۔ خوش جمال بہت دھیان سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

جب بابا نے شاہی کی تو وہ نئی مہی کے ساتھ آئی تھی۔ مشاغل۔ لیکن مجھے اس کا آنا اچھا نہیں لگتا تھا۔



جار ہے تھے اسفند اور وہ ایک مشترکہ پروجیکٹ پر کام کر رہے تھے اس پروجیکٹ میں ان کے ساتھ سانچی اور علی بھی تھے اسفند لندن میں ہی پیدا ہوا تھا اور بہت سچا کھرا اور صاف گو تھا۔ وہ سیدھی بات کرتا تھا بغیر کسی ہیر پھیر کے۔

”سنو خوش جمال!“ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

”مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے؟“  
 ”ہاں کہو!“ وہ چلتے چلتے اپنی فائل کی ورق گردانی بھی کر رہی تھی اسے ان مینوں سے وہ پوائنٹ ٹیکسٹس کرنے تھے جو رات ہی اس نے تیار کیے تھے۔

”میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تم مجھ سے شادی کر دو؟“

پہلے اس کے فائل کی ورق گردانی کرتے ہاتھ رکے تھے پھر قدم ٹھہرے تھے۔ اس نے اسفند کی طرف دیکھا۔ وہ ایک اسپارٹ لڑکا تھا، بکے ٹھنکریا لے بالوں اور خوب صورت آنکھوں والا وہ ذہن اور سنجیدہ سا بھی تھا۔ اس نے کبھی اسے فضول سرگرمیوں میں ملوث نہیں دیکھا تھا۔ وہ بلاشبہ ایک بہترین انسان تھا۔

”خوش جمال! ہر روز جب میں سہیں دیکھتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ تم ہی وہ لڑکی ہو جسے میری زندگی کا سانچا بننا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ یہ کیا ہے۔ صرف پسندیدگی یا محبت، لیکن ہرگز روتے دن کے ساتھ میرے اندر یہ خواہش شدت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ تم! صرف تم ہی وہ لڑکی ہو خوش جمال! جو میری زندگی میں اجالے بکھیر سکتی ہو۔“

اور خوش جمال نے کھلی ہوئی فائل کے درمیان انگلی رکھی اور فائل بند کر کے کچھ دیر اسے دیکھتی رہی اسفند ایسا تھا کہ کوئی بھی لڑکی اسے اپنی زندگی میں شامل کر کے فخر محسوس کرتی۔ اس وقت اس کی جگہ یہاں کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید خوشی سے کھیل اٹھتی۔ لیکن وہ ساکت کھڑی بھی اس کے دل میں کہیں کوئی ارتعاش پیدا نہیں ہوا تھا۔ وہ معمول کی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔

بے معنی بات بھی بہت توجہ سے سنتا تھا اور اب عبدالہادی نہیں تھا تو اس کے اندر باتوں کا ایک ڈھیر جمع ہو گیا تھا۔ وہ اماں اور بابا سے یہ باتیں کبھی نہیں کر سکی تھی اس لیے نہیں کہ وہ اسے چاہتے نہیں تھے اور اس کا خیال نہیں رکھتے تھے بلکہ اس لیے کہ ان کے پاس وقت نہیں ہوتا تھا۔ بابا گھر آتے تو تھکے ہوئے ہوتے تھے اور اماں کو تو عبدالہادی کے دکھنے اور سو کر دینا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا۔ وہ آج ہی وہ ساری باتیں اس سے شیئر کرے وہ سب بتائے جو ہادی کو بتایا کرتی تھی۔ اچی سیلیوں کی باتیں اور اپنے پیچرز کی۔ اسے اپنی اہم دکھائے اپنے اسکمچوز دکھائے جو اس نے عبدالہادی کے بعد بنائے تھے۔

لیکن بابا نے کہا تھا کہ وہ بیمار تھا اور کمزور ہے ابھی اسے آرام کرنے دو۔ وہ اس سے تقریباً ”ایک سال چھوٹا تھا۔ اس نے سوچا تھا وہ اس کا ایسے ہی خیال رکھے گی۔ جیسے عبدالہادی اس کا خیال رکھتا تھا۔ اور وہ اس کا خیال رکھنے لگی یوں گویا اس کا سایہ بن گئی ہو۔ جب جب وہ رویا اس نے اس کے آنسو پونچھے وہ ڈگمگایا تو ہاتھ تھام کر اسے کھڑا کیا۔

ایک وقت آیا کہ وہ بھی اس کا ایسا ہی خیال رکھنے لگا جیسے وہ رکھتی تھی۔ وہ اگر اس کی فکر کرتی تھی تو اسے بھی اس کی فکر ہوتی تھی سو وہ اس کے لیے پریشان ہوتی تو وہ بھی اس کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتا تھا۔ ذرا سا فلو ہوتا اسے تو اس کے کمرے میں بیٹھا رہتا اور ایک روز جب وہ سارا کے کمرے آ رہی تھی تو ایک سسٹن گلی میں ایک لڑکے نے اس کا دھڑا کھینچا اور پرس چھین لیا۔ اتفاق سے مصطفیٰ نے گلی میں داخل ہوتے اسے دیکھ لیا اور مار مار کر اس کا حشر کر دیا۔ اور اس روز اسے لگا تھا کہ اب مصطفیٰ نہ صرف اپنا خیال رکھ سکتا ہے بلکہ اس کا بھی رکھ سکتا ہے اور اس روز لمحہ بھر کے لیے اس کے ذہن میں آیا تھا کہ انہیں۔ ان تینوں کو بھی الدین قاطعہ اور وہ انہیں کسی اور شخص کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ ان کے پاس مصطفیٰ ہے۔ سو یونیورسٹی میں بھی اس کی کسی اور کے ساتھ خاص دوستی نہ تھی۔ لیکن اس روز اسفند اور وہ لب کی طرف



”خوش جمل!“ اسفند کی آواز بہت خوب صورت تھی۔ ”تم اگر میرے بارے میں مزید جانا چاہو۔ جتنا تم جانتی ہو اس سے زیادہ تو پوچھ سکتی ہو۔ میرے ڈیڈ ڈاکٹر ہیں اور ماماؤس ڈاکٹر۔“

اب بھی وہ ساکت کھڑی تھی، لیکن اس نے اسفند کے چہرے سے نگاہیں ہٹائی تھیں۔

”تم چاہو تو کچھ وقت لے لو۔ سوچ لو۔ میرے متعلق کچھ معلوم کروانا چاہو تو کروالو۔“

”سوری اسفند! میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔“ اسفند کا رنگ پھیکا رہ گیا تھا۔ اسے خود پر یقین تھا کہ کوئی لڑکی اسے رد نہیں کر سکتی، بھلے وہ خوش جمل ہی کیوں نہ ہو۔

”وہ کون خوش نصیب ہے خوش جمل؟“ اسفند کی آواز دھیمی تھی شکست خوردہ سی۔

”مصطفیٰ!“ مصطفیٰ کا نام غیر ادوی طور پر بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ وہ خود بخود شہر کی رہ گئی تھی، لیکن دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئی تھیں۔ وہ دھڑکنیں جو یونی کی بے شمار لڑکیوں کے آئینہ دار اور بہرہ کے پروپونزل پر کس سے مس نہیں ہوئی تھیں۔

صرف مصطفیٰ کا نام لینے پر اودھم مچائے ہوئے تھیں۔ وہ دل پر ہاتھ رکھے وہاں ہی کھڑی رہ گئی تھی اور وہ سر جھکائے آگے بڑھ گیا تھا۔ اس روز مصطفیٰ کے لیے اس کے دل میں موجود احساس کے معنی بدل گئے تھے اور اس کی محبت کے جس رنگ میں وہ رہ گئی ہوئی تھی اس پر کسی نے ہولناکے رنگ پھینک دیے تھے جیسے اب مصطفیٰ کی طرف اس کی نگاہیں اٹھیں تو ان میں جلنے دیے کسی الوہی محبت کی روشنی کی لودھتے۔ لیکن مصطفیٰ کو ابھی تک ان بدلتے رنگوں کا احساس نہیں ہوا تھا۔ وہ بے طرح مصروف رہتا تھا۔ پڑھائی، کلب، سیر اور وہ پڑھائی ختم کر کے جاب بھی کرنے لگی تھی اور فاطمہ کو اب اس کی شادی کی فکر نے گھیر لیا تھا۔ لیکن وہ ہر آنے والے رشتے کے لیے منع کر دیتی۔

”ابھی نہیں ملاں پلیز کچھ دن اور مچھا مصطفیٰ! ماچسٹر یونیورسٹی جوائن کر لے پھر۔“

اور اب نہ صرف مصطفیٰ، ماچسٹر یونیورسٹی کا حصہ بن گیا تھا، بلکہ چار سال کا معاہدہ کرنے بھی جا رہا تھا، وہ اب بھی شادی کے لیے تیار نہیں ہو رہی تھی۔

گھڑی نے تین کا گھنٹہ بجایا تو مصطفیٰ نے چونک کر خوش جمل کی طرف دیکھا جو دائیں ہاتھ کی کبھی گھنٹے پر ٹکائے دائیں ہاتھ کی پتیلی میں ٹھوڑی ٹکائے چمکتی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”سوری خوش جمل! تین بج گئے اور مجھے احساس ہی نہیں ہوا۔“

”مجھے تمہیں سننا اچھا لگ رہا تھا۔ پہلی بار تم نے مشاغل اور اپنے بابا کے متعلق مجھ سے اپنی باتیں کیں، ویسے مشاغل دیکھنے میں کیسی تھی۔“

”وہ بہت باریک تھی“ اس کی آنکھیں اور بال سنہری بال بھورے تھے اور اس کا کھڑا ہمارے جیسا فیر نہیں تھا بلکہ سافٹ تھا، لیکن وہ بال کے پریوں جیسے فراک پنے بالکل کسی فیئر نیل کی ایک دل چری لگتی تھی، جب رات کو اپنی مٹی سے چوری جیسے کچھ کھانے کو دینے کے لیے میرے کمرے میں آئی تھی۔“

مصطفیٰ کے ہونٹوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”اگین سوری خوش جمل! کہہ میں نے تمہاری نیلہ خراب کی۔“

”نیلہ خراب خراب نہیں ہوئی، لیکن تم نے بار بار سوری کر کے مجھے تکلیف دی ہے۔“ اس کے لہجے سے دکھ جھلکتا تھا۔

”نہیں۔“ مصطفیٰ نے خوب کر اس کی طرف دیکھا۔ ”اگر تمہیں میرے سوری کرنے سے تکلیف ہوئی ہے تو میں اپنا سوری واپس لیتا ہوں۔ میں تمہیں بالکل بھی تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا اور میں زندگی میں کبھی بھی تکلیف دینا نہیں چاہوں گا۔ تم بابا اور اماں۔ میں تکلیف دینے سے پہلے خود مر جانا پسند کروں گا خوش جمل! یہ ہمیشہ یاد رکھنا۔“ وہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔

”میں جانتی ہوں مصطفیٰ! ہمارے درمیان سوری اور تھینک یو والی کوئی بات نہیں ہے۔ ہمارا ایک



ایک لے آتے ہیں اور اہل کچھ گھر میں بنالیتی ہیں اور ہم چاروں مل کر ایسے ہی ایک دو سرے کا برتھ ڈے سیلیبریٹ کرتے ہیں۔ لیکن اس بار اس نے اسے بھی بلایا تھا اور اس نے اس کے لیے بست خوب صورت چھوٹی سی کرسٹل کی باسکٹ لی تھی جسے مار تھا ہتھیا چکی تھی۔ یہ اس کی بد قسمتی تھی کہ مار تھانے اسے گھر سے نکلے دیکھ لیا تھا اور پھر ہاتھ پکڑ کر تقریباً کھینچتی ہوئی اندر لے آئی تھی اور اگر وہ ضد کر کے چلی بھی جاتی تو اس کا مطلب ایک زبردست لڑائی۔ لڑائی جس سے وہ گھبراتی اور ڈرتی تھی۔ اس لیے وہ بیٹھی ہوئی تھی اور اپنے کمرے میں جانے کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی اور مار تھا کی چپھتی نظریں جیسے اس کے اندر چھید رہی تھیں، لیکن وہ وہاں بیٹھنے پر مجبور تھی۔ خوش حال سے تو خیر وہ معذرت کر لے گی اور اس کے لیے نیا گفٹ خرید لے گی، لیکن مصطفیٰ کو وہ کیسے دیکھ جائے گی وہ تو اسے سیشن کی وجہ سے ہفتوں آتا تھا ایک آدھ دن کے لیے اور یہ زباں ایسا تھا جس پر اس کا دل تڑپ رہا تھا اور آنکھیں اسوں سے بھری جاتی تھیں۔ آج کل وہ دو جگہ کام کر رہی تھی کیوں کہ پال پاکستان جانا چاہتا تھا، لہذا پتا تھا ان سے ملنے کے لیے اور اسے نکلتے کے لیے پیسے جمع کرنا تھے وہ بہت تنگ جاتی تھی اور اب پتا نہیں مار تھا کتنی دیر اسے بٹھائے رکھتی۔

وہ ہونٹ پیچھے ابھی تک اسے دیکھ رہی تھی۔ ایک سال سے اس نے اس سے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ جوی کو اس کے ساتھ رہے پر رضی کر لے گی اب تو ایلن بھی بے زار نظر آنے لگا تھا بلکہ اس کی گرل فرینڈ بھی اس کے ساتھ رہ رہی تھی مار تھا کے بار بار فون کرنے پر وہ آتا تھا اور وہ بھی خالی ہاتھ، لیکن وہ مار تھا بھی۔ جانتی تھی کہ اگر آج جوی ایلن پر مریاں ہو جائے تو وہ پہلے جیسا ایلن بن جائے اس نے اس کی آنکھوں میں اب بھی جوی کی طلب دیکھی تھی۔ یہ طلب ختم نہیں ہوئی تھی۔ ذرا سی دیا سلائی دکھانے کی ضرورت تھی، لیکن یہ جوی۔ اس نے دانت پیسے۔

دوسرے پر حق ہے تم چاہو تو ساری رات مجھے جگا سکتے ہو اور اگر میں کہوں کہ تم ساری رات یہاں کھڑے رہو تو مجھے یقین ہے تم کھڑے رہو گے۔

”ہاں تمہارا یقین درست ہے یہیں کھڑا رہوں گا۔“ مصطفیٰ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”ساری رات بغیر کوئی گگہ شکوہ کیسے“ اور میں تمہیں اس طرح کھڑا کرنے پر ہرگز سوری نہیں کہوں گی جیسے آج تم نے کہا۔

”اچھا کہانا میرا سوری واپس کرو۔“

”نہیں۔ اسے میں کسی اور موقع کے لیے رکھ لیتی ہوں سنبھال کر جب تم سوری نہ کرو اور مجھے لگے کہ تمہیں مجھ سے سوری کرنا چاہیے تھا۔“

”تم بہت عجیب ہو خوش حال۔“ وہ ہنس دیا۔

”اوکے اب تم جا کر کچھ دیر سو جاؤ۔ نو بجے تک تمہیں اولڈ ٹریفک کے لیے نکلنا ہے۔“

”ٹھیک ہے گڈ نائٹ سوئیٹس ریمز۔“

اس نے خوش حال کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں دے سے جگمگا رہے تھے اور وہ ہونٹوں پر بڑی الوہی سی مسکراہٹ لیے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے دیکھنے میں کچھ تھا۔ کچھ مختلف۔ لیکن کیا؟ وہ سمجھ نہیں پایا اور اپنے بیدار کی طرف بڑھ گیا۔

مار تھا ٹانگ ٹانگ رکھے بیٹھی تھی اور اس کی تیز نظریں جو زمین کے اندر تک اتر رہی تھیں۔ اس کی نظروں میں بلا کی چھین اور جو زمین بے حد بے چینی محسوس کر رہی تھی اس کا بی چاہ رہا تھا کہ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی جائے، لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اگر وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تو یہ بات مار تھا کے موڈ کو اور بھی خراب کرے گی۔

اسے مصطفیٰ کے گھر جانا تھا۔ آج خوش حال کا برتھ ڈے تھا اور خوش حال نے اسے بتایا تھا کہ مصطفیٰ صرف اس کا برتھ ڈے دس کرنے کے لیے گھر آ رہا ہے اور یہ کہ وہ کوئی برتھ ڈے وغیرہ نہیں مناتے بس بابا



”پال! تم نے تو آنکھیں بند کر رکھی ہیں، لیکن میں تمہاری طرح آنکھیں بند نہیں کر سکتی۔ آنکھیں کھولو پال۔“

بال نے اپنی بند ہوتی آنکھیں پوری کوشش سے کھولیں اور صوفے پر بڑے وال پیمپر ایک طرف کرتے ہوئے صوفے پر گر سا گیا۔ وہ دونوں سے کام پر نہیں جا رہا تھا۔ پورے گھر میں وال پیمپر لگانے اور مرمت کرتا تھی۔ کئی جگہ کاپینٹ خراب تھا سو وہ سارا دن بیٹھ کر ہنگامہ کر رہے تھے۔ چکا تھا اور صرف آرام کرنا چاہتا تھا۔ تھکن دور کرنے کے لیے اس نے کچھ زیادہ میٹھی لی تھی اور بستر لیٹا ہی تھا کہ مار تھا کی آواز سن کر اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ مار تھا بھی اس کی پوری دشمن تھی اسے اپنا دوسرا چھوٹی اینٹوں والا گرجے سے منسلک گھر یاد آیا۔ اس کا سرخ ران اور ڈھیروں پھول۔

”تم صرف آپس بھر سکتے ہو بال! اپنی بیٹی کو نہیں روک سکتے جو صبح و شام اس لڑکے کو مصطفیٰ کے گھر کے چکر لگاتی ہے۔“ مبالغے میں بھی مارتھاں کمال حاصل ہے۔ جوزفین نے سوچا۔ ”چکر چلا رکھا ہے اس نے مصطفیٰ کے ساتھ۔“

صطفیٰ کے نام پر جو زمین کی ایک دھڑکن جیسے  
 مس ہوئی تھی اور اندر در تک خوشبو سی بکھر گئی تھی۔  
 "مارتھا! خوش جمال اس کی فریڈ ہے تم خواہ  
 لازم تراشی مت کیا کرو۔" وہ وال پیپر کا ایک ٹکڑا اٹھا  
 کر ڈیزائن دیکھنے لگا۔

”ہاں ہاں، خوش جمال اس کی دوست ہے احمق  
آوی خوش جمال کا تو پرہ ہے، اس کی آڑ میں یہ اس  
مقام مصطفیٰ سے ملتی ہے کب تک آنکھوں پر پٹی  
باندھے رکھو گے۔“

”میں! وہ مصطفیٰ تو بہت کم گھر پر ہوتا ہے۔ وہ تو کوالیفائنگ راولونڈز کے میچوز میں بڑی رہتا ہے اور میں تو خوش جمال۔۔۔“ جوزفین نے وضاحت کرنے کی کوشش کی۔

اگرچہ وہ دو تین بار ایلین کے ساتھ باہر گئی تھی، لیکن وہ ایلین سے بے تکلف نہیں ہو سکی تھی۔ بہت دیر گھومنے کے بعد مارتھا نے اس کے چہرے سے نظرس ہٹائیں تو اس نے سکون کا سانس لیا۔

”سنو جوزی! ہم پاکستان میں نہیں رہتے۔ سو جیسا  
 ویسا بھیں۔“ اس کا لہجہ نرم تھا، لیکن لبوں پر بڑی  
 براسرار سی مسکراہٹ تھی۔ ”اب تم اپنا ٹھکانا کر لو۔  
 ہم کب تک تمہارا بوجھ اٹھا میں گئے۔“

”لیکن میں۔“ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ ”میں ایک سال سے توجا ب کر رہی ہوں اور ساری پے آپ کو دیتی ہوں اپنے رہنے اور کھانے کا بل۔“

”برہنہ دو۔ بی بی یہ یہ ملے۔“ مارتھانے اس کی بات کالی۔ ”ہمارے سر سواری مت کرو۔ جدھر جی چاہے جاؤ۔ چاہو تو این کے پاس چلی جاؤ بس ہمارے گھر سے نکلو۔“

”کس کو گھر سے نکال رہی ہو اور تم؟“ پال نے  
 ملاؤنچ میں قدم رکھا اور پھر اس کی نظر جو زمین پر پڑی جو  
 سہمی ہوئی اسے دیکھ رہی تھی اور اس کے رخساروں پر  
 آنسو بہ رہے تھے۔

"جوزی کو۔" پال نے جوزفین کی طرف اشارہ کیا اور پھر وہ لڑکھاتا ہوا مار تھا کے سامنے جا کھڑا ہوا۔  
 "تم۔۔۔ یہو جیکم تم نکل جاؤ اس گھر سے۔" اس نے باہر کی طرف اشارہ کیا۔  
 "اور آج کے بعد میری بیٹی کو گھر سے نکلنے کے لیے مت کہنا ورنہ۔"

”ورنہ کیا؟“ مار تھا چمک کر بولی۔  
 ”میں مارشل سے کہہ کر تمہارے کاغذات ضائع  
 کروا دوں گا اور پھر تم دیکھتی رہنا انگلینڈ میں رہنے کے  
 نواب۔“ مار تھا ایک لمحہ کے لیے دھمک سی رہی۔  
 اس کا پاسپورٹ اور سارے لیگل ڈاکیومنٹس مارشل  
 کے پاس تھے۔ اور آج کل میں انہیں برٹش پاسپورٹ  
 ملنے والے تھے۔ پال نے ٹھیک اس کی دیکھتی رنگ پر  
 تھہر رکھا تھا۔ اس نے فوراً ”چیترا لدا۔“



”تو کیا میں جھوٹ بولی رہی ہوں۔“ مارتھا نے غصے سے کہا تو غیر ارادی طور پر جوزفین کا سر اثبات میں ہل گیا۔

”کیا؟“ مارتھا نے اٹھ کر اسے بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ ”کیا میں جھوٹی ہوں؟“

”مہی پلیز، میرے بال چھوڑیں۔“ اس نے بال چھڑانے کی کوشش کی۔ تکلیف سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”چھوڑ دو۔ چھوڑ دو میری بیٹی کو، نہیں تو میں پولیس کو فون کرتا ہوں کہ تم میری بیٹی پر تشدد کر رہی ہو؟“ پال اٹھتے ہوئے دھاڑا۔

اس نے ایک جھٹکے سے اس کے بال چھوڑے۔ وہ صوفے کی پشت سے ٹکرائی۔

”تمہیں مسئلہ کیا ہے مارتھا؟“ وہ جوزفین کے قریب آیا تھا اور اس کے بالوں کو ہولے ہولے سٹاربا تھا۔

”مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے مسئلہ تمہیں ہو گا پال! جب یہ اس مصطفیٰ سے شادی کر لے گی۔ اپنی ماں کی طرح مسلمان سے عشق اس کے خون میں ہے۔ پادری کی پوتی ہو کر جب یہ شادی رچا لے گی اس سے تو ہمارے ہی نہیں ہمارے پورے خاندان کے منہ پر کالک ٹپ جائے گی۔“

وہ سچ کہہ رہی تھی اسے غلام مصطفیٰ سے عشق تھا اور یہ عشق آج تو نہیں ہوا تھا اسے لگتا تھا جیسے اس عشق کا بیج بہت پہلے اس کے دل کی زمین پر نمویا جا چکا تھا شاید اس کی پیدائش سے پہلے جب روخص خلق ہوئی تھیں۔ اور اب تو جڑیں پھیل چکی تھیں اور وہ ایک تناور درخت بن گیا تھا لیکن یہ بات وہ مارتھا سے یا پال سے نہیں کہہ سکتی تھی

”بس اب اور کچھ مت کہنا ورنہ ایک لگاؤں لگا۔ منہ شیرھا کر دوں گا تمہارا۔“ نشے میں آکر وہ بہاؤ ہو جاتا تھا۔ مارتھا صرف اسے گھور کر رہ گئی۔

”میں اپنی بیٹی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ ایک جی کر سچن ہے۔ پیور عیسائی۔“ غیر ارادی طور پر

جوزفین نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔ ”اور یہ بھی جانتی ہے کہ اس کا دادا پادری ہے۔ پورے ضلع کے کر سچن اس کی عزت کرتے ہیں۔“

اس نے بست مان سے جوزفین کی طرف دیکھا اور اس کے اندر جلتے دیے بھڑک کر بجھے تھے اور شدت کرپ سے اس نے آنکھیں میچتے ہوئے نچلا ہونٹ دانتوں تلے کچلا۔

اس ایک سال میں وہ بہت بار خوش جمال کے گھر گئی تھی لیکن مصطفیٰ سے صرف چند بار ملاقات ہوئی تھی اور ہر بار اس کا نقش پہلے سے زیادہ گہرا ہوا تھا اور ہر بار اسے لگا تھا جیسے وہ مصطفیٰ کو صدیوں سے جانتی ہو۔ وہ سب سے مختلف تھا۔ ایلن، ڈیوڈ، مری سب سے مختلف اس کی آنکھوں سے پسندیدگی جھلکتی تھی لیکن ان میں ہوس کا رنگ نہیں تھا۔ شفاف، پاکیزہ آنکھیں۔ سلیبی ہوں باتیں۔

”ہوں!“ مارتھا نے تیز نظروں سے دونوں کی طرف دیکھا اور پھر کھٹ کھٹ کر لی ہوئی باہر چلی گئی۔

”منو جوزی!“ پال اس کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔ ”میں نے پاکستان فون کیا تھا زری ایک بار روزی کو فنی تھی۔ روزی کے پاس اس کا نمبر ہے۔ اس نے دیا تھا، لیکن اسے یاد نہیں کہ اس نے کہاں لکھا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی تلاش کرے گی۔ بس مل گیا تا تو پھر تم چلی جانا اپنی مہی کے پاس۔“ اس نے ہلکی سی۔

”یہ عورت۔۔۔ یہ کسی روز تمہیں بچ دے گی۔“ اس نے گالی دی۔ ”یہ اس قابل نہیں تھی کہ ایک پادری کی ہونٹ کو جیرا لے لے کی بھنو۔ ایک دم جھوٹی نکار۔“ اس نے پھر گالی دی۔

”کہتی ہے تم خوش جمال سے ملنے نہیں جاتی ہو۔ مصطفیٰ کے ساتھ ڈیٹ پر جاتی ہو۔ میں دیکھتا ہوں اسے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

وہ اٹھ کر تیزی سے دروازے کی طرف اپکا۔ ”نہیں پاپا۔ پلیز نہیں۔“ جوزی نے دوڑ کر اسے پکڑا۔

”بیچھے بنو۔ مت رو کو مجھے۔ وہ عورت تمہاری



دشمن ہے۔

اس نے ہاتھوں سے جوزفین کو پیچھے کیا، لیکن خود لڑکھڑا کر نزدیکی صوفے پر گر گیا اور پھر وہاں ہی ڈھیر ہو گیا۔ جوزفین نے جلدی سے اس کے سر کے نیچے کٹھن رکھا۔ اس کے جوتے اتارے اس کے پاؤں سوچے سوئے تھے۔ وہ شوگر کا مریض تھا اور میٹھی پر سارا دن کھڑا رہ کر کام کرتا رہا تھا۔ جوزفین ہولے ہولے اس کے پاؤں دبائے لگی۔

”غلام مصطفیٰ۔ کیسا لڑکا ہے جوزفین؟“ پال نے

پوچھا۔

”بہت اچھا پلیئر ہے۔ آپ نے اس کے میچوز دیکھے ہیں نا۔“

”ہاں، لیکن پلیئر کے علاوہ۔“

”اچھا ہے۔ اس کے باا، اماں اور خوش جمال سب بہت اچھے ہیں۔ آپ یقین کریں میں خوش جمال سے ملنے جاتی ہوں۔ وہ اپنے میچوز میں مصروف رہتا ہے۔ بس کبھی کبھی گھر ہوتا ہے۔“

”ہاں۔ تم اپنا مذہب چھوڑے بغیر بھی اس سے شادی کر سکتی ہو، لیکن دیکھو۔“ اس نے نگلی لی۔

”تم پھر بھی اس سے شادی نہیں کرو گی۔“

”نہیں کروں گی بابا! اسے کچھ دیر پہلے پال کی اپنی طرف سے دیکھتی نظر میں یاد آئیں۔“

”تم اچھی لڑکی ہو۔ مجھے تمہیں تمہاری مہی کے پاس سے نہیں لانا چاہیے تھا۔“

اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ ہولے ہولے کچھ کہہ رہا تھا۔ جوزفین کی سمجھ میں نہیں آیا تھا وہ اب اس کے بازو دبا رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر اس کے رخساروں کو بھگور رہے تھے وہ رو رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے اور غلام مصطفیٰ کے

راستے الگ ہیں ان کی منزل کبھی ایک نہیں ہو سکتی لیکن پھر بھی وہ اندھا دھند اسی راستے پر بھاگتی جا رہی تھی یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ بے دم ہو کر راستے میں ہی گر جائے گی، کبھی اس تک نہیں پہنچ پائے گی۔ وہ خود کو روک نہیں پا رہی تھی۔

پال، اس کا تایا، مارشل، اس کے دوسرے بچے، پھوپھیاں اور اس کا دادا جو پادری تھا گونئی بھی پسند نہیں کرے گا کہ وہ ایک مسلمان سے شادی کرے، لیکن وہ اس دل کا کیا کرتی جو ہمک، ہمک کر مصطفیٰ کی طرف لپکتا تھا۔ اس کے آنسو زیادہ تیزی سے بننے لگے۔ پال نے ذرا سی آنکھ کھول کر اسے دیکھا اور اسے اندر کہیں اور اک ہوا کہ وہ کیوں رو رہی ہے، لیکن وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تنہا نہیں تھا اس کا پورا ایک خاندان تھا۔ سب اٹھ کھڑے ہوتے ان کے خلاف اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور بے بسی کا ایک گہرا احساس اس کے اندر پھیلتا چلا گیا۔

\*\*\*

مارچ کے ان آخری دنوں میں لندن کا موسم بہت خوشگوار تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی اولڈ ٹریفک سے آیا تھا۔ اگلے چند دنوں میں کیا ہونے والا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا۔ سلیکٹر کے منتخب کرنے والے تھے، لیکن جلد ہی یورپین چیمپئنز لیگ کے لیے کھلاڑیوں کے ناموں کا اعلان ہونے والا تھا۔ وہ بہت پر امید تھا۔ پہلے سارے میچوز میں اس کی کارکردگی بہت اچھی رہی تھی۔ اخبارات نے اسے سراہا تھا اگرچہ اسے کچھ مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا۔ ابتدائی میچوز میں اس کے خلاف ”بائی“ کے نعرے بھی لگے تھے، لیکن محی الدین نے کہا تھا اسے کنویر نہیں بدنامی لوگ ایک دن تمہیں تسلیم کریں گے۔ مائچسٹرو ٹائیٹنڈ کے میچوز نے بھی اسے حوصلہ دیا تھا۔ کچھوں نے اس کی نظر صرف اہلیت پر تھی اس کے نزدیک اہم یہ تھا کہ مائچسٹرو ٹائیٹنڈ نے جیتنا ہے ڈیوڈ کی کارکردگی انگلش پریمر لیگ اور مائچسٹرو ٹائیٹنڈ چیمپئنز لیگ میں کچھ اچھی نہیں رہی تھی جس کا اسے بے حد افسوس تھا۔

ڈیوڈ اس کا واحد دوست تھا گو وہ چاہتا تھا کہ دونوں یکساں کامیابیاں حاصل کریں۔ اتنے بہت سارے مصروف دنوں کے بعد آج اس کا ارادہ آرام کرنے کا تھا۔ محی الدین، فاطمہ اور خوش جمال کچھ دیر پہلے ہی



سیف اللہ کے گھر گئے تھے، لیکن اس نے محی الدین سے کہا تھا کہ وہ کچھ دیر آرام کر کے ڈیوڈ سے ملنے آجائے گا۔ ڈیوڈ پچھلے کئی دنوں سے اس سے کترا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے یقیناً کوئی پریشانی ہے۔ اس نے کلائی موڑ کر وقت دیکھا چار بج رہے تھے۔ وہ کچھ دیر آرام کر سکتا تھا۔

پھر بیڈ پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں، اسے پتا ہی نہیں چلا اور اس کی آنکھ لگ گئی۔ دو بارہ جب اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا تھا۔ کچھ دیر تو وہ یونہی لیٹا اندھیرے میں دیکھتا رہا۔ پھر یک دم اٹھ بیٹھا۔ اسے تو ڈیوڈ کی طرف جانا تھا۔ نیکی کے پاس بڑا فون اٹھا کر اس نے مسیح چیک کیے۔ خوش حال کے دو تین مسیح تھے۔ اس نے پوچھا تھا کہ وہ گھر ہے یا ڈیوڈ کی طرف اور یہ کہ اگر اس کا موبائل جائے تو وہ انگل سیف اللہ کی طرف آجائے۔ وہ دروازے کے ساتھ ہی کریں گے۔ اس نے خوش حال کے مسیح کا جواب دیا اور پھر جلدی جلدی تیار ہو کر لاک وغیرہ چیک کیے اور گھر سے باہر نکل آیا۔ باہر اسٹریٹ لائٹیں جل چکی تھیں۔ لاک سے چابی نکال کر باکٹ میں ڈالتے ہوئے وہ عمارت اس کی نظر خوزفین کے گھر پر پڑی اور اس نے دیکھا جوڑی اپنے گھر کے گاؤن کی طرف سے آ رہی تھی وہ ادھر ادھر تھا۔ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

یہاں اس اسٹریٹ پر موجود تمام گھروں کے مین دروازوں کے اطراف میں چھوٹے چھوٹے لائن تھے یا گارڈن اور ان کے گرد لکڑی کی باڑھیں اور لکڑی کا ہی دروازہ تھا وہ بہت دنوں بعد اسے دیکھ رہا تھا اس وقت وہ جینز کے اوپر ایک کھلی سی شرٹ پہنے ہوئے تھے اور اس کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔

وہ ایک ہاتھ سے بال پچھے کرتی ہوئی اس کے گھر کی طرف آ رہی تھی اور دھن دھن سے پیچھے مڑ کر بھی دیکھنے لگتی تھی۔ وہ جوں ہی سڑک پر اس گھر کے اس کے گھر کی طرف بڑھی وہ اندھیرے سے روشنی میں آگیا اور اسے سلام کیا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

”وہ میں خوش حال کی طرف آئی تھی۔“ وہ اکثر

اس کے سامنے بات کرتے ہوئے گھبرا جاتی تھی۔ ”وہ سب تو گھر پر نہیں ہیں۔“ اس نے واپسی سے اسے دیکھا، لیکن سب کے گھر پر نہ ہونے کا سن کر وہ کچھ پریشان ہو گئی تھی۔

”کوئی پر ابلم؟“ اس نے پوچھا۔

”اوہ ہاں۔ وہ گھر میں ایلین تھا اور۔“

”تو تم اس سے بھاگی ہو۔“

اس نے ثبات میں سر ہلایا۔ ”وہ لاؤنج میں مئی سے باتیں کر رہا تھا میں بچن کے دروازے سے نکل کر آگئی کہ کچھ دیر خوش حال کے پاس۔“

”بچو ان کے آنے تک ہم واک کرتے ہیں۔“ وہ

اس کے مسائل جانتا تھا۔ خوش حال بتاتی رہتی تھی۔

”آپ کیسے جا رہے تھے؟“ اس کے ساتھ ساتھ

چلتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”ہاں مجھے ڈیوڈ کی طرف جانا تھا۔“

”وہ آپ کا انتظار کر رہا ہوگا۔“ وہ اب اپنی اسٹریٹ

سے نکل کر دو سری اسٹریٹ میں چل رہے تھے۔

”اسے علم نہیں ہے میرے آنے کا۔ سو کل چلا

جاؤں گا۔“

مصطفیٰ نے اس کی طرف دیکھا اسٹریٹ لائٹ کی

روشنی میں اس کے سنہری بال مکمل بھورے بالوں جیسا

رہے تھے اور اس کے چہرے پر انوکھی سی خوشی تھی اور

یہ بات مصطفیٰ نہیں جانتا تھا کہ اس کے ساتھ اس

طرح چلنا اس کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں تھا۔ وہ

اس وقت بالکل بھول چکی تھی کہ اس کے گھر جانے

کے بعد کیا ہوگا۔ وہ اس وقت مار تھا یا ایلین کے متعلق

نہیں سوچنا چاہتی تھی وہ اس وقت صرف اس خوشی کو

محسوس کرنا چاہتی تھی جو غلام مصطفیٰ کے ساتھ چلتے

ہوئے اس کے رگڑے میں رقص کر رہی تھی۔

”اور جب ہم گھر واپس جاؤ گی جو تمہیں جانا ہے تو

تمہاری ہاٹو لائیں گی تم سے۔“ مصطفیٰ نے کہا۔

”ہاں! وہ مسکرائی۔ ”کسی خوشخوار ملی کی طرح بچے

جھاڑ کر پیچھے بڑ جائیں گی، لیکن زیادہ مسئلہ نہیں ہوگا“

تب تک پایا آجائیں گے اور وہ سنبھال لیں گے مئی



”کون۔“

”یعنی تیروں کا رخ ان کی طرف ہو گا۔“ مصطفیٰ نے  
چلتے چلتے رک کر اسے دیکھا۔

”آؤ وہاں بیٹھتے ہیں۔“ وہ ایک اسٹور کے چبوترے  
پر بیٹھ گئے۔ اسٹور بند تھا اور اوپر چلتے بلبوں کی روشنی  
سیدھی ان پر پڑ رہی تھی۔

”وہیے تمہارے پاپا کو ایک کرسچن عورت سے  
شادی نہیں کرنا چاہیے تھی۔“ اس نے خیال ظاہر  
کیا۔

”دراصل میری مہی کے بعد پاپا کو ان سے میرا  
مطلب ہے مارتھا مہی سے محبت ہو گئی تھی شاید۔  
وہیے اگر آپ کو کسی کرسچن لڑکی سے محبت ہو جائے  
تو کیا آپ اس سے شادی کریں گے؟“ جوزفین نے  
حوالہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”پتا نہیں۔ یہ تو محبت ہونے کے بعد ہی بتایا  
جاسکتا ہے کہ اس کی شدت کتنی ہے اور ہم اس محبت  
کی خاطر کتنا آگے تک جاسکتے ہیں۔ کیا وہ اتنی شدید  
ہے کہ میں اس کی خاطر اپنے والدین کا دل دکھا سکتا  
ہوں؟ میرا نہیں خیال کہ میں کبھی پاپا اور ماں کا دل  
دکھاؤں گا۔“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”اے بہت مشکل ہوتا ہے والدین کا دل دکھانا  
محبت قربان کر کے یا دل دکھا کر۔“

اسے بھی بال بال کا خیال آیا تھا۔ کیا وہ کبھی پاپا کا مان  
توڑ سکتی ہے۔ شاید نہیں۔

اس کی آنکھوں میں پھل گئی مصطفیٰ نے بغور  
اسے دیکھا۔ بھورے بالوں اور سنہری مائل بھوری  
آنکھوں والی وہ لڑکی جو بہت خوب صورت نہیں تھی  
لیکن جس کی ساقوں کی رنگت میں بلا کی ملاحیت تھی اور  
جس کی آنکھوں کا غم اور ان میں بکھرے اداسی کے  
رنگ اسے متاثر کرتے تھے۔ یہ رنگ جانے کیجئے  
تھے۔

اس غم سے اس کی برسوں پرانی یاری تھی۔ کبھی  
اس کی آنکھوں میں بھی اواسی کے ان رنگوں نے  
ڈیرے جھار کھے تھے۔ اسے اپنا اور اس کا درد مشترک

لگا۔

”جب تمہاری مہی کی ڈنڈہ ہوئی تو تم کتنی بڑی  
تھیں؟“

”نہیں، میری مہی کی ڈنڈہ نہیں ہوئی۔ ان کی  
علیحدگی ہو گئی تھی۔ مہی نے کسی اور سے شادی کر لی  
تھی۔“ اس نے سر جھکا لیا تھا۔ جیسے یہ کوئی بہت غلط  
بات تھی۔

”اوہ!“ مصطفیٰ کے لبوں سے نکلا۔ ”اور تمہاری  
مہی۔ کیا وہ تم سے ملتی ہیں؟“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا اور کھڑی  
ہو گئی۔

”چلیں۔“

”کیا پاپا چلا گیا ہو گا؟“ وہ بھی کھڑا ہو گیا۔  
”پتا نہیں لیکن پاپا آگئے ہوں گے۔“ وہ دونوں  
ایک بار پھر چلتے گئے تھے۔ دونوں خاموش تھے۔

”سنو جوزی!“ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ دائیں طرف  
کی گلی سے نکل کر ڈیوڈ نے اس کے کندھے پر ہاتھ  
مارا۔

”ہے مصطفیٰ!“

”اوہ ڈیوڈ! تم کیسے ہو۔ مجھے آج تمہاری طرف آنا  
تھا، لیکن پھر۔“ غیر ارادی طور پر اس نے جوزفین کی  
طرف دیکھا۔

”اے!“ ڈیوڈ نے جوزی کی طرف اشارہ کیا۔  
”ONE NIGHT STAND“ اور حلق

پھاڑ کر ہنسا۔  
مصطفیٰ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ ڈیوڈ اوہرا دھر

لڑکھار رہا تھا۔ وہ نشے میں تھا۔ یقیناً اس نے بہت زیادہ  
پی رکھی تھی۔

”یہ جوزی ہے۔“ اس نے بمشکل خود پر قابو پاتے  
ہوئے کہا۔

”اچھا جوزی۔“ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے  
دیکھا۔ ”جوزی۔ وہ ایلین کی محبوبہ۔“

”شٹ اپ!“ جوزفین کے منہ سے بے اختیار  
نکلا۔



کے لیے اس نے تیزی سے قدم اٹھائے اور پھسل گئی۔ مصطفیٰ نے یکدم مڑ کر اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔ اور اب وہ اس کا ہاتھ پکڑے تیز تیز چل رہا تھا۔ اور جوزفین کو لگا جیسے یہ اس کی زندگی کا سب سے خوب صورت دن پھر اس کی زندگی میں بھی نہیں آئے گا۔ کاش۔ وقت یہیں ٹھہر جائے اور وہ یونہی مصطفیٰ کا ہاتھ تھامے بارش میں بیٹھنے ہوئے چلتی رہے اور زندگی ختم ہو جائے اس کے دل نے بے اختیار خواہش کی، لیکن بھلا ایسی خواہشیں بھی کبھی پوری ہوئی ہیں؟ وہ اپنی اسٹریٹ میں داخل ہو چکے تھے۔ مصطفیٰ نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

”تو کیا نہیں ہو اس کی محبوبہ؟“ اس کی آواز بھی لڑکھڑاہی تھی۔ مصطفیٰ نے تاسف سے اسے دیکھا۔ ”ڈیوڈ! تم نشے میں ہو۔ اس طرح تم خود کو جہاں کر رہے ہو۔ تمہیں اتنی زیادہ ڈر تک نہیں کرنا چاہیے، جبکہ سچ کل میں عیم کے لیے کھلاڑیوں کا انتخاب ہونے والا ہے۔“

”جھا!“ ڈیوڈ نے عجیب نظروں سے اسے دیکھا۔

”تمہیں تو جوزف عیم کا کپتان بنا رہا ہے نا۔ تم خوش ہو جاؤ۔“ اس نے قہقہہ لگایا۔

”اس وقت تم نشے میں ہو۔ ڈیوڈ میں صبح تم سے بات کروں گا۔“

”کسی کا رہا ہوا تحفہ واپس نہیں کیا جاتا لڑکی!“ وہ کب واپس کرنا چاہتی تھی وہ تو اسے ہمیشہ اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی۔ ”لیکن مکی۔ جی۔ وہ۔ مکی۔“ اس کے منہ سے بے رہا اور بالکل جملہ نکلا اور مصطفیٰ لمحے کے ہزاروں حصے میں بات کی تہہ تک پہنچ گیا اور اس نے جیکٹ تھام لی۔

”جاؤ۔ جاؤ۔“ ڈیوڈ نے اسے ہلکا سا دھکا دیا۔ مصطفیٰ نے جوزفین کی طرف دیکھا اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور وہ سہمی ہوئی لگ رہی تھی۔ وہ جو سوچ رہا تھا کہ ڈیوڈ کو گھر تک پہنچا دے اس کا گھر یہاں سے چند رہ منٹ کی واک پر تھا۔ جوزفین کو دیکھ کر اس نے ارادہ بدل دیا اور جوزفین کے ساتھ قدم آگے بڑھا لیے۔

وہ شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی، لیکن لفظ اس کے اندر ہی جم ہو گئے تھے اور آنکھیں جھلملا گئی تھیں۔ ”تمہیں شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ خوشی کسی سے بعض رشتوں میں شکریہ اور سوری تکلیف دیتے ہیں۔“

”میں ڈیوڈ کو شکرم ثانی ہوں۔“ ڈیوڈ نے چلا کر کہا۔

”اور مجھے “جوزے“ عیم سے باہر نہیں کر سکتا۔“

مصطفیٰ کا دل اس کے لیے دکھا۔ سننے میں آ رہا تھا۔ کہ جوزے ڈیوڈ کو عیم سے باہر کرنے والا ہے۔ شاید ڈیوڈ نے بھی سن لیا تھا۔ اور یہ شاید اسی کارروائی تھا۔ وہ دونوں اب فٹ باٹھ رہے تھے ڈیوڈ پیچھے رہ گیا تھا۔ صبح موسم بہت خوشگوار تھا، لیکن یکایک آسمان پر بادل چھا گئے تھے اور ابھی وہ اپنی اسٹریٹ سے دور ہی تھے کہ ایک دم تیز بارش نے انہیں آلیا۔ تیز تیز چلتے ہوئے مصطفیٰ نے اپنی جیکٹ اتار کر اسے دی۔

”لیکن!“ وہ جھجکی۔

”رشتہ کیا مصطفیٰ سمجھتا ہے کہ ان کے درمیان کوئی رشتہ ہے؟“ اس کے اندر یکدم پھول کھلے تھے اور ساتھ ہی آنسوؤں کی برسات ہوئی تھی۔ اور بھیگی پٹکیں لمحہ بھر کے لیے مصطفیٰ کی طرف اٹھی تھیں۔ مصطفیٰ اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ بھیجے ہوئے بھورے بال اس کی پیشانی اور رخساروں سے چٹنے ہوئے تھے اور پانی کے کچھ قطرے اس کے بالوں اور پیشانی پر اتر گئے تھے اور آنکھوں میں جھلملاتے دے یکدم مہابیوں میں ڈوب گئے تھے اس سے پہلے کہ یہ پانی پٹکیوں کی حدیں توڑ کر رخساروں تک آتا وہ یک دم تیزی سے مڑی اور دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔

”یہ بہن جو جوزی۔!“ مصطفیٰ نے نرمی سے کہا۔ وہ یونہی گھریلو کپڑوں میں ایلین کے آنے پر کچن کے راستے سے نکل آئی تھی۔ جیکٹ لیتے ہوئے اس نے شکریہ ادا کیا تو مصطفیٰ لمحہ بھر رک گیا تاکہ وہ جیکٹ پہن لے۔ وہ اس سے چند قدم پیچھے تھی اس کے برابر پہنچنے



مصطفیٰ لمحہ بھر وہاں ہی کھڑا رہا۔ اس کا دل جیسے ان جھلسلاتی آنکھوں میں اٹک گیا تھا۔  
یہ لڑکی اسے اچھی لگتی تھی۔

”یہ محبت تو نہیں ہے؟“ اس نے خود سے پوچھا۔  
”ہاں شاید یہ محبت ہی ہے۔“

گھر کا لاک کھولتے ہوئے اس نے اعتراف کیا اور گھر میں داخل ہو گیا۔



محی الدین قاطمہ اور غلام مصطفیٰ تینوں لاؤنج میں بیٹھے تھے اور خوش حیلان یکن سے لاؤنج اور لاؤنج سے یکن کے چکر لگا رہی تھی۔ پورے گھر میں چاروں طرف خوشی اور مسرت کا احساس بکھرا ہوا تھا۔ قاطمہ کی آنکھیں نم تھیں مگر وہ نہ ہی منہ میں کچھ بڑھ بڑھ کر مصطفیٰ پر پھونک رہی تھی۔ محی الدین کی تم آنکھیں بھی بار بار مصطفیٰ کی طرف اٹھتی تھیں اور پھر وہ فوراً ہی نظرس جھکا لیتے تھے کہ کہیں مصطفیٰ کو ان کی نظر ہی لگ جائے۔ کچھ دیر پہلے وہ مصطفیٰ سے ملے اور اسے مبارکباد دیتے ہوئے جذباتی ہو گئے تھے۔ اگرچہ انہوں نے خود کو سنبھال لیا تھا، لیکن پھر بھی آنکھیں بار بار بھرتی تھیں اور یہ خوشی و تشکر کے آنسو تھے۔

خود مصطفیٰ کو ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ایسا ایک بار بھی نہیں سوچا تھا کہ اپریل میں ہونے والے 2010-2011 کے یورپن چیمپئنز لیگ کے لیے جس ٹیم کا انتخاب کیا جائے گا۔ اس کی کپتانی کا سر اس کے سر رکھا جائے گا۔ انٹرنیشنل کلب کی جرسی پہنائی کسی اعزاز سے کم نہ تھا کہ اب اسے ایک اور اعزاز مل گیا تھا۔ اس نے تو صرف یہ چاہا تھا کہ جب ٹیم کے کھلاڑیوں کا نام اناؤنس ہو تو اس میں اس کا بھی نام شامل ہو۔

اس ایک سال سے زیادہ عرصے میں اس نے بے شمار میچز کھیلے تھے اور حیرت انگیز گول داغے تھے اور کچھ ایوارڈ بھی ملے تھے اسے تاہم کچھ تعصب ضرور پایا جاتا تھا کہ جب ورلڈ پلٹو آف دی ایئر کے لیے فیفا

ایوارڈ روٹی کو دیا گیا تو کچھ صحافیوں نے دبے لفظوں میں اس کا نام لیا تھا۔ لیکن اسے کوئی افسوس نہیں ہوا تھا۔ روٹی بہترین کھلاڑی تھا۔ اور اب بھی اگر کپتانی اسے سونپی جاتی تو اسے افسوس نہ ہوتا۔ لیکن یہ ایک غیر متوجع خوشی تھی جو اسے ملی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

”تم اس کے حق دار ہو۔“ جوزے نے اس کے کندھے جھپکے تھے۔ ”یہ پہلا موقع ہے کہ ماسچسٹر یونائیٹڈ نے کسی پاکستانی کھلاڑی کو جتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم ہماری امیدوں کو نہیں توڑو گے۔ اور مجھے ماسچسٹر یونائیٹڈ کی انتظامیہ کے سامنے شرمندہ نہیں کرو گے۔“ اور وہ جان گیا تھا کہ ایسا جوزے کی وجہ سے ہوا ہے۔ وہ ذرا بھی متعصب نہیں تھا۔

”مجھے آج تمہارا بھائی بہت یاد آ رہا ہے۔ اور مجھے خوشی ہو رہی ہے تمہاری اس کامیابی پر۔“ آرسل کلب کا میجر فرگوسن بھی اس وقت وہاں ہی تھا۔ ”وہ اگر زندہ رہتا تو ایک عظیم فٹ بالر تھا اس کے شاٹ شاندار تھے اور رفتار حیران کن میں اس کی زندگی کا وہ آخری گول کبھی نہیں بھول پاؤں گا۔“ اس نے سر جھکا کر عبداللہادی کو خراج تحسین پیش کیا تھا۔

ڈیوڈ کا نام ان کھلاڑیوں میں شامل نہیں تھا مصطفیٰ کو افسوس ہوا تھا کہ اس کا دوست تھا۔ وہ اسے تسلی دینا چاہتا تھا اس کا حوصلہ بڑھانا چاہتا تھا کہ وہ ہمت نہ ہارے۔ وہ اسے ڈھونڈتا تھا اس بیٹج تک آیا تھا جہاں وہ مایوس دل شکستہ ساسر جھکائے بیٹھا تھا۔ ”ڈیوڈ!“ اس نے اس کے قریب جاتے ہوئے کہا تو اس نے سر اٹھایا، ایک نفرت بھری نظر اس پر ڈالی اور اٹھ کر تیزی سے ایک سمت بڑھ گیا تھا۔

”نہیں۔ یہ ڈیوڈ تھا اس کا واحد دوست، کیسے اسے نظر انداز کر کے چلا گیا تھا۔“

”دراصل وہ ڈس ہارٹ ہوا ہے اس لیے۔“ اس نے خود ہی دل کو سمجھا لیا تھا۔ ایک دو روز تک ٹھیک ہو جائے گا تو پھر میں اسے سمجھاؤں گا۔



گی۔

چائے بہت خوشگوار ماحول میں دلچسپ باتوں کے درمیان لی گئی تھی۔ محی الدین اور فاطمہ چائے پی کر اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ وہ تینوں لاؤنج میں آکر باتیں کرنے لگے تھے۔

”ہم بہت جلد ایک شاندار دعوت کریں گے اس خوشی میں۔“ خوش جمال دعوت پلان کر رہی تھی جب اس کی کسی کولیگ کا فون آگیا تو وہ معذرت کر لی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”یہ بہت معمولی ہے۔“ جوزفین نے خوش جمال کے جانے کے بعد چاکلیٹ کے ڈبے کی طرف اشارہ کیا۔

”نمبر لے بہت قیمتی ہے۔“ مصطفیٰ نے ایک بھر پور نظر اس پر ڈالی اس کے رخسار ہلکوں ہو گئے۔

”یہ نیل۔ کیا کر رہی ہیں؟“ مصطفیٰ اس کا نیل دیکھ رہا تھا۔

”نہیں۔ اس رات می نے بار تھا۔“ جوزفین کی نظریں جھک گئیں اور مصطفیٰ کے اندر کوئی پرانا ورد جاگا۔

”ملن ناراض ہو کر چلا گیا تھا اور می بہت غصے میں تھیں۔“

”تم اپنی می کے ساتھ کیوں نہیں گئیں۔ کیا ان کے دو سرے فریڈ نے تمہیں رکھنے سے انکار کر دیا تھا۔“ مصطفیٰ نے مہذب سے اسے دیکھا۔

”نہیں۔ وہ اچھے آدمی تھے۔ پیار کرتے تھے مجھ سے۔“ وہ سر جھکائے بتا رہی تھی۔

”میں خود می کو چھوڑ کر چلی آئی تھی۔ بلایا مجھے ملنے آئے تھے تو میں می کو بتائے بغیر ان کے ساتھ آگئی۔“

”کیوں؟“ مصطفیٰ نے پوچھا۔ ”تم اپنی می کے پاس رہتیں تو کم از کم سوتیلی۔ می کے ظلم سے بچ جاتیں۔“

”در اصل میں می سے ناراض تھی۔ مجھے ان پر بہت غصہ تھا۔“

”تم کیوں ناراض تھیں ان سے جوڑی۔؟“

”وہ مار تھا می سے زیادہ ظالم تھیں مہتموں نے ہادی

”شراب نوشی کی کثرت نے اس کی کارکردگی کو متاثر کیا ہے۔“ وہ اچھا کھلاڑی ہے۔ انتظامیہ کو ایک پار اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنا چاہیے۔“ اخبارات نے تبصرہ کیا تھا اور اس کا بھی یہی خیال تھا۔

”تھیک دس منٹ بعد آپ سب ڈائننگ ٹیبل پر آجائیں۔“ خوش جمال نے ہاتھ میں پکڑی ڈش ٹیبل پر رکھی۔ وہ خوشی سے چسکتی پھر رہی تھی۔ اس نے گھر آنے پر گلاب کا ایک بڑا بکے مصطفیٰ کو دیا تھا۔

مصطفیٰ نے اپنی کیفیت سے باہر آکر خوش جمال کی طرف دیکھا اور پھر ٹیبل کی طرف جو لاؤنج میں ہی ایک طرف لگی ہوئی تھی۔ اور خوش جمال نے چائے کے ساتھ اچھا خاصا اہتمام کر لیا تھا۔

”ہم صرف چار بندے ہیں خوشی!“

”بھی پانچواں بھی آتا ہے۔“ وہ مسکرائی۔ خوشی اس کے وجود کے ہر حصے سے پھوٹ رہی تھی۔

”کون جوڑی؟“ وہ سمجھ گیا تھا کہ خوش جمال نے ضرور اسے خبر کر دی ہوگی۔ تب ہی وہ ٹیبل ہوئی تھی اور خوش جمال لاؤنج سے باہر نکل گئی تھی۔ اور پھر فوراً ہی جوڑی کے ساتھ واپس آئی تھی۔ جوڑی نے جب کو مشترکہ سلام کرنے کے بعد مبارک دی اور پھر ہاتھ میں پکڑا چاکلیٹ کا چھوٹا سا ڈبا مصطفیٰ کے سامنے ٹیبل پر رکھا۔

”آپ کے لیے اس خوشی کے موقع پر۔“

وہ اس روز کے بعد آج جوڑی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی ناک تھوڑی سوجی ہوئی تھی اور ناک کے ساتھ رخسار پر لکا نیل تھا۔ اس نے نیت کا سفید ٹخنوں تک لمبا قرآک پہنا ہوا تھا جس میں کہیں سفید ٹکینے جگمگاتے تھے۔ اور اس نے اپنے ہاتھوں کو ایک سفید رنگ کے سکلی رومال سے باندھا ہوا تھا اور ایسا ہی ایک سفید سکلی رومال گلے میں لٹکایا ہوا تھا۔ وہ بغیر میک اپ کے سارا سے چہرے کے ساتھ بھی اسے اچھی لگ رہی تھی۔ لیکن یہ نیل۔ وہ پوچھنا ہی چاہتا تھا۔ کہ خوش جمال نے ٹیبل کے پاس کھڑے کھڑے آواز دی۔

”سب فوراً“ آجائیں نہیں تو ہر چیز ٹھنڈی ہو جائے



کو گھر سے نکال دیا تھا۔“

”ہاوی۔“ وہ چونکا۔

”ہاں ہاوی۔ ان کا سوتا بیٹا۔ وہ اسے بست مارتی تھیں اور انگل حبیب سے اس کی جھوٹی شکایتیں لگاتی تھیں۔“

”تم۔“ مصطفیٰ نے انگلی سے اس کی طرف اشارہ کیا۔ ”تم مشاغل ہو؟“

”ہاں۔ لیکن تمہیں کیسے پتا۔ یہ میرا فرسٹ نیم ہے پاکستان میں سب مجھے فرسٹ نیم سے بلاتے تھے یہاں مارتا تھا مجھے جوزی کہہ کر ملانے لگیں۔“

”میں۔ میں ہاوی ہوں۔“

اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ”لیکن تم تو؟“  
اس کا منہ تھوڑا سا کھلا تھا اور وہ ہلکی سی جھپکائے بغیر اس کی سیاہ بھنورا آنکھوں کو دیکھ رہی تھی۔ ہاں وہی ہاوی کی آنکھیں تھیں۔

”مشاغل۔ مشاغل لی یو۔ میں ہاوی ہی ہوں۔“

اس نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑا۔  
”ہاوی تو ماما مجھے پیار سے بلاتی تھیں۔ میرا اصل نام تو غلام مصطفیٰ ہی ہے۔“

”یہ کیسی کہانیوں جیسی بات ہوئی ہے نا۔؟“  
وہ اسے دیکھ رہا تھا اس کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ جب خوش جمل نے لاؤنج میں قدم رکھا۔ ایک لمحہ کے لیے وہ ٹھک کر رک گئی۔ اور اس کا دل ڈوب گیا۔  
”خوشی۔ خوشی! مصطفیٰ نے اسی طرح اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے خوش جمل کی طرف دیکھا۔

”یہ۔ یہ مشاغل ہے۔ ایسا عجیب اتفاق ہے۔“ اور خوش جمل کا ڈو بتا دل جیسے ڈوب کر ابھر اور وہ قدم بڑھا کر اس کے قریب آئی۔ تو وہ اس کا ہاتھ چھو کر اسے تفصیل بتانے لگا۔ اور پھر تفصیل بتاتے بتاتے اسے خوش جمل کی بات یاد آئی تو اس نے جوزفین کی طرف دیکھا۔

”خوش جمل نے کہا تھا تم جب کبھی مجھے ملو تو مجھے تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ تم میرا خیال رکھتی تھیں۔ اور۔“

”کچھ رشتوں میں شکریہ اور سوری تکلیف دیتے ہیں۔“ اس نے مصطفیٰ کی بات دہرائی تو وہ بے اختیار ہنس دیا۔ خوش جمل بھی مسکرا دی۔

”جب پہلی بار میں نے مصطفیٰ کو دیکھا تو مجھے اس کی آنکھیں بست جانی پہچانی لگی تھیں جیسے میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہو ملن آنکھوں کو۔“

وہ خوش جمل کو بتا رہی تھی اور مصطفیٰ کے دل میں برسوں پرانا دکھ جاگ اٹھا تھا۔ کہ وہ پایا کو نہیں بتا سکا تھا کہ اس نے سنی کو نہیں گرایا۔ اور وہ اس سے ناراض ہی چلے گئے۔

انگل کو کراچی میں بست دن لگ گئے تھے جب وہ واپس آئے تو انہوں نے ہاوی کو بست ڈھونڈا۔ تھانے میں بھی رپورٹ لکھوائی تھی۔ انہوں نے دہلی میں کسی کے ساتھ پارٹنرشپ کی تھی، انہیں ہر صورت وہاں جانا تھا ہاوی کی وجہ سے پہلے ہی وہ لیٹ ہو گئے تھے۔ وہ ضروری کام کر کے دہلی سے واپس آئے تو می نے انہیں بتایا کہ تھانے سے آدمی آیا تھا انہیں ایک دس گیارہ سالہ بچے کی لاش ملی تھی جنکال سے۔ ممی گئی تھیں لاش دیکھنے۔ لاشیں مسخ ہو گئی تھیں لیکن ممی نے اس کے لباس سے اور جوتوں سے پہچان لیا تھا وہ ہاوی ہی تھا۔ لاش کی حالت صحیح نہیں تھی۔ اس لیے ممی جھریس لائی تھیں۔ اور اسے تھانے والوں نے ہی دفنایا تھا۔ پہلے مجھے لگا تھا ممی جھوٹ بول رہی ہیں۔ لیکن جب انگل خود تھانے گئے تو انہیں ایس ایچ۔ او نے بتایا کہ ایک لاش ملی تھی اور آپ کی وائف آئی تھیں اور انہوں نے پہچانا تھا۔ اس روز میں اور مینو بست روئے تھے اور انگل کو تو جیسے سکت ہو گیا تھا وہ ہر وقت کمرے میں لینے رہتے اور ہاوی کی تصاویر دیکھتے رہتے۔ اور یہ وہی دن تھے جب بابا مجھے ملنے آئے تھے اور میں چپکے سے پایا کے ساتھ چلی آئی تھی۔“

وہ خوش جمل کو بتا رہی تھی اور وہ ساکت سا سن رہا تھا۔

”پہلے میں بابا کے ساتھ لاہور آئی جہاں وہ پڑھاتے تھے۔ بابا نے ممی کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ وہ مجھے ساتھ



لے آئے ہیں۔ مئی بہت چینی چلائی تھیں، پاپا نے فون بند کر دیا تھا۔ پھر چند ماہ بعد ہم کراچی آ گئے۔ اب مجھے مئی یاد آئی تھیں۔ میں نے لاہور سے ایک بار انہیں فون کیا تھا۔ تو انہوں نے کہا تھا کہ اگر پاپا مجھے زبردستی اپنے ساتھ لائے ہیں تو وہ ان پر کیس کر دیں گی۔ لیکن میں نے کہا کہ میں خود آئی ہوں اپنی مرضی سے اور میں ان کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ بعد میں ایک دو بار میں نے انہیں فون کیا تو انہوں نے میری آواز سنتے ہی فون بند کر دیا۔

”نور پاپا۔ میرے پاپا کو کیا تم نے یا مینو نے بتایا تھا کہ میں نے سنی کو نہیں گرایا تھا اور تمہاری مئی نے جھوٹ بولا تھا۔“

وہ ذرا سا خاموش ہوئی تو مصطفیٰ نے یکدم پوچھا وہ ابھی تک اسی دکھ کے حصار میں تھا۔

”ہاں۔ انکل کو پتا تھا۔ انہوں نے گیٹ کے باہر لکھا ہوا بڑھ لیا تھا اور پھر انہوں نے میو سے اور مجھ سے پوچھا تھا تو ہم نے بھی بتا دیا تھا۔“

”مختی تک گاڑا پاپا مجھ سے ناراض نہیں تھے۔“ اسے لگا جیسے برسوں سے اس کے دل پر دھراؤ ہو رہا ہو۔

”تھیں سارے پاپا تمہیں یاد کر کے بہت روتے تھے ہادی۔“

وہ اب اس کے لیے غلام مصطفیٰ نہیں ہادی تھا۔ غلام مصطفیٰ سے وہ تکلف سے بات کرتی تھی لیکن ہادی سے بے تکلفی سے بات کر رہی تھی۔ تب ہی مصطفیٰ کا فون بج اٹھا۔ اسٹرین پر مدلی کا نام چمک رہا تھا۔ وہ فون آن کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور کچھ فاصلے پر کھڑا ہو کر اس سے باتیں کرنے لگا۔ گاہے گاہے وہ اس کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا جو خزان کن خوشی کے ساتھ خوشی جمل کو ان دنوں کے حلق چٹا رہی تھی جب وہ اور ہادی ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔

کر نہیں بدلتے دیکھ کر محی الدین نے ہاتھ میں پکڑی کتاب نیچے کے پاس اونٹنی کر کے رکھی۔

”کیا عبد الباقی یاد آ رہا ہے؟“

”وہ بھولتا کب ہے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ اللہ ہمارے مصطفیٰ کو نظر بند سے بچائے۔“

”آمین۔“ انہوں نے بغور فاطمہ کو دیکھا۔ ”کوئی پریشانی ہے فاطمہ۔“

”نہیں تو بس یونسی سوچ رہی تھی وقت کتنی جلدی گزر گیا۔ کل مصطفیٰ اور خوش جمل بچے تھے آج شادی کے قابل ہو گئے ہیں۔“

”خاندانی پر یاد آیا تم نے خوش جمل سے اس رشتے کے متعلق بات کی؟ سیف اللہ بہت تعریف کر رہا ہے اس کے داماد بھائی ہے۔ اس کی بیٹی اپنے گھر میں بہت خوش ہے مجھے تو یہ رشتہ بہت مناسب لگا ہے۔“

”ہاں لیکن خوش جمل نے منع کر دیا ہے۔“

”لیکن کیوں؟“ محی الدین کو حیرت ہوئی۔

”وہ اگر چاہے تو مل لے۔ میں اسے معیوب نہیں سمجھتا اگر وہ۔“ انہیں ایسی بات نہیں ہے۔ فاطمہ نے ان کی طرف دیکھا۔

”پھر کیا بات ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”آپ نے کبھی سوچا کہ وہ ہر رشتے سے انکار کر دیتی ہے حالانکہ اس کے لیے جتنے بھی رشتے آئے سب اچھے تھے۔“ فاطمہ نے آہستگی سے کہا۔

”تو کیا کوئی اور؟“ ان کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔

”اور کون۔۔۔ اپنا مصطفیٰ؟“ فاطمہ کو بھی توکل ہی پتا چلا تھا کہ خوش جمل مصطفیٰ کے علاوہ کسی اور کے ساتھ زندگی نہیں گزارنا چاہتی۔ انہوں نے کل جب اس رشتے کا ذکر کیا تھا اور اس نے انکار کر دیا تھا تو اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے انہیں یکدم اور اک ہوا تھا اور جب انہوں نے تصدیق چاہی تھی تو اس نے سر جھکا لیا تھا۔

”کیا مصطفیٰ بھی یہی چاہتا ہے؟“ محی الدین کے اندر جیسے ایک ساتھ بہت سے پھول چٹکے تھے دل میں

”کیا بات ہے فاطمہ! نیند نہیں آرہی کیا؟“ انہیں



دلی خواہش کی کونسل مٹی کا سینہ چیر کر باہر نکل آئی تھی۔ اگر ایسا ہو جائے تو بھلا اس سے اچھا کیا ہو سکتا ہے۔

”چتا نہیں۔“ فاطمہ نے بے چینی سے ہاتھوں کو ایک دوسرے سے رگڑا۔ ”لیکن دونوں کا آپس میں بہت جوڑ ہے میرا مطلب ہے دونوں ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ آپ بات کریں نا مصطفیٰ سے۔“

”میں۔“ محی الدین نے اپنی طرف اشارہ کیا۔ ”اگر اس کا ایسا کوئی خیال ہو تا تو وہ خود ذکر کرتا۔“

”بچہ ہے اب وہ کیا کہے گا۔ یہ تو ہمیں خود سوچنا ہے۔“ فاطمہ ماں تھیں، ان کے دل میں بیٹی کا خیال تھا۔

”لیکن فاطمہ! جب میں نے سیف اللہ کے بتائے رشتے کا ذکر کیا تھا مصطفیٰ نے تو اس نے تعریف کی تھی لڑکے کی اور خوشی کا اظہار کیا تھا۔“ انہیں اچانک خیال آیا تھا۔

”لیکن آپ بات کریں گے تو وہ انکار نہیں کرے گا۔“ فاطمہ اس وقت صرف خوش جمال کی ماں بن کر سوچ رہی تھیں۔

”ہاں۔ وہ انکار نہیں کرے گا فاطمہ! میں جانتا ہوں۔ لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ وہ سوچے کہ ہم نے اس لیے اسے الایسا ہے کہ آج اس سے اس احسان کا بدلہ لیں۔ ہمیں فاطمہ اتم خوش جمال سے پھر بات کرو کہ وہ اس رشتے کے متعلق سوچے اور تم بھی اب سو جاؤ۔“

انہوں نے لیتے ہوئے کروٹ بدلی تھی۔ لیکن فاطمہ کی آنکھوں سے نیند دور تھی۔ اس نے خوش جمال کی آنکھوں میں مصطفیٰ کے نام پر چلتے دیے دیکھے تھے۔ وہ کیسے ان ریوں کو بھجھا دیتیں۔ وہ کیسے اپنی بیٹی کی خوشی چھین لیتیں۔ ایک بار بات کر لینے میں کیا حرج تھا۔ سو انہوں نے صبح ناشتے کے بعد جب مصطفیٰ لاؤنج میں بیٹھا لی۔ وی دیکھتے ہوئے ”جوزے“ کے فون کا انتظار کر رہا تھا مصطفیٰ سے بات کرنے کا سوچا اور اس

کے قریب آکر بیٹھ گئیں۔

”مصطفیٰ! میں سوچ رہی ہوں تمہارے میچز کے بعد تمہاری اور خوش جمال کی شادی کر دیں۔“ مصطفیٰ نے ریموٹ سے آواز آہستہ کی۔

”کیا خوش جمال نے اس انجینئر کو اوکے کر دیا۔ وہ انکل سیف اللہ کے داماد کا بھائی۔“ وہ مسکرایا۔

”محی الدین صحیح کہتے تھے اس کے دل میں ایسا کوئی خیال نہیں تھا۔ فاطمہ نے ایک گہری سانس لی۔

”نہیں۔ دراصل۔ وہ میں نے سوچا تمہاری اور خوش جمال کی شادی۔“ وہ اٹھیں۔ ”مہم دونوں ایک دوسرے کو سمجھتے ہو۔ ایک دوسرے کے ساتھ خوش رہو گے۔ اور ہماری آنکھوں کے سامنے رہو گے باہر کہیں رشتہ کرتے ہوئے دل ڈرتا ہے سو طرح کے وہم آتے ہیں۔“

وہ سر جھکائے کہہ رہی تھیں اور وہ ساکت بیٹھا تھا۔ کچھ دیر پہلے جو مسکراہٹ اس کے لبوں پر نمودار ہوئی تھی وہ دم توڑ چکی تھی۔ انہوں نے سواٹھا کر اسے دیکھا تو ان کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ اگر خوش جمال ان کے دل کا ٹکڑا تھی تو وہ بھی تو دل کا ٹکڑا ہی تھا۔ بے شک انہوں نے اسے جہنم نہیں دیا تھا لیکن وہ اس خوش جمال سے کم عزیز نہیں تھا۔

یہ۔ یہ صرف ہماری خواہش ہے کوئی جبر اور زبردستی نہیں ہے اگر تمہارا دل نہیں مانتا تو کوئی بات ہیں۔ میرے دل میں ایک خیال آیا تو میں نے کہہ دیا۔“

وہ دل گرفتگی سے کہتی ہوئی لاؤنج سے باہر چلی گئیں۔ اور وہ وہاں ہی بیٹھا رہا۔ ابھی تو اس کے دل میں محبت کی کونسل پھوٹی تھی۔ ابھی تو اسے اس جذبے کا اور اک ہوا تھا۔ ایک انوکھا سا خوب صورت سا احساس اس کے دل کو گل رنگ کیے رکھتا تھا۔ ابھی تو اس نے اس دلوئی میں قدم رکھا تھا اور۔

”کیا وہ اماں اور بابا کی خواہش پر اپنی محبت قربان کر سکتا ہے۔“

اس نے خود سے پوچھا۔ بابا نے اسے اس وقت



جوزی کے لیے کیا تھا۔

جوزی نے تو اس روز اس کے دل میں اپنی محبت کا بوجھ بویا تھا، جس روز اس نے پہلی بار اسے اپنے گھر سے باہر روتے دیکھا تھا اور اک اسے اب ہوا تھا۔ کاش یہ اور اک اسے کبھی نہ ہوتا۔ اس کا نو خیز دل پہلی پہلی محبت کا دکھ برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ اندر عجیب سی ٹوٹ پھوٹ محسوس تھی اور آنکھوں میں دھول اڑتی تھی اور اس دھول کو سب سے پہلے خوش جمال نے محسوس کیا۔ وہ خوش جمال تھی جو ہمیشہ اس کے دل میں اتر کر اس کی پریشانی جان لیتی تھی تو اب کیسے نہ جان پاتی۔

دو تین روز تو وہ اپنی ہی خوشی میں مگن رہی تھی۔ لیکن اب وہ اسے دیکھ رہی تھی منور کر رہی تھی اور اس کے چہرے پر کھلتے ست رنگی خوشیوں کے پھول مرجھائے جا رہے تھے۔

مصطفیٰ نے صرف اہاں اور بابا کی خواہش کا احترام کیا ہے۔ ورنہ اس کا دل اسے اس روپ میں قبول نہیں کر رہا وہ جان گئی تھی۔

لیکن کیا کوئی اور؟

اور جوزی اس کے سامنے آنکھیں دھونے لگی۔

چور نظروں سے مصطفیٰ کو دیکھتی۔

مصطفیٰ کے نام پر لبوں پر چٹکتی مسکراہٹ اور آنکھوں میں اترتی جگمگاہٹیں۔

”تو جوزی؟“

ایک لمحے کے لیے اس کے اندر اندھیرے اتر آئے

مصطفیٰ جوزی سے محبت کرتا ہے۔

”لیکن۔ میں اسے اتنا چاہوں گی۔ اتنا خیال رکھوں

گی کہ وہ جوزی کو بھول جائے گا۔ میرا اور اس کا تو

سالوں کا ساتھ ہے اور جوزی۔ زندگی میں پہلی بار اس

نے مصطفیٰ کی خواہش کو نظر انداز کیا تھا اور پہلی بار وہ

اپنے لیے خود غرض ہو گئی تھی۔ ورنہ اب تک تو وہ

مصطفیٰ کے لیے اپنی چھوٹی چھوٹی خواہش اور خوشیاں

قربان کرتی آئی تھی۔ لیکن اس روز اسے لگا وہ خود غرض

نہیں ہو سکتی۔

اس روز رونی مصطفیٰ سے ملنے آیا تھا۔ پر کمال سے

جھگڑ لگایا تھا، سہارا دیا تھا، جب مشاغل کی مٹی نے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔ اگر وہ اسے سہارا نہ دیتے تو وہ آج یہاں نہ ہوتا جہاں ہے۔ شاید جنگل میں ملنے والی لاش اس کی ہوتی اور اماں۔

اماں کے لمس میں اس نے ماں کا لمس تلاش کیا تھا۔ اماں جب سردیوں کی راتوں میں اٹھ کر پیچھے گرا ہوا کمرے میں اس پر ڈالتیں تو اس کی آنکھ کھل جاتی تھی اور اسے مانا یاد آ جاتیں۔ کیا مانا اس سے اس سے زیادہ محبت کرتی تھیں، جتنی اماں نے اس سے کی تھی؟ اور خوش جمال۔ کیا وہ بھی؟

اس نے سوچا اس روز اس نے سارا دن خوش جمال کو ادھر ادھر آتے جاتے کام کرتے دھیان سے دیکھا۔ اسے دیکھ کر اس سے باتیں کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جو دھبے جل اٹھتے تھے۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی پلکیوں کا اٹھنا اور گرتا اس کے محبت آشنا دل نے اسے یقین دلایا کہ یہ محبت ہے۔ پہلے وہ نہیں جانتا تھا لیکن اب جان گیا تھا۔ اسے لگا کہ وہ اماں، بابا اور خوش جمال کی خواہش قربان کر کے اپنی محبت کے ایوان نہیں سجا سکتا۔ ہاں وہ ان کی خواہش پر اپنی محبت قربان کر سکتا ہے۔ اور اس نے فاطمہ کے سامنے سر جھکا دیا۔

”اماں جان! آپ نے اور بابا نے میرے لیے جو

فیصلہ کیا ہے۔ وہ مجھے دل و جان سے قبول ہے۔“

اور فاطمہ نے اس کی پیشانی چومتے ہوئے ڈھیروں

دعا مانگی۔ لیکن اس کے اندر برسات ہو رہی تھی۔

اپنی نئی نوکری محبت کے مرجانے پر ماتم پاتا تھا۔ پہلی محبت

کے پھچکڑ جانے کا دکھ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ وہ فوراً

ہی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

پورے گھر میں خوشی کی ایک لہر دوڑی تھی۔ خوش

جمال تنہا کی طرح اڑتی پھرتی تھی۔ خوش گلوں پر

کی طرح چٹکتی پھرتی تھی۔ اور اس کے چہرے پر ست

رنگی خوشیوں کے رنگ دکھتے تھے۔ اور یہ رنگ پہلے

اسے نظر کیوں نہیں آئے۔ اس نے اپنے دل میں

خوش جمال کے لیے ایسا جذبہ کیوں محسوس نہیں کیا جو



اس کا تیرہ سالہ بھائی۔ فٹ بال کے گراؤنڈ میں ایک حیرت انگیز لگ لگاتے ہوئے دنیا سے چلا گیا تھا۔ فٹ بال سے محبت اس کی گھٹی میں تھی۔ اور وہ مصطفیٰ سے بھی محبت کرتی تھی وہ اسے نونے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ فیصلہ کرتے ہوئے اس نے اپنے دل کو ہزاروں کرچیوں میں تبدیل ہوتے دیکھا۔ اور ٹرائی میں چائے کا سامان لگاتے ہوئے اس کے آنسو اس کے رخساروں کو بھگوتے رہے۔ لیکن رونی کے جانے کے بعد جب وہ مصطفیٰ کے کمرے میں گئی تو اس کی آنکھیں خشک تھیں گواندر اب بھی برسات ہو رہی تھی اور یہ برسات نہ جانے کب تک ہونی تھی۔

مصطفیٰ بیڈ کراؤن سے نیک لگائے سامنے دیوار پر نظریں جمائے جانے کیا سوچ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”جب تم فارغ ہو بھی تو ازل سیف اللہ کے نواسے کی مبارک باد دے آئیں۔ اماں بتا رہی تھیں غافہ اور اس کے میاں ہم دونوں کا پوچھ رہے تھے۔“

”اب تو فارغ ہی فارغ ہوں جب کو چلے چلتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں کیا تھا ایسا جس نے خوش جمال کو اندر تک ہلا دیا۔ اور وہ جو ابھی تک سڑے میاں جالی تھی کہ کیسے بات شروع کرے ایک دم اس نے پوچھا۔

”سنئے! جوزی تمہیں کسی لگتی ہے۔“

”کیا مطلب کسی لگتی ہے؟“ مصطفیٰ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”ابھی لڑکی ہے اور تم مجھ سے زیادہ جانتی ہو اسے۔“

”ہاں لیکن تم تو اسے اس کے بچپن سے جانتے ہو۔“ مصطفیٰ نے صرف اثبات میں سر ہلایا۔

”دراصل۔“ خوش جمال جو کرسی کے ہتھ پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی بیٹھ گئی۔ ”اماں اور میں سوچ رہے ہیں کہ جوزی کو تمہارے لیے مانگ لیں۔“

”کیا۔؟“ مصطفیٰ کی حیرت واضح تھی۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟“

”وہی جو تم نے سنا۔“ وہ شعوری کوشش سے

تعلق رکھنے والا یہ کھلاڑی بہت خوش مزاج اور مخلص تھا۔ اور اسے بھی جوزے نے ہی ہائیر کیا تھا۔ وہ ٹیچ ٹائم تھا اور وہ مصطفیٰ سے پوچھنے آئی تھی کہ رونی لچ کرے گا یا چائے بنالوں ڈرائنگ روم کے دروازے کے باہر لمحہ بھر رک کر اس نے اپنا اسکارف درست کیا تھا جب اس نے رونی کو کہتے سنا۔

”تمہیں کیا ہو گیا ہے غلام مصطفیٰ۔ جوزے بہت پریشان ہے۔ ریکشن میچز میں تمہاری کارکردگی دیکھ کر۔ انتظامیہ کی طرف سے دباؤ ہے۔ صحافی بھی کہہ رہے ہیں کہ جوزے بچھتا ہے والا ہے اس لیے اسے پہلے ہی اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لینی چاہیے۔ جوزے نے مجھے بھیجا ہے اگر تمہیں کوئی پریشانی ہے تو ہم سے شیئر کرو۔ ہو سکتا ہے ہم تمہاری کوئی مدد کر سکیں۔“

اور وہ وہاں ہی ٹھہر کر ان کی باتیں سننے لگی۔

”ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو رونی۔! مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ جیسے میں اب کھیل نہیں پاؤں گا۔ جیسے میرا دل مر رہا ہے ہو لے ہو لے۔ اور میں تم ہو رہا ہوں دھیرے دھیرے۔“

”اوہ مائی گاڈ۔ کیس تمہیں بھی اپنے بھائی کی طرح TACHYCARDIA کی بیماری تو نہیں ہے۔ میں جوزے کو بتاتا ہوں وہ بہترین ڈاکٹر ہے۔“

”ایسا کچھ نہیں ہے رونی۔! بس میرا دل۔ میرا خیال ہے میں اب کبھی نہیں کھیل سکوں گا۔ جوزے کو چاہیے کہ وہ انتظامیہ کو مطلع کر دے۔“

خوش جمال کا دل جیسے اٹھ گھرائیوں میں ڈوبا تھا وہ مصطفیٰ سے کچھ پوچھے بنا واپس پکن میں آئی تھی۔

”نہیں! تم کھیل نہیں چھوڑ سکتے مصطفیٰ! بابا کا خواب ان کی خوشی۔ بلکہ ہم سب کا خواب غلام مصطفیٰ عظیم فٹ بالر۔ نہیں۔“

اس نے اپنے دل کے کئی ٹکڑے ہوتے محسوس کیے۔

وہ کھلاڑی کی بیٹی تھی۔ اس کے بابا فٹ بالر تھے۔ اس کے دادا کو فٹ بال سے عشق تھا۔ اس کا بھائی۔

مسکرائی۔ ”لیکن۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ کیسے۔“  
 ”اماں نے تم سے اپنی ایک خواہش کا اظہار کیا اور تم نے اچھے بچوں کی طرح اس خواہش پر سر جھکا دیا۔ لیکن میں تمہاری طرح اچھی بچی نہیں ہوں، کور میں نے تمہارے لیے جوڑی کو پسند کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس کے ساتھ خوش رہو گے۔“ اور اس نے ہونٹ مزید پھیلائے۔  
 ”تم اس سے محبت کرتے ہو مصطفیٰ؟“ وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی اور دل تھا کہ تکرار کیے جاتا تھا کہ وہ کہہ دے کہ میں تو جوڑی سے محبت نہیں کرتا۔ لیکن مصطفیٰ نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا اس کی نظریں جھک گئی تھیں۔ وہ سبہ حد مضطرب سا نظر آنے لگا تھا۔ اس نے دو تین بار سبہ یقینی سے خوش جمال کی طرف دیکھا۔ وہ خوب صورت تھی۔ جوڑی سے زیادہ خوب صورت، لیکن دل تو جوڑی کے نام پر دھڑکتا تھا۔

”سہ۔ میں آپ کو شرمندہ نہیں ہونے دوں گا۔“  
 ”ان شاء اللہ!“ خوش جمال نے آہستگی سے کہا اور اسے باتیں کرنا چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اب اس میں مزید وہاں کھڑے ہونے کی ہمت نہیں تھی۔ اور ابھی اسے اماں سے بھی بات کرنا تھی۔ جو سبہ حد خوش تھیں۔ اندر جوڑے اسے ڈانٹ رہا تھا۔  
 ”میں نے تم پر اس لیے محبت نہیں کی تھی کہ تم ہمت مار کر کھینٹا ہی چھوڑو فوراً“ مجھے ملو۔“

”تمہارا کیا خیال تھا کہ میں تمہارے دل کا حال نہیں جانتی۔“ خوش جمال نے نگاہیں جھکائیں۔ ”اب جلدی سے بتاؤ۔ میں اور اماں کس روز جوڑی کے گھر جائیں گی۔“

”ابھی نہیں۔ پہلے میں خود جوڑی سے بات کر لوں۔“  
 ”نہیں تو کیا تم نے ابھی تک اس سے بات نہیں کی؟“

خوش جمال نے آنکھیں پھیلا دیں۔ اور خود کو اس اداکاری پر آسکر ایوارڈ کا حق دار قرار دیا۔ دل دھاڑیں مار مار کر روئے کو چاہ رہا تھا وہ ہنس رہی تھی۔

”تم کس تردد میں پڑ گئے ہو غلام مصطفیٰ میں بابا اور اماں ہم سب تمہاری خوشی میں خوش ہیں۔ اور میں ہم جوڑی کے گھر۔“

”نہیں خوش جمال! ابھی نہیں گمانا پہلے میں اس سے بات کر لوں۔“  
 وہ ابھی تک متذبذب سا خوش جمال کو دیکھ رہا تھا۔

کیا پہلے اس کی آنکھوں نے دھوکا کھایا تھا یا آج دھوکا کھا رہی ہیں۔ اس کا فون بج رہا تھا۔  
 ”فون تو اٹھاؤ مصطفیٰ؟“ خوش جمال نے کہا تو اس نے چونک کر فون اٹھایا۔ دوسری طرف۔ جوڑے تھا۔  
 ”جی سہ۔ میں کچھ آپ سیٹ تھا اس لیے۔“  
 ”تم لوگوں کی پروا مت کرو غلام مصطفیٰ۔ وہ جب تمہارا کھیل دیکھیں گے تو انہیں یاد نہیں رہے گا کہ تم کون ہو۔ مجھے شرمندہ مت ہونے دو۔“ جوڑے کہہ رہا تھا۔

”سہ۔ میں آپ کو شرمندہ نہیں ہونے دوں گا۔“  
 ”ان شاء اللہ!“ خوش جمال نے آہستگی سے کہا اور اسے باتیں کرنا چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اب اس میں مزید وہاں کھڑے ہونے کی ہمت نہیں تھی۔ اور ابھی اسے اماں سے بھی بات کرنا تھی۔ جو سبہ حد خوش تھیں۔ اندر جوڑے اسے ڈانٹ رہا تھا۔  
 ”میں نے تم پر اس لیے محبت نہیں کی تھی کہ تم ہمت مار کر کھینٹا ہی چھوڑو فوراً“ مجھے ملو۔“

”تمہارا کیا خیال تھا کہ میں تمہارے دل کا حال نہیں جانتی۔“ خوش جمال نے نگاہیں جھکائیں۔ ”اب جلدی سے بتاؤ۔ میں اور اماں کس روز جوڑی کے گھر جائیں گی۔“  
 ”ابھی نہیں۔ پہلے میں خود جوڑی سے بات کر لوں۔“  
 ”نہیں تو کیا تم نے ابھی تک اس سے بات نہیں کی؟“  
 خوش جمال نے آنکھیں پھیلا دیں۔ اور خود کو اس اداکاری پر آسکر ایوارڈ کا حق دار قرار دیا۔ دل دھاڑیں مار مار کر روئے کو چاہ رہا تھا وہ ہنس رہی تھی۔  
 ”تم کس تردد میں پڑ گئے ہو غلام مصطفیٰ میں بابا اور اماں ہم سب تمہاری خوشی میں خوش ہیں۔ اور میں ہم جوڑی کے گھر۔“  
 ”نہیں خوش جمال! ابھی نہیں گمانا پہلے میں اس سے بات کر لوں۔“  
 وہ ابھی تک متذبذب سا خوش جمال کو دیکھ رہا تھا۔

اسے ابھی تک جوڑی سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ دوبار اس نے اسے فون بھی کیا تھا۔ لیکن اس نے فون اٹینڈ نہیں کیا تھا۔ آج اس کا ارادہ اس کے اسٹور پر جانے کا تھا۔ وہ جوڑے کے ساتھ اولڈ ٹریفک سے نکلا تو صحافیوں نے اسے گھیر لیا تھا وہ اس سے مختلف سوال کر رہے تھے۔ جوڑے کی مدد سے بمشکل ان سے جان چھڑا کر وہ اپنی کار تک آیا تھا۔ اور کار میں



سوچنے نہیں دیا تھا بے ہوش ہونے سے پہلے اس کے کانوں میں کسی گاڑی کی آواز آئی تھی اور ساتھ ہی لڑکی کی آواز۔

”بھاگو۔ جلدی۔“ اور اس کے ساتھ ہی وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گیا۔ دوبارہ جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ اسپتال میں تھا سب سے پہلے اس کی نظر جس چہرے پر پڑی وہ محی الدین کا تھا اور ان کے ساتھ ہی جوزے تھا۔ پریشانی جس کے چہرے سے جھلکتی تھی۔ اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر دونوں ایک ساتھ اس پر ہنسنے لگے۔

”کیا ہوا۔ کیسے ہوا یہ سب؟“ کیا ہوا تھا اس نے ذہن پر زور دیا اور اٹھنے کی کوشش کی مگر گلوں میں درد کی فیس اٹھ گئی۔

”تم سڑک پر رخصت حالت میں ملے تھے۔ وہ تو شکر ہوا کہ پولیس کی ایک پٹرول کار نے تمہیں دیکھ لیا اور اسپتال پہنچایا۔“ محی الدین نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے اٹھنے سے منع کیا۔

”تو بے ہوش ہونے سے پہلے اس نے گاڑی کی جو آواز سنی تھی وہ پولیس کی پٹرول کار تھی۔ اس نے سوچا۔ سر میں ٹھیس اٹھ رہی تھیں۔ جو رشتہ تشویش سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ابھی وہ ڈاکٹر سے تفصیلی بات کر کے آ رہا تھا۔ اگرچہ ٹانگ کی ہڈی ٹوٹنے سے بچ گئی تھی لیکن فہم بھڑکا ہوا تھا اور پیس سے پیچیس دن تک کے لیے پلاسٹر لگنا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ ہریل میں ہونے والے یورپین جیمپینز لیگ کے مقابلوں میں وہ شرکت نہیں کر سکے گا۔ تشویش میں مایوسی بھی شامل ہو گئی تھی۔

”کیا ہوا تھا کیا کوئی؟“ اور ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے ساری بات بتا دی۔

”اوہ مالی گاڈ! کیا ضرورت تھی ہمدردی کرنے کی؟“ جوزے کی مایوسی غصے میں ڈھل گئی۔ ”کیا تم نہیں جانتے تھے کہ یہ میچز تمہارے کیریئر کے لیے کتنے اہم تھے۔ کم از کم تین ماہ سے پہلے تم کسی میچ میں شرکت نہیں کر سکتے۔ میں نے کئی ڈاکٹروں سے بات کی ہے۔

بیٹھے ہوئے جب اس نے وقت دیکھا تو نوحہ رہے تھے اس کا مطلب تھا کہ اسٹور بند ہو چکا ہو گا اور سب خیر کل سہی۔ وہ بہت آرام سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ اور اس کا ذہن مختلف سوچوں کی آمادہ گاہ بنا ہوا تھا۔ وہ خوش جمال کے متعلق کچھ اندازہ نہیں کر پا رہا تھا۔ چند دن پہلے اسے لگا تھا کہ وہ بہت خوش ہے۔ عام دنوں سے زیادہ۔ اور اب بھی وہ اسے غم زدہ نظر نہیں آئی تھی اور اس نے جوزی کے ساتھ اس کی شادی کے حوالے سے کافی باتیں کی تھیں۔

پچھلے دو دنوں سے وہ انکل سیف اللہ کے ہاں تھی۔ اور اس نے فاطمہ کو فون کر دیا تھا کہ عافیہ گھر آئی ہوئی ہے اور وہ مجھے آنے نہیں دے رہی۔ عافیہ اس کی بہت اچھی دوست تھی۔ اس نے گاڑی کا رخ انکل سیف اللہ کے گھر کی طرف موڑا۔ وہ ایک بار پھر خوش جمال سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اندازہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن پھر آدھے راستے سے ہی پلٹ پڑا۔ میں بھلا میں کیا کہوں گا اس سے۔ میں خواہ مخواہ ہی پریشان ہو رہا ہوں۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ جوزی کا نام کیوں نہیں اس کے سامنے۔ اب وہ پھر گھر کی طرف جا رہا تھا۔ پھر اچانک ہی اس نے بریک پر پاؤں رکھا تھا سانسے سے کوئی دھماکا ہوا آ رہا تھا۔ اور اس کے پیچھے دو آدمی تھے بھاؤ۔ دو ڈھنڈھالی لڑکی تھی اور چلا رہی تھی۔

”ہیلپ! ہیلپ!“ وہ تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ لڑکی کے پیچھے بھاگنے والے آدمی اس کے سامنے رک گئے تھے غیر ارادی طور پر لڑکی کو اس نے بازو سے پکڑ کر پیچھے کیا۔ اور ابھی وہ ان سے کچھ پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ وہ دونوں آدمی اس پر پل پڑے ان کے ہاتھوں میں موٹے ڈنڈے تھے۔ زمین پر گرے ہوئے اس نے اس لڑکی طرف دیکھا۔ ”بھاگ جاؤ۔“ لیکن وہ اطمینان سے کھڑی تھی۔ دونوں آدمی اسے بری طرح مار رہے تھے اس کی ٹانگ سے خون بہہ نکلا تھا۔

”مٹا گئیں توڑ دو۔“ بند ہوئی آنکھوں کے ساتھ اس نے لڑکی کی آواز سنی تھی۔ لیکن سر پر پڑنے والی چوٹ نے اسے کچھ



ہسپتال آئے تھے اور پھر ابھی کچھ دیر پہلے انہوں نے مصطفیٰ کے فون پر جوزے کی کئی مس کالز کے بعد ایک کال اٹینڈ کر کے اسے اس حوالے کا بتایا تھا۔  
”با میں ٹانگ میں فربہ کچھ ہے۔“

جوزے بے حد ناراض نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ڈیوڈ نے اسے بہت مایوس کیا تھا۔ لڑکیاں اور شراب اسے تباہ کر رہی تھیں۔ آج اگر وہ فٹ ہو تا تو اسے مصطفیٰ کے حادثے سے اتنی پریشانی نہ ہوتی۔

”اوہ!“ ڈیوڈ کے چہرے پر یکدم چمک آئی تھی۔  
”پھر تو یہ ایرل میں ہونے والے مقابلوں میں شرکت نہیں کر سکے گا۔“

”بہت افسوس کے ساتھ یہ قسمی سے لیں۔“  
جوزے اپنے بے بسی کی بجائے چھٹائی نہیں سکا تھا۔ مائیکسنر یونائیٹڈ کلب کی کامیابیاں اس کی زندگی کا حاصل تھیں اسے اس کلب اور فٹ بال سے عشق تھا۔

”کبھی کبھی ہمدردی مہنگی بھی ہو جاتی ہے اور۔“  
وہ بات کرتے کرتے کسی خیال سے اچانک خاموش ہو گیا تھا۔ مصطفیٰ اور محی الدین کی نظریں بے ساختہ ایک دوسرے کی طرف اٹھی تھیں۔

ان تینوں کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا ہے۔ مصطفیٰ کو یاد آیا کہ جب اس نے محی الدین سے ڈیوڈ کے رویے کا شکوہ کیا تھا تو انہوں نے کہا تھا۔

”یاد رکھو مصطفیٰ! جب کوئی دوست بغیر وجہ کے نظر چرانے لگے، چھپنے لگے اور ملنے سے کتراتے تو سمجھ لو کہ اس نے تمہارے خلاف سازش کی ہے، تمہارا کچھ چرایا ہے یا تمہیں کوئی نقصان پہنچایا ہے، لیکن تمہیں اس کا علم نہیں ہے۔“

”لیکن بھلا ڈیوڈی نے میرا کیا چراتا ہے اور میرے خلاف کیا سازش کر رہی ہے۔“

اس روز اس نے سوچا تھا، لیکن اس وقت جو اور اک اسے ہوا تھا اس نے جیسے اس کا دل چیر دیا تھا۔ اس ملک میں وہ اس کا واحد دوست تھا۔ اس کے

پلا سٹر کھلنے کے بعد بھی تمہیں ریسٹ اور ورزش کی ضرورت ہوگی۔“

مصطفیٰ کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا اور آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ وہ خود اور اس کا خاندان سب ان میچز کے متعلق کتنے پر جوش ہے۔ فاطمہ اور خوش جمال ہر لمحہ اس کی کامیابیوں کے لیے دعا گو تھیں۔ اور اسے گمان سا تھا کہ خوش جمال۔

اس نے معذرت طلب نظروں سے جوزے اور محی الدین کو دیکھا اور اپنی نم پلکوں کو انگلیوں سے پونچھتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔

”کسی انسان کی مدد کرنا میرے لیے میرے کیریر سے زیادہ اہم ہے۔ انسان کیریر سے زیادہ اہم ہے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ دھوکا اور فراڈ ہے۔ میرے سامنے ایک عورت تھی جو مدد کے لیے پکار رہی تھی۔“

”اٹس اوکے!“ جوزے کے چہرے کے سخت عضلات نرم ہوئے تھے۔ اور محی الدین کی آنکھوں میں اس کے لیے ستائش تھی۔  
”تم نے ٹھیک کہا۔“

جوزے نے اس کے کندھے تھپکے۔  
”ورلڈ کپ تمہارا منتظر ہے بیٹے میں۔ تم صحت مند ہو کر یقیناً ورلڈ کپ میں شرکت کر سکو گے بلکہ اس سے پہلے والے میچز میں بھی۔“  
تب ہی دروازے کو طعنا سا ٹاک کر کے ڈیوڈ اندر داخل ہوا۔

”ہیلو مصطفیٰ۔ تمہارے حادثے کا بہت افسوس ہوا۔“ مصطفیٰ اور محی الدین نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”بہتر ہوں، لیکن تمہیں کیسے پتا چلا۔“  
مصطفیٰ نے پوچھا۔

”وہ ایلن نے بتایا شاید اسے جوزی نے بتایا ہو۔ میں پریشان ہو کر چلا آیا زیادہ چومیں تو نہیں آئیں؟“

محی الدین بہت گرمی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ پولیس کے فون پر وہ گھر میں کسی کو بتائے بغیر



ہوتے ہوئے اس نے کبھی کسی اور کو دوست بنانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر اس اذیت کو برداشت کرنے کی کوشش کی جو دل چیرتی تھی۔

محی الدین جوڑے اور وہ۔ تینوں نے ایک ہی بات سوچی تھی۔ جوڑے کی پیشانی پر لکسوں کا جال سا بن گیا تھا۔ محی الدین افسردگی سے مصطفیٰ کو دیکھ رہے تھے۔ ڈیوڈ کے ہونٹوں پر براسراری مسکراہٹ تھی اور وجود سے انجالی خوشی پھوٹتی تھی۔ آنکھوں کی سرخی سے پتا چلتا تھا کہ وہ ابھی بھی کچھ شے میں ہے۔

”او کے غلام مصطفیٰ! میں پھر چکر لگاؤں گا۔“ جوڑے نے محی الدین سے مصافحہ کیا۔ مصطفیٰ کے کندھے پر تھپکی دی اور ڈیوڈ پر ایک غصیلی نظر ڈالی۔ جو کچھ ابھی اس نے جانتا تھا۔ اس نے اسے بہت تکلف دی تھی۔ اس نے مانچسٹر یونیورسٹی کو بہت دھچکا پہنچایا تھا۔

”کیا یہ اب کبھی نہیں کھیل سکے گا؟“ ڈیوڈ نے محی الدین سے پوچھا، لیکن جواب جوڑے نے دیا تھا۔

”کھیلے گا۔ اس لیے کہ یہ فٹ بال کھیلنے کے لیے ہی پیدا ہوا ہے ڈیوڈ کیمرن۔ تم ڈیوڈ کو کھم نہیں بن سکتے، لیکن یہ ڈیوڈ کو کھم اور روٹنڈو کی جگہ لے گا۔“ ایک نظر ڈیوڈ کے حیران چہرے پر ڈال کر جوڑے نے قدم باہر کی طرف بڑھا دیے۔ ڈیوڈ کا منہ حیرت سے کھلا تھا اور وہ جوڑے کے پیچھے ہی باہر نکلنے لگا تو محی الدین نے اس کی طرف دیکھا۔

”اچھے دوست وہ ہوتے ہیں ڈیوڈ کیمرن! جو دوستوں کی راہ کے کانٹے چن لیتے ہیں۔ ان کی راہوں میں کانٹے نہیں بچھاتے۔ تمہارے آنے کا شکریہ۔“

محی الدین نے ایسا کیوں کہا اس کا شمار آلود ذہن سمجھ نہیں سکا اور اسے سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس نے جو چاہا تھا وہ ہو گیا تھا۔ وہ تیزی سے باہر نکل گیا اور محی الدین مصطفیٰ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جس کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔ انہوں نے

قریب بیٹھتے ہوئے اس کے آنسو پونچھے۔ ”ایسے دوستوں کو دل کی مسند سے اتار دینا چاہیے غلام مصطفیٰ!“

”لیکن اس نے تو زندگی میں جس جس کو ایک بار دوست کہہ دیا اسے کبھی دل سے نہ نکال سکا تھا اور یہ ڈیوڈ کیمرن۔“

اس نے آنکھیں بند کر لیں اور محی الدین ہولے ہولے اس کا سر سہلانے لگے۔



”مصطفیٰ۔ مصطفیٰ کہاں ہو؟“ خوش حال اسے پکارتی ہوئی لاؤنچ میں داخل ہوئی۔ وہ ٹائٹس پہنائے صوفے کی پشت سے سرٹیکے آنکھیں موندے نیم دراز تھا۔

”تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے مصطفیٰ؟“ وہ اسے یوں آرام سے بیٹھے دیکھ کر لالہ ہوئی۔ ”ہمیں جانا تھا۔“

”کیا جانا بہت ضروری ہے خوش حال؟“ اس نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

”مگر تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو نہیں جائے۔“ خوش حال اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

پلا سٹرائٹ کے بعد ٹانگ میں تھوڑا کھینچاؤ تھا اس لیے وہ فزیکو تھراپی کے لیے جا رہے تھے۔

”بس آج جی نہیں چاہ رہا۔“ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”تم کچھ پریشان ہو مصطفیٰ! پریشان نہ ہو ڈاکٹر صاحب کہہ تو رہے تھے کہ بہت جلد تم پہلے کی طرح ہل سکو گے اور۔“

”نہیں۔ میں کچھ اور سوچ رہا تھا خوش حال! ڈیوڈ نے ایسا کیوں کیا۔ دوست ہو کر چھپ کر وار کیا۔ وہ مجھ سے کہتا۔ تم مت کھیلو۔ میں وجہ پوچھے بغیر چھوڑ دیتا کھیلنا۔ میں چھوڑ سکتا تھا خوشی وہ مجھے آزما تا تو۔“

آئی سات ہفتوں کے لیے پاکستان گئے ہیں اور اسے اپنے بچوں کے پاس گھر چھوڑ گئے ہیں۔“  
”ٹھیک ہے وہ آجائے تو بات کر لوں گا۔“ اس کی نظروں کے سامنے جوزی کا سراپا لہرایا اور لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”کیا وہ بھی تم سے محبت کرتی ہے مصطفیٰ؟“ اس نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”پتا نہیں۔ کبھی اس نے ظاہر نہیں کیا، لیکن کیا اس سے فرق پڑتا ہے خوشی میں تو اس سے محبت کرتا ہوں۔“

پہلی بار اس نے خوش جہل کے سامنے کھل کر اغترافے کیا۔

”شاید نہیں، لیکن اگر وہ کہیں اور انٹرنیٹ ہو اس کے والدین انکار کریں تو۔۔۔؟“ خوش جہل کی نظریں ابھی تک کارپٹ کے فرباش سے ابھری ہوئی تھیں۔

”نہیں۔۔۔“ مصطفیٰ نے فوراً ”نہی میں سر ہلایا۔

”ایسا نہیں ہے۔ ہوتا تو وہ بتاتی اور انکار میرا نہیں خیال کہ اس کے پاپا انکار کریں۔“

”تو پھر ٹھیک ہے تم اس سے بات کر کے بتاؤ۔ بابا اور اماں بات کر لیں گے اس کے پیر میں سے۔“

خوش جہل اٹھ کھڑی ہوئی۔ آنسو نکلنے کو بے تاب ہو رہی تھی۔ کتنا مشکل ہوتا ہے نا اپنی محبت کسی اور کو سونپنا۔

”اوکے پھر فون کرنا ڈاکٹر کو اور کل کسی وقت کا ٹائم لے لینا۔“

وہ بات کر کے رکی نہیں تھی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ مصطفیٰ نے پاس پڑا فون اٹھا کر ڈاکٹر کے اسٹنٹ کا نمبر ملا یا۔ وہ ایک خوش مزاج شخص تھا اور اس کے کھیل کا دلچ۔

”چند دنوں بعد ہی آپ کھیل کے میدان میں ہوں گے غلام مصطفیٰ۔“ ہمیشہ کی طرح اس نے آج بھی کہا تو وہ مسکرا دیا۔

”ان شاء اللہ!“ اور واقعی چند دنوں بعد وہ ریکٹس کے لیے اولڈ ٹرفٹ آیا تو اس کا کھیل دیکھنے کے بعد

”میں جانتی ہوں۔“  
”اس نے مجھ پر ظلم کیا خوشی! ظلم یہ نہیں کہ اس نے مجھے مڑایا۔ میری ٹانگیں توڑنے کی کوشش کی۔ بلکہ ظلم یہ ہے کہ اس نے لفظ دوست پر ضرب لگائی، میری دوستی کی توہین کی۔ یہ اذیت مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی خوش جہل!“

”طیوٹ مصطفیٰ!“ وہ انھ کے قریب آئی اور اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ ”وہ تمہارا دوست نہیں تھا۔ دوست ہوتا تو ایسا نہ کرتا وہ تمہاری دوستی کے قابل نہیں تھا۔“

”جس تکلیف سے میں گزر رہا ہوں وہ کیسے اتنی جلدی فراموش کر سکتا ہوں خوش جہل!“

مصطفیٰ نے نظریں اٹھائیں اور کچھ دیر بونہی اس کے چہرے کی طرف دیکھا رہا۔ وہ ایسی نہیں لگ رہی تھی جیسے ہمیشہ نظر آتی تھی۔ خوش، مطمئن اور پرسکون۔ وہ زندگی جو اس کے چہرے پر اسے ہمیشہ رقص کرتی نظر آتی تھی وہ زندگی مفقود تھی اور اس کی آنکھوں میں ملال کے رنگ بہت گہرے تھے۔

”تمہیں کیا ہوا ہے خوشی؟“

”نہیں۔ مجھے کیا ہوتا ہے۔“ وہ واپس اپنی جگہ پر لگ بیٹھ گئی۔

”نہیں۔ کچھ تو ہے خوش جہل! تم بہت اپ سیٹ لگ رہی ہو اور کچھ کمزور بھی لگ رہی ہو۔ پلیز بتاؤ نا کیا بات ہے۔ سب ٹھیک ہے نا۔ آفس کا کوئی پرابلم؟“

”نہیں۔“ اس نے نہی میں سر ہلایا۔ ”ایسا کچھ نہیں ہے۔ بس تمہاری وجہ سے ہم سب پریشان تھے۔ بابا! اماں اور میں، لیکن اب اللہ کا شکر ہے کہ تم ٹھیک ہو۔ بابا تو بہت سیشن میں تھے کہ بلا سے اترنے کے بعد کہیں کوئی ڈیفیکٹ نہ رہ جائے۔ اچھا خیر یہ بتاؤ۔ تم نے جوزی سے بات کی تھی؟“

”نہیں۔ میرا خیال تھا کہ ٹھیک ہونے کے بعد ہی بات کروں گا۔ اور کافی دنوں سے وہ نظر بھی نہیں آئی۔“

”اوسے مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ اس کے انکل اور



جوزے نے اس کی پیٹھ تھکی۔

”تم پورچین چیمپنز لیگ کے میچز نہیں کھیل سکتے، لیکن مجھے یقین ہے آنے والے تمام میچز میں تم اپنی شہرت کے جھنڈے گاڑو گے۔“

ایسا یقیناً ہونے والا تھا۔ اس روز وہ جوزے اور محی الدین کے ساتھ بارنگ کی طرف جا رہا تھا جب صحافیوں نے انہیں گھیر لیا۔

”سنا ہے غلام مصطفیٰ کے معاملے میں توسیع کی جارہی ہے اور انگلش سیزن 2011 کے کھلاڑیوں میں مصطفیٰ کا نام بھی شامل ہے؟“ انہوں نے جوزے سے پوچھا تھا۔

”آپ کو یقین ہے کہ غلام مصطفیٰ مائنسٹر یونائیٹڈ کے لیے اچھا انتخاب ہو گا۔“

صحافی دونوں سے تباہ کن سوال کر رہے تھے بمشکل ایک گھنٹے بعد وہ ان کے نزدیک سے نکلا تھا۔

”اللہ کرے غلام مصطفیٰ تم جوزے کی امیدوں پر پورا اترے۔“

محی الدین نے اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے ایک محبت بھری نظر اس پر ڈالی تو وہ مسکرایا۔

محی الدین پرونس ماوتھ کلب کے ساتھ ان کا ایک دوستانہ میچ دیکھنے آئے تھے اس میچ میں اس نے حیرت انگیز کارکردگی دکھائی تھی اور وہ پرونس ماوتھ کلب سے تین مہرے جیت گئے تھے۔ محی الدین اسے محتاط رہنے کی نصیحت کرتے ہوئے راستے میں ہی اتر گئے تھے انہیں کسی کام سے جانا تھا۔ اور اسے بھی

آج جوزے سے ملنا تھا۔ ان سبے دنوں میں جوزے اس کی صرف چند ملاقاتیں ہوئی تھیں وہ بھی مختصر سی۔

تین بار وہ گھر آئی تھی اور دوبارہ اسے گھر سے باہر اسٹاپ کی طرف جاتی ہوئی ملی تھی اور اب تو اسے انکل کے گھر سے آئے ہوئے بھی اسے کافی دن ہو گئے تھے

لیکن اپنی بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے وہ اس سے ملنے کے لیے وقت ہی نہیں نکال پا رہا تھا۔ کل صبح اس نے اسے گھر سے نکل کر اسٹاپ کی طرف جاتے دیکھا تو فوراً ”گھر سے نکل کر تقریباً دوڑتا ہوا اسٹاپ تک آیا

تھا۔

”کیسی ہو جوزی؟“ جوزفین نے اس کی طرف دیکھا لمحہ بھر کے لیے جیسے اس کے اندر چرانیاں ہوا۔

”ٹھیک ہوں۔“

”انگل کے گھر سے کب آئی ہو مشاعل۔ کیا میں تمہیں مشاعل کہہ کر بلا سکتا ہوں۔ دراصل مجھے اس نام میں زیادہ اپنائیت محسوس ہوتی ہے۔“

اس نے ساتھ ہی وضاحت بھی کر دی تو جوزمین نے اثبات میں سر ہلایا۔

”مشاعل! مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے

تین شام کو تم پارک میں آ جانا۔ زیادہ تاخیر نہیں لوں گا۔“

”تین شام کل شام چھ بجے۔ آج مجھے کچھ شاپنگ کرنا ہے۔“

”اوکے ٹھیک ہے۔“ اور وہ اس وقت تک کھڑا رہا جب تک اس کی بس نہیں آئی۔

اور اب سات بجتے والے تھے وہ لیٹ ہو گیا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ وہ اس کا انتظار کر رہی ہوگی اور ایسا ہی تھا وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔

”سوری مشاعل! میں لیٹ ہو گیا۔“ وہ اس کے پاس ہی بیچ پر بیٹھ گیا۔

”میں زیادہ دیر نہیں رک سکوں گی پہلے ہی دیر ہو گئی ہے اور تمہیں پتا ہے نا؟“ مصطفیٰ نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تمہاری شاپنگ ہوئی؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔“ بابا کچھ دنوں تک پاکستان جا رہے ہیں۔ دادا جان اور دادی کے لیے کچھ گفٹ خریدنے تھے۔“ اس نے کلائی موڑ کر وقت دیکھا تو مصطفیٰ کو احساس ہوا کہ اسے اوھر اوھر کی باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

”مشاعل! میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اماں اور بابا تمہارے گھر آنا چاہتے ہیں، لیکن میں پہلے تم سے بات کرنا چاہتا تھا“

تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔“ اس نے زندگی میں



گھلے میں ڈال دیا اور مسکرایا۔

”اس پذیرائی کا شکریہ جوزی!“ وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا، لیکن وہ اپنے ہاتھ کی بند مٹھی کی طرف دیکھ رہی تھی، پھر آہستہ آہستہ اس نے اپنی بند مٹھی کھولی اور اپنا ہاتھ اس کے سامنے کیا مصطفیٰ نے اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ کو دیکھا اور ہاتھ میں موجود چین کو اٹھایا اور اب وہ ٹمکنوں سے جچی اس مٹھی سی صلیب کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

”کیا یہ کوئی عام لاکٹ تھا یونہی فیشن کے طور پر پہنا جانے والا یا پھر۔۔۔“

”کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے مصطفیٰ؟“

اس نے صلیب والی چین اس کے ہاتھ سے اٹھا کر پھر اپنی مٹھی میں بند کر لی۔

درختوں میں گئے ننھے ننھے بلیوں کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس کے سنہری مائل بھورے بال اس کے کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے اس نے انہیں پیچھے سینے کیا تھا۔ اس مدہم روشنی میں اس کا چہرہ بہت مستاحوا لگ رہا تھا اور وہ اپنی بند مٹھی کو دیکھ رہی تھی۔

”میرے دادا پاکستان کے ایک چھوٹے شہر کے گرجا میں پادری ہیں۔“ اس نے اپنی بند مٹھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور میرا پورا نام مشاعل جوزفین ہے اور بابا کا نام پال نڈر ہے۔“

اور وہ بوا بھی کچھ سمجھنے نہ سمجھنے کی کیفیت میں تھا اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کی بند مٹھی کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے جکڑ لیا۔

”نہیں۔ میرا نہیں خیال کہ اس سے کچھ فرق پڑتا ہو۔ محبت میں ہر چیز بے معنی ہو جاتی ہے۔ صرف محبت باقی رہ جاتی ہے۔ جو کچھ نہیں دیکھتی جو بے دھڑک آتش سرود میں کود جاتی ہے۔“

”میری مٹی اور بابا کی آپس میں پہلے دن ہی نہیں بنی تھی۔ وہ جتنا عرصہ بابا کے ساتھ رہیں روز جھڑے ہوتے۔“

وہ سر جھکائے کہہ رہی تھی۔

اس کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتا تھا اور کوئی خواہش نہیں کی تھی کہ یہ سیاہ بھنونا آنکھوں والا لڑکا اس کا ہو جائے۔ وہ اس سے محبت کرے ایسے ہی جیسے وہ اس سے کرتی ہے۔ اتنی نہ سہی اس سے کچھ کم ہی سہی لیکن وہ اس سے محبت کرے اور اب جب کہ اس کی خواہش پوری ہو گئی تھی اور وہ اسے اپنانے کی بات کر رہا تھا اس سے محبت کا اعتراف کر رہا تھا تو اس کا جی چاہ رہا تھا وہ دھاڑیں مار مار کر روئے زمین و آسمان ایک کر دے۔ سب کچھ جل تھل ہو جائے لیکن وہ ہونٹ بھیچے بیٹھی تھی۔ وہ خوش قسمت تھی بہت خوش قسمت کہ غلام مصطفیٰ اس سے محبت کرتا تھا۔

وہ بہت بد قسمت تھی کہ وہ اس محبت کو اپنے سر کا تاج نہیں بنا سکتی تھی۔ وہ اس شخص کو مایوس کرنے والی تھی جس سے وہ عشق کرتی تھی اور جو بہت اشتیاق سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”اوہ ہاں!“ اسے جیسے اچانک کچھ یاد آیا تھا اور اس نے اپنی پلاکٹ میں ہاتھ ڈالا اور ایک بھولی ڈبیا نکالی۔ ”یہ لاکٹ ہے مشاعل! میں نے تمہارے لیے خرید ا تھا۔ چھوٹا سا گفٹ۔“ اس نے ڈبیا کھولی۔ گولڈ کی چین میں آنسو کی شکل کا چھوٹا سا سفید زرقون تھا۔

جوزفین نے اس کے ہاتھ میں موجود اس خوب صورت چین کو دیکھا۔ لکھ بھر کو وہ جیسے سب کچھ بھولی گئی وہ سب کچھ جو پچھلے کئی دنوں سے خود کو سمجھاتی آئی تھی۔ کسی خوب صورت جذبے نے اندر زقند بھری تھی اور اس نے ہاتھ پیچھے کر کے گلے میں بڑی چین کا لاک کھولا اور چین آکر مٹھی میں بند کر لی۔ عام سی چند پونڈ کی آرنٹفشل چین جس میں موجود چھوٹی سی ٹمکنوں سے جچی صلیب ہمیشہ اس کی شرٹ یا سوٹر کے اندر ہوتی تھی اور اب اس کی مٹھی میں بند تھی۔ اس نے مسکرا کر مصطفیٰ کی طرف دیکھا اور اپنا رخ موڑا اور مصطفیٰ کے دل میں ایک ساتھ ہزاروں قمقمے جل اٹھے۔

”تھینک یو۔“ اس نے اس کے بھورے بال نرمی سے ہٹائے اور لاکٹ کا لاک کھول کر اس کے



”پھر مئی اور پیلا میں ڈائوس ہو گئی۔ مئی نے انکل حبیب کے آفس میں جاب کر لی اور پھر ان سے شادی کر لی اور مجھے اپنے ساتھ تمہارے گھر لے آئیں۔ مجھے علم نہیں، لیکن ہمارا تھامی کہتی تھیں کہ انہوں نے تمہارے پیلا سے شادی کرنے کے لیے اپنا مذہب تبدیل کر لیا تھا۔“

”مشاعل! مجھے اس سب سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ میں نے کہا تھا کہ محبت میں سب کچھ بے معنی ہو جاتا ہے، لیکن تم کیا تمہیں اس سے فرق پڑتا ہے۔“

اس نے اپنے ہاتھ میں دلی اس کی بند مٹھی کھول کر صلیب والی چین کو اٹھا کر لہرایا۔

”مجھے۔۔۔“ اس نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے دھواں سا بھرا تھا۔

”میں جب مئی کے ساتھ تمہارے گھر تھی۔“ اس نے پھر نظریں جھکا لی تھیں۔

”تو تم مجھے بہت اچھے لگے تھے۔ میرا دل چاہتا تھا تم سے کھیلوں، باتیں کروں۔۔۔ تمہیں اپنے اس گھر کے متعلق بتاؤں جو چرچ سے منسلک تھا، لیکن تم مجھے پسند نہیں کرتے تھے۔ مجھ سے بات نہیں کرتے تھے اس وقت جب میں محبت کے مفوم تک سے نا آشنا تھی۔

میں نے ہر دن اور ہر رات مقدس مريم سے دعا کی کہ تم میرے دوست بن جاؤ۔ تم مجھے ناپسند نہ کرو۔ جب مئی تمہیں مارتی تھیں تو میرا دل چاہتا تھا کہ تمہاری تکلیف میں لے لوں۔ میں تمہارے لیے روتی تھی اور دعا کرتی تھی کہ وہ درد جو تمہیں ہو رہا ہے وہ مجھے ہو جائے اور تم ٹھیک ہو جاؤ۔“

اس نے ذرا سی گردن اونچی کی۔ گولڈ کی لنگر والی سنہری رو پہلی چین اس کی خوب صورت گردن میں سج گئی تھی اور زرقون کا آنسو گردن سے نیچے جلد سے چپکا ہوا تھا۔

”تو مشاعل! اللہ نے تمہاری دعا سن لی۔“ وہ مسکرایا۔

”اللہ نے میرے دل میں تمہاری محبت بھری۔“

”ہاں اللہ نے میری دعا سن لی، لیکن میں۔۔۔ میرا مذہب۔۔۔“

اس کی آنکھیں یک دم آنسوؤں سے بھر گئیں اور آنسو رخساروں پر پھیل آئے۔

”مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا مشاعل! تم بتاؤ۔ کیا تمہیں اس سے فرق پڑتا ہے؟“ اس نے اپنا سوال پھر دہرایا۔

”وہ محبت جو مجھے تم سے ہے غلام مصطفیٰ سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ لیکن مجھے فرق پڑتا ہے۔“

وہ اب زارو قطار رو رہی تھی اور مصطفیٰ حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”میرے خاندان کو فرق پڑتا ہے۔ میں اپنے پیلا کا مان نہیں توڑ سکتی غلام مصطفیٰ۔ میرا دادا ایک پادری ہے۔ میں نہیں دیکھ سکتی کہ پورا خاندان میرے پیلا پر انگلیاں اٹھائے۔ میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔ میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں، لیکن میں سے کرتی ہوں۔“

زارو قطار روتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھ جوڑ لیے۔

”مجھے صاف کر دو مصطفیٰ! میں نے تمہیں تکلیف دی، میں نے تمہیں رنج پہنچایا۔ جس طرح میں تمہیں مئی کی مار سے نہیں بچا سکتی تھی اس طرح تمہیں اس دکھ سے بھی نہیں بچا پارہی۔“

مصطفیٰ ساکت بیٹھا تھا۔ صلیب والی چین اس کے ہاتھ سے گر پڑی تھی۔ مشاعل نے جھک کر صلیب اٹھائی اسے چوما اور ساکت بیٹھے مصطفیٰ کو دیکھا اور کھڑی ہو گئی اور بہت دیر تک اسے دیکھتی رہی یوں جیسے اس کی شبیہ کو ہمیشہ کے لیے اپنے دل میں محفوظ کر رہی ہو۔ جیسے اسے پتا ہو کہ آج کے بعد پھر وہ ان سیاہ آنکھوں کو نہیں دیکھ سکے گی۔ آنسو اب بھی اسی روانی کے ساتھ اس کے رخساروں کو بھگور رہے تھے۔ مصطفیٰ اسے روتے ہوئے دیکھ رہا تھا وہ اس کے آنسو

# بلیک بی

ٹیکم پاؤڈر

Black Beauty  
COLOGNE TALC



خوشبو کا احساس جو رہے  
گھنٹے آپ کے ساتھ



ایک عرصہ تک چلے جائے آپ کو خوشبو کے چہرے میں اور نہ ہوا کے آپ کے تصور کو

Digital Creations



وہ سنجیدگی سے سامنے دیکھتے ہوئے ڈراؤ کر رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے آنسو پونچھ لیے تھے کیوں کہ اس کے آنسوؤں سے مصطفیٰ کو تکلیف ہو رہی تھی اور وہ اسے تکلیف نہیں دینا چاہتی تھی نہ صرف ایک بات سوچنا چاہتی تھی کہ وہ مصطفیٰ کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہے۔ جب وہ گھر کے سامنے اتری تو ایک اور خواب لمحہ دل کی انہم میں محفوظ ہو چکا تھا۔

مصطفیٰ تیزی سے گاڑی آگے نکال لے گیا تھا اور پھر کتنی ہی دیر تک وہ یونہی بے مقصد مختلف سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا پھرا اور پھر محی الدین اور فاطمہ کی پریشانی کے احساس نے اسے چونکا یا اور ناؤم سا ہو کر اس نے گھر کا رخ کیا۔

وہ چپکے سے اپنے کمرے میں جا کر سو جانا چاہتا تھا اس وقت وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے ڈور بیل بجانے کے بجائے اپنی چابی سے دروازہ کھول لیا تھا۔ وہ کم از کم خوش حمال کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ تو جیسے اس کے اندر اتر کر اس کے دل کا حال جان لیا کرتی تھی، لیکن اس کے کمرے کے دروازے کے پاس سے دبے پاؤں گزرتے ہوئے وہ سکین کی آواز پر تھک کر رک گیا۔ کیا خوش حمال رو رہی تھی، لیکن کیوں اس سے پہلے کہ وہ نیم اور دروازے کو دھکیل کر اندر جاتا اسے عافیہ کی آواز سنائی دی۔ وہ آج صبح سے ادھر آئی ہوئی تھی اور شاید خوش حمال نے اسے روک لیا تھا۔

”لیکن تم نے ایسا کیوں کیا خوش حمال؟ اپنی محبت کی قربانی کیوں دی۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد وہ جوڑی کو بھول جاتا۔ تم اتنی اچھی ہو کہ۔“

”ہاں شاید۔“ خوش حمال کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”لیکن میں نہیں چاہتی تھی عافیہ! کہ اس کا کیریر تباہ ہو۔ وہ اب سیٹ تھا اتنا کہ کھیل چھوڑ دینے کی باتیں کر رہا تھا۔ اس کی پریشانی اس کے کھیل کو متاثر کر رہی تھی۔ وہ لال اور بابا کی خواہش رد نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنی محبت کی قربانی دے رہا تھا تو کیا میں نہیں

پوچھنا چاہتا تھا، لیکن اس کے ہاتھ یونہی گود میں دھرے رہے۔ اس کے اندر عجیب سی ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا اسے سلی دینا چاہتا تھا اسے بتانا چاہتا تھا وہ اس سے ناراض نہیں ہے۔

وہ صبح کمرہ رہی ہے یہ بہت مشکل ہوتا ہے اپنے خاندان کو چھوڑنا انہیں تکلیف دینا۔ محبت مرنے نہیں ہمیشہ دل کے نہال خانوں میں زندہ رہتی ہے۔ تو وہ اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن لفظ اس کے اندر بن بن کر ٹوٹ رہے تھے۔

وہ یونہی روٹی ہوئی مڑی اور ہولے ہولے چلنے لگی۔ وہ اسے جانتے ہوئے دیکھتا رہا حتیٰ کہ وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ تب وہ چونکا اسے لگا جیسے پارک میں موجود درختوں اور قلعے کے دم بجھ گئے ہوں۔

پھر وہ اٹھا اور تیز تیز چلتا ہوا پارک سے باہر آیا۔ وہ کچھ فاصلے پر اسے یونہی سر جھکا کے ہولے ہولے چلتی نظر آئی۔ گھر پارک سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ یہاں تک پیدل آئی ہوگی اور اب پیدل ہی واپس جا رہی تھی۔ اس نے مڑ کر اپنی گاڑی کو دیکھا اور اس کی طرف دیکھا۔ چند ہی لمحوں میں وہ اس کے قریب گاڑی روک چکا تھا۔

”آجائو مشاعل!“

اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولا۔ مشاعل نے رک کر ایک نظر اسے دیکھا اور خاموشی سے بیٹھ گئی۔ آنسو اب بھی رخساروں کو بھگوتے ہوئے گردن اور گردن سے گریبان میں جذب ہو رہے تھے۔

”مت روؤ مشاعل۔!“ اس نے بے بسی سے مشاعل کی طرف دیکھا۔ ”میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ تم نے بالکل صحیح فیصلہ کیا۔“

رشتوں کا مان نہیں ٹوٹنا چاہیے۔ رائی محبت۔ تو وہ تو ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ میں تم سے ہمیشہ محبت کرتا رہوں گا۔“

اس سے زیادہ اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ تھا۔

دیکھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب محی الدین نے صحافی کی بات کا جواب دیا تھا۔

”اسے یہ شوق اپنے ماموں اور اپنے نانا سے ملا ہے۔ اس کے مرحوم ماموں عبد الہادی بہت اچھے کھلاڑی تھے اور اس کے والد کو کھیلنے کا شوق نہیں تھا۔“

محی الدین کو ہمیشہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ بات یاد رہتی تھی کہ لے پانکوں کو ان کے باپوں کے ناموں سے محروم مت کرو۔

”آپ۔۔۔!“ صحافی کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

”میرے بابا ہیں، میرا سب کچھ۔“ غلام مصطفیٰ کی آنکھوں میں محی الدین کے لیے عزت جیسی احترام تھا۔ محبت کی۔

”ہاں میں اس کا بابا ہوں اور کسی میرا سرمایہ اور میری عمر بھرتی ہو گئی ہے، لیکن اس کے حقیقی باپ کا نام حبیب الرحمن تھا۔“

ان کے دل کو جیسے کسی نے ٹھٹھی میں لیا تھا، اسکرین کا منظر بدل گیا تھا۔ اب نیوز کا سٹرکونی اور خبر سنا رہا تھا۔

”زری!“ ان کی آواز اتنی بلند تھی کہ اپنے کمرے سے سنی بھی بھاگتا ہوا آگیا تھا۔

”کیا ہوا بابا۔“

”زری!“ وہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر پھر چیخنے لگی تھی۔

”کیا ہوا؟“ زری نے ہاتھ صاف سے پوچھتی ہوئی کچن سے آئی تھی۔

”تم نے۔۔۔ تم نے ہادی کی لاش کو تھانے میں اس کے کپڑوں سے پھپھانا تھا اور اس کے جوتوں سے۔“

”جی۔۔۔ جی!“

”جھوٹ بولتی ہو تم۔ جھوٹ بولنا تم نے۔“ وہ یک دم چیخنے لگی اور اٹھ کر تیزی سے اس کی طرف بڑھے وہ بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹی۔

”تم نے پھپھانا تھا ہادی کی لاش کو؟“

”مجھے لگا تھا کہ وہ ہادی ہے۔“ زری نے خوف زدہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

دے سکتی تھی۔“

”تم نے کہاں کو لایا؟“ عافیہ پوچھ رہی تھی۔

”انہیں۔ میں نے کئی بار بتانا چاہا، لیکن کہاں کا خوشی سے دیکھتا چہرہ دیکھ کر میری ہمت جواب دے گئی۔ وہ

ایک بار جوڑی سے بات کر لے تو پھر۔“

اور اس نے قدم اپنے کمرے کی طرف بڑھا دیے

اس کی آنکھوں کے سامنے کئی منظر آ رہے تھے۔

خوش جمال کی بھیگی پلکیں۔

اس کا طویل چہرہ

اس کی پھٹکی رنگت۔۔۔

اور ہر منظر اس کہانی کی تصدیق کر رہا تھا جس کا علم

اسے اب ہوا تھا، لیکن جس کا اور اک اس کے اندر

پہلے سے موجود تھا۔

\*\*\*

دہلی کے ایک خوب صورت ولا کے ٹی وی لاؤنج

میں صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر ٹی وی دیکھتے

ہوئے حبیب الرحمن ایک دم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے

تھے بہت سارے صحافیوں میں گھرے ہوئے غلام

مصطفیٰ کا کلوز اپ دکھایا جا رہا تھا۔ غلام مصطفیٰ

ابھی ابھی کستانی فٹ بالر۔ ایک بار پھر پانچسٹریوٹائینڈ کا

حصہ بنے جا رہا ہے۔

”غلام مصطفیٰ آپ کا تعلق پاکستان سے ہے۔“

اب پھر وہ صحافیوں کے ہجوم میں گھرا نظر آ رہا تھا اور

ایک صحافی پوچھ رہا تھا۔

”جی!“ غلام مصطفیٰ کے ہونٹوں پر بڑی دلکش

مسکراہٹ تھی۔ ”پاکستان کے ایک چھوٹے سے شہر

سے تعلق ہے میرا، لیکن میں پچھلے دس سالوں سے

یہاں ہوں۔ میں نے اپنے کھیل کا آغاز آئرلینڈ

کی طرف سے کیا تھا۔“

”آپ کو یہ شوق اپنے والد کی طرف سے ورثے

میں ملا۔ آپ کے ڈیڈ اور مرحوم بھائی بھی اچھے کھلاڑی

ہیں۔“

”جی!“ اس نے پاس کھڑے محی الدین کی طرف



”بچوں سے غلطیاں ہو جاتی ہیں آپ نے اسے فون پر اس بری طرح ڈانٹا کہ وہ۔۔۔“  
زری نے انہیں الزام دیا تو وہ بھی یہی سمجھنے لگے کہ ان کی ڈانٹ سے۔۔۔

اور پھر انہوں نے اسے کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا، ہانگوں کی طرح گاڑی دوڑاتے پھرے۔ ایک ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹا کر پوچھا۔ تھانے میں رپورٹ لکھوائی اور اس روز گیٹ کے باہر والی دیوار پر ان کی اچانک نظر پڑی تھی۔ ”میں نے سنی کو نہیں گرایا پایا! مہی نے۔“  
اور انہوں نے مشاعیل اور مینو سے پوچھا تھا۔ مینو تو بچے خاموش رہی تھی، لیکن مشاعیل نے تصدیق کی تھی کہ سنی تو کراہی نہیں تھا۔ وہ تو پونسی رو رہا تھا۔  
انہیں اس کے زری سے نفرت محسوس ہوئی تھی۔ انہوں نے اس کی طرف دیکھا اور بولنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ گھنٹوں گیٹ کے باہر کمرے اس کے لکھے جلے کو بڑھتے رہتے۔ اس پر انگلیاں پھیرتے۔  
”مجھے یقین ہے ہادی۔!“

وہ زیر لب کہتے اور اس کے لکھے بظہور ہونٹ رکھ دیتے اس کی اس آخری تحریر کو انہوں نے اتنی بار دہرایا کہ ان کے ہونٹ پھل گئے تھے۔ وہ راتوں کو اٹھ کر اس کے کمرے میں چلے جاتے اس کا تکیہ اس کے کھونٹے اس کی کتابیں ایک ایک چیز کو چومتے پٹ پٹ کر دوتے تھے۔

اور پھر انہیں وہی جانا پڑ گیا۔ ناگزیر ہو گیا تھا کہ انہیں سارے معاہدوں پر دستخط کرنے تھے۔ اگر وہ نہ جاتے تو بہت سے مسائل گھڑے ہو جاتے۔ ہو سکتا ہے سارا سرمایہ ہی ذوب جاتا، لیکن وہ بہت سارے دن وہاں نہیں رہے تھے۔ جلد لوٹ آئے تھے اور زری نے انہیں بتایا کہ ہادی کی لاش مل گئی تھی اور انہیں لگتا تھا جیسے وہ پاگل ہو جائیں گے۔ یہ دکھ برداشت نہیں کر پائیں گے۔ بہت وقت لگا تھا انہیں سمجھنے میں اور پھر وہ اپنے ایک دوست عبدالرحمن کو گھر کرائے پر دے کر وہی آگئے تھے۔

”پاپا!“ سنی نے آہستگی سے کہا۔ ”خوصلہ کریں۔۔۔“

”نہیں۔۔۔ تمہیں لگا نہیں تھا۔ تم نے جھوٹ بولا تھا۔ تم جانتی تھیں۔ تمہیں بتا تھا۔ وہ ہادی نہیں تھا۔“  
انہوں نے آنسو بھری آنکھوں سے سنی کی طرف دیکھا اور ٹوٹی آواز میں بولے۔

”اس عورت کو میری نظروں سے دور کر دو۔ ورنہ میں کچھ کر بیٹھوں گا۔“  
”مما پلیز! آپ باہر جائیں۔“

سنی نے زری کے بازو پر ہاتھ رکھا اور مز کر صیب الرحمن کی طرف دیکھا جو صوفے پر گرے گئے تھے۔  
”پاپا!“ وہ تیزی سے ان کے پاس آکر بیٹھ گیا اور اپنا بازو ان کے گرد حائل کیا۔

”کیا ہوا۔۔۔ پلیز مجھے بتائیں ساری بات۔“  
”اس عورت نے مجھ پر بہت ظلم کیا۔ تمہارے بھائی کو گھر سے نکال دیا۔ اور۔۔۔“

ان کی آواز گھٹ گئی۔ سر جھک گیا اور آنکھیں برسنے لگیں۔ کتنے کرب سے گزرے تھے وہ، کتنی اذیت اٹھائی تھی انہوں نے۔۔۔ پیسے مل ایک زخم تھا مسلسل رستا ہوا۔

کراچی میں خلاف توقع انہیں بہت دن لگ گئے تھے۔ وہ دہلی میں کسی کے ساتھ پارٹنرشپ میں بہت پڑا بزنس کرنے والے تھے اور جب وہ واپس آئے تو لاؤنج میں بیٹھے سب کو گفٹ دیتے ہوئے انہیں ہادی کا خیال آیا تھا۔

”ہادی کہاں ہے؟“  
”وہ تو گھر سے بھاگ گیا تھا“ اسی روز جب اس نے سنی کو گرایا تھا۔ ”زری نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔“  
”کیا!“ انہوں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

”میں نے بہت ڈھونڈا ہر جگہ نہیں ملا۔“ زری سر جھکائے ہوئے تھی۔

”اور تم نے مجھے بتایا نہیں ذکر تک نہیں کیا ہر دوسرے دن میں فون کرتا تھا۔“

”میں نے تمہاری پریشانی کے خیال سے نہیں بتایا تھا۔“

”وہ میرا بیٹا تھا کوئی چیز نہیں تھا۔“

مت اس طرح روئیں آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔“  
 ”نہیں۔ پاپا آپ کو ممی کا نمبر مل گیا تھا؟“  
 ”ہاں۔ وہ روزی نے بتایا تو تھا۔ یہی فون اسٹینڈ پر دیکھو۔ ڈائری میں لکھا تھا۔ روزی کے نام کے ساتھ۔“

”پاپا! میں ممی کے پاس جانا چاہتی ہوں۔“  
 ”تین سالوں بعد کیا وہ تمہیں رکھ لے گی۔“ پاپا نے دل گرفتگی سے اسے دیکھا۔  
 ”جی نہیں پاپا۔ لیکن اگر انہوں نے نہ رکھا تو میں واوا کے پاس پاکستان چلی جاؤں گی۔ میں یہاں نہیں رہوں گی۔“  
 پاپا نے افسردگی سے سر ہلایا۔  
 ”آپ کی سیٹ کنفرم ہو گئی۔“  
 اس نے فون اسٹینڈ کی طرف جاتے پوچھا۔  
 ”نہیں۔“ پاپا نے نفی میں سر ہلایا۔  
 ”اس نے صحیح فیصلہ لیا ہے۔ اسے اب یہاں نہیں رہنا چاہیے۔ مارتھا نے میری زندگی اجیرن کر رکھی ہے اور اس کی بھی۔ شاید اس کے جانے کے بعد حالات بہتر ہو جائیں۔“ اس کا دل رونے لگا۔  
 ”لوگیاں بہا کر بھی تو باپ کے گھر سے رخصت ہو جاتی ہیں۔“  
 وہ خود کو تسلی دے رہا تھا۔ اور وہ خود ڈائری ہاتھ میں لیے فون اسٹینڈ کے پاس کھڑی تھی۔  
 ”ہاں۔ بہتر ہے۔“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔  
 وہ یہاں مصطفیٰ کے گھر کے سامنے رہی تو کیسے روک پائے گی خود کو مصطفیٰ کو دیکھنے سے۔ اسے دیکھ کر دل جیسے نہ اس کی قسمت کے لیے مچلے گا۔  
 وہ جانتی تھی وہ نہیں روک سکے گی۔ خود کو۔ اپنے فیصلے پر قائم نہیں رہ سکے گی۔ وہ پاپا کا مان توڑ دے گی۔ محبت اتنی ہی زور آور ہوتی ہے کہ اپنی راہ میں آئی ہر شے کو خس و خاشاک کی طرح بہائی ہوئی لے جاتی ہے۔ کسی تیز بڑے سیلابی ریلے کی طرح۔ وہ بھی ڈرتی تھی کہ کہیں پاپا، واوا اس کی پہچان سب اس ریلے میں بہ نہ جائیں اس لیے بہتر تھا کہ وہ یہاں سے چلی

”خوصلہ۔ کیسے حوصلہ کروں سنی۔ تمہاری ماں نے مجھے مار دیا۔ اس عورت نے فریب دیا مجھ سے نہ جانے کس کی آنکھوں کا نور تھا وہ جس کی قبر پر یہ مجھے لے کر گئی۔ میں اتنے سالوں سے تڑپ رہا ہوں۔ میرا بیٹا اس دنیا میں نہیں رہا۔ اللہ کی مرضی اتنی ہی زندگی تھی۔ میں خود سے کہتا، لیکن اسے میرے گھر سے کفن بھی نصیب نہیں ہوا لاوارثوں کی طرح دفن ہوا۔ یہ اذیت میں آج تک رہا تھا۔ یہ عورت ڈائن ہے سنی۔ لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ وہ زندہ ہے۔“

”پاپا پلیز! مجھے ساری بات بتائیں۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔“  
 حبیب الرحمن نے اپنے آنسو پونچھے اور ہولے ہولے اسے بتانے لگے۔

”پاپا! جو ذہین لاؤنج میں بیٹھنے لگی وہ دیکھنے پال کے قریب آئی۔ اس کی آنکھیں سوچی ہوئی تھیں۔ چہرہ تیار ہوا تھا۔ پاپا نے آواز آہستہ کر کے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا منہ خراب تھا۔ مارتھا نے اسے بتایا تھا کہ وہ غلام مصطفیٰ کے ساتھ ڈیٹ پر گئی ہے۔ مارتھا کے ساتھ ایک طویل لڑائی کے بعد وہ تھک کر یہاں لاؤنج میں آکر بیٹھ گیا تھا اور مارتھا غصے سے بیڈ روم میں بند ہو گئی تھی۔“

”تم کہاں تھیں اب تک؟“ اس نے لہجہ نرم رکھنے کی کوشش کی تھی، لیکن کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

”پاپا! میں پارک میں چلی گئی تھی۔ دل بہت بھرا رہا تھا۔“

”ہوں!“ اب کے اس نے بغور دیکھا۔ ”کیا مارتھا سے تمہاری لڑائی ہوئی ہے۔“  
 ”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا اور پاپا کے پاس



کھلاڑی ہے۔ کہیں سے کوئی رابطہ مل جائے گا۔  
وہ ایک بار پھر رونے لگے تھے۔ ان کا بس نہیں چل  
رہا تھا کہ وہ اڑ کر لکھنؤ میں اس کے پاس پہنچ جائیں۔  
”ایسا۔“ سنی نے انہیں تسلی دی۔ ”آپ پریشان نہ  
ہوں اتنے مشہور کھلاڑی کا ایڈریس معلوم کرنا مشکل  
نہیں ہے۔ صبح میں پہلے تو مانچسٹر یونائیٹڈ سے رابطہ  
کرنے کی کوشش کروں گا۔ ان شاء اللہ پتا چل جائے  
گا۔ میں آپ کو لے کر جاؤں گا بھائی کے پاس پر اس۔  
ہم ڈھونڈ لیں گے اسے۔“

”اور اگر اس نے مجھ سے ملنے سے انکار کر دیا۔ وہ  
مجھ سے ناراض ہوا تو۔؟“ انہوں نے ڈبڈبائی آنکھوں  
سے سنی کی طرف دیکھا۔

”ایسا نہیں ہو گا بھائی!“ اس نے ان کا بازو تھپتھپایا۔  
تب ہی فون کی بیل بجی اس کا خیال تھا کہ سٹنگ  
روم میں بیٹھی ہوئی ندری فون اٹھالے گی لیکن فون بج  
بج کر بند ہو گیا تھا۔

”اس وقت پتا نہیں کس کا فون ہے۔“ سنی نے  
سوچا اور میگزین لینے کے لیے اپنے کمرے کی طرف  
بڑھا۔ تب ہی بیل دوبارہ ہونے لگی۔ تو اس نے ریسپور  
اٹھالیا۔

”ہیلو!“  
”دوسری طرف سے کسی لڑکی کی آواز آئی  
تھی“ سنی ہوئی اور روٹی روٹی سی آواز۔ ”یہ حبیب  
الرحمن صاحب کا کمرہ ہے۔“

”جی آپ کون؟“ سنی نے پوچھا۔  
”وہ میں۔ مجھے مئی سے بات کرنی ہے۔ میرا مطلب  
ہے سر حبیب الرحمن سے۔“

”آپ کون؟“ سنی نے پھر پوچھا۔  
”میں مشاعل ہوں اور آپ۔“  
”میں سنی ہوں۔“

”سنی! تم آواز سے کتنے بڑے بڑے لگ رہے  
ہو۔“ مشاعل کی آواز سے اشتیاق جھلکتا تھا۔

”ہاں۔ میں اولیول میں ہوں۔“ اس نے بتایا۔  
”نمی کیسی ہیں اور انگل؟“

جائے یہاں نہ رہے دور ہوگی تو شاید وہ اس زور آور  
محبت کو دبا لے اور شاید مصطفیٰ کو بھی اسے بھولنے میں  
آسانی ہو۔

اس نے محلے میں موجود چین کو چھوا۔ خوب  
صورت چین ایک آنسو کو اپنے وامن میں لیے اس کی  
گردن سے لپٹی تھی۔

اس نے بال کی طرف دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔  
اور ریسپونڈ تھا اگر نمبر ملانے لگی۔



”میں نے ابھی ٹی۔ وی پر اسے دیکھا ہے سنی!  
کھیلوں کی خبروں میں وہ غلام مصطفیٰ ہے فٹ بار۔  
مانچسٹر یونائیٹڈ سے وابہ تہ کھلاڑی۔ اور اس کے ساتھ  
محی الدین تھا۔ عبداللہ کی کا دوست میں اسے اچھی  
طرح جانتا ہوں۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ جب  
تمہاری مئی نے اسے گھر سے نکالا تو وہ اپنے ماموں  
عبداللہ کی دوست کے پاس چلا گیا ہو گا۔“

وہ ابھی تک صوفے پر بیٹھی تھی اور ابھی تک سنی کا  
ایک بازو ان کے گرد حائل تھا اور ابھی تک ان کے  
رخسار بھیکے ہوئے تھے۔

”غلام مصطفیٰ!“ سنی نے سوالیہ نظروں سے حبیب  
الرحمن کو دیکھا۔ ”بھائی کا نام تو ہادی ہے۔“  
”ہادی تو پیارے ام کلثوم سے بلاتی تھی اور پھر  
سب ہی ہادی کہنے لگے۔“

”غلام مصطفیٰ مانچسٹر یونائیٹڈ کا پاکستانی کھلاڑی وہ تو  
میرا فیورٹ کھلاڑی ہے۔ بہت پھر تھلا اور چست۔  
ایک میگزین میں اس کی تصاویر ہیں۔ میرے پاس  
ہے وہ میگزین میں آپ کو دکھانا ہوں۔“ ف۔ او۔ مجھے  
کشتی خوشی ہو رہی ہے کہ میرا بھائی غلام مصطفیٰ انٹر  
نیشنل کلب کی نمائندگی کرتا ہے۔“

وہ اٹھا لیکن حبیب الرحمن نے اس کے ہاتھ تھام  
لیے۔

”سنی! مائی سن! مجھے اس کے پاس لے چلو۔ پتا کرو  
اس کا کہیں سے اس کا ایڈریس ڈھونڈو۔ وہ تو اتنا مشہور

ماں باپ دونوں ہی بہت بیش قیمت ہوتے ہیں۔ وہ ان کی آپس کی نفرتوں اور جھگڑوں کے متعلق نہیں جانتے۔ انہیں بس صرف یہ پتا ہوتا ہے کہ یہ ان کے ماں باپ ہیں اور انہیں ان دونوں کے ساتھ ہی رہنا ہے اور جب انہیں کسی ایک کے پاس رہنا پڑتا ہے تو وہ دوسرے کو کبھی نہیں بھولتے۔

”کیا کہانیاں سنا رہی ہے؟“ زری کمر پر ہاتھ رکھے کھڑی اسے گھور رہی تھی۔ سنی نے اسے جواب نہیں دیا تھا۔ اس کا دل مشاغل کے لیے دکھ رہا تھا۔ ”سنی!“ ایک ذرا توقف کے بعد مشاغل نے پوچھا۔ ”نکل گھر میں ہیں۔ کیا میری ان سے بات ہو سکتی ہے؟“

”ہاں پایا گھر میں ہیں لیکن ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ سنی نے جیلا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت وہ کس کیفیت سے گزر رہے ہیں۔

”لیکن مجھے ان سے بہت ضروری بات کرنا تھی سنی۔ پھر بتا نہیں موقع ملے یا نہ ملے۔ مجھے ان سے ہادی کے متعلق بات کرنی ہے پلیز۔“

”وہ ہادی سے متعلق آپ سے بات کرنا چاہتی ہے؟“

سنی نے حبیب الرحمن کی طرف دیکھا۔ تو وہ ایک دم اٹھ کمرے ہوئے۔ ”ہادی کے متعلق!“ انہوں نے آگے بڑھ کر ریموڈ اس سے لے لیا۔

”اسے تو ہمیشہ ہے ہی ہادی کی پیڑ (درد) تھی۔“ زری ہڑبڑاتی تو سنی نے ناسف سے انہیں دیکھا۔ ”ہیلو۔ ہیلو مشاغل بیٹا! میں حبیب الرحمن بول رہا ہوں۔ کیسی ہو؟“

”انکل! میں ٹھیک ہوں۔ مجھے آپ کو بتانا تھا کہ ہادی زندہ ہے اسے کچھ نہیں ہوا تھا وہ یہاں رہتا ہے ہمارے گھر کے سامنے۔ کئی بار میری ملاقات ہوئی ہے اس سے، لیکن مجھے پہلے آپ کا نمبر نہیں پتا تھا۔“

وہ بتا رہی تھی اور رو رہی تھی۔ ”رہلیکس بیٹا۔ مجھے اپنا ایڈریس بتاؤ۔ اور تمہارے

”سب ٹھیک ہیں۔ آپ کہاں سے بات کر رہی ہیں؟“

”لندن سے، مجھے مئی سے بات کرنی ہے۔“ اس نے کہا تو اس نے حبیب الرحمن کو بتایا۔

”مشاغل ہے۔“

اس نے اپنی اس۔ بسن کو دیکھا تنک نہ تھا وہ تقریباً دو سال کا تھا جب وہ اپنے پایا کے ساتھ چلی گئی تھی لیکن مئی سے اس نے کئی بار اس کا ذکر سنا تھا۔ وہ اس سے سخت خفا تھی اور اکثر اس خفلی کا اظہار کرتی تھی کہ اس نے اس کے بجائے اپنے پایا کے پاس رہنا پسند کیا تھا۔

”مما! مشاغل کا فون ہے وہ آپ سے بات کرنا چاہتی ہے ادھر سے فون اٹھالیں۔“ اس نے بلند آواز میں کہا۔

”کون مشاغل؟ میں کسی مشاغل کو نہیں جانتی۔؟“ وہ سٹنگ سے ہی چیخ کر بولی تھی۔ ”کہہ دو اس کے مجھے اس سے بات نہیں کرنا۔“

”مما پلیز!“ اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”کرلیں تا بات۔“

”کیوں کروں بات؟“ وہ سٹنگ روم سے اٹھ کر لائن میں آ بیٹھی تھی۔ حبیب الرحمن سے رخ موڑ لیا۔ ”تجربہ کیا ضرورت پڑ گئی ہے اسے میری باپ مر گیا ہے یا ماں نے گھر سے نکال دیا ہے۔“ وہ ہمیشہ سے انتہا پسند تھی۔

سنی نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا اور پھر مشاغل کو مخاطب کیا۔

”مشاغل! وہ مئی آپ سے بات نہیں کرنا چاہتیں۔“ اسے لگا جیسے وہ رو رہی ہو۔

”آپ پریشان مت ہوں۔ میں انہیں سمجھاؤں گا۔ اور آپ کی بات کروں گا ان سے۔“

”مجھے پتا تھا سنی۔ وہ مجھ سے بات نہیں کریں گی پھر بھی میں نے ان سے بات کرنا چاہی۔“ وہ روئی روئی آواز میں بولی۔

”سنی! تم مئی کو بتا رہی ہیں ان سے بہت محبت کرتی ہوں میں نے ہمیشہ انہیں بہت یاد کیا۔ بچوں کے لیے



پاس اس کا نمبر ہو گا۔ مجھے بتاؤ۔“ ان کی آواز کچکپا رہی تھی۔

”سنی۔ سنی جلدی سے کاغذ قلم لے کر آؤ۔“

سنی نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ سے ریسیور پکڑ لیا تھا۔ اور وہ نڈھال سے صوفے پر گر گئے تھے۔ وہ اتنے سالوں سے جس بیٹے کو مردہ سمجھ رہے تھے۔ وہ زندہ تھا۔ موجود تھا۔ ایک بار پھر ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ لیکن یہ آنسو خوشی کے تھے، شکر کے تھے۔ سنی نے نمبر لکھ کر ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ کیونکہ فون بند ہو گیا تھا۔

”کس کا نمبر لکھوا رہی تھی۔“ زری ابھی تک وہاں ہی کھڑی تھی۔

”مجھے مت کہنا حبیب الرحمن کہ میں اس سے بات کروں یا اپنے پاس رکھ لوں۔“

حبیب الرحمن نے وہی جواب نہیں دیا تھا۔

”مما! یہ ہادی بھائی کا نمبر ہے۔“

”ہادی کا نمبر۔ اوہ تو یہ آگ اس نے لگائی ہے۔“ وہ بڑبڑاتی۔

”سنی!“ حبیب الرحمن کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

”اپنی ماں سے کچھ چلی جائے یہاں سے۔ ایک بار میں نے اسے اس لیے معاف کر دیا تھا کہ تم بھی ہادی کی طرح ماں کی امیتا سے محروم نہ ہو جاؤ۔ تمہاری خاطر میں نے اسے معاف کیا تھا لیکن شاید اب ایسا نہ کر سکوں۔ میں اسے دیکھنا نہیں چاہتا۔“

”پاپا پلیز۔“ سنی وہ ذکر ان کے پاس آیا۔ ”پاپا پلیز میری خاطر۔ میں جانتا ہوں میں نے بہت بُرا کیا۔ بہت غلط کیا، لیکن پاپا وہ میری ماں ہیں۔ میں ان سے بہت محبت کرتا ہوں۔ آپ انہیں معاف کر دیں۔“

سنی کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ وہ خبردار تھا کہ انہیں دیکھ رہا تھا۔

حبیب الرحمن نے سنی کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی نو عمر تھا۔ کون سا بہت بڑا ہو گیا تھا۔ چودہ پندرہ سال کا ہی تو تھا۔

انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”میں نے تمہاری خاطر اور اپنے ہادی کی زندگی کے صدقے اسے معاف کیا، لیکن اپنی ماما کو سمجھاؤ کہ میرے سامنے مت آیا کرے۔“

وہ سنی کا بازو تھپتھا کر کھڑے ہو گئے اور اس سے فون نمبر لے کر فون کی طرف بڑھ گئے۔

\*\*\*

وہ آنکھیں موندے ہیڈ کراؤن سے نیک لگائے نیم دراز تھا۔ اور آنکھوں کے سامنے ایک ہی شبیہ تھی جو زری کی مشاغل کی۔

حبیب وہ مشاغل تھی تو چھوٹی سی مہمان پری کی طرح لگتی تھی اسے۔ وہ اظہار نہیں کر پاتا تھا لیکن دل ہی دل میں اعتراف ضرور کرتا تھا کہ وہ اپنی ماما سے مختلف ہے ہمدرد اور مہمان۔

اور پھر جب اس نے اسے جو زری کے روپ میں دیکھا۔ تو وہ روٹی ہوئی، پریشان کی لڑکی اسے اچھی لگی۔ جو اپنے ماما کی لڑائی پر گھر سے باہر آ کر روتی تھی۔ وہ اسے پسند کرنے لگا تھا۔

اور پھر جب اس نے جانا وہ مشاغل ہے تو وہ جیسے دل میں اتر گئی۔

اور پھر جب اسے لگا وہ اس سے محبت کرنے لگا ہے۔ وہ اسے زندگی کے ہم سفر کے روپ میں دیکھنے لگا۔ اور اس سے پسند کہ وہ اپنی محبت کا اظہار کرنا کہ اماں کی خواہش ہے اس کے کب سی دیے۔ اسے لگا جیسے وہ بچوں کے دوپٹوں کے درمیان پس رہا ہو۔ وہ جو زری کی محبت سے دست بردار نہیں ہو سکتا تھا اور اماں اور پاپا کی خواہش کو رد نہیں کر سکتا تھا۔ اس کشمکش نے اس کے کھیل کو بھی متاثر کیا اور وہ سوپنے لگا اب وہ کبھی کھیل نہیں سکے گا، تب خوش جمال نے اسے زندگی کی نوید دی اور آج۔ آج وہ خود اس کی زندگی سے نفٹ گئی تھی۔

کاش وہ اس کی زندگی میں نہ آتی اور اگر آتی بھی تھی تو اسے اس سے محبت نہ ہوتی۔

”اور یہ آسان نہیں ہے۔“ اس نے ایک گہری

# بیکہ

ہیرے



● مختلف شیزز میں دستیاب ہے

کمپیکو کے مسٹر انشانت سے پاک

جرمن ماہرین کی کاوشوں کا نچرہ



انتقال کا پتا چلا۔ نام کی مناسبت سے دھوکا کھا گئے۔  
وہ چونکا۔ محی الدین کی بات کو سمجھنے کی کوشش کی  
اور پھر کسی اور اک نے اسے بیڈ سے اٹھا دیا۔  
”یہ بابا کس سے بات کر رہے ہیں۔ کون ہو سکتا  
ہے۔“

”وہ آپ ہی کا ہے حبیب بھائی! بس اللہ نے کچھ  
عرصہ کے لیے اس کی ذمہ داری ہمیں سونپی تھی۔“  
اسے محی الدین کی آواز بھرائی ہوئی سی لگی۔  
وہ الجھ کر دروازے تک آیا اور دروازہ کھول کر باہر  
بھاگا۔ محی الدین نے اسے دیکھ کر اشارے سے اپنے  
قریب آنے کے لیے کہا۔

”بابا! اس وقت مجھے کسی سے بات نہیں کرنی آپ  
منع کر دیں۔“  
قریب آکر اس نے سرگوشی کی تو محی الدین ریسیور  
اس کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے مسکرائے۔  
”یہ کسی نہیں ہیں۔ تمہارا بھائی ہے۔“

”پاپا! اس نے حیرت سے اس کی دیکھا یعنی ابھی  
کچھ دیر پہلے اسے جو اور اک ہو رہا تھا وہ کون تھا۔“  
”ہاں بیٹا تم بات کرو اپنے پاپا سے۔ بہت بے چین  
ہیں۔ بعد میں ہمیں تفصیل بتانا ہوں۔“  
اس نے ابر میں کانوں سے لگایا۔

”ہاؤی۔ ہاؤی میری جان۔ میرے بچے میری  
زندگی!“

دوسری طرف حبیب الرحمن رو رہے تھے۔  
”مجھے معاف کرو۔ میرے بچے میں نے تمہارا  
دھیان نہیں رکھا اور تمہیں کھو دیا۔“

”پاپا! میں نے سنی کو نہیں گرایا تھا۔ میں تو اس سے  
بہت پیار کرتا تھا۔“ اب وہ بھی رو رہا تھا۔

”میری جان۔ مجھے پتا ہے میں جانتا ہوں۔ میں۔“  
حبیب الرحمن دھاڑیں مار مار کر رونے لگے تھے۔ بڑی  
دیر بعد وہ سنبھلے تھے۔

”میں جانتا ہوں تم مجھ سے بہت ناراض ہو۔ بہت  
خفا ہو۔ میں نے۔“

”پاپا! میں آپ سے ناراض نہیں ہوں۔ میں کبھی

سانس لی۔“ وہ اسے کہے بھول پائے گا۔ لیکن اسے  
بھولنا ہو گا۔ ان کے لیے۔ ان سب کے لیے جنہوں  
نے اس کے لیے خواب دیکھے۔ جو اس کے لیے تھکے  
ہر مشکل میں اس کے ہم قدم رہے۔ اسے مشاغل  
جو زمین کی محبت کو اپنے دل کے نساں خانوں میں دفن  
کرنا ہو گا۔

”یا اللہ مجھے اس درد کو برداشت کرنے کا حوصلہ  
دے۔ میرے درد محبت کو میرے لیے چراغ راہ بنا  
اسے کم کر دے رہا۔!“

اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے چکلتے ہوئے زور  
سے آنکھیں پھینچ لیں۔ جیسے اس درد کو ہمیشہ کے لیے  
دل کی گہرائیوں میں اتار رہا ہو۔

فون کی مسلسل ہوتی بیل۔ پر اس نے آنکھیں  
کھول کر سامنے گھڑی پر نظر ڈالی۔ گیارہ بج رہے تھے۔  
وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ تھوڑے سے وقفے کے بعد بیل  
پھر ہونے لگی تھی۔ فون سیٹ لائونگ میں تھا۔ یوں سب  
کے پاس اپنے اپنے سیل فون تھے۔

”کس کا فون ہو سکتا ہے؟“ اس نے سوچا۔ وہ اٹھنا  
ہی چاہتا تھا کہ اسے محی الدین کی آواز سنائی دی۔ وہ  
اپنے کمرے سے فون سننے کے لیے نکل آئے تھے۔  
”ہیلو! السلام علیکم! انہوں نے دہرایا۔“

”جی۔ جی! محی الدین بات کر رہا ہوں۔ آپ کون؟“  
پھر یکدم ان کی آواز بلند ہوئی۔

”کون۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ وہ تو۔“ پھر ان کی  
آواز آہستہ ہو گئی یا وہ خاموش ہو کر دوسری طرف کی  
بات سن رہے تھے۔

”اللہ جانے کس کا فون ہے۔“

اس نے سوچا۔ ”خیر جس کا بھی ہو، میرا نہ ہو مجھے  
اس وقت کسی سے بات نہیں کرنی۔“

اس نے پھر آنکھیں موند کر بیڈ کراؤن سے ٹیک  
لیگی۔ کچھ دیر بعد محی الدین کی آواز قدرے بلند ہوئی  
تھی وہ کہہ رہے تھے۔

”یقین کریں حبیب بھائی! ہم کئی بار گئے۔ میں اپنا  
فون نمبر دے کر آیا، مسیج دیا اور پھر رحمن صاحب کے



بھی آپ سے ناراض نہیں تھا۔ مجھے پتا تھا آپ کو یکدم غصہ آجاتا ہے لیکن۔“

”میں نے تمہارے بعد کبھی غصہ نہیں کیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں خود کو کیا سزا دوں۔ کیا کروں ایسا کہ روز محشر ام کلثوم کا سامنا کر سکوں۔“

”پیلا پلیز! ریلیکس ہو جائیں۔ میں تھوڑا بڑی ہوں ورلڈ کپ کے لیے کیپ لگنے والا ہے۔ میں جیسے ہی فارغ ہو رہا ہوں آپ سے ملنے آؤں گا۔“

”میں خود آؤں گا تمہارے پاس جیسے ہی ممکن ہوتا ہے فوراً۔“ تمہیں ایک بار گلے لگانے سنو، محی الدین سے کہو۔ تم اس کے بیٹے ہو۔ ہمیشہ اسی کے بیٹے رہو گے۔ میرا تم پر کوئی حق نہیں ہے۔ بس مجھے اتنی اجازت دے دیں کہ میں ایک نظر آکر تمہیں دیکھ لوں۔ ان آنکھوں کی پاس مجھ جائے گی، تمہیں گلے لگاؤں تو دل کو سکون مل جائے گا قرار آجائے گا۔“

اس نے پھر ریسپور محی الدین کو پکڑا دیا تھا اور اب حبیب الرحمن ان سے بھی بات کر رہے تھے۔

”کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ انعام مصطفیٰ آپ کا بیٹا ہے۔ ہم تو محض ایک امانت دار تھے وہ آپ کی امانت ہے۔“

”کیا ہوا۔ اس وقت کس کا فون ہے خیریت سے ما سب باتیں کر رہے ہیں آپ کیا باتیں کر رہے ہیں؟“ فاطمہ بوکھلائی ہوئی نکل کرے سے باہر نکلی تھیں۔

”بالکل خیریت ہے۔“ مصطفیٰ نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے جھٹل کر ان کی طرف دیکھا۔ اور پھر انہیں حبیب الرحمن کے متعلق بتانے لگا۔

فاطمہ کا رنگ زرد پڑ گیا اور وہ وحشت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔ کتنے مہینے انہوں نے خوف کے عالم میں گزارے تھے کہ کسی روز حبیب الرحمن آکر اسے لے جائیں گے۔ وہ اسے پیار کرتے ہوئے جھجک جاتی تھیں۔ وہ گیارہ سال کا تھا جب ان کے پاس آیا تھا، سہا ہوا سا اور بارہ سال بعد وہ جب بھرپور جوان تھا اور وہ ہر خوف سے آزاد ہو گئی تھیں تو۔

”تم ہمیں چھوڑ کر چلے جاؤ گے مصطفیٰ؟“ ان کی آواز میں ہزاروں آنسوؤں کی نمی تھی۔

”کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ! میں بھلا آپ کو چھوڑ کر کہاں جاؤں گا۔ میرا سب کچھ آپ ہی ہیں میرا جینا مرنا سب آپ کے ساتھ ہے۔“

اس نے انہیں اپنے ساتھ لگا لیا۔ لیکن پھر بھی ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے اور وہ دل پر ہاتھ رکھے متوحش نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”میں تمہیں کہیں جانے نہیں دوں گی مصطفیٰ۔“ انہوں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

”مجھے اپنی جنت چھوڑ کر کہیں نہیں جانا اماں۔ وہ میرے والد ہیں۔ ان کی زندگی کا سن کر خوشی ہوتا اور گلے کی خواہش پیدا ہونا فطری ہے۔ لیکن میری جگہ آپ کے قدموں میں ہی ہے۔“

اس نے انہیں یقین دلایا۔ اور محی الدین کی طرف دیکھا جو اپنے مخصوص نرم اور جیسے سے جیسے میں کہہ رہے تھے۔

”نہیں حبیب بھائی! دوسری شادی کوئی جرم نہیں ہے، لیکن دوسری شادی کر کے اپنی پہلی اولاد سے خوشی کے پایا! فاطمہ نے کیک پاتی آوازیں انہیں مخاطب کیا شاید وہ ان سے بھی یقین دہانی چاہتی تھیں کہ وہ مصطفیٰ کو اپنے باپ کے پاس نہیں بھیجیں گے۔ محی الدین نے ان کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر ریسپور مصطفیٰ کی طرف بڑھایا۔

”لو یہ بات کرو اس جیلا سے۔“

اور ریسپور اسے پکڑا کر فاطمہ کو ہولے ہولے سمجھاتے ہوئے انہیں اپنے ساتھ لیے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

”آپ کب تک آئیں گے پایا۔“ بہت دیر تک ان کی بات سننے کے بعد مصطفیٰ نے پوچھا۔ اور رخ موڑ کر اپنے دائیں طرف کھڑی خوش جمال کو دیکھا جو کچھ دیر پہلے ہی اپنے کمرے سے نکل کر آئی تھی اور محی الدین اور فاطمہ کے جانے کے بعد بھی وہاں ہی کھڑی تھی۔ شاید وہ پوری بات جانتا چاہتی تھی۔ جو کچھ اس نے سنا



وہ ریسیور کڑیل پر رکھ کر اس کی طرف مڑا۔  
”یہ ابھی تم نے کیا کہا تھا؟“ اس کی آواز میں  
لرزش تھی۔

”وہی جو تم نے سنا خوش جمال!“  
وہ دو تین قدم چل کر بالکل اس کے سامنے جا کھڑا  
ہوا۔ اور بغور اسے دیکھنے لگا۔

وہ بلاشبہ بہت خوب صورت تھی۔ جوزی سے  
کہیں زیادہ خوب صورت اور اس کا دل اس سے بھی  
زیادہ خوب صورت تھا۔ اس بیش قیمت دل کو توڑنے  
جارہا تھا وہ اور یہ شاید اللہ کو بھی پسند نہیں آیا تھا تب ہی

اس کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔

”اب جب بابا“ ہیں تو میں چاہتا ہوں کہ پر اپر طریقے  
سے باضابطہ طور پر بابا“ اماں اور بابا سے میرے لیے

تمہارا ہاتھ مانگیں۔“  
”لیکن تم نے تو جوزی سے بات کرنا تھی مصطفیٰ!  
اور تم اس سے محبت کرتے تھے۔“

”ہاں مجھے ایسا ہی لگا تھا خوش جمال۔ میں نے  
تمہارے متعلق اس طرح کبھی نہیں سوچا تھا شاید

اس لیے کہ ہم ایک ہی گھر میں ایک ساتھ لیے بڑھے  
تھے۔ میں تم سے بہت محبت کرتا تھا۔ تم جانتی ہو۔

لیکن مجھے لگا تھا اس محبت کی نوعیت مختلف ہے۔ میں  
اس کے لیے ہمیشہ سے اپنے دل میں ایک نرم گوشہ

رکھتا تھا۔ وہ صرف پسندیدگی تھی احسان مندی تھی  
لیکن میں نے سمجھا یہ محبت ہے۔ لیکن جب میں اس

کی طرف جارہا تھا تو مجھے لگا میرا بابا پیلو خالی ہے۔ اور  
میرا دل بیس کیس اسی دہلیز پر رہ گیا ہے اور ابھی تو میں

نے صرف اس کی طرف جانے کا سوچا اور میرا دل خالی  
ہو گیا اور اگر۔ تب میں نے جانا کہ میں اور تم ایک

دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں اماں اور بابا کا فیصلہ بالکل  
سچ ہے۔“

کبھی کبھی کسی اپنے کی خوشی کے لیے جھوٹ بولا  
جاسکتا ہے۔  
اس نے سوچا اور شعوری کوشش سے مسکرایا اور

تھا اس سے وہ زیادہ نہیں جان پائی تھی۔ اس کی  
آنکھیں سوچی ہوئی تھیں اور رخساروں پر سرخی تھی

اور وہ جو پچھلے کئی گھنٹوں سے سوچ رہا تھا کہ کیسے وہ کیسے  
خوش جمال سے کہے گا کہ اسے جوزی سے شادی نہیں

کرنی کیسے اسے اپنے اس فیصلے سے آگاہ کرے گا جو  
کچھ دیر پہلے اس نے کیا تھا۔ کس طرح بات کرنے کہ

اسے یہ نہ لگے۔ کہ جوزی نے اسے ٹھکرا دیا تو وہ اس کی  
طرف پلٹا۔ حالانکہ اگر وہ پہلے خوش جمال کے دل کا

جال جان جاتا تو وہ اپنی محبت قربان کر دیتا۔ اتنی ہی عمر  
تھی اسے خوش جمال۔

اس نے ایک نظر خوش جمال پر ڈالی اور لمحے کے  
ہزاروں حصے میں اسے وہ بات سوچھ گئی جس سے وہ

خوش جمال کی عزت نفس کو مجروح ہونے سے بچا سکتا  
تھا۔

”جیسے ہی پیرا ملا۔ ایک منٹ کی بھی دیر نہیں لگاؤں  
گا میں تو بہن پانی کی پچھلی کی طرح تڑپ رہا ہوں ہادی۔“

جیب الرحمن کہہ رہے تھے۔  
”دیر لگائے گا بھی مت بابا۔“

اس نے ایک نظریں خوش جمال پر ڈالی جو اس طرح  
اسی انداز میں کھڑی تھی۔

”اب آپ کے ہوتے ہوئے میں بابا اور اماں سے  
خود اپنے رشتے کی بات کرتا ہوا بالکل بھی اچھا نہیں

لگوں گا بابا۔“  
”جی بابا۔ آپ کی ہونے والی بہو بہت پیاری ہے“

بالکل اپنے نام کی طرح خوش جمال۔  
”اور خوش جمال کو لگا جیسے اس کے کانوں نے کچھ غلط

سنا ہو۔ یہ مصطفیٰ نے کیا کہا۔“  
”جی بابا۔ وہ میرے پیارے بابا اور اماں کی اکلوتی بیٹی

ہے۔“  
”یہ مصطفیٰ کیا کہہ رہا ہے۔“  
اس نے بے اختیار ایک قدم آگے بڑھایا اور پھر

ایک قدم آگے بڑھ کر خوش جمیل کے ٹھنڈے ہوتے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے۔  
 ”مجھے یقین ہے خوش جمیل ہم دونوں بہت خوش رہیں گے۔“

خوش جمال کے چہرے پر ایک ساتھ کئی رنگ اترے تھے اور آنکھوں میں ہزاروں کرکٹ شب جگمگانے لگے تھے۔ لیکن اس کے اندر جلتے سارے چراغ بجھ گئے تھے اور چاروں اور اندھیرا تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ خوش جمال کو اندھیروں میں چراغ جلاتا آتا ہے اور ایک دن وہ اس کے دل کے اندھیروں میں بھی چراغاں کرے گی اور وہ مشاغل جوزفین کی محبت کو ایسے ہی بھول جائے گا کہ جیسے وہ کوئی خواب تھا۔ وہ خوش جمال کی طرف دیکھ کر پھر مسکرایا۔

”تم بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو جاگر آرام کرو۔ ان شاء اللہ صبح بات کریں گے۔“

اور اسے وہاں ہی حیران چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا کہ ابھی آنکھیں بند تھیں اور دل میں دھول اڑتی تھی۔

کرتی تھوں کو دیکھ کر سوچا تھا کہ کیا کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ بھی ان فنز کے ساتھ عشائے ربانی میں شامل ہو کر ان کے ساتھ اس میز پر بیٹھے۔ اور پھر خود ہی اس نے اپنی اس سوچ کی نفی بھی کر دی تھی۔ لیکن آج وہ ان کا حصہ بننے جا رہی تھی۔ اس نے پال کا سر مارا تھا کہ سامنے جھکنے نہیں دیا تھا بلکہ بلند کر دیا تھا۔ ہاں دل کی منڈیر پر اب بھی مصطفیٰ کا نام جگمگاتا تھا۔ لیکن ایک دن آئے گا جب وہ اسے بھول جائے گی ایسے ہی جیسے وہ کوئی خواب تھا۔ اس نے خود کو یقین دلایا۔

چرخ کے صحن میں جھاڑو دستانہ عمر لاؤ گانگنا سا تھا۔  
 کہ جیسے خواب تھا کوئی بکھر گیا  
 کہ جیسے رنگ تھا کوئی اتر گیا  
 کہ جیسے خواب تھا۔

”ہاں جیسے خواب تھا کوئی۔“ اس نے زیر لب کہا۔  
انگلیوں سے سینے کی صلیب کا نشان بنایا۔ اپنے دادا کی  
طرف دیکھ کر مسکرائی اور جرجرجا کر دروازہ دھکیلتی ہوئی  
اندر چلی گئی۔

ایم ایس ایم ایس کراہر کریم

Herbal

سوہنی شیمپو

SOHNI SHAMPOO

ہاں کے استعمال سے جسم میں ٹنگل ختم  
گرتے ہوئے ہاتھوں کو تازہ  
ہاتھوں کو صاف اور چمکا دیتا ہے

قیمت 90 روپے

دھوئی سے نکھاتے ہاتھ علی آوار سے نکھاتے ہاتھ

250 روپے تین بھریں 350 روپے

اس میں لاک فری اور بیکنگ پورین شامل ہیں۔

بازار میں اس سے نکھاتے کپڑے

بائی ٹیکس 53 گریڈ کے کپڑے کے لئے استعمال کریں۔

اپنی لڑائی کے لئے

نیکس کرانڈا 37 مارک اور کراہی۔ فون نمبر 32218381

2011 کا انگلش پریمیر لیگ کا پہلا میچ شروع ہو چکا تھا۔ مانچسٹر یونائیٹڈ پوری تیاری کے ساتھ میدان میں اتری تھی۔ ایک بار پھر جوز سے نے مانچسٹر یونائیٹڈ کی کپتانی مصطفیٰ کو سونپی تھی۔

پہلے بیچ کے پہلے ہفتے میں ہی مصطفیٰ نے مخالف شیم پر گول کر دیا تھا اور وی۔ ای۔ بی انکو ڈر میں مٹی الدین اور حبیب الرحمن ساتھ ساتھ بیٹھے تھے وہ بلڈن اسٹیڈیم میں مصطفیٰ کے نام کے نعرے لگ رہے تھے اور ان سے دونوں کے چہرے خوشی سے چمک رہے تھے۔

عین اسی وقت پاکستان کے ایک چھوٹے سے شہر  
میں اپنے دادا کے ساتھ سسّ چھوٹی اینٹوں والے چرچ  
کے داخلی دروازے کے سامنے کھڑی سوچ رہی تھی  
ایک بار اس نے ایک چرچ میں عشاء کی تیار



# دل کی بات

دن رات اس کے سر پر شادی کی تلواریں لٹک رہی ہیں کہ آخر تم شادی کے لیے ہائی کیوں نہیں بھرتے۔ خاندان اور حلقہ احباب میں حسین سے حسین لڑکی اس کی نظر انتہات کی منتظر ہے۔ وہ بے چارہ ”کچھ عرصہ ٹھہر جائیں“ کہہ کہہ کر تھک چکا ہے اور ہر ملاقات پر میرے پیچھے پوچھتا ہے کہ دیکھو! وقت میرے ہاتھ سے نکلتا جا رہا ہے۔ میں ایسا نہ ہو کہ تم مجھے کھو دو۔ ہر مرتبہ یہ فقرہ مجھے ازیت میں جھٹکا کرتا ہے اور میرا دل چاہتا ہے کہ مسجدوں میں نکل جاؤں اور مولویوں کی منت کر کے اپنی بہنوں کا رشتہ کرادوں۔ یا اللہ! تو ہی میری سن لے۔ وہ مولوی بیچ دے جو میری بہنوں کو شرعی طریقے سے برقعوں میں بیاہ کر لے جائیں۔ پتا نہیں میری دعائیں کب رنگ لائیں گی۔“

میں نے بے بسی سے ہونٹ کالے



”علیہ بیٹا! آج شام کو وہ ہنگ کھر کا سوٹ پہن لیتا جس پر امیر انڈیا کی ہے اور بیٹا! میری ماں تو معمولی سی ہم رنگ لپ اسٹک بھی لگاتی ہے۔ آج شام کو راشدہ خالہ کچھ خواتین کو لے کر آ رہی ہیں۔ اللہ سے امید ہے کہ میری بچی کے نصیب بھی کھل جائیں گے بڑی آس دلائی ہے تمہاری خالہ نے۔“

ای نے ہمیشہ کی طرح بچیا کو دھیسے لہجے میں سمجھایا مگر مجھے آج بھی قوی امید تھی کہ امی کا مدعا سمجھ کر بھی وہ انجمن ہی بنی رہیں گی اور وہی کریں گی جو ہمیشہ سے ہر آئے مہمان کے سامنے کرتی رہی ہیں۔ میں نے تو محل کر کچھ کہنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ ان کو سمجھانا ہمیشہ کے

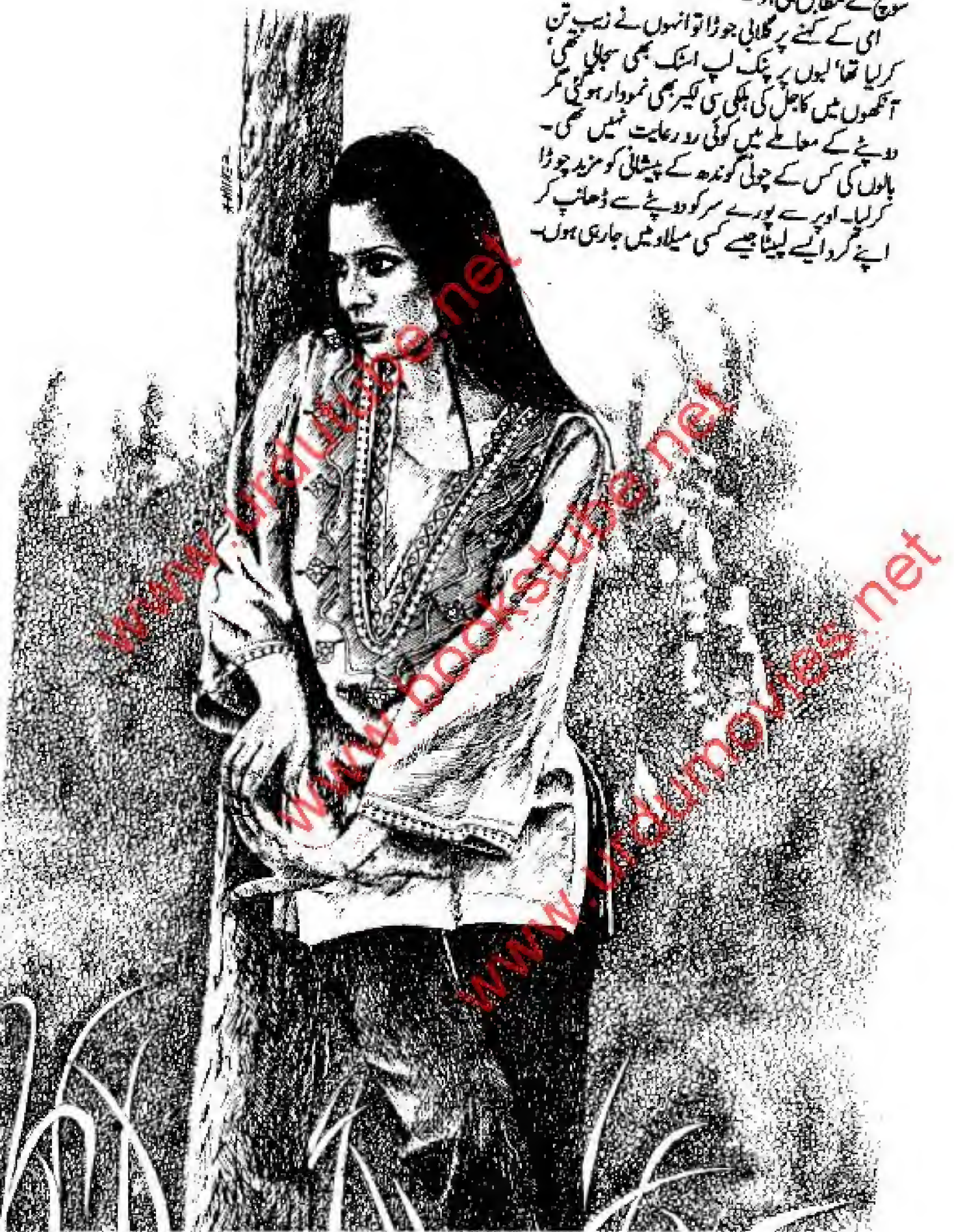
”یہ دونوں بہنیں مجھے لے ڈوبیں گی۔ انہوں نے اپنے ساتھ ساتھ میرے نصیب پر بھی سیاہی پھیر رکھی ہے۔ پتا نہیں کیا سوچ کے بیٹھی ہوئی ہیں۔ اگر اللہ نے دیتا رنگ اور مونے نین نقوش بنا دیے ہیں تو بندہ تھوڑی محنت کر کے کچھ تو اپنی شکل کو نکھار سکتا ہے کہ اس گھر سے تو دھکا لگے۔ بے شمار کریمیں لاکے ڈھیر کر دیں، سینکڑوں رنگ گورا کرنے کے ٹوکے پتالے۔ مگر مجال ہے جوان برائی برابر بھی اثر ہوا ہو۔ ماں کی راتوں کی نیندیں اڑا رکھی ہیں تو باپ کو فکر پریشانی میں جھٹکا کر رکھا ہے مگر ان کو احساس نہیں ہے۔ ہزار دفعہ چھوٹی ہو کے سمجھا چکی ہوں کہ یہ چادر کی بکلی مار کے پھینکی ہی شکل لے کے مہمانوں کے سامنے مت جلیا کرو۔ تھوڑا سا چہرے پہ فاؤنڈیشن لگا کے لائٹ سی لپ اسٹک لگا لو۔ وہ پٹا سر کے بجائے شانے پر ڈال لو۔ خوب صورت نہ سہی قبول صورت تو لگو۔ پر ان کی عقل میں میری بات کہاں سناؤں ہے۔ جب ماں کا ہی ان کو احساس نہیں ہے تو میں کس کھیت کی مولی ہوں۔ اب میں اپنے منہ سے یہ کہتی کیا خاک اچھی لگوں گی کہ تمہارے رشتہ نہ ہونے کی وجہ سے میری عمر بھی نکل جائے گی۔ اپنا نہیں تو میرا ہی خیال کر لو! ابھی تو پھر بھی اکا دکا رشتہ بھولے پھٹکے آجاتا ہے۔ دو چار سال اور گزرے تو اسی ویلنٹین بیٹھی رہ جائیں گی۔ پھر دونوں بہنیں مل کر دوسرے کھول لیتا اور ساری عمر بچوں کو درس دیتی رہتا۔ ماں باپ کو اپنے غم میں وقت سے پہلے قبر میں پہنچا دیتا اور مجھے مجھے تو سلگا سلگا کر ماریں گی یہ ملانیاں۔“

عاقب کب تک انتظار کرے گا۔ اس کی ماں نے تو



آگے بین بجانا کے مترادف تھا مگر شام کو بالکل میری  
سوچ کے مطابق ہی ہوا۔

امی کے کہنے پر گلابی جوڑا تو انہوں نے زیب تن  
کر لیا تھا، لیوں پر پنک لب اسٹیک بھی سجلی تھی،  
آنکھوں میں کاجل کی ہلکی سی لکیر بھی نمودار ہو گئی مگر  
دوپٹے کے معاملے میں کوئی رو رعایت نہیں تھی۔  
پالوں کی کس کے چوٹی گوندھ کے پیشانی کو مزید چوڑا  
کر لیا۔ اوپر سے پورے سر کو دوپٹے سے ڈھانپ کر  
اپنے گرد ایسے لپیٹا جیسے کسی میلاؤ میں جارہی ہوں۔





”یہ آپ ہیں حلیہ بچیا! میں حیران ہوئی۔“  
 ”ہاں غور سے دیکھ لو مجھے۔ تمہارے من پسند  
 روپ میں کیسی لگ رہی ہوں میں۔“ وہ مسکرائیں۔  
 ”بہت بہت ہی پیاری۔“ میں نے ان کے گلے میں  
 بائیس حائل کر دیں۔ خوشی سے سرشار امی بچن سے  
 باہر نکلیں تو ہم دونوں کی طرف دیکھ کر مسکرا دیں۔

”امی! آج تو ہماری بچیا پر سے دیکھے گا مہمان  
 خواتین کی نگاہیں ہی نہیں اٹھیں گی۔ بس آج آپ  
 مٹھائی تیار رکھیں۔“  
 ”اب شاء اللہ“ امی بھی بچیا کی اس تبدیلی سے بڑی  
 مطمئن نظر آ رہی تھیں۔

”اچھا چلو تم بچن میں جاؤ۔ نسیم کی بدد کرواؤ۔ صبح  
 سے اکیلی لگی ہوئی ہے۔“ امی نے مجھے بچن کی طرف  
 دھکیلا۔

”اور ہاں تم ڈرائنگ روم کا رخ نہ کرنا۔“ وہ ہمیشہ کی  
 طرح مجھے نصیحت کرتا نہ بھولیں۔

”مجھے اچھی طرح پتا ہے اور آج تو بچیا کے سامنے  
 میرا چراغ کیا جلتے گا۔“ میں نے انہیں تو صلیبی  
 نگاہوں سے دیکھا تو وہ شرابی نکلیں۔

میں گنگنا تے ہوئے نسیم کے ساتھ کام کروانے  
 لگی۔ آج تو بچیا کا یہ روپ دیکھ کر میرا دل بلیوں اچھل  
 رہا تھا۔ اچھی بھلی شکل کو کسے بگاڑ رکھا تھا۔

آج تو بس لوگے والے آپس منگنی کی انگوٹھی ہی نہ  
 پہنا جائیں۔“ میں دل ہی دل میں مسکرا رہی تھی اور  
 نسیم کی طرف دیکھ کر اسے بھی نظروں ہی نظروں  
 میں نصیحت کی کہ کچھ سبق دیکھو بچیا سے، مگر وہ ہر بات  
 سے بے نیاز اپنے کاموں میں لگی رہی۔

\*\*\*

ڈرائنگ روم میں بچیا چائے کی ٹرالی لے کر جا چکی  
 تھیں اور میں حسب روایت کھڑکی کی اوٹ سے سارا  
 منظر آنکھوں میں قید کر رہی تھی۔ بچیا مسکراتا چہرہ لیے  
 اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتی اک شان بے نیازی

چائے کی ٹرالی لیے سنجیدہ سی صورت بنائے جب وہ  
 کمرے میں داخل ہوئیں تو خواتین بچیا پر ایک نظر  
 ڈالنے کے بعد آپس میں نظروں کا تبادلہ کرنے لگیں۔  
 اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے پر اپنی  
 رائے بھی واضح کر دی۔ میں جو کھڑکی سے لگی یہ سارا

منظر ملاحظہ کر رہی تھی من کی نظروں کو دیکھتے ہی بھانپ  
 گئی تھی کہ ”یہ نکل منڈھے نہیں چڑھے گی“ اور وہی  
 ہوا جس کے خوف سے ہمارے دل لرز رہے تھے۔  
 انہوں نے تو چائے کے ساتھ رکھے لوازمات سے بھی  
 انصاف کرنا گوارا نہ کیا اور خالی چائے پی کے اٹھ کھڑی  
 ہوئیں۔

”معاف کرنا بس! آپ کی بچی بہت سادہ ہے  
 ہمارے بچے کی ڈیمانڈ بولڈ اور پُرکشش لڑکی ہے، ہمیں  
 اجازت دیں۔“ انہوں نے تو غیر اخلاقیات کا ایسا  
 مظاہرہ کیا کہ بچیا کے منہ پر ہی صاف انکار کر کے چل  
 دیں۔ امی صوفہ پر بیٹھی جیسے ڈھے سی نکلیں۔ راشدہ  
 خالدہ ان کو تسلی دینے لگیں اور بچیا نارمل چہرے اپنے  
 کمرے کی طرف چل دیں۔  
 ”ہونہ ایہ کہاں باز آئیں گی اپنی سادگی سے۔“  
 میں نے سخت سے جملہ ان کی طرف اچھالا اور امی کے  
 پاس ہی بیٹھ گئی۔

\*\*\*

کئی دنوں کے بعد صبح اپنی تینا کیوں سمیت جلوہ  
 گر ہوا تھا۔ میرے امتحانات قریب تھے اور میں پوری  
 دلچسپی سے پڑھائی میں مصروف تھی۔ میں صبح ناشتے  
 کے بعد اپنی کتابیں لے کر اوپر چھت پر چڑھی تو  
 ”آفتاب“ صاحب کو رخصت کر کے ہی نیچے بیڑیوں  
 کی جانب قدم بڑھائے سامنے سے آئی بوتھ کا  
 اسٹافٹس سوٹ پہنے، لیرز میں کٹے ہل، تراشیدہ  
 بھنویں اور ہلکے سے میک اپ میں لمبی صراحی دار  
 گردن میں دھڑاڈالے بچیا کو دیکھ کر میں عجب ہی تو کھا کر  
 رہ گئی۔



سے بیٹھی تھیں اور رشتے کے لیے آئی خواتین آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے سوال کر رہی تھیں۔

”ہمیں آپ کی بچی پسند ہے“ کے الفاظ ادا کر بھی دو۔ اور کتنا صبر آزمائی۔ ”میں ان کی خامشی سے جھٹلائی، مگر اگلے ہی پل میری سماعتوں نے وہ الفاظ سنے کہ میں گنگ رہ گئی۔

”ہسن! ہمیں تو بتا چلا تھا کہ آپ کی بچی بہت سادہ اور فیشن سے مبرا ہے۔ ہمارا بچہ مذہبی ذہن کا مالک ہے اسے صوم و صلوة کی پابند اور شریعت کے مطابق پرہیز کرنے والی لڑکی چاہیے تاکہ دونوں کی ذہنی ہم آہنگی ہو سکے۔ شاید ہمیں کسی نے غلط معلومات دیں۔“ مسلمان خواتین نے مجھ سمیت سب پر ہم پھوڑا۔ امی ساکت رہ گئیں اور بچیاں وہ تو کائنات بدن میں لمبو نہیں کے مصداق جہاں کی تمنا رہ گئیں۔ خود میرے تلووں سے زمین نکل گئی۔

”ہائے اللہ! یہ کیسا ہولناک موقع میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ آج اگر بچیاں سر پر دوڑا اور مجھے ان کے سامنے بیٹھی ہوتیں تو مغربی کی آنکھوں میں ضرور آنسو ہاتھوں میں رچ جاتی۔ میری تو قسمت ہی خراب ہے۔ مارے دکھ کے میری آنکھوں سے آنسو ہی نکل آئے۔

”ہاں۔“ ذہن میں جھماکا ہوا۔ ”لوہ لیس۔ یہ بھیک ہے۔“ عقل نے بروقت گھوڑے دوڑائے اور میں بھاگتی ہوئی نسیم کے کمرے کی طرف دوڑی جو عشاء کی نماز کی نیت باندھنے ہی لگی تھی۔ دوڑنا سر کے گرد اچھی طرح لپیٹے صاف ستھرا میک اپ سے بے نیاز صورت۔ ”ہاں یہی ہے ان کے خوابوں کی تعبیر۔“ میں نسیم کو بھیج کر ڈرائنگ روم میں لے گئی۔

”وہ ارے مجھے چھوڑو یہ کیا کر رہی ہو۔ کہاں لے کے جا رہی ہو۔ مجھے نماز پڑھنی ہے۔“ بولتی جا رہی تھی اور میں اس کی پروا کیے بغیر اسے ڈرائنگ روم میں لے کر داخل ہو گئی۔

”آئی! آپ کو جس نے بتایا ہے بالکل درست بتایا

ہے۔ یہ ہیں میری بچیاں صوم و صلوة کی پابند، شرعی پرہیز کرتی ہیں۔ نماز پڑھ رہی تھیں اس لیے آنے میں دیر ہو گئی۔“ میں نے نسیم، بچیاں کو ان کے سامنے صوف پر بٹھایا تو وہ خواتین جیسے اپنا مطالبہ گوہر پار کھل اٹھیں۔ ”ہاں بالکل! ہمیں ایسی ہی بچی کی تلاش بھی ساشاء اللہ بڑی نیک بچی ہے۔ ہمارا بچہ بھی بہت سادہ و نیک ہے۔ اللہ نے چاہا تو دونوں کی زندگی بڑی اچھی گزرے گی۔“ انہوں نے نسیم، بچیاں کے سر ہاتھ پھیرا۔

”بس ہماری طرف سے تو رشتہ پکا ہی ہے۔ اب آپ بتائیں ہمارے بچے کو دیکھنے کب آ رہی ہیں۔“ خاتون نے فوراً ”نسیم، بچیاں کے لیے اپنی پسندیدگی ظاہر کر دی۔

امی حیرت سے منہ کھولے کبھی مجھے، کبھی نسیم، بچیاں کو، حلیمہ بچیاں کو اور کبھی مسلمان خواتین کو تلے جا رہی تھیں۔

”آئی! ان شاء اللہ بہت جلد ہم بھی آپ کے گھر حاضری دیں گے۔“ میں نے چپکے سے امی کا ہاتھ دبا کر انہیں ہوش دلایا۔

”ہاں۔ ہاں۔ ہسن! ہم بھی ضرور جلد ہی آپ کے گھر تشریف لائیں گے۔“ امی حیرت، خوشی اور ہاتھ افسردگی لیے جذبات سے گویا ہوئیں اور میں دل میں سوچ رہی تھی حلیمہ نہ سہی نسیم کو تو دھکا لگا۔ ایک سل سرکی سے تو دوسری بھی ایک دن مل ہی جائے گی۔ شروعات تو ہوئی۔ خواتین رخصت ہوئیں تو میں شرمندہ سی بچیاں سے نظروں ملائے بغیر اپنے کمرے کی طرف ہوئی۔

”آہ۔ میری پیاری حلیمہ بچیاں۔ ہماری خاطر ذہن و دل سے جنگ کر کے اپنا چولا بدلنا اور پھر بھی مقدر ہار گئے۔“

مجھے حقیقتاً ”افسوس“ ہوا۔ اب پتا نہیں وہ اپنا یہی حلیمہ اپنائے رکھیں گی یا پہلے والی جون میں واپس آجائیں گی۔ میں تو تجالت سے کی سوچ رہی ہوں۔ مگر بہر حال میرا آدھا مسئلہ تو حل ہوا!

❦





دوسری قسط

مفتاحی



سیاہ حاشیہ پارت کر۔ ”بچھڑاؤ گی۔ ایک غامضہ آواز روکتی رہی لیکن وہ لڑکی نہ رکی۔ سیاہ حاشیہ عبور کر گئی اور تب اسے احساس ہوا کہ اپنے لیے جہنم خرید چکی ہے۔



عمر نے کاشیہ کبائٹ میں اپنی پرانی ڈائریاں تلاش کر رہی ہے۔ ایک کتبہ ملتا ہے۔ جس پر اس کی والدہ صالحہ رفیق کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات درج ہوتی ہے۔ وہ بری طرح الجھ جاتی ہے۔ اس کی والدہ تو زندہ ہیں پھر یہ کتبہ کس نے اور کیوں بنوایا ہے۔ تب ہی اس کی والدہ صالحہ آجاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ڈائریاں تو انہوں نے روی والے کو دے دی ہیں۔ عمر نے کوہست دکھ ہوتا ہے پھر اسے کتبہ یاد آتا ہے تو وہ سوچتی ہے کہ عبد اللہ سے اس کے متعلق پوچھے گی۔





### ذاتی لٹ

عبداللہ بابر صوم و صلوة وہ مسجد کا موذن بھی ہے اور اس سے علی میں ایم فل کر رکھا ہے عدینہ کی اس کے ساتھ منگنی ہو چکی ہے۔ عدینہ ہسٹل میں رہتی ہے اور میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔

عدینہ کے والد مولوی مفتی کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ اپنی ماں سے زیادہ داری سے قریب ہے مونا اس کی کزن ہے۔ وہ جوڑیاں شہر سے قرآن حفظ کرنے ان کے گھر آئی ہے۔

عدینہ عبداللہ سے بہت جتن کرتی ہے۔ عبداللہ بھی اسے چاہتا ہے لیکن شرعی اصولوں کے تحت زندگی گزارنے والی صالحہ آپا نے منگنی ہونے کے باوجود اس میں آپس میں بات چیت کی اجازت نہیں دی۔

شانزے ماڈل بننا چاہتی ہے۔ ریپ پروڈاک کرتے ہوئے اس کا پاؤں مڑ جاتا ہے اور وہ گر جاتی ہے۔

ڈاکٹر بینش نیلی کو ٹھی میں اپنے بیٹے ارجم کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کے شوہر کرنل ڈاکٹر حماد کا انتقال ہو چکا ہے۔

نیلی کو ٹھی کے دوسرے حصے میں ان کے تایا ڈاکٹر جمال اپنی بیوی اور پوتی اورید کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی دو شادی شدہ بیٹیاں ہیں اور اکلو تایا تیمور لندن میں مقیم ہے۔ بیوی کی وفات کے بعد تیمور نے اورید کو پاکستان اپنے باپ کے پاس بھجوادیا ہے۔ جیٹا مامیر ان کے پاس لندن میں ہے۔

اورید اور ارجم کی بہت دوستی ہے جو ڈاکٹر بینش کو بالکل پسند نہیں۔ ڈاکٹر بینش تیمور کے نام سے بھی نفرت کرتی ہیں۔

عبداللہ عدینہ کو اپنا سیل نمبر بھجواتا ہے۔ صالحہ آیا دیکھ لیتی ہیں۔ وہ شہید غصہ ہوتی ہیں اور نمبر بھاڑ کر پھینک دیتی ہیں۔

سرمد اپنے دوست کے پروڈکشن ہاؤس میں جاتا ہے تو وہاں شانزے کو دیکھتا ہے۔ شانزے اس کی فتیس کر رہی ہے کہ وہ ایک چانس اسے دے کر دیکھے۔



آنے کی کوشش کیوں نہیں کرتی ہوا شازے! جس کی نظر کرم سے نقد پر بدل جاتی ہے۔ ”رباب نے ہمیشہ کی طرح اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”بس بس رہنے دو۔“ اس نے فوراً ہی اس کی بات کو مسترد کیا۔ ”مجھے زندگی میں اس نے دیا ہی کیا ہے۔“ وہ بچوں کے سے انداز سے بھڑکی۔

”بہت بری بات ہے شازے! اللہ کو ایسی ناشکری کی باتیں پسند نہیں۔“ رباب خوف زدہ ہوئی۔

”اور مجھے وہ سب پسند نہیں جو میرے ساتھ ہو رہا ہے۔“ وہ مایوسی کی اس اشتباہ پر بھی، جہاں انسان پہلے اپنی ذات اور پھر دنیا کی ہر چیز سے منکر ہو جاتا ہے۔ ”نماز پڑھا کرو سکون ملے گا۔“ رباب نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

”جن کو اللہ نے سکون نہ دینا ہو، وہ انہیں کسی بھی چیز میں نہیں دیتا۔“ وہ اس کی ہر بات بے دردی سے رد کر رہی تھی۔

”شازے! ایسے نہیں کہتے۔“ رباب نے حواس باختہ انداز سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں نے ہندو ازم، یہودیت، عیسائیت سب میں سکون تلاش کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ مجھے کہیں نہیں ملا۔“ شازے نے تکیہ گود میں رکھ کر تلخ لہجے میں کہا۔

”ختم قرآن پڑھو، ان شاء اللہ تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔“ رباب خاموشی سے اس کے پاس آن بیٹھی اور محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ خاموش رہی اس نے رباب کی اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

”تم اپنی پھیپھوں کے گھرواپس کیوں نہیں چلی جاتی ہو شازے۔۔۔؟“

”وہ گھر جہاں مجھے دیکھ کر صبح شام استغفار استغفار کی گردان کی جاتی ہے۔“ شازے کے استہزائیہ انداز پر وہ الجھی۔

”میں گناہ کی وہ پولی ہوں جسے میری ماں جائز نکاح کے ہوتے ہوئے ناجائز سمجھ کر پھینک کر چلی گئی۔“ شازے ایک دفعہ پھر خود ترسی کا شکار ہوئی۔

وہ جب سے ارسل سے مل کر آئی تھی۔ ایک بار شہ کمرے سے باہر اور ایک اس کی آنکھوں سے ہو رہی تھی۔ اپنے کمرے میں موجود پینٹیں ایک جگہ اور تین کپ توڑنے کے بعد وہ دھڑام سے اپنے بیڈ پر بیٹھی اور کشن آنکھوں پر رکھ کر لیٹ گئی، وہ اب بے آواز مد رہی تھی۔ آج پھر اس پر ڈیپریشن کا دورہ پڑا تھا۔ جو اگلے کئی گھنٹوں تک رہنا تھا۔

”رونے سے اگر مسئلے حل ہو جاتے تو یقیناً نواب تک پوری دنیا آنسوؤں کی پالی میں ڈوب چکی ہوتی۔“

اس کی روم میٹ رباب جو خاموشی سے اس کی تحریکات کا ردائی کو غور سے دیکھ رہی تھی، ہاتھ میں پکڑا قرآن پاک الماری میں رکھ کر بڑے سادہ سے انداز سے بولی۔

شازے نے آنکھوں پر رکھا کشن ہٹایا اور وہ کشن اب کارپٹ پر پڑا بالکل اس کی طرح اپنی قسمت کو رو رہا تھا۔

”تم نے افتخار عارف کی نظم ”بارہواں کھلاڑی“ پڑھی ہے کبھی؟“ شازے کا لہجہ خاصا عجیب تھا۔

”ہاں۔ لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“ رباب نے اس کا دھواں دھواں سا چہرہ دیکھا۔

”سارے بد قسمت لوگ بارہویں کھلاڑی کی طرح ہوتے ہیں۔ جن کو تقدیر اپنی صلاحیتیں آزمانے کا موقع بہت کم دیتی ہے۔ وہ لوگ اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں، یہاں تک کہ زندگی کا بیج ہی ختم ہو جاتا ہے اور وہ خالی ہاتھ اور خالی دامن لیے گناہ کی موت مر جاتے ہیں۔“ وہ حد درجہ قنوطیت کا شکار تھی۔

”ایسے نہیں کہتے شازے، تمہیں قدرت اپنی صلاحیتوں کو آزمانے کا موقع ضرور دے گی۔“ رباب نے اسے حوصلہ دیا۔

”مجھے معلوم ہے، میری قسمت میں کوئی ایسا لمحہ نہیں آئے گا۔ جس میں لوگوں کی نظریں مجھ پر نہ پڑ جائیں۔“ مایوسی اس کے لفظ لفظ سے ٹپک رہی تھی۔ اس کے پاس ہمیشہ اگلے شکوؤں کی ایک گٹھڑی بندھی رہتی، جسے موقع دیکھتے ہی وہ کھول کر بیٹھ جاتی۔

”تم لوگوں کی نظروں کے بجائے اس کی نظریں



”تم اپنے باپ سے رابطہ کیوں نہیں کرتی ہو؟“  
ریباب نے کچھ سوچ کر کہا۔

”میرے والد۔۔۔ ان کو تو ایک مذہبی جنونی نے قتل کر دیا تھا۔۔۔“ شانزے کی بات نے اسے حیران کیا۔  
”وہ کیوں۔۔۔؟“

”ظاہر ہے، میرے باپ نے اس کے مذہبی نظریات کو مجروح کرنے کی کوشش کی ہوگی۔“ وہ لا پرواہی سے بولی۔

”تم مسلمان ہوئاں۔۔۔؟“ رباب نے بے تابی سے پوچھا۔

”میرا سارا خاندان مسلم ہے، اس لیے میں بھی باپے برتھ مسلمان ہی ہوں۔“ وہ انہی اور الیکٹرک

کھیل میں پانی گرم کرنے لگی۔  
”پھر تم نے ہندو ازم۔۔۔ عیسائیت کو بھنسنے کی کوشش کیوں کی؟“ رباب اب الجھن آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”مسکون کی تلاش میں۔۔۔“ اس نے فی بیک نکال کر کپ میں رکھا اور گرم پانی ڈالنے لگی۔  
”تم نے اسے اسلام میں تلاش کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟“ رباب حد درجہ سنجیدہ ہوئی۔

”کسی کے گناہی نہیں۔۔۔“ وہ سادگی سے مسکرائی تو رباب نے سکون کا سانس لیا۔ وہ ابھی اس حد تک بھی گمراہ نہیں ہوئی تھی جتنا وہ سوچ چکی تھی۔

شانزے اور رباب کی دوستی بہت عجیب انداز میں ہوئی تھی۔ رباب کو ہوشل آئے ایک مہینہ ہی ہوا تھا۔ جب وارڈن نے اسے بلا کر خصوصی طور پر درخواست کی کہ وہ ماس کیونٹیکشن کی شانزے کو اپنے ساتھ رکھ لے، کیونکہ اس کے بھڑالو مزاج کی وجہ سے کوئی بھی اسے رکھنے کو تیار نہیں تھا۔ شانزے کی

ایک روم میٹ تو تنگ آکر خود اس کا کمرہ چھوڑ کر چلی گئی اور باقی دوسری نے شانزے کو خاصائف ٹائم دیا، جس کے نتیجے میں ہوشل والوں کو کئی تاریخی جنگیں دیکھنے کو ملیں۔

آخری معرکہ تو بہت زوردار ثابت ہوا۔ شانزے

نے اپنی روم میٹ رومانہ کا سر بھاڑ دیا تھا۔ ہوشل میں باقاعدہ انکوائری کمیٹی بیٹھی۔ وہ تو شانزے کی قسمت اچھی تھی کہ ثابت ہو گیا کہ دونوں کا قصور ففٹھی ففٹھی ہے۔ اس لیے وارننگ دے کر معاملہ رفع دفع کر دیا گیا۔ اس قصے میں شانزے کو اپنا روم چھوڑ کر رباب کا روم میٹ بننا پڑا۔ جو ایک سادہ اور بے ضرر سی لڑکی تھی اور اسلامیات میں ایم فل کر رہی تھی۔

”تم نے رومانہ کنول کا سر کیوں بھاڑا۔۔۔؟“ کافی دن کے بعد رباب نے یوں ہی اس کا موڈ اچھا دیکھ کر پوچھا۔  
”اس نے مجھے گالی دی تھی۔“ اس نے سادگی سے جواب دیا۔

”لیکن کیوں۔۔۔؟“  
”کیوں کہ میں نے اس کا سیل فون توڑ دیا تھا۔“ اس کی وضاحت نے رباب کو ہکا بکا کیا۔

”تم نے ایسا کیوں کیا۔۔۔؟“ رباب حیران ہوئی۔  
”کیوں کہ وہ ساری رات اپنے پوائے فرینڈ سے باتیں کر کے میری غیند ڈسٹرب کرتی تھی۔“ اس کے معصوم انداز پر رباب کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ گئی، جس کا شانزے نے خاصا غلط مطلب اخذ کیا تھا۔

”تمہیں تمہارا بھی تو کوئی ایسا فرینڈ نہیں ہے۔۔۔؟“ شانزے کے اگلے سوال پر رباب کو کرنٹ سا لگا۔  
”استغفر اللہ۔۔۔ میں تمہیں ایسی لڑکی لگتی ہوں۔“ رباب نے براہ راست بتایا۔

”ایسی لڑکی سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ شانزے سے بحث میں جیتنا آسان تھوڑی تھا۔  
”میں لڑکوں سے دوستی کو گناہ سمجھتی ہوں۔“ رباب نے اس دفعہ کھل کر کہا۔

”سوری۔۔۔ میرا نظریہ اس سے مختلف ہے، میں دوستی کو برا نہیں سمجھتی۔ ہاں اس چیز کو برا سمجھتی ہوں کہ کوئی آپ کی وجہ سے ڈسٹرب ہو یا ذہنی اذیت کا شکار ہو۔“

شانزے نے کھل کر اپنا موقف بتایا، جو رباب کو خاصا عجیب تو لگا، لیکن وہ چپ رہی۔



”لیکن آپ نے آپ کی اور عبد اللہ بھائی کی متغنی کیوں توڑ دی۔“ مونہا کے سوال نے اس کے دل پر تیز دھار والی چھری چلائی۔ عذرہ کی بھیگی آنکھوں کے بند ایک دفعہ پھر ٹوٹ گئے۔ وہ آہستگی سے سارا واقعہ اسے سنائی گئی۔

”آپ کو عبد اللہ بھائی سے ایک دفعہ ضروریات کرنی چاہیے۔“ مونہا نے اسے اکسایا۔

”نہیں کر سکتی۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔ وہ دونوں اب چھت پر چلی آئی تھیں۔ عصر کی نماز کا وقت ہونے والا تھا۔

”آخر کیوں...؟“ مونہا نے احتجاجی نظروں سے اسے دیکھا۔

”آپ نے منع کیا ہے۔“ عذرہ نے دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھوں کو صاف کیا۔ وہ خاصی افسردہ لگ رہی تھی۔

”تو آپ ان کو مت بتائیں۔“ مونہا کے پاس ہر بات کا جواب تھا۔

”میں کوئی بھی کام آپ سے چھپ کر نہیں کرتی۔“ عذرہ کی اپنی مجبوریات تھیں، آپا نے شاید کچھ چیزیں گھٹی میں ڈال کر اسے ملا دی تھیں، وہ چاہتے ہوئے بھی ان سے انحراف نہیں کر سکتی تھی۔

”لیکن ایک بار بات کرنے میں کیا حرج ہے؟ یا پھر آپا سے ہی پوچھ لو۔“ مونہا نے منہ بنا کر کہا۔

”لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی، اگر عبد اللہ کے ساتھ میری نسبت طے ہوئی تو شاید۔“ عذرہ کی ادھوری بات کا مطلب وہ سمجھ چکی تھی۔

”تو ٹھیک ہے، لیکن کچھ بتا بھی تو چلے، آپا نے ایسا کیوں کیا؟“ مونہا ہلکا سا جھنجھلائی۔

”دونوں کے درمیان میں شاید کسی بات پر تلخ کلامی ہوئی تھی۔ اسی لیے آپا بہت غصے میں ہیں۔“ عذرہ ٹھیک ٹھاک پریشان تھی۔

”اب تک سو نفل تو وہ بڑھ چکی ہوں گی۔“ مونہا نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔

وہ دونوں جانتی تھیں کہ آپا صالحہ سخت پریشانی یاد دکھ کے لحاظ میں جب جائے نماز پر کھڑی ہوتیں تو پھر

ویسے بھی شانزے کے ساتھ اس کا وقت دوسروں کی نسبت خاصا اچھا گزر رہا تھا۔ رہاب کو اس کی روم میٹ بننے ہی احساس ہو گیا تھا کہ شانزے خاصی بے ضرر سی اور کسی حد تک دوسروں کے معاملے میں ٹھیک ٹھاک قسم کی بے حس لڑکی واقع ہوئی ہے۔ وہ رہاب کی ذاتیات میں بالکل بھی دخل اندازی نہیں کرتی تھی۔ اسی طرح سے وہ بالکل بھی پسند نہیں کرتی تھی کہ کوئی اس کے پرستل معاملات کو کریدے۔

اس نے ایک دن خود ہی کسی دھن میں ہٹا دیا تھا کہ اس کے والدین میں علیحدگی ہو گئی تھی۔ مدر کا کچھ پتا نہیں اور والد کو کسی نے قتل کر دیا تھا۔ اس کی پرورش اس کی دادی اور چچھو نے مل کر کی تھی۔ اس کے پچھلا ٹھیک ٹھاک قسم کے بزنس میں تھے، کچھ اس کی دادی مرتے ہوئے اپنے حصے کا ایک گھر شانزے کے نام کر گئی تھیں۔ جس کا اچھا خاصا کرایہ شانزے کی ضروریات زندگی کے لیے کافی تھا۔ اس لحاظ سے اسے معاشی مسائل کا بالکل بھی سامنا نہیں تھا۔

اس نے بی ایس کرنے کے بعد ایم ایس میں ایڈمیشن بس ہوسٹل میں رہنے کے لیے لے رکھا تھا۔ ورنہ اسے اب پڑھائی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ صرف اور صرف شو بزم میں اپنا ایک نام اور مقام بنانا چاہتی تھی۔

”کیا...؟“ مونہا نے اپنے چہرے پر عذرہ کے سامنے سخت تعجب کا اظہار کیا۔ ”اوہ میرے خدایا...“ اس کے ماتھے کے بل گہرے ہوئے۔

”آپا صالحہ کا مانغ ٹھیک ہے؟“ پوری بات سنتے ہی مونہا کے منہ سے بے اختیار پھسلا۔ عذرہ کی بھیگی آنکھوں میں ناگواریت کا احساس اجاگر ہوا۔ مونہا کو ایک لمحے میں احساس ہوا کہ آپا صالحہ کے بارے میں اس کے تلخ الفاظ عذرہ کو اتنے نہیں لگے، کچھ بھی تھا وہ اس کی ماں تو تھیں۔

”آئی ایم سہری۔“ وہ تھوڑا سا سنبھل کر بولی۔

”آپا کو تو عبداللہ بہت پسند تھا، ایسا کہتا ہوا، جوان کی ساری پسندیدگی، دھواں بن کر فضا میں تحلیل ہو گئی۔ ایک نئی سوچ نے اس کا دامن تھام لیا۔ نیند نے بھی شاید اس رات اس کے پاس نہ آنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

وہ ننگے پاؤں کمرے سے نکل آئی۔ آپا کے کمرے کا زیرو واٹ کا بلب روشن تھا۔ وہ پاس سے گزری اندر سے آنے والی ریڈیو کی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔ اسے دھچکا سا لگا۔ آپا اور موسیقی دونوں متضاد چیزیں تھیں۔ لیکن اس وقت ریڈیو کی ہلکی ہلکی سی آواز کمرے سے باہر آرہی تھی۔ عیدینہ کو پہلی دفعہ معلوم ہوا تھا کہ آپا موسیقی سے بھی شغف تھا۔

بلبیا کی جاناں میں کون؟  
نہ میں مومن دج مسیتاں۔  
نہ میں دج کفر ویاں ریتاں۔  
نہ میں پاکاں دج پلستاں۔  
نہ میں موسیٰ نہ میں فرعون۔  
بلبیا کی جاناں میں کون؟

رات کی خاموشی اور تیرگی میں جب پورے صحن میں موتیا کے پھولوں کی مسک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ صحن کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ آسمان پر موجود چاند اسے آج سے پہلے کبھی اتنا تنہا نہیں لگا تھا۔ دماغ میں بے معنی سوچوں کا جھوم تھا۔ جیسے جیسے رات گزر رہی تھی ویسے ویسے اس کا دل پھل رہا تھا۔ رات کا وہ نہ جانے کون سا پر تھا۔ وہ ننگے پاؤں صحن سے چھت پر جانے والی سیڑھیوں کی طرف چلی پڑی۔ اس کے گھر کی اور مدر سے کی چھت ایک تھی اور دوسری جانب بھی سیڑھیاں تھیں۔ اس نے مدر سے کی جانب جھانکا، سامنے صحن کے ساتھ بنے برآمدے میں رکھی چارپائی پر اسے عبداللہ کا گمان ہوا۔

چاند کی چاندنی میں اس کا وجود صاف پہچانا جا رہا تھا۔ عیدینہ کے دل کی دھڑکنیں بے تاب ہوئیں۔ یہ وہ شخص تھا جس کی محبت نے کسی کمزوری کی طرح آہستہ آہستہ اس کے وجود کے گرو جالا ہوا تھا اور

گھٹنوں نفل پڑھتی رہتیں، اس کے بعد جب وہ فارغ ہوئیں تو ان کے چہرے پر ایک الوہی سی چمک ہوتی جو دیکھنے والوں کو بے اختیار نظریں پڑانے پر مجبور کر دیتی تھی۔

”تو اب آپ کیا کریں گی۔؟“ موٹا کے سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

دل مسلسل بغاوت پر اتر رہا تھا۔ محبت اب تک ہزار دلیلیں دے چکی تھی، لیکن عقل کی ایک نگاہ عیدینہ کے اندر کا سارا جوش ختم کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس کا سب سے بڑا مسئلہ تھا کہ وہ عشق اور عقل دونوں کو ساتھ لے کر چلتی تھی۔ اس سے بھی بڑھ کر اس کے حلال، حرام، گناہ اور ثواب کے نظریات تھے جو آپا نے اسے رٹا رکھے تھے۔ وہ دونوں نیچے آگئی تھیں۔

~ ~ ~

آج فضا میں عجیب سی اداسی تھی۔ ہوا بھی سانس روک کر کھڑی تھی، ہر طرف ٹھنکن کا راج تھا۔ آپا نے آج نہ دیہر کا اور نہ ہی رات کا کھانا کھایا تھا۔ وہ صحن پر بیٹھ انوں بے معنی سی بحث میں الجھی ہوئی تھیں۔ جو موتیا عیدینہ کے آنے پر فوراً ہی ختم کر دی جاتی اور ان کے جانے کے بعد منقطع سلسلہ وہیں سے جوڑ لیا جاتا۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ کافی دیر تو عیدینہ کمرے میں بدلتی رہی اور تنگ آکر بیٹھ کر بیٹھ گئی۔ موٹا سو چکی تھی۔

”آخر ایسی کون سی بات تھی جو عبداللہ اس کے ساتھ کرنا چاہتا تھا۔؟“ اس سوچ نے اس کی نیند حرام کر دی۔

”ان کی باتیں اور ادھورے جملے، خوب صورت ریپر میں لپٹے کسی گفٹ پیک کی طرح ہوتے ہیں۔ انسان یا تو اپنی پسندیدہ چیز کے خیال سے خوشی سے جھومتا رہتا ہے یا یہ سوچ کر خود کو پریشان رکھتا ہے کہ اگر گفٹ پیک میں سے من پسند چیز نہ نکلی تو کیا ہو گا۔“



آکٹوپس کی طرح اس کے وجود کو اپنی ذات کے حصار میں جکڑ لیا تھا اور وہ بھی کولہو کے تیل کی طرح اس کی چاہت کے کنویں کے ارد گرد چکر لگا کر خوش ہوتی رہتی تھی۔

آج رات اگر اس پر بھاری تھی تو اس کے ساتھ ساتھ عبداللہ بھی پرسکون نہیں تھا۔ دل کا دل سے کہیں نہ کہیں تعلق تو جڑا ہوا تھا۔ سفید کرتے شلوار میں وہ چارپائی پر رکھے گول تکے پر کہنی جمائے ہاتھ میں سیل فون پکڑے بیٹھا تھا۔ اس کی نظریں اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ عدینہ کو سخت افسوس لاحق ہوا۔

وہ منڈیر پر کنیاں جمائے مکمل محویت سے اپنے سے کافی فاصلے پر موجود عبداللہ کو ٹکٹنگی باندھے دیکھ رہی تھی۔ عبداللہ نے بھی شاید خود کو کسی کی نظریں کے حصار میں محسوس کر لیا تھا۔ اس نے بے چینی سے دائیں بائیں دیکھا۔ اس کے ارد گرد کچھ چارپائیوں پر بہت سے بچے لائن میں سو رہے تھے۔ ایک دم اس نے نظر اٹھا کر چھت کی منڈیر پر کھڑی عدینہ کو دیکھا۔ اسے ایک لمحے کو اس پر ہنسی ہوئی روح کا کان ہوا۔ وہ بوکھلا کر اٹھ بیٹھا۔ کچھ لمحے سوچنے کے بعد وہ چھت کی جانب جانے والی میڑھیوں کی طرف بڑھنے لگا۔ عدینہ کا دل بے ہنگم انداز سے دھڑکا۔ وہ ایک لمحے کے ہزارویں بل میں سمجھ چکی تھی کہ وہ اسے دیکھ کر چھت پر آ رہا ہے۔ عدینہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ پلٹی اور جھلی کی سی رفتار سے اپنی طرف کی میڑھیوں کی طرف تیز تیز چلنے لگی۔

”میری بات سنو عدینہ۔“ وہ چھت پر پہنچ چکا تھا اس کی آواز پر عدینہ کے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہو گئیں۔ اسے لگا اس نے اس وقت چھت پر آنکرائی زندگی کی سب سے بڑی بے وقوفی کی ہے۔ اس نے وہ رک نہیں اور میڑھیوں کی طرف بڑھنے لگی۔

”مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“ عبداللہ کی پکار پر اس کے قدم سست تو ہوئے، لیکن اس نے مزید نہیں دیکھا۔ اسے معلوم تھا وہ اگر پلٹ کر دیکھ لے گی تو پتھر کی ہو جائے گی۔

”میری آخری بات سن لو عدینہ! پھر ہمارے زندگی موقع دے یا نہ دے۔“ وہ اب چھت کی سب سے اوپر والی میڑھی سے نیچے جھانک کر بڑے افسردہ انداز سے اس سے درخواست کر رہا تھا، لیکن عدینہ اس وقت آخری میڑھی پر پہنچ چکی تھی۔

وہ اس سے کہنا چاہتی تھی کہ اس طرح اکیلے ملنا، اخلاقی اور معاشرتی لحاظ سے بہتر نہیں، وہ مناسب نہیں سمجھتی۔ اس لیے وہ یہاں سے چلا جائے۔ لیکن عبداللہ کے سامنے تو اس کی قوت گویائی ویسے ہی سلب ہو جاتی تھی۔ وہ نیچے پہنچ چکی تھی، جیسے ہی اس نے گھن میں قدم رکھا اس کی روح فنا ہو گئی۔

سامنے ہی آپا صالحہ غضب ناک لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں، ان کی نگاہوں میں شک، افسوس اور غصے کے رنگ اتنی شدت سے ابھرے کہ عدینہ کو لگا جیسے زمین نے مضبوطی سے اس کے پیروں کو جکڑ لیا ہو۔ آپا آگے بڑھیں۔ انہوں نے جھانک کر میڑھیوں کی طرف دیکھا۔ سب سے اونچی میڑھی پر کھڑا عبداللہ ان کی نگاہوں کی پستیوں میں ایک لمحے میں آن گرا تھا۔ انہیں اپنا فیصلہ بالکل ٹھیک محسوس ہوا۔

”میں نے تمہاری ایسی تربیت تو نہیں کی تھی۔“ وہ سسٹنل انداز سے آگے بڑھیں اور پوری قوت سے ایک تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔ عدینہ کو ایسے لگا جیسے پورے گھر کی چھت اس کے سر پر آن گری ہو۔ عبداللہ واپس پلٹ گیا تھا۔

”آپا۔۔۔“ اس نے سخت صدمے سے ان کی طرف دیکھا۔ وہ ان کو جتنا چاہتی تھی کہ ایسا کچھ نہیں، انہیں غلط فہمی ہوئی ہے، لیکن اس سے پہلے ہی آپا سخت الفاظ میں شروع ہو چکی تھیں۔

”کسی نامحرم سے تنہائی میں ملنے کا مطلب سمجھتی ہو؟ ہزاروں سال جنم میں جلوگی۔“ وہ بولیں نہیں بلکہ پھٹکاری تھیں۔

”میں نے تمہارا نام عدینہ یعنی جنت میں رہنے والی رکھا تھا لیکن تم وہ بد قسمت لڑکی ہو جسے جنم پکڑ پکڑ کر



اپنی طرف کھینچ رہا ہے تم سے زیادہ بد نصیب لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔“ وہ اپنے اندر موجود سارا زہر اگل کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

عمرینہ پر تو قیامت سے پہلے قیامت ٹوٹ گئی۔  
”اپنی ذات اور کردار کے بارے میں گواہی دینا جتنا مشکل کام ہے اس سے زیادہ اذیت ناک کسی اپنے کی آنکھوں میں اپنے لیے شک اور بدگمانی کے رنگ دیکھنا ہے۔ انسان ایک لمحے میں جیتے جی مر جاتا ہے اور مرنا ہوا انسان کہاں اپنے حق میں گواہی دینے کے قابل رہتا ہے۔“ اس حقیقت کا اور اک آج عمرینہ کو کھل کر سامنا کرنا پڑا۔  
”اس کی پاکیزہ محبت نے اسے اس کی ماں کی نظموں میں رسوا کر دیا تھا۔“

اس کے اپنے زندگی گزارنے کے اصولوں نے عبد اللہ کو بدگمان کر دیا تھا۔  
وہ بھٹی بھٹی نگاہوں سے ”اپنے کمرے کے بند دروازے کو دیکھتی رہ گئی۔ آسمان پر موجود مینا چاند اسے مزید ذلت سے بچانے کے لیے کہیں چھپ گیا تھا۔

عمرینہ کا بھی دل چاہا کہ وہ بھی کسی باطل کو اور بڑے اور بڑے کس جا کر پھاڑوں پر برس جائے۔  
\*\*\*

”دیکھو بھئی! سوئی کو اچھی طرح پڑھنا“ سمجھنا اور پھر حل کرنا۔“ اوریدہ کا پیپر تھا اور صبح سے اس کی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ آج خلاف توقع ارصم اسے اسکول چھوڑنے جا رہا تھا۔ وہ بدحواس انداز سے اپنے نوٹس کھولے فارمولے رٹنے میں مصروف تھی۔  
”میں تم سے کہہ رہا ہوں اوریدہ!۔“ ارصم نے نرمی سے اسے ٹوکا۔

”پلیز ارصم! مجھ سے بات مت کرو مجھے سب کچھ بھول جائے گا۔“ وہ حد درجہ روپاشی تھی۔

”لی بیویار! تم ابھی سے اتنی کنفیوز ہو رہی ہو“ پیپر کے دوران کیا کردگی؟“ ارصم اس کے لیے پریشان ہوا۔

”وہی ہو گا جو فزکس کے پیپر میں ہوا تھا۔“ اس نے منہ بنا کر یاد دلایا۔ فزکس کے پیپر میں وہ اچھا خاصا ایک نیم پیکل اپنی بدحواسی میں غلط کر آئی تھی۔ اور یہ غم ابھی تازہ تھا۔

”ایسا کچھ نہیں ہو گا ان شاء اللہ“ لیکن پلیز تم ریلیکس رہنا۔“ ارصم نے مسلسل اسے سمجھانے کا فریضہ جاری رکھا۔

”مجھے لگتا ہے نانتھ کی طرح میرا اس دفعہ بھی لی گریڈ ہی آئے گا۔“ وہ مایوس انداز سے ارصم کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”اگر اس بی گریڈ آیا تو تمہاری اور میری دوستی ختم“ میں کسی نالائق لڑکی کو اپنا دوست نہیں بنا سکتا۔“ ارصم نے خالص غلط موقع پر دھمکی دی تھی اوریدہ نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے ارصم کا سنجیدہ چہرہ دیکھا۔

”تم سیریس ہو۔“ وہ بمشکل پوری قوت لگا کر پھنسی پھنسی آواز میں بولی ارصم کو فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اوریدہ اکاچرہ دھواں بھواں سا تھا۔

”نفاق کر رہا ہوں یا ر۔“ اس کی وضاحت سے پہلے ہی وہ دونوں ہاتھ منہ پر رکھے بری طرح روکنے لگی۔

”ماں! گاڈ اوریدہ! بااگل ہو گئی ہو کیا۔؟“ وہ گھبرا گیا۔ پیپر سے اوجھ گھٹنے پہلے اس کا رونا پیپر پر کس طرح سے اثر انداز ہو گا وہ اچھی طرح جانتا تھا۔

”مجھے پتا ہے تم نفاق نہیں کر رہے ہو۔“ اس نے بازو کی پشت سے اپنی آنکھیں رگڑیں۔

”میں ایسا کر سکتا ہوں بھلا؟“ وہ اب نرمی سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر پوچھ رہا تھا۔ اوریدہ نے بے یقینی سے اس کا رُخ خلوص چہرہ دیکھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ خاموش رہی۔

”زندگی میں سب سے مشکل کام اس شخص کی آنکھوں میں اپنے لیے بے اعتباری دیکھنا ہے جس کے متعلق آپ ساری دنیا کے سامنے دھڑلے سے دعو ا کرتے ہوں کہ وہ آپ کو سب سے زیادہ جانتا ہے۔“ ارصم کی بات پر وہ اب بھی خاموش رہی۔



واپس جانے کو۔“ وہ ہنسنا اور بیدار شرمندگی سے سر جھکا کر آہستگی سے بولی۔ ”اتنی دیر کیا کرتے رہے؟“

”تمہارے پیچھے نہیں ہونے کی دعائیں کرتا رہا۔“ اس نے ہلکے ہلکے انداز سے کہہ کر گاڑی اسٹارٹ کی۔

”کوئی فائدہ نہیں۔ کچھ لوگوں کو کسی کی بھی دعائیں نہیں لگتیں۔“ وہ خاصی دل گرفتہ تھی۔

”کیا پیچھا نہیں ہوا۔۔۔؟“ ارصم نے ایک سنگٹل پر گاڑی روک کر اس کا چہرہ دیکھا، جو ضبط کی کوشش میں سرخ ہو رہا تھا۔

”دو سوال غلط ہو گئے۔۔۔“ اس نے سر جھکا کر اعتراض کر دیا۔ ارصم کی بے ساختہ ہنسی نکل گئی، اور یہ اسے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

”میرا تو خیال تھا کہ تم از کم پانچ یا چھ تو تم ضرور غلط کر کے آؤ گی، لیکن تمہاری ایوریج تو نارمل ہے۔“ اس نے وضاحت دی۔

”اچھے خاصے آسان سوال تھے، میں نے جلدی میں فارمولا ہی غلط لگا دیا۔“ وہ سخت زہ انداز میں گویا ہوئی۔

”چلو کوئی بات نہیں، اب کیمسٹری کی تیاری اچھی کرتا۔۔۔“ ارصم نے اسے حوصلہ دیا۔

”کیجئے کھاؤ گی؟“ ارصم نے ایک ریسٹورنٹ کے سامنے گاڑی آہستہ کی۔

”نہیں نہیں۔۔۔ بڑی اماں پریشان ہو رہی ہوں گی، انہیں صبح ایک وقفہ بتا کر آتی تھی کامیابی کے لیے۔“ اس کے معصوم انداز پر ارصم نے اپنے حلق سے برآمد ہونے والے قہقہے کو بمشکل روکا۔

”کیا بات ہے تمہاری بھی اور یہ! ایسا لگ رہا ہے، تمہارے ایگزام نہیں پورے گھر کے ہو رہے ہیں۔“

”میں کیا کروں، پاکستان کا امتحالی سسٹم ہی ایسا ہے۔ میں رے لگاتے جاؤ۔ پھر بھی کچھ بتا نہیں ہوتا، کس وقت گیا ہو جائے۔“ اسے یہاں کے تعلیمی نظام سے بہت شکایتیں تھیں۔ وہ اب گاڑی میں انگلش میوزک لگا کر خاموشی سے سن رہی تھی۔ آدھے گھنٹے کے بعد

ارصم کی گاڑی نیلی کوٹھی میں داخل ہوئی اور ساتھ ہی

”وہ شخص جس کو آپ ہمیشہ ہنستا مسکراتا دیکھنا چاہتے ہوں اس کی آنکھوں میں آنسو آپ کے لیے کس قدر لذت کا باعث بنتے ہیں، اگر اسے پتا چل جائے تو شاید اس کی آنکھیں رونا ہی بھول جائیں۔“

وہ اب دونوں ہاتھ اسٹیرنگ پر رکھے بڑے افسردہ انداز سے بول رہا تھا۔

”آئی ایم سوری۔۔۔“ اور بیدار کی سمجھ میں بات آگئی تھی۔

”یسٹ آف لک۔۔۔“ اس نے اسکول کے گیٹ کے پاس اپنی گاڑی روکی۔

”تھینکس۔۔۔“ اور بیدار بڑی مسکرائی اور گاڑی سے اتر گئی۔ ارصم نے دیکھا، وہ ایک دفعہ پھر نوٹس کھولے فارمولے رٹنے میں مصروف تھی۔ اس کی تمام تر توجہ ہاتھ میں پکڑے کانڈول کی طرف تھی تب ہی جلتے جلتے وہ ایک لڑکی سے ٹکرائی۔ ارصم اپنی گاڑی میں بیٹھنے بیٹھے مسکرایا، اسے علم تھا کہ وہ ان پیپرز کو ایگزامینیشن ہال میں بھی لے جائے گی اور پھر نگران عملے کے ڈانٹنے کے بعد ہی رکھے گی۔

”ارصم! تم کہاں ہو۔۔۔؟“ تین گھنٹے کے بعد اس کی گھنٹے گھنٹے سے انداز سے کال آئی، ارصم کو انہونی کا احساس ہوا۔

”گیٹ پر۔“

”اوکے آئی ایم کمنگ۔“ پانچ منٹ کے بعد وہ تھکے تھکے سے انداز سے فارم اٹھاتی ہوئی اس کی گاڑی کی طرف آ رہی تھی۔ ارصم کو پتہ چلتا ہی پتا چل گیا۔ اس کے منہ کے پیچھے کا جس ویسی حال ہوا ہے جو اس سے پہلے فزکس کے ساتھ ہو چکا ہے۔

”تم کب پہنچے۔۔۔؟“ وہ گاڑی میں بیٹھنے ہی لاپرواہی سے بولی۔

”میں گھر واپس گیا ہی کب تھا۔۔۔“ ارصم کے جواب پر وہ بری طرح چوگی۔ ”تم تین گھنٹے سے یہیں باہر روڈ پر کھڑے تھے؟“ حیرانی سے اس کی آواز بلند ہوئی۔

”جب اس طرح روک کر جاؤ گی تو کس کا دل چاہے گا



تھک کر رہی تھیں، تھک آکر اس نے انگلیٹڈ میں اپنے پایا کو کال ملائی۔

”تمہیں علیحدہ گاڑی کیوں چاہیے اوریدا! جب پہلے سے تین تین گاڑیاں گھر میں موجود ہیں۔“ تیمور اپنی بیٹی کی اچانک فرمائش پر حیران ہوئے۔

”ان میں سے ایک بیا آئی کی، ایک بڑے لپا کی اور ایک اتفاقی کی ہے۔“ اس نے باقاعدہ انگلیوں پر گن کر بتایا۔

”یہ ان میں سے میری کوئی بھی نہیں ہے۔“ اس نے اس کے لہجے میں کچھ تھا، جو ہزاروں گلو میٹر کے فاصلے پر موجود تیمور کے دل کو کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا۔ وہ بری طرح چونکے۔

”اوریدا! تمہیں کسی نے کچھ کہا ہے کیا۔؟“ انہوں نے محتاط انداز سے اپنی لادلی بیٹی سے پوچھا۔

”جی ہاں۔۔۔“ اوریدا اکاؤنٹ گرفت اندازاً نہیں بہت کچھ سمجھا گیا۔

”کس نے۔؟“

”بیا آئی نے۔۔۔“ اوریدا کے منہ سے نکلے ان تین الفاظ نے تیمور کے آج کے دن کا سارا سکون ورنہ برہم کر دیا۔ انہوں نے مزید ایک لفظ بھی نہیں پوچھا۔

دو اب اس سے ادھر ادھر کی دوسری باتیں کر رہے تھے، لیکن وہ غم میں اوریدا کی بات نے ایک حشر سا پر کر دیا تھا۔ رات سے پہلے پہلے تیمور کے بہترین دوست شہر پار علی، ان کی بیٹی کے لیے زیرو میٹر ”ڈر“ گاڑی نیلی کو بھی میں پہنچا گئے تھے۔ گاڑی پیچھے ہی گھر بھر میں حیرانی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

”گھر میں تین تین گاڑیاں کھڑی تھیں، تم نے اوریدا کے لیے اور کیوں بھجوائی۔؟“ بڑی اماں سیل فون کان کے ساتھ لگائے ڈانٹنگ روم میں داخل ہوئیں دوسری طرف تیمور تھے، جو اس وقت بڑی اماں کے سوال و جواب کے سیشن کی زد میں تھے۔

بڑے لبا کے ساتھ ساتھ ار صم نے بھی چونک کر اوریدا کی طرف دیکھا، جو بوکھلا کر چاول کی پلیٹ پر جھک گئی۔ بڑے لبا اگلے ہی لمحے بڑے سکون سے کھانا

اوریدا کی آنکھیں پٹ کر کے کھل گئیں۔ سامنے ہی آنٹی بیٹش اپنی گاڑی کے انتظار میں کھل رہی تھیں۔ اوریدا نے خوف زدہ نگاہوں سے ار صم کی طرف دیکھا، جو بڑے پرسکون انداز سے ان کی ہنڈاسوک پورج میں کھڑی کر رہا تھا۔

”کہاں رہ گئے تھے تم؟ تمہیں کچھ احساس ہے، مجھے اپنے کلینک جانا تھا۔“ وہ بات ار صم سے کر رہی تھیں اور کھا جانے والی نگاہوں سے اوریدا کو دیکھ رہی تھیں۔

”تو کیا ہوا؟ آپ اتفاقی کی گاڑی لے جاتیں۔؟“ ار صم نے آنکھ کے اشارے سے اوریدا کو اندر جانے کو کہا تو وہ فوراً ”اپنی چیزیں سمیٹ کر باہر نکل آئی، اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سلمانی ٹوپی اوڑھ لے تاکہ آنٹی بیٹش کو نظر ہی نہ آئے۔“

”تمہیں اچھی طرح پتا ہے، میں اپنی گاڑی کے علاوہ کسی اور کی چیز استعمال نہیں کرتی۔“ وہ چڑ کر بولیں۔

”اوریدا اکا پیر تھا، بڑی اماں نے کہا تھا مجھے اسے لانے کو۔“ اس نے سنجیدہ انداز سے وضاحت دی۔

”تو تم پچھلے تین گھنٹے سے غائب ہو گھر سے۔“ ان کا ہوا دور تک بھی مکمل تھا۔

”بڑی اٹھا۔۔۔ میں اپنی چالی۔۔۔“ اس نے صلح جو انداز سے گاڑی کی چالی ان کی طرف بریالی، جو انہوں نے ناراض سے انداز میں باقاعدہ چینی تھی۔

”جتنی مرضی کو ششیں کرو، رزٹ پھر بھی پچھلے سال جیسا ہی آئے گا۔“

وہ اوریدا کے پاس سے گزرتے ہوئے غصہ انداز سے بولیں اور غصے سے گاڑی کا دروازہ زور سے بند کیا۔ اوریدا پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اس کا چہرہ شرمندگی کے گہرے احساس سے سرخ ہوا اور وہ تیزی سے بھاگتی ہوئی اپنے پورشن کی طرف بڑھ گئی، پھر ساری دہ پورہ اپنے کمرے سے نہیں نکلی، بڑی اماں کو بھی خود اس کے پیچ کا پوچھنے کے لیے چل کر کمرے میں آنا پڑا۔

آنٹی بیٹش کا طنزیہ لہجہ اور استہزائیہ نگاہیں اسے بار بار



کھانے لگے۔ لیکن ارصم ٹھیک ٹھاک قسم کا بے چین ہو چکا تھا۔ وہ آج اتفاق سے ان کی طرف کھانے پر موجود تھا۔

”کیا احساس محرومی ہو رہا تھا تمہاری بیٹی کو۔؟“  
بڑی اماں کے انداز سے باقاعدہ ناراضی جھلکی۔ ارصم نے پھر نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

”اے ڈاکٹنگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھ چکی تھیں۔ انہیں ٹھیک ٹھاک قسم کا غصہ آ رہا تھا۔ دوسری جانب تیمور نے کچھ کہا تھا جسے سنتے ہی بڑی اماں کے ہونٹوں کو چپ لگ گئی۔ وہ اب خاموشی سے تیمور کی باتیں سن رہی تھیں۔

اورید کا سارا دھیان بڑی اماں کی گفتگو کی طرف تھا، لیکن ان کی ہوں ہاں سے وہ دوسری جانب ہونے والی بات چیت کا اندازہ لگانے میں ناکام ہو گئی تو سکون سے بیٹھ کر کھانا کھانے لگی۔ بڑی اماں نے مزید کوئی بھی بحث کیے بغیر فون بند کر دیا تھا۔ وہ اب سنجیدہ انداز سے اپنی پلیٹ میں کھانا نکال رہی تھیں۔ اورید اپنے کن آکھیوں سے ان کے چہرے کو پڑھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ اسی دوران بڑے ابا نے کن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کھٹے ہو گئے۔ انہوں نے اس ساری گفتگو میں بالکل حصہ نہیں لیا تھا، ویسے بھی اورید کا اس گھر میں ہونا یا نہ ہونا ان کے لیے برابر تھا۔

”میرے کمرے میں گرین ٹی بھجوا دیجیے گا۔“  
بڑے ابا نے بڑی اماں سے کہا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ ان کے ڈاکٹنگ روم سے نکلتے ہی بڑی اماں نے ناراض نگاہوں سے اورید کو دیکھا کہ گڑبڑا گئی۔ بڑی اماں نے بھی ہاتھ میں پکڑی روٹی جھجکا کر پلیٹ میں رکھی اور خفا خفا سے انداز سے کھانا کھانے لگی۔ گئیں۔ اب وہ ارصم کی گہری نظروں کے حصار میں تھیں۔ آج تو امتحان در امتحان ہو رہے تھے۔

”تم نے ماما کی گاڑی والی بات کو مانڈ کیا تھا۔؟“ وہ اب سنجیدگی سے اس کا بو کھلایا ہوا چہرہ دیکھ رہا تھا۔  
”نہیں تو۔“ وہ صاف مکر گئی اور ارصم کے سامنے اس طرح مکرنا اسے اتنا منگا پڑے گا، اسے اس چیز کا

پہلے سے اندازہ ہوتا تو کبھی جھوٹ نہ بولتی۔  
”ایک بات یاد رکھنا اورید! مجھے زندگی میں ایک چیز سے نفرت ہے اور وہ ہے جھوٹ۔“ ہلکی سی برہمی اس کے لہجے سے پھٹکی۔ ”تم ساری دنیا کے سامنے جھوٹ بول سکتی ہو، لیکن میرے سامنے نہیں۔“ وہ ڈاکٹنگ روم سے نکلتے نکلتے اس کا سارا سکون بخارت کر گیا۔

شام تک وہ بے چینی سے اس کے نمبر پر کئی دفعہ کال کرتی رہی۔ لیکن نمبر مسلسل بند جا رہا تھا۔ تنگ آ کر وہ لان کی طرف نکل گئی، ارصم سامنے ہی اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اورید کے بیٹھنے پر بھی کوئی نوٹس نہیں لیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

”مجھے یاد آتی ہے وہ بات واقعی اچھی نہیں لگی تھی۔“ اس نے ہلکا سا جھجک کر وضاحت دی۔ ارصم کی ناراضی کے ڈر سے اس نے اعتراف کیا۔  
”لیکن انہوں نے تمہیں نہیں سمجھے کہا تھا۔“

ارصم نے گردن موڑے بغیر اسے یاد دلایا۔  
”میری وجہ سے ہی کہا تھا۔“ اورید اپنے احتجاجی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اور تم نے انکل تیمور کو شکایت لگا کر گاڑی منگوا لی۔“ ارصم کے لہجے میں ہلکی سی خفگی جھلکی۔  
”میں نے شکایت نہیں لگائی تھی، بس یہی کہا تھا کہ مجھے گاڑی کی ضرورت ہے۔“ اس نے فوراً وضاحت دی۔

”چلائی آتی ہے تمہیں۔؟“ وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

”نہیں۔“ اس کے منہ سے بے ساختہ پھسلا تو ارصم نے پہلی دفعہ گردن موڑ کر اس کی طرف حیرانی سے دیکھا۔

”جلد ہی سیکھ لوں گی۔“ اس نے گڑبڑا کر جواب دیا۔

”یکسٹری کے پیپر کی کیسی تیاری ہے؟“ وہ اب نارمل انداز سے پوچھ رہا تھا۔

”ایک لفظ بھی پڑھا نہیں جا رہا۔“ اس نے بے



ہر موسم لائے  
نگہار



BIO  
**Nikhaar**

Fairness Cream



Herbal Extracts  
with Saffron and Milk



Glaxo





چارگی سے کہا تو ارصم نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا، جو خاصی افسردہ سی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ آہستگی سے بولی۔ ”تم جو خفا تھے مجھ سے۔“

”میں ساری دنیا سے خفا ہو سکتا ہوں اور یہاں، لیکن تم سے نہیں۔“ وہ کھل کر مسکرایا تو اورید کی جان میں جان آئی۔ اس کے ہتے ہوئے اعصاب ایک دم ہی پرسکون ہوئے۔ سارے دن کی ذہنی مشقت کے بعد اب جا کر وہ پرسکون ہوئی تھی۔ اس لیے وہ اب ہلکے پھلکے انداز سے اس کے ساتھ گپ شپ لگا رہی تھی۔

\*\*\*

”کیا ہوا ہے؟“ مونٹا اس سے پوچھ پوچھ کر تھک گئی تھی، جب کہ عدینہ کے لبوں پر لگتا تھا۔ کسی نے خاموشی کی کئی مرگ کوئی ہو تو تاج منج سے اپنے کمرے سے نہیں نکلی۔ طبیعت میں عجیب سی پڑمردگی کا رنگ غالب تھا۔

”عبداللہ بھائی کی امی آئی تھیں آپ سے ملنے۔“ مونٹا نے اسے اطلاع دی، لیکن وہ خاموشی سے اپنے ہاتھ کے ناخنوں پر لگا عرق دیکھتی رہی، یہ عرق اکثر عدینہ کے بڑے انتہام سے مونٹا سے لگوائی تھی، کیونکہ نیل پائش لگانے کی اجازت آپا نے اسے کبھی نہیں دی تھی۔

”لیکن آپ اپنے کمرے سے ہی نہیں نکلیں، جنگ آکر وہ بے بے سے مل کر رہی گئیں۔“ مونٹا کی اس بات پر بھی اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

”آپ کو منگنی ٹوٹنے کا غم ہو رہا ہے ناں؟“ مونٹا نے ہمدردی سے اس کے متورم چہرے کو دیکھا وہ شاید ساری رات روٹی رہی تھی۔

”نہیں۔“ اس کے سپاٹ لمبے نے مونٹا کو حیران کیا۔

”کیوں؟“

”مجھے منگنی ٹوٹنے کا غم نہیں، بلکہ اس اعتبار کے ٹوٹنے کا غم ہے، جو آپا کو مجھ پر تھا۔“ اس نے بہت دیر بعد ایک طویل جملہ بولا۔

”کیسا اعتبار؟“ وہ پریشان ہوئی۔

”وہ اعتبار جو کبھی انہیں مجھ پر تھا ہی نہیں۔“ اس کی استغرائیہ مسکراہٹ پر مونٹا مزید الجھ گئی۔ وہ خاموشی سے عدینہ کا غم میں ڈوبا چہرہ دیکھنے لگی۔ اسی وقت دروازہ ہلکا سا کھٹکھٹا کر آپا صالہ کی گیارہ بارہ سالہ شاگرد ضوسیہ اندر داخل ہوئی، اس کے چہرے پر ہلکی سی گھبراہٹ تھی۔

”کیا بات ہے ضوسیہ؟ کیا کام ہے؟“ مونٹا نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا، اس وقت اسے ضوسیہ کی ہر سخت ناگوار گزری تھی۔

”مدرنہ باجی۔۔۔ وہ۔۔۔“ ضوسیہ انکی۔ وہ ہراساں لگا ہوں سے انہیں بائیں دیکھ رہی تھی۔

”آپا صالہ سے آج کوئی سفارش نہیں کریں گی عدینہ باجی، سمجھیں۔“ مدر سے کی بچیاں اکثر عدینہ یا مونٹا سے سفارش کر کے آپا سے منجھنی لے لیا کرتی تھیں، اس وقت بھی وہ یہی سمجھتی تھیں کہ ضوسیہ ایسے ہی کسی کام کے سلسلے میں آئی ہے۔

”ایسی بات نہیں ہے! مجھے تو۔۔۔“ ضوسیہ شش و پنج کا شکار ہوئی۔

”کیا یہ وہ لگا رکھی ہے، صاف صاف بات کرو۔“ مونٹا کا مدر سے کی بچیوں پر خاصا رعب تھا۔ وہ آپا کا رائٹ ہینڈ کہلاتی تھی۔

”مجھے تو عبداللہ بھائی نے بھیجا ہے کہ عدینہ باجی کا موبائل نمبر لکھوا کر لاؤ۔“ ضوسیہ کی بات پر وہ دونوں ہی حیران ہوئیں۔

”ان سے کہہ دو، میں اپنا نمبر آپا کی اجازت کے بغیر کسی کو نہیں دیتی۔“ عدینہ کے دو ٹوک انداز پر مونٹا نے احتجاجی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”دے دیں، کیا حرج ہے۔“ مونٹا کا سامنٹائی۔

”ہرگز نہیں۔“ عدینہ کے سخت لہجے پر وہ ہلکی گھبرا کر کمرے سے نکل گئی۔

”ایک دفعہ بات کر لینے میں تو کوئی حرج نہیں۔“ مونٹا کو اس کی یہ حرکت پسند نہیں آئی۔

”انسان کوئی بھی غلط کام کرنے سے پہلے یہی سوچتا

خوب صورت تحریر کو دیکھنے لگی اس کے بعد کچھ سوچ کر اس نے وہ چٹ اپنی فزیا لوجی کی کتاب میں رکھ دی۔

”عبداللہ بھائی نے کیا لکھا ہے۔؟“ مونا کے بے تاب انداز پر وہ پھیکے سے انداز سے مسکرائی۔

”کچھ نہیں، وہی بات کرنے کا مطالبہ جو میں پورا نہیں کر سکتی۔“ وہ افسردہ سے انداز سے کھڑی ہوئی، مونا نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں آپ سے بات کرنے جا رہی ہوں۔ تم بے بے کو ایک کپ چائے کا بنا کر دے آؤ۔“ وہ اپنے کمرے سے نکل آئی۔ سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا جو سیاہ یادوں کے ڈھکے ڈھکے ہوا تھا۔ ہوا میں موجود نمی سے اس نے اندازہ لگایا۔ وہ زمین پر پاؤں پر بارش ہو رہی تھی۔

”مجھے آپ کو اپنی صفائی دینی چاہیے۔“ اس نے پاپا صالحہ کے کمرے میں جھانکا۔ وہ ظہر کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر کھڑی انہیں دیکھتی رہی۔ آپا نے سلام پھیر کر بے زار سی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ ابھی تک اس سے خفا تھیں۔

”مجھے آپ سے بات کرنی ہے آپا۔“ وہ جھجک کر مزید بولی۔ ”دیر کچھ نہیں تھا، جو رات آپ بھی تھیں۔“

لیکن مجھے تمہاری وضاحتوں کی ضرورت نہیں ہے عذر نہ میں سب کچھ جانتی ہوں، جاؤ مجھے تنگ مت کرو۔“ انہوں نے ناراضی سے کہہ کر ایک دفعہ پھر نیت باندھ لی۔ عذر نہ مجھے کچھ تو انہیں دیکھتی رہی اور پھر افسردہ سے انداز سے بے بے کے کمرے کی طرف برہہ آئی۔ دل میں ٹھٹھن کا احساس ایک دم ہی برہہ گیا تھا۔

وہ جیسے ہی اندر داخل ہوئی سانسے بے بے اور مونا کوئی مار تنگ شوشر مکرر دیکھنے میں لگن تھیں۔

عذر نہ بھی خاموشی سے ان کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ بے بے ٹی وی کی خاصی شوقین تھیں۔ جبکہ آپا صالحہ اور عذر نہ کو ایسا کوئی شوق نہیں تھا۔ ہاں کبھی کبھار آپا صالحہ اپنی سانس کے ساتھ بیٹھ کر کوئی اسلامی نذر آکر دیا

ہے کہ وہ پہلی اور آخری دفعہ کر رہا ہے لیکن بات ساری ہی ”پہلے“ قدم کی ہوتی ہے۔ اس کے بعد شیطان آپ کے پیروں کے ساتھ پھنسے باندھ دیتا ہے، انسان خود ساختہ فرضی دلیلوں سے اپنے ضمیر کو مطمئن کرتا ہوا برائی کے راستے کی طرف بھاگنے لگتا ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے جب انسان غلط کاموں پر بھی خود کو ڈھٹائی سے حق بجانب سمجھنے لگتا ہے۔“

وہ سنجیدہ انداز سے مزید گویا ہوئی۔ ”میں اپنی پہلے قدم کی جھجک کو ختم کرنا نہیں چاہتی۔“

”عبداللہ بھائی، سب اچھے ہیں عذر نہ۔“ مونا نے جھنجھلا کر کہا۔

”میں نے کب کہا وہ بُرے ہیں، بڑی چیز تو وہ نامحرم رشتوں کے درمیان موجود تہائی اور شیطانی حربے ہوتے ہیں۔ جن سے جاوا ملنی چاہیے۔“ عذر نہ نے اٹھ کر اپنی چیزیں سمیٹنا شروع کر دیں وہ ویک اینڈ پر گھر آئی تھی اور کل اسے لکھا تھا۔ اسی وقت ضوریہ باپتی کائنیتی واپس آئی اس نے اپنے دام میں ہاتھ میں ایک چٹ چھپا رکھی تھی جو اس نے آتے ہی عذر نہ کے بند پر رکھ دی۔

”کیا ہے؟“ عذر نہ سمجھ تو گئی تھی، لیکن بچی کو سخت زہنوں سے دیکھا۔

”عبداللہ بھائی نے دیا ہے۔“ وہ بچی آنکھیں پیرا کر شرمندگی سے گویا ہوئی۔

”آئندہ مت لے کر آنا، اچھی بچیاں ایسے کام نہیں کرتیں، چلو بھاگ جاؤ یہاں سے۔“ عذر نہ نے جلدی سے چٹ اٹھائی۔

”عذر نہ، تمہیں رات کم از کم میری بات تو سننی چاہیے تھی۔ کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں تھا خود پر؟ خیر میں پر سوں تبلیغی دورے پر ملائشیا جا رہا ہوں اور جانے سے پہلے کچھ چیزیں کلکٹر کرنا چاہتا ہوں، پلیز مجھ سے ایک دفعہ تو بات کر لو۔“

عذر نہ نے اس چٹ کو بہت سنجیدگی سے پڑھا۔ اس کے انداز میں اب بے چینی سی جھلک رہی تھی۔ وہ دوبارہ ست سفید کانڈ پر تحریر عبداللہ کی موتوں جیسی



قرآن و حدیث کے متعلق دینی پروگرام ضرور دیکھ لیتی تھیں۔ نی وی کے معاملے میں دونوں ساس بہو کی پسند خاصی مختلف تھی۔



”بہت اذیت میں ہوں“ آپ سوچ بھی نہیں سکتے کس قیامت سے گزر رہی ہوں میں۔“ مارتنگ شو کے اس خصوصی پروگرام میں فون کرنے والی خاتون کی آواز شدت غم کی زیادتی سے حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ مشہور و معروف چینل کے لائیو پروگرام کا سیٹ لگا ہوا تھا۔ میزبان آج ذرا بستر حلیے میں تھی۔ سفید رنگ کا نیٹ کا دپٹہ بمشکل سر پر نکلے، وہ گاہے بگاہے اپنے دائیں جانب تین سیٹوں پر موجود ایک مفتی صاحب اور دو مختلف مکتبہ ہائے فکر کے عالم دین پر سرسری سی نظر ڈال لیتی تھی۔ قفے دقے سے ہاتھ میں موجود چٹ سے بھی استفادہ کیا جا رہا تھا۔

”دیکھیں لی بی، جب تک آپ اپنا مسئلہ کھل کر نہیں بتائیں گی، ہم کیسے مشورہ دیں گے آپ کو؟“ مارتنگ شو میں بیٹھے مفتی صاحب نے الجھن بھرے انداز سے اپنی میزبان کو دیکھا جو خود بھی لائیو کارکر کی بے ربط گفتگو کی وجہ سے بے چینی سے پسو بدل رہی تھی۔

”میرے پاس الفاظ ہی نہیں ہیں جو میرے کرب کو“ میرے دکھ کو بیان کر سکیں۔“ وہی خاتون بمشکل بولیں۔

”دیکھیں مس نگت صاحبہ، آپ مفتی صاحب کو اپنا مسئلہ بتائیں، ہمارے پاس وقت کی قلت ہے اور مجھے ابھی بریک پر بھی جانا ہے۔“ مارتنگ شو کی میزبان کے لہجے کی سنجیدگی نے شاید دوسری طرف موجود کالر کو سگینا کا احساس دلا دیا تھا، اسی وجہ سے وہ اب بولنے پر آمادہ تھی۔

”مفتی صاحب میں دو دن پہلے ہی سعودیہ سے لوٹی ہوں، عمر کرنے گئی تھی۔“ فون کال پر موجود خاتون کے لہجے میں افسردگی کا عنصر غالب آیا۔

”ماشاء اللہ یہ تو بہت سعادت کی بات ہے۔“ مفتی صاحب نے لقمہ دیا۔

”لیکن۔۔۔ اب میں سوچتی ہوں کہ کاش میں نہ جاتی۔“ خاتون کی اگلی بات نے مارتنگ شو میں موجود تمام لوگوں کو تعجب میں مبتلا کیا۔

”خدا خواستہ ایسا کیا مسئلہ ہو گیا میری بہن۔۔۔“ ایک عالم دین ذرا محتاط انداز سے بولے۔

”مجھ جیسی بد قسمت گناہ گار عورت پوری دنیا میں نہیں ہوگی، جسے اللہ نے اپنے گھر بلا کر دھتکار دیا۔“ اس عورت کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش شامل ہوئی۔

”ایسا کیا ہوا وہاں۔۔۔؟“ مفتی صاحب کی پیشانی پر موجود دل گہرے ہوئے۔

”آپ کو شاید یقین نہ آئے مولانا صاحب۔۔۔“ اس عورت کی بات پر میزبان خاتون نے پھر کوفت سے پسو بدلا۔

”آپ کچھ بتائیں گی تو پتا چلے گا ناں۔۔۔“ میزبان نے قدرے رخ اور جھجکتے ہوئے انداز سے کہا۔

”ہاں ہاں میری بہن، آپ کھل کر بتائیں۔۔۔“ عالم دین صاحب نے ذرا نرمی سے انہیں بولنے پر اکسایا۔

”ایسا ہے مفتی صاحب جب میں حرم میں پہنچی۔۔۔“ وہ شرمندگی سے اٹکیں۔

”ہاں ہاں پھر۔۔۔؟“ میزبان کی بے تابی عروج پر تھی۔

”تو مجھے حرم کے صحن میں خانہ کعبہ ہی نظر نہیں آیا۔۔۔“ وہ عورت پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ مارتنگ شو میں موجود تمام لوگوں کا دل غ بھک کر ٹکے اڑ گیا۔ وہ بے یقین انداز سے اس فون کال کو سن رہے تھے۔

”کیا مطلب۔۔۔؟“ مارتنگ شو کی میزبان کو بریک پر جانا بھول گیا۔

”میں سات دن تک حرم کے صحن میں گھومتی رہی، ایک ایک شخص سے پوچھتی تھی، کعبہ کدھر ہے، لیکن جو بھی مجھے اشارے سے بتاتا تو مجھے وہاں خالی جگہ کے علاوہ کچھ نظری نہیں آتا تھا، آپ سوچ نہیں سکتے، میں



”لیکن یہ عورت کم از کم جھوٹ نہیں بول رہی تھی۔“ بے بے کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔  
 ”ایک سو ایک فیصد جھوٹی اور جعلی کالر تھی، ورنہ یہ کیسے ممکن ہے، کسی کو سامنے موجود مجسم چیز نظر نہ آئے۔“ عدینہ کی بات نے بے بے اور مونا دونوں کو شش درج میں مبتلا کر دیا، عقل چھلانگ لگا کر دل کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی اور اب پوری دھڑائی سے مسکرا رہی تھی۔

”ہاں شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو، بھلا ایسے کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔“ مونا بھی کچھ مطمئن ہوئی۔  
 ”یہ عورت جھوٹ نہیں بول رہی۔“ آپا صالحہ جو کمرے کے دروازے میں کھڑی تھیں، سپاٹ لمبے میں بولیں، وہ بیویوں چونک گئیں۔ پتا نہیں وہ کب سے وہاں کھڑی تھیں، ”ابیں جاتی نہیں چلا۔“ عدینہ نے گھبرا کر اٹاٹوی کی کتاب پر سر جھکا لیا۔  
 ”وہ کیسے آیا؟“ مونا بے بے بول۔

”جب کوئی شخص نفس کو اپنا محبوب بنا کر شریعت کی حدود و قیود سے بے نیاز ہو جائے، سرکشی پر اتر آئے تو اللہ اس سے دیکھنے، سننے اور سمجھنے کی ساری صلاحیتیں چھین لیتا ہے، جب دنوں پر مہر لگ جائے تو انسان کی آنکھیں دبی دیکھتی ہیں جو وہ دیکھنا چاہتا ہے۔ وہی سنتی ہیں جو وہ سنتا چاہتا ہے۔“

صالحہ بیگم کی آنکھوں سے بے آواز آنسو ایک لڑی کی صورت میں بہہ اٹے۔ اس سے وہ اداسی کا ایک ایسا صحرا لگ رہی تھیں جس کے دامن سے انسان کو سوائے پیاس اور تھکن کے کچھ نہیں ملتا۔ عدینہ اور مونا دونوں کو دھچکا لگا۔ آپا کمرے سے جا چکی تھیں۔ وہ دونوں بھی آہستگی سے باہر نکل آئیں۔ آپا صالحہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر عدینہ کو اپنی ناراضی بھی وقتی طور پر بھول گئی۔

”آخر ایسی کیا بات تھی جو آپا صالحہ کو رلا گئی۔؟“ عدینہ پریشان ہو رہی تھی۔ جب کہ مونا کا ذہن ابھی تک اس مارنگ شوکی خاتون کی بات میں الجھا ہوا تھا۔  
 ”آپ کا کیا خیال ہے، وہ عورت ٹھیک کہہ رہی

کتنی اذیت میں ہوں۔“ وہ اب بلند آواز میں رو رہی تھی۔ اس کی دردناک آواز میں کچھ تھا جو وہاں موجود سننے والوں کو ہلا رہا تھا۔

”استغفار۔ استغفار۔“ مفتی صاحب کے ساتھ بیٹھے ایک عالم دین صاحب بے ساختہ گویا ہوئے۔  
 ”توبہ۔۔۔ توبہ۔۔۔“ مارنگ شو میں بیٹھیں کچھ خواتین نے خوفزدہ انداز سے کانوں کو ہاتھ لگائے۔  
 ”آپ سے ایسا کون سا گناہ سرزد ہو گیا میری بہن۔“

جو اللہ نے آپ کو اپنے گھر کے دیدار کی سعادت ہی نصیب نہیں کی۔“ عالم دین صاحب نے فوراً ہی خاتون کو گناہ گار ہونے کی سند ہاتھ میں تھما دی۔  
 ”ایک ایسا گناہ جو میں یہاں سب کے سامنے نہیں بتا سکتی، مجھے سمجھ نہیں آ رہی میں کیا کروں؟“ عورت کی کال ڈراپ ہو گئی۔ ساتھ ہی عدینہ نے بیزارگی سے ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی کا ٹین آف کر دیا۔  
 ”پتر مفتی صاحب کا جواب تو سنئے۔“ بے بے

بے تڑپ کر بولیں۔  
 ”عدینہ بائی چلا میں ٹائی وی۔“ مونا نے بھی بے چینی سے پہلو بدلا، وہ دونوں اس وقت بے جی کے کمرے میں موجود تھیں۔

”ڈرا بے بازی ہے ساری ان مارنگ شو والوں کی۔“ عدینہ نے بیزارگی سے اپنی اٹاٹوی کی کتاب کھولی۔  
 ”لو اب ایسا جھوٹ تو نہیں بول سکتے چینل والے۔“ مونا کو یقین ہی نہیں آیا۔

”آج کل ہر کوئی دین کا ترکہ لگا کر اپنی ہڈیا بیچ رہا ہے۔ ہم فطری طور پر ایک ڈریوک قوم ہیں، مذہب کے ڈراوے میں آکر اکثر وہ کام بھی کر جاتے ہیں جو کوئی ہم سے کلا شکوف سے بھی نہیں کروا سکتا۔ عدینہ کا جذباتی بن فوراً ہی باہر نکل آیا۔

”اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔“ مونا ابھی بھی متفق نہیں ہوئی۔

”تم تارخ اٹھا کر دیکھ لو، مذہب کو جتنا نقصان ان جنونیوں نے پہنچایا ہے، کسی عام بندے نے نہیں پہنچایا ہو گا۔“



عزیزہ اور مونا چلتے چلتے بے بے کے تندور کے پاس پہنچی  
آئیں۔ جو کہ بالکل ٹھنڈا پڑا تھا۔ کافی دنوں سے بے بے  
نے اس میں آگ نہیں سلگائی تھی۔ تندور کے پاس  
کافی سارا سوکھا بالن اور ردی۔ کاندوں کا ڈھیر تھا۔ جو  
شاید آپا نے اسٹور روم سے نکلوائے تھے۔

عزیزہ کی نظر اچانک چارلس ڈکنز کی کتاب  
Great Expectations پر پڑی وہ چونک گئی۔  
کتاب خاصی بوسیدہ حالت میں تھی۔ اس کے کافی  
صفحات کو دیمک کھا گئی تھی۔ وہ سخت حیرانگی سے اس  
کتاب کو کھول کر دیکھ رہی تھی۔ اچانک اس کے اندر  
سے ایک بہت پرانی بلیک اینڈ وائٹ پاسپورٹ سائز کی  
تصویر نکلی۔ زمین پر جا گری۔ جسے مونا نے فوراً اٹھا  
لیا۔

”ارے یہ کس کا فوٹو ہے؟“ مونا نے الجھن بھرے  
انداز سے تصویر کو دیکھا۔ ہالڈن کوٹ میں فریج کٹ  
واڑھی کے ساتھ وہ شخص اپنے دور کا خاصا ہینڈ سم اور  
فیشن ایبل مرد لگ رہا تھا۔ عزیزہ نے اسے پہچاننے کی  
کوشش کی، لیکن ناکام ہو گئی۔  
”یہ کتاب کہاں سے آئی گھر میں؟“ عزیزہ نے  
پوچھی۔ مونا سے دریافت کیا۔

”میں نے اسٹور کی پڑچھتی سے یہ سارا گندا اتارا  
تھا۔“ مونا نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ ”لیکن یہ بندہ  
بے کون؟ آپا ہے یا بھول؟“

”خبردار۔ آپا کا بے ٹال۔“ عزیزہ نے اسے ڈرا  
کر تصویر پکڑی اور اپنے گھرے میں لے آئی۔ کافی دیر  
تک وہ بغور اس تصویر کا جائزہ لیتی رہی اور پھر تنگ آکر  
اپنی ڈائری میں رکھ دی۔ وہ اسے پہچاننے سے قاصر  
تھی۔

”ہو سکتا ہے ایاجی کے کسی کزن کی ہو۔“ اس نے  
خود کو مطمئن کیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ذہن کے  
پردے پر عبد اللہ کی وہ خفا خفا سی آنکھیں ابھریں اور  
اسے ایک دفعہ پھر بے چین کر گئیں۔ وہ ایک دفعہ پھر  
عبد اللہ کو سوچنے لگی۔

”کیا سوچتا ہو گا وہ“ میں نے اس کے ساتھ رابطہ

نہی؟“ مونا فکر مندی سے بولی۔  
”ویسے تو اللہ بستر جانتا ہے، لیکن میرے خیال میں  
اس خاتون کے ساتھ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہوا ہو گا۔“  
عزیزہ نے مونا کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

”کیا مطلب؟“ مونا نے بے تابی سے پوچھا۔  
”چونکہ وہ عورت گناہ کے گہرے احساس سے  
مغلوب ہو کر وہاں گئی تھی اس لیے ہو سکتا ہے اسے  
ایسا محسوس ہوا ہو۔“ عزیزہ نے سنجیدگی سے جواب دیا  
”اس کا دلغ ابھی تک آپا صاحبہ کے آنسوؤں میں الجھا  
ہوا تھا۔“

”پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے آپا ٹھیک کہہ رہی  
تھیں۔“ مونا نے سنجیدگی سے کہا۔

”ہو سکتا ہے۔“ عزیزہ نے۔ لاپرواہی سے  
کندھے اچکائے۔ وہ دنوں چلتے چلتے جا من کے  
درخت کے نیچے آن کھڑی ہوئی۔

”آپ سے ایک بات پوچھوں عزیزہ باجی۔؟“  
مونا نے موضوع گفتگو بدلا۔

”ہاں پوچھو۔“ عزیزہ نے مسکرا کر اپنی جھولی سی  
دست کو دیکھا، جس سے اسے سنگی بہنوں کی طرح  
محبت تھی۔

”یہ واقعی عبد اللہ سے بات نہیں کریں گی۔“  
مونا نے ہلکا سا تنک کر پوچھا۔  
”نہیں۔“ عزیزہ نے نفی میں سر ہلایا۔

”اس کا مطلب ہے آپ کو ان سے محبت تھی ہی  
نہیں۔“ اس نے منہ بنایا۔

”مجھے اب بھی اس سے محبت ہے، لیکن میں ایسی  
محبت کو نہیں مانتی جسے ہر لمحہ اپنے ہونے کے لیے  
ثبوت کی ضرورت ہو۔“ عزیزہ نے لاپرواہی سے کہا۔  
”بہت ظالم ہیں آپ۔“ مونا کو اس کا فیصلہ بالکل  
پسند نہیں آیا تھا۔

”اپنے مذہب اور معاشرے کی اخلاقی اقدار کا  
خیال رکھنے کے لیے اپنے نفس پر ظلم کرنا پڑتا ہے  
کیونکہ نفس کا گھوڑا تو بے لگام ہوتا ہے۔ جہاں چاہے  
دوڑا کر لے جائے۔ وہ تو حدود و حدود سے ماورا ہوتا ہے۔“

کیوں نہیں کیا۔“ کوئی ہزاروں دفعہ اس نے یہ جملہ سوچا۔ ایک دفعہ پھر اس کا سارا سکون غارت ہو گیا۔

\*\*\*

”تیور اپنی چپ حرکتوں سے کبھی باز نہیں آ سکتا۔“ ڈاکٹر بینش کافی کے دوپ کے لیے آغا جی کے اسٹڈی روم میں داخل ہوتے ہوئے غصے سے بولیں۔ اکثر شام کو دونوں باپ بیٹی ڈسکشن کرتے ہوئے کافی اٹھنے پیا کرتے تھے۔

”آپ کیا کیا اس نے۔؟“ آغا جی نے گود میں رکھی میڈیکل کی بھاری کتاب بند کی اور اپنی اکلوتی بیٹی کا چہرہ غور سے دیکھا جس پر تیور کے نام پر دنیا جہاں کی بیزاری اور کوفت کا ٹھکانا تھا مارتا سمندر صاف دکھائی دے رہا تھا۔

”اپنی پھینٹ بھر کی بیٹی کو ہی گاڑی لے کر دے دی اس نے۔“ انہوں نے کمرے کی کھڑکیوں سے پرے ہٹاتے ہوئے ناگواری سے کہا۔

”تو کیا ہوا؟ اس کی بیٹی ہے اور یہاں وہ لے کر دے سکتا ہے۔“ آغا جی نے لاپرواہی سے کافی کا گم اٹھا کر چھو کر بھروسہ کیا۔

”آپ کو اصل بات کا علم نہیں ہے آغا جی۔“ وہ جھنجھٹا کر کہیں۔

”اچھا تو جو اصل بات ہے وہ تم بتا دو مجھے۔“ ان کے اطمینان میں ذرہ بھر فرق نہ آیا ہو۔ ڈاکٹر بینش ان کو سارا واقعہ سناتی گئیں۔ آغا جی نے بہت اطمینان اور سکون سے سن کر سنجیدگی سے کہا۔ ”بہت غلط کیا تم نے ارصم کے ساتھ۔؟“

”ارصم کے ساتھ۔؟“ وہ چونکیں۔ وہ تو سمجھ رہی تھیں انہوں نے اور یہاں کی طبیعت صاف کی ہے۔ ”تمہیں اندازہ ہے تمہاری اس حرکت سے تمہارا بیٹا کتنا ہرٹ ہوا ہو گا؟“

”ارصم ایسی چھوٹی موٹی باتوں کو سہیں نہیں لیتا۔“ انہوں نے آغا جی سے زیادہ خود کو تسلی دی۔

”چھوٹی چھوٹی باتیں بڑے بڑے رشتوں میں ایسے

بدگمانی کے سوراخ کر دیتی ہیں کہ انسان ساری عمر ان سوراخوں میں وضاحتوں کی آغوشیں لگا کر بھی اپنے خوب صورت رشتے کو نہیں بچا سکتا۔“ آغا جی نے اپنے مخصوص اور دو ٹوک انداز میں کہا وہ الجھ ہی گئیں۔

”دیکھ لینا ارصم! آپ تمہاری گاڑی کو کبھی ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔“ انہوں نے مزید اپنی بیٹی کا سکون غارت کیا۔

”ایسا نہیں ہے آغا جی، وہ جانتا ہے مجھے وقتی طور پر غصہ آتا ہے۔“

”تو ٹھیک ہے، آغا کر دیکھ لینا۔“ ڈاکٹر بینش کو آغا جی کے لیے زیادہ دیر انتظار کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔

اسی راست جب وہ ان کے اسٹڈی روم کے کونے میں رکھی میز پر ایک مریض کی فائل کھولے، کیس کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ارصم بے تکلفی سے دروازہ کھول کر آغا جی کے پاس چلا آیا۔ جو اپنے کمپیوٹر ٹیبل کے سامنے بیٹھے تھے۔

”آغا جی آپ کی گاڑی کی چابی کہاں ہے، مجھے ذرا مارکیٹ تک جانا ہے۔“ ارصم کی آواز پر ڈاکٹر بینش نے مڑ کر دیکھا۔ ارصم ان کی موجودگی سے بے خبر تھا۔ اس طرح بلند آواز میں آغا جی کو مخاطب نہ کرتا۔

”میری گاڑی لے جاؤ، اس کی چابی بڑی ہے لاؤنج میں۔“ انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، جو اب قدرے سنجیدہ سا لگ رہا تھا۔

”تھینک یو ملکہ، لیکن مجھے اس وقت آغا جی کی ہی گاڑی چاہیے۔“ اس کا انداز ڈاکٹر بینش کو سگسا گیا۔ ”میرے بیڈ روم کی سائیڈ ٹیبل پر رکھی ہیں چابیاں، وہاں سے لے لو۔“ آغا جی نے ممکنہ بحث سے بچنے کے لیے ارصم کو منظر سے غائب کیا۔

”تھینک یو آغا جی۔“ وہ فوراً اسٹڈی روم سے نکل آیا۔

”آپ نے اس کے اسٹاکل دیکھے ہیں۔“ ڈاکٹر بینش تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھیں اور شکایتی نظروں سے اپنے باپ کو دیکھا۔



”میں نے کہا تھا ناں۔ وہ تمہاری گاڑی اب استعمال نہیں کرے گا۔“ آغا جی نے انہیں یاد دلایا۔ وہ جھنجھلا سی انھیں۔

”اب یہ اتنی سی عمر میں اپنی اماں کو انا دکھائے گا۔“  
 دماغ خراب کر دیا ہے اس لڑکی نے اس کا۔  
 ”اس میں اور یہ اکا کوئی تصور نہیں، اس کا مزاج شروع سے ہی ایسا ہے، یاد نہیں ایک دفعہ تم نے اسے اپنا سیل فون اٹھانے سے منع کیا تھا، دوبارہ جو کبھی اس نے ہاتھ لگایا ہوا ہے۔“

آغا جی نے انہیں یاد دلایا لیکن ڈاکٹر بینش کو سمجھانا بھینس کے آگے ہیں، بجانے کے مترادف تھا۔ وہ اپنے پوائنٹ سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں ہوتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ کہیں کو بھول کر ارصم کے مزاج کو سمجھنے کی کوشش میں لگ چکی تھیں۔

\*\*\*

”اور یہ ہزار دفعہ سمجھایا ہے کلچ سے آگے نہ ہٹو، پاؤں ہٹایا کرو، تم ایک دم اٹھالیتی ہو، اس لیے گاڑی بار بار بند ہوتی ہے۔“ اور یہ ا کے انگریز ام ختم ہو چکے تھے اور وہ اس وقت ارصم کے ساتھ ایک خالی پلاٹ میں گاڑی چلانا سیکھ رہی تھی۔

”کیا مصیبت ہے ملیا کو اتوٹنک گاڑی لے کر دینی چاہیے تھی۔“ وہ کلچ، ایک اور میسر کے چکر میں الجھی ہوئی ہتھاری سے ناک چڑھا کر بولی۔

”اتنا آسان کام تو ہے ڈر نہ ہوگا کرنا۔۔۔“ ارصم نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر میسر کی پریکٹس کروانی شروع کی۔

”یہ تیسرا میسر نہیں لگتا مجھ سے۔۔۔“ وہ تپ کر بیچے اتر آئی۔

”تم ہر کام سیکھنے سے پہلے اتنا شور کیوں مچاتی ہو اور یہ؟ میں چلا گیا تو کوئی بھی اتنی محنت سے نہیں سکھائے گا تمہیں۔“ ارصم نشو سے چہرہ صاف کرتے ہوئے نرمی سے بولا۔

”تم کہاں جاؤ گے۔؟“ وہ بوکھلا سی گئی۔

”لما سوچ رہی ہیں مجھے میڈیکل کے لیے کنگ ایڈورڈ لاہور میں بھیجیں گی۔“ ارصم نے اس کی سماعتوں میں ایک ہم ہی تو پھوڑا تھا۔ اور یہ ا کے حواس بالکل ہی ساتھ چھوڑ گئے، وہ کئی لمحے تو بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی اور ایک دم ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”بھی تمہیں سکھا کر جاؤں گا ڈرائیونگ، ٹینشن کیوں لے رہی ہو۔“ ارصم غلط سمجھا تھا۔

”میں اس لیے نہیں رو رہی ہوں۔۔۔“ اس نے بازو کی بات سے آنکھوں کو گرزا۔  
 ”تو۔۔۔؟“ وہ حیران ہوا۔

”تم یہاں اسلام آباد یا ہنڈی سے بھی تو کر سکتے ہو میڈیکل۔“ اس کی بات بروہ ایک دم ہنس پڑا۔

”مالی گاؤں۔ تم قسبی بے وقوف ہو اور یہاں۔۔۔ میں تو سمجھا۔“ اس نے مسکرا کر بات اور صوری چھوڑی۔

”تم ہمیشہ مجھے غلط سمجھتے ہو۔“ اس کے غلط الزام پر وہ ہلکا سا گڑبڑایا۔

”لیکن اس میں روسنے کی کیا بات ہے؟“ وہ سنبھل کر گویا ہوا۔

”تمہیں معلوم ہے، پورے پاکستان میں تمہارے علاوہ کوئی اور میرا دوست نہیں ہے۔“ اس کا جتنا ہوا انداز ارصم کو مسکراتے پر مجبور کر گیا۔

”اسی لیے تو کہتا ہوں کہ تم اپنی کلاس میں اچھی اچھی لڑکیوں سے فریڈ نہ کر لو۔“ اس نے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے مفت مشورہ دیا۔

”لڑکیاں کبھی بھی اچھی دوست نہیں ہوتیں۔“ اور یہ ا کے اپنے نظریات تھے۔

”اور پاکستان میں لڑکوں سے دوستی کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔“ ارصم نے سنجیدگی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”مجھے معلوم ہے۔“ وہ بڑا سامنے بناتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔

”تمہارا رزلٹ آرہا ہے کل۔“ ارصم کی اطلاع پر اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

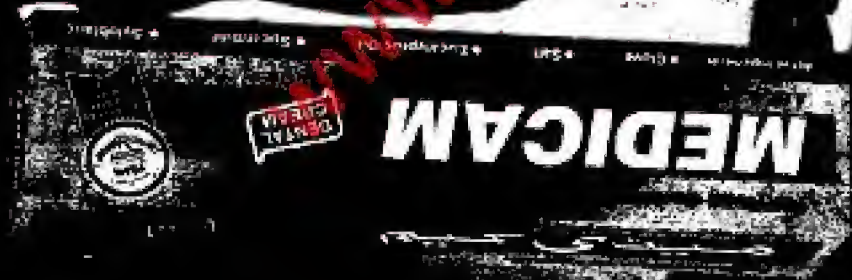
Dentist's Recommendation

# THE PROBLEM SOLUTION

MEDICAM

MEDICAM

میڈی کیم ڈینٹل کریم جیسے۔۔۔ دانتوں کی لائف ٹائم انشورنس۔





”پھر ایف ایس سی میں ایڈمیشن لوگی ناں۔؟“

ارصم نے اسے چھیڑا۔

”نفرت ہے مجھے میڈیکل سے۔۔۔“ وہ جز کر بولی۔

”اوں ہوں۔ ایسے نہیں کہتے، بلکہ اچھی بات ہے

ناں، تم بھی میرٹ بنا کر اسی کالج میں آجانا، جہاں میں

تمہارا سینئر ہوں گا۔“ ارصم کے مشورے پر وہ بے

ساختہ خوش ہوئی، لیکن اگلے ہی لمحے اس کا سارا جوش

جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

”میرا تو مر کر بھی میرٹ نہیں بنے گا۔“ وہ اپنے

بارے میں کافی خود آگاہ تھی۔ ارصم نے اس بات پر

کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ دونوں لمبی واک کر کے گھر پہنچے

تو ارصم اپنے پورشن کی طرف بڑھ گیا، جبکہ وہ اپنے

لاؤنج میں داخل ہوئی۔ بڑی اماں کے ساتھ بڑے لبا کو

وہاں بیٹھ دیکھ کر اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے

رہ گیا۔ اسے دیکھتے ہی بڑی اماں کو لچا تک یاد آیا۔

”تمہاری رات طبیعت خراب تھی کیا؟“ بڑی اماں

نے جانچتی نگاہوں سے اپنی پوتی کو دیکھا، جو کہیں سے

بھی بیمار نہیں لگ رہی تھی۔

”نہیں۔“ اس نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔

”پھر سات سمندر پار بیٹھے تمہارے باپ کو کیا کوئی

خواب آیا تھا؟“ بڑی اماں نے ناراض نگاہوں سے

اس کا جائزہ لیا تو اوپر اُلو ایک دم ہی یاد آگیا۔

”وہ۔۔۔“ اس نے لپسا ”وہ“ اُلو کیا تو بڑی اماں کو

ایک لمحے میں احساس ہو گیا کہ یہ آگ واقعی ان کی اسی

پوتی کی نگالی ہوئی ہے۔ وہ تب ہی کہیں۔

”وہ تو رات ہلکا سا کام تھا، مجھے اب پلاسے بات کر

رہی تھی میں۔۔۔“ اس نے شرمندگی سے وضاحت

کی۔

”ہزار دفعہ سمجھایا ہے ایسی باتیں مت بتایا کرو اسے

تمہیں تو ہلکا سا کام تھا اسے پریشانی سے وہاں بیٹھ کر

بخار ہونے لگتا ہے۔“ بڑی اماں نے بیزارگی سے سر

جھکا تو اوپر اٹھیک ٹھاک شرمندہ ہو گئی۔

”اب گو تم بدھ بن کر کھڑے ہونے کی ضرورت

نہیں، وہ کچن میں رکھا میٹھی سویوں کا باؤل ارصم کو

دے کر آؤ۔“ وہ جلدی سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

”بڑے بابا، پاپا سے کیوں خفا ہیں اتنا۔۔۔“ بڑا سالان

عبور کرتے ہوئے وہ یہی بات سوچتی ہوئی ارصم کے

پورشن کی طرف بڑھی، جیسے ہی اس نے لاؤنج کا دروازہ

کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا، آنٹی بیشش کی تیز اور تلخ

آواز نے اس کے قدم روک لیے۔

”آغا جی، تیمور کی بیٹی مر مر کر بی گریڈ بھی لے لے تو

بڑی بات ہے۔ آپ میڈیکل میں جانے کی بات کر

رہے ہیں۔“ آنٹی بیشش کا سگلا لہجہ اور یہ اسے بغور سنا

تھا۔ وہ ٹھٹھک کر وہیں رک گئی۔

”مجھے تو لگتا ہے اس دفعہ کہیں ایک آدھ کپارٹ

ہی نہ آجائے اس کی۔“ وہ طنزیہ لہجے میں گویا ہوئیں۔

”اب اتنی بھی ٹالاق نہیں ہے وہ۔“ آغا جی ہمیشہ

غیر جانبدار ہو کر بات کرتے تھے۔

”آپ کو نہیں پتا شکل تو باب کی لے لی ذہانت میں

پوری ماں پر ہے۔ اسی کی طرح زفر اور ٹالاق۔“ وہ

استہزائیہ انداز میں نہیں۔ ان کی بیٹی کی آواز نے

اور یہ اکو شرمندگی کے عمیق گڑھے میں اور دھم منہ

گرایا تھا۔ وہ اندر جانے کی ہمت نہیں کر سکی۔ سن

ہوتے ہوئے دماغ کے ساتھ وہ کچھ دیر تو لان چائیر

میں بیٹھی رہی اور پھر کچھ سوچ کر اس کے قدم سروٹ

کو اوپر کی طرف اٹھ گئے۔ وہ آنٹی بیشش کی کڑوی باتیں

سن کر میٹھی ستیاں اندر لے جانے کی ہمت نہیں کر

سکتی تھی۔

اس لیے چوکیدار کے خاندان پر یہ عنایت کر کے

خود آکر اپنے بیڈ روم میں بیٹھ گئی۔ وہ اب دل ہی دل

میں دعا کر رہی تھی کہ اللہ کرے بڑی اماں ارصم سے

سویوں کا نہ پوچھ لیں، ورنہ اس کی شامت بیٹنی تھی۔



”اوہ نو۔۔۔ مجھے یقین نہیں آ رہا۔“ شانزے

پھو ڈاریر سے اپنے بال خشک کرتے ہوئے پرجوش

انداز سے بولی۔

”اس میں یقین نہ کرنے والی کیا بات ہے۔“ رباب



نے سادگی سے شانزے کا خوش و خرم چہرہ دکھا تو اسے احساس ہوا۔ خوشی کے رنگ غام سے چہرے کو بھی کتنا خوب صورت بنا دیتے ہیں یہ تو شانزے کا حسین چہرہ تھا جو اس وقت لاکھیں مار رہا تھا۔

”جب ارسل صاحب نے مجھے کال کی اور بسکٹ کے ایڈ کا بتایا تو سچ پوچھو میں کئی لمحے تک بول ہی نہیں سکی۔“ وہ ایک دفعہ پھر شروع ہو چکی تھی۔ آج اسے کسی کے ریفرنس سے ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی کی طرف سے کال آئی تھی اور پچھلے دو گھنٹوں سے اس کی تیاریاں جاری تھیں۔

”اچھا اچھا زیادہ خوش نہیں ہوتے، کبھی کبھار انسان کو اپنی ہی نظر لگ جاتی ہے۔“ رباب نے اسے ٹوکا۔

”تم دیکھنا رباب اس ایڈ کے بعد میرے پاس کام کا ڈھیر لگ جائے گا۔“ وہ اپنی ہی دھن میں مستقبل کے خوشنما خواب دن میں دیکھ رہی تھی۔

”ان شاء اللہ۔“ رباب نے غلو ص دل سے کہا۔  
”فیشن شو والے دن بھی مجھے کسی ماڈل گرل کی ہی ویسی نظر لگی ہوگی، ورنہ میں تو اس سے بھی بڑی ٹیل پین کو بڑے آرام سے چل سکتی ہوں۔“ شانزے نے بڑی مہارت سے شس آن لگاتے ہوئے رباب کی بات کو آگے بڑھایا۔

”اسی لیے تو کستی ہوں چاروں قل پڑھ کر اپنے اوپر پھونک مار لیا کرو۔“ رباب نے پاس ہر چیز کا روحانی علاج موجود تھا۔

”سچ پوچھو تو بار بار! چار قل میں سے صرف تین آتے ہیں مجھے۔“ وہ ہلکی سی شرمندگی سے مسکارتے ہوئے ڈھکن کھول رہی تھی۔

”کسی دن ٹائم نکال کر یاد کر لو ناں۔۔۔“ رباب نے اس کی پھیلائی ہوئی چیزیں سمیٹنا شروع کر دیں۔

”یار بہت مشکل ہیں تم ہی پڑھ کر پھونک دیا کرو ناں، آخر روم سیٹ ہو تم میری۔“ شانزے کا موڈ آج خاصا خوشگوار تھا۔

”اچھا اچھا ٹھیک ہے۔“ رباب نے گیلا تولیہ واش

روم کے اسٹینڈ پر رکھا۔

”میں کیسی لگ رہی ہوں۔“ شانزے کی تسلی نہیں ہو پا رہی تھی، سفید سیٹ کی میکسی میں وہ ہلکے میک اپ کے ساتھ خاصی دلکش لگ رہی تھی۔

”ماشاء اللہ۔۔۔ ایسا لگتا ہے چاند زمین پر اتر آیا ہو۔“ رباب نے کھلے دل سے اسے سراہا۔ وہ مسکرا کر اپنے ہائی ہیل سینڈل پہننے لگی، نازک پیوں والے سفید سینڈل میں اس کے خوب صورت پیروں پر نظر نہیں سر رہی تھی۔ اس نے بلیڈ ریڈ کلر کی ہیل پالش اپنے لمبے لمبے ناخنوں پر لگا رکھی تھی۔

”دیکھ کر نا۔“ اس نے اپنا سفید موتیوں والا کچھ اٹھاتے ہوئے رباب سے درخواست کی۔

”دھیان سے جانا۔“ رباب نے فکر مند انداز میں اسے نصیحت کی۔

”تم کیوں اتنا پریشان ہو رہی ہو؟“ وہ جاتے جاتے پٹی اور خوشگوار انداز سے مسکرائی۔

”میرا خیال ہے گیٹ کپڑے کدہ کی کیسی گیٹ پر متگلو۔“ رباب اس کے لیے ایسی ہی کیڑک بگ تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر فکر مند ہونے والی۔

”اے رہنے دو یار، خواجواہ سات آٹھ سو مانگ لے گا، میں مین روڈ سے بے لوں گی۔“ اس نے لاپرواہی سے کہے ہوئے ایک دفعہ پھر دوبارہ پر فکس ہونے سے باز نہ آئے شیشے میں اپنا عکس دیکھا۔ وہ اب کھل کر کسی فلاح کی طرح مسکرا رہی تھی۔

شانزے جیسے ہی اپنے روم سے نکلی، گوریڈور سے گزرتی لڑکیوں نے ٹھنک کر اسے دیکھا۔ لڑکیوں کی توصیفی نگاہیں اس کے لیے نئی نہیں تھیں۔ وہ اس وقت خود کو خاصا انرجیٹک محسوس کر رہی تھی۔

”کس کے پل پر بجلیاں گرانے جا رہی ہو۔؟“ سوسائٹی کی اقصیٰ نے اسے شرارت سے چھیڑا۔ ویسے ہی اس کے تعلقات شانزے کے ساتھ بہتر تھے۔ ورنہ کسی اور کو ایسا بے تکلفانہ تہنو کرنے کی اجازت کم از کم شانزے نہیں دے سکتی تھی۔

”ابھی تو ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی والوں نے بلایا



ہے مجھے۔“ اس نے بڑی ادا سے اپنے ہاتھوں کو جھٹکا دیا۔

وہ صوفے پر دونوں پاؤں اوپر رکھے دھواں دھار انداز میں رونے میں مصروف تھی۔ ارصم کو دیکھتے ہی آنسوؤں میں ایک دم ہی روانی آگئی۔

”لو آگیا تمہارا ہمدرد۔“ بڑی اماں نے ارصم کو دیکھ کر سکون کا سانس لیا۔

”تم ہی سمجھاؤ اسے، میرا تو بول بول کر منہ دکھنے لگا ہے۔“ بڑی اماں اس کے مسلسل رونے پر خاصی کوفت کا شکار تھیں۔

”اور یہ اکیلا پر اہم ہے، یاس تو ہو گئی ہو۔۔۔؟“ وہ اس کے پاس بیٹھ کر ہمدردی سے گویا ہوا۔

”ہو نہ ہی گریڈ میں۔۔۔“ وہ روتے روتے تلخ انداز میں بولی۔

”تو محنت کرتی تھی ناں۔۔۔“ بڑی اماں بھی زخموں پر نمک چھڑکنے میں باہر تھیں۔

”کیا محنت کرتی؟“ وہ جھنجھلا کر کھڑی ہوئی۔ ”ماما کی ڈنٹھ کے بعد میں نے نائنٹھ کے پیپرز بغیر تیاری کے دیے تھے۔“

”تو اب تو پورا سال تھانیں تمہارے پاس اس سال محنت کر لیتیں۔“ بڑی اماں نے منہ بنا کر پاس رکھا۔

باداموں کا چار کھولا اور دو تین بادام منہ میں ڈالے۔ اس وقت ان کا دماغ بری طرح چکرار رہا تھا۔

”آپ سب لوگوں کی بددعاؤں سے ہی میرا سی گریڈ آیا ہے۔“ وہ ہمیشہ کی طرح بغیر سوچے سمجھے بولی تو بڑی اماں کو نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسی آگئی۔

اسی وقت بڑے ابا اپنی طبیعتی بینش کے ساتھ ہاسپٹل سے گھر پہنچے، وہ دونوں لاؤنج میں داخل ہو رہے تھے۔ ارصم نے انہیں دیکھ لیا تھا جبکہ اورید اور بڑی اماں کی ان کی جانب پشت تھی اس لیے انہیں ان کی آمد کا احساس نہیں ہوا۔

”اچھا۔۔۔؟ کس نے وی تمہیں ایسی بددعا؟“ بڑی اماں نے محض مزالینے کے لیے پوچھا۔

”آئی بیلا اور بڑے ابا نے۔۔۔“ اس نے ترخ کر جواب دیا۔ لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے ابا اور ڈاکٹر

”یار جس لڈ میں اتنی آفت ماڈل ہو گی، وہ چیز تو لوگ ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔“ انصی کے توصیفی جملے نے اس کا سیروں خون برہا دیا۔

گیٹ تک اس نے بہت سے کمشنس اپنا حق سمجھ کر وصول کیے تھے۔ وہ اب ہوسٹل سے نکل کر مین روڈ کی طرف جا رہی تھی۔ روڈ پر خاصا رش تھا۔ وہ بڑے سنبھل سنبھل کر قدم اٹھا رہی تھی۔

اچانک دو سنبھلے لڑکے بائیک پر ون ویلنگ کرتے ہوئے ایک گلی سے نمودار ہوئے۔ شانزے ڈر کر ہلکا سا پیچھے ہٹی۔ وہ دونوں اب گول گول دائروں کی صورت میں شانزے کے گرد چکر لگا رہے تھے۔

شانزے اس وقت کسی خوفزدہ ہٹی کی طرح ان دونوں شرارتی لڑکوں کو دیکھ رہی تھی۔ جو اس کے ڈرنے پر خوش ہو رہے تھے۔ شانزے کا دل بری طرح سے دھڑک رہا تھا۔

اچانک سائیڈ گلی سے ایک گاڑی بڑی تیزی سے برآمد ہوئی اور ایک موٹر سائیکل والا اس کی زد میں آیا۔

وہ موٹر سائیکل سمیت اچھل کر سڑک پر دو سری جانب

اور اس کی موٹر سائیکل بے قابو ہو کر سڑک پر موجود شانزے کے ٹکرائی اور اسے لگا جیسے کسی نے

گرم گرم سلاخ اس کے جسم میں گھسادی ہو۔ وہ پشت کے بل زمین پر گری۔ اس کا ہاتھ چھٹ چکا تھا اور ماتھے سے نکلنے والا خون سڑک پر پھیلتا جا رہا تھا۔ شانزے کو

ایک دفعہ پھر بازی اپنے ہاتھ سے نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

\*\*\*

”کہا تھا میں محنت کر لو اب رونے کا کیا فائدہ۔؟“ ارصم نے جیسے ہی ٹی وی لاؤنج میں قدم رکھا، حسب توقع سامنے وہی منظر تھا جس کی امید لے کر وہ اپنے پورشن سے نکلا تھا۔ اورید اکامیٹرک کارڈلٹ آچکا



بیش کو جھٹکا ہی تو لگا تھا۔

”وہ لوگ ہی چاہتے تھے میں قیل ہو جاؤں۔“

اوریدہ کی بات بڑے ابا کا سا کھنکھارے اوریدہ نے جیسے ہی مڑ کر دیکھا۔ وہ بالکل پتھر کی ہو گئی تھی۔ بیش آٹنی نے کھا جانے والی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اوریدہ کا چہرہ فق ہو گیا۔ بڑے ابا ایک سردی نگاہ اس پر ڈال کر اپنے کمرے کی طرف برہہ گئے۔

”اسلام علیکم۔“ ڈاکٹر بیش کی آواز پر بڑی اماں بھی گڑبڑا سی گئیں۔ وہ خفا نگاہوں سے اوریدہ کو گھور رہی تھیں جو جو اس بانٹ سے انداز سے کھڑی تھی۔

”اوریدہ! تم جاؤ اندر۔۔۔ بڑی اماں نے سب سے پہلے مجرم کو منظر عام سے ہٹانے کی کوشش کی۔

”تالی اماں! اپنی پوتی کو بتا دیجئے گا میرے پاس بد دعاؤں کا اتنا فالتو اشاک نہیں ہے جو میں ایروں غیروں پر لٹاتی پھروں۔“ ڈاکٹر بیش ٹھیک ٹھاک برا مان چکی تھیں اور اس کا اظہار ان کے سروں سے ہو رہا تھا۔

”ارے یہ تو بچی ہے! اسے کیا پتا۔۔۔ بڑی اماں نے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

”ہونہ بچی۔“ وہ استہزائیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی ہوئی بڑے ابا کی اسٹڈی کی طرف برہہ گئیں۔

”ار صم! کیا ہو گا۔؟“ وہ خوف زدہ لہجے میں اس سے کوئی پانچوں بار پوچھ چکی تھی۔ دونوں اس وقت لان کی طرف نکل آئے تھے اور یونہی چہل قدمی کر رہے تھے۔ اوریدہ کو اپنا رزلٹ بھول کر اب نئی پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔

”کچھ بھی نہیں ہو گا ڈونٹ دوری۔“ ار صم ہر قسم کے حالات میں پرسکون رہتا تھا۔

”آٹنی بیش تو سخت ناراض ہو چکی ہیں مجھ سے۔“

”وہ تم سے خوش ہی کب تھیں۔“ ار صم نے اس کا مذاق اڑایا تو وہ فوراً ہی شفق ہو گئی۔ ”ہاں کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔“

”انگل تیمور کو بتایا تم نے اپنے رزلٹ کا۔؟“

ار صم نے اس کا دھیان ہٹانے کو خاصا غلط سوال پوچھ لیا تھا۔ اوریدہ کی آنکھیں پھر آنسوؤں سے بھر گئیں۔

”مجھے لگتا ہے تم نے اپنی آنکھوں کے پیچھے کوئی نیوب ویل لگا رکھا ہے جو ہر وقت چلتا رہتا ہے۔“ وہ ہلکا سا چڑ کر بولا۔

”تمہیں اتنی باتیں سننی پڑیں تو پھرتا چلے ٹاں۔“ وہ جتنی جلدی پڑتا شروع کرتی تھی اتنی ہی جلدی چپ بھی کر جاتی تھی۔ ”پاپا نے ٹھیک ٹھاک سنائی ہیں مجھے۔ بہت زیادہ ہرٹ ہوئے ہیں وہ میرے سی کریڈ سے۔“

”چلو ایف ایس سی میں ان کے ٹھکے دور کرو تا۔“ ار صم نے اپنے پھلکے انداز سے کہا، وہ دونوں گیٹ کھول کر باہر نکل آئے۔ اب لمبی سڑک پر واک کرنے لگے۔ سڑک بالکل سناں تھی۔

”مجھے ایف ایس سی نہیں کرنی۔ میں فائن آرٹس پڑھوں گی اب۔“ وہ ارادہ کر چکی تھی، ار صم ایک لمحے کو چپ ہوا اور پھر اس کے ساتھ چلنے لگا۔

”میرے کہنے پر بھی نہیں کرو گی۔؟“ ار صم کی بات پر اس کے قدم سست ہوئے۔ وہ چلتے چلتے رک گئی۔ اس نے چونک کر ار صم کی طرف دیکھا۔ شاہ بلوط کے درختوں پر اترتی شام بڑے دل سے مسکرائی۔ وہ اپنے دونوں بازو سینے پر باندھے بڑے مزے سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اوریدہ کا دل عجیب سی لے میں دھڑکا۔

”چلو ٹھیک ہے اگر فائن آرٹس میں کرنا چاہتی ہو تو اسی میں کر لو۔“ وہ زیادہ دیر تک کسی کو اپنے لیے امتحان میں نہیں ڈال سکتا تھا، یہ تو اس کے سامنے اوریدہ تھی جس کی پڑھائی سے دلچسپی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اگر تیمور کا ڈر اور ار صم کی محنت نہ ہوتی تو شاید وہ اپنی ماں کی اچانک وفات کے بعد کبھی بھی نہیں بڑھ سکتی تھی۔

”نہیں۔۔۔ میں سوچوں گی۔“ ار صم کو وہ بھی دو ٹوک انداز میں انکار نہیں کر سکتی تھی۔

”میرا خیال ہے گھر چلنا چاہیے کانی دیر ہو گئی۔“ وہ چلے چلے کانی دور نکل آئے تھے۔

\*\*\*



اگلا پورا ہفتہ وہ آنٹی بینش اور بڑے ابا سے دانستہ چھپتی رہی، لیکن دس دن کے بعد آنٹی بیا سے اس کا سامنا ہو ہی گیا۔ ناشتے کی میز پر وہ بڑی اماں اور بڑے ابا کے ساتھ موجود تھی، جب آنٹی بینش بڑے پر جوش انداز میں ڈانٹنگ روم میں داخل ہوئیں۔

”بڑے ابا، مبارک ہو، ارصم نے ایف ایس سی میں ٹاپ کیا ہے۔“ آنٹی بینش نے یہ اطلاع تو سب کو دی تھی، لیکن ان کا جتنا ہوا لہجہ اور طنزیہ نگاہوں سے اورید اکو کھنا بڑی اماں نے بطور خاص نوٹ کیا۔

”ماشاء اللہ بہت بہت مبارک ہو، ارصم مجھے بھی بھی مایوس نہیں کرتا، بہت جہنمیں ہے وہ۔“ اورید ا نے پہلی دفعہ بڑے ابا کو اتنا خوش دیکھا تھا۔

”ظاہر ہے بڑے ابا ایسا کس کا ہے۔“ آنٹی بینش کے لہجے میں پچھلی خود برائی اورید ا کے لیے نئی تھی۔ ”تو پھر کب کر رہی ہو سلیویشن۔؟“ بڑے ابا، آنٹی بینش کے ساتھ باتیں کرتے کرتے ڈانٹنگ روم سے نکل گئے۔

”یہ تو پہلے ہی کسی کو جینے نہیں دیتی تھیں اب تو“ بوا رحمت چائے کا فلاسک لاتے ہوئے بیٹاری پر رواں ہیں۔

”آنٹی اپنی قسمت کی بات ہے بوا، اور نہ ٹاپ تو میری طبیعت نے بھی کھاتا تھا۔“ بڑی اماں نے رنجیدہ سے انداز سے آہ بھری۔ ”جب بھی جلال صاحب اتنا خوش نہیں ہوئے تھے جتنا بینش کی اولاد کے لیے ہو رہے ہیں۔“ ”ساری زندگی بیٹی سے فرحت ملتی تو کسی اور کی طرف دیکھتے۔“ بوا رحمت سارے خاندانی رازوں سے واقف تھیں۔

”پاپا، ارصم نے بورڈ میں ٹاپ کیا ہے، میں نے جھٹ سے باپ کو فون ملایا اور بڑے پر جوش انداز سے اطلاع دی۔“

”کاش کہ ایسی کوئی نیوز تم مجھے اپنے حوالے سے دیتیں تو مجھے بھی خوش ہونے کا موقع ملتا۔“ دوسری جانب تیمور نے خاصا جمل کر کہا۔ اورید ا پر گھڑول پانی پڑ گیا۔

”تمہارے اس ”سی“ گریڈ نے مجھے بڑے ابا کے سامنے جتنا ”ڈی“ گریڈ کیا ہے تم اس ذلت کا احساس نہیں کر سکتیں۔ بہت مایوس کیا ہے تم نے مجھے اورید ا! وہ فون بند کر چکے تھے۔ ارصم کے اچھے رزلٹ نے ان کے سارے زخم ہرے کر دیے تھے، ان کی بہت خواہش تھی کہ اورید ا ان کی طرح آؤٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹ ہوتی، لیکن اورید ا نے ان کے بیٹے ماہیر کے مقابلے میں ہمیشہ انہیں مایوس ہی کیا تھا۔

”میرے اتنے اچھے رزلٹ کی گلتا ہے تمہیں بالکل خوشی نہیں ہوئی۔“ وہ اس شام ارصم کے ساتھ سال ریسٹورنٹ میں تھی۔ ارصم اسے بڑی اماں سے اجازت لے کر اسپیشل ڈنر کروانے لایا تھا۔ وہ کچھ چپ چپ سی تھی۔

”ایسی تو دلکی بات نہیں۔“ وہ پھیکے سے انداز سے مسکرائی۔

”پھر ایسے من بنا کر کیوں بیٹھی ہو۔؟“ ارصم نے دونوں کھنیاں میز پر رکھ کر اس کی طرف غور سے دیکھا، وہ کچھ بزل ہوئی۔

”ایسے ہی پاپا کی باتیں بار بار ذہن میں آ رہی تھیں۔“ اس کی سوتلی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ ”ایک بات پوچھوں ارصم۔؟“

”ماں ضرور۔“ اس نے مسکراتے ہوئے اورید ا کو دیکھا جس کے چہرے پر افسردگی صاف جھلک رہی تھی۔

”ارصم! کیا بھی میری بھی پوزیشن آسکتی ہے۔“ وہ خفت زدہ انداز سے اٹک اٹک کر بولی۔

”ہاں کیوں نہیں، اگر تم محنت کرو تو۔“ وہ اسے کبھی بھی مایوس نہیں کرتا تھا۔

”ہائے ارصم۔۔۔ باؤ آ رہو۔“ شوخ و چیخ سی دو لڑکیاں اچانک ہی کسی ٹیبل سے اٹھ کر ان کے پاس پہنچیں۔ ارصم انہیں دیکھ کر کھل کر مسکرایا۔

”ہائے زرتش! ایسی ہو؟ سیٹ مالی کزن اورید ا۔“ شاکنگ پنک جینز پر بے بی پنک ٹاپ میں ملبوس اس باربل ڈول ٹائپ لڑکی نے بڑی نزاکت سے اپنا ہاتھ

اوریدا کی طرف بڑھایا۔ اس کے چہرے پر موجود  
دستانہ مسکراہٹ کم از کم اوریدا کو اچھی نہیں لگی  
تھی۔

”اوریدا! یہ زرش آفاق ہے“ اس نے بورڈ میں  
سیکنڈ پوزیشن لی ہے۔ ”ارصم کے پر جوش انداز پر وہ  
زبردستی مسکرائی۔

”بہت تیز ہو تم ارصم! ہر دفعہ مجھے زخم لگاتے ہو“  
اب میڈیکل میں دیکھوں گی کیسے مجھ سے آگے بڑھتے  
ہو۔ ”وہ بے تکلفی سے ارصم سے مخاطب ہوئی۔

”تم ایک دفعہ کہہ کر تو دیکھو میں خود ہی رضا کارانہ  
طور پر اپنی پوزیشن سے دست بردار ہو جاؤں گا۔“  
ارصم کے شوخ لمبے پردہ کھلکھلا کر نہیں۔ اس کی ہنسی  
کی پھوار اوریدا کے دل پر کسی گرم پانی کے آبشار کی  
طرح برسی اور پورا دل ہی جلا گئی۔

”کہاں ایڈمیشن لے رہے ہو۔“ اس نے بے  
تابی سے پوچھا۔

”تم کہاں لوگی۔۔۔“ وہ بھی مکمل طور پر زرش کی  
طرف متوجہ تھا۔

”تمہیں پتا تو ہے اسکول کالج ہر جگہ ہم دونوں  
بیکٹ ساتھ رہے ہیں اب پھر ہمیشہ کی طرح جہاں تم  
وہاں ہم۔“ وہ خاصے پُر اعتماد انداز سے گویا ہوئی۔

”اس کا مطلب ہے اگلے پانچ سال پھر تم سے جان  
نہیں چھوٹے گی۔“ ان دونوں کی چھیڑ چھاڑ اوریدا کے  
لیے خاصی بے چینی کا باعث بن رہی تھی۔ وہ ہنسی  
سے سامنے پہاڑوں پر آخری شام کو دیکھنے لگی جو اس  
سے پہلے اسے اتنی بری کبھی نہیں لگی تھی۔

”ماشاء اللہ بہت برہنٹ اسٹوڈنٹ بھی یہ۔“ اس  
کے جانے کے بعد ارصم نے توصیفی لمبے میں بسمو کیا  
جو کم از کم اوریدا کو زبردست لگا تھا۔

”لگ تو نہیں رہا۔“ اوریدا نے برا سامنے بنایا۔  
”ارے نہیں نہیں۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے“

بہت اچھی اسٹوڈنٹ اور بہت زبردست ڈیپتھو رہی ہے  
زرش۔ ”ارصم لا پرواہی سے فرائینڈ رائس اپنی پلیٹ  
میں نکالتے ہوئے اسے یسین دلا رہا تھا۔

”تمہاری فرینڈ ہے کیا؟“ اوریدا اکا انداز خاصا عجیب  
تھا۔

”ہاں یہی سمجھ لو۔“ وہ رشین سلا دانہی پلیٹ میں  
ڈالتے ہوئے اس کی ساری بھوک اڑا چکا تھا۔

”گمرل فرینڈ۔؟“ اس کے سوال پر وہ پہلی دفعہ  
چونکا اور حیرانگی سے اپنی کزن کا بے زار سا چہرہ دیکھا۔  
اسے پہلی دفعہ کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا۔

”اوریدا! یہ پاکستان ہے یہاں گرل فرینڈز نہیں  
ہوتیں۔۔۔“ وہ سنبھل کر بولا۔ ”تم کھانا کیوں نہیں کھا  
رہی ہو؟“

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ اوریدا کے سپاٹ لمبے  
نے حیران کم اور پریشان زیادہ کیا۔

”کوئی بات بری لگی ہے تمہیں؟“ وہ ہاتھ میں پکڑا  
چمچ پلیٹ میں رکھ کر اب پریشان نظروں سے اسے دیکھ  
رہا تھا۔

”میں تو سمجھتی تھی میں ہی تمہاری فرینڈ ہوں۔“  
اس نے شکایتی نگاہوں سے اپنے سامنے بیٹھے ارصم کو  
دیکھا۔

”تم میری فرینڈ اور کزن بھی تو ہو۔“ وہ مختلط انداز  
سے گویا ہوا۔ سامنے بیٹھی لڑکی کی حساسیت اسے اکثر  
انتخان میں ڈال دیتی۔

”تم اس کے والے میڈیکل کالج میں ایڈمیشن مت  
لینا۔“ اس کی عجیب و غریب قرعائش پر وہ بوکھلا گیا۔ اس  
نے ابھی تک کھانا بھی پلیٹ میں نہیں نکالا تھا اور  
دو ٹھے روٹھے انداز سے بیٹھی تھی۔

”اوریدا! کوئی پرائیم سے تمہارے ساتھ؟“ وہ اب  
سنجیدگی سے اس کا چہرہ بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میں تو ویسے ہی کہہ رہی تھی مجھے اچھی نہیں لگی  
یہ لڑکی۔“ اوریدا نے خود کو سنبھالتے ہوئے دانستہ لا پرواہ  
انداز اپنایا۔

”وہ بہت اچھی لڑکی ہے اوریدا! تم غلط سمجھ رہی ہو۔“  
وہ ہلکا سا جھنجھلا یا اوریدا ہاتھ میں پکڑا چمچ پلیٹ میں  
بیچ کر غصے سے کھڑی ہو گئی۔

”کیا ہوا؟“ وہ حیران ہوا۔



”مجھے گھر جانا ہے۔“ اس کا موڈ ٹھیک ٹھاک خراب ہو چکا تھا۔ ارصم کو اس کی یہ حرکت اچھی نہیں لگی۔ میز پر سارا کھانا جوں کا توں بڑا تھا۔ اور یہ انے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ ارصم کو خاصا دکھ ہوا۔ وہ خاموشی سے پارکنگ کی طرف بڑھ گیا۔ بہت اچھے ڈنر کا اختتام خاصے برے طریقے سے ہوا تھا۔



”تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ ہے عدینہ؟“ سائرہ نے اس دن ہوسٹل آتے ہی اس سے پوچھا۔  
 ”کیوں؟ کیا ہوا؟“ گھر جانے کے لیے پکینگ کرتے ہوئے وہ چونکی اور اپنی روم میٹ کو دیکھا، جو اپنا سفید اور آل تمہ کر کے ڈسٹر میں لٹکا رہی تھی۔  
 ”تمہاری آج کی پرفیمنیشن بھی سوسو تھی اور کل اناٹومی کے ٹیسٹ میں بھی تم نے نمبر اچھے نہیں لیے۔ پروفیسر رضی سخت حیران ہو رہے تھے، انہیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا یہ تمہارا ٹیسٹ ہے۔“ سائرہ اس کے پاس آکر ہمدردی سے بولی۔

”پتا نہیں کیوں، آج کل اسٹڈی میں دل نہیں لگ رہا میرا۔“ اس نے صاف گولی سے کہا اور اپنے بیک کی جانب ہونٹ کی ایک اینڈ کی وجہ سے وہ گھر جا رہی تھی۔  
 ”گھر میں کوئی پرابلم تو نہیں ہے؟“ سائرہ پریشان ہوئی۔

”شاید ہے بھی اور نہیں بھی۔“ وہ خود بُری طرح ابھی ہوئی اب اپنا عبا باندھ رہی تھی۔

”ڈونٹ وری، اللہ بہتر کرے گا۔“ سائرہ نے اسے دلاسا دیا، اسے معلوم تھا عدینہ اپنے دل کی بات بہت کم شیئر کرتی ہے، اس لیے اس نے اصرار نہیں کیا۔ اس دن وہ ویک اینڈ پر گھر آئی تو نور سے ماحول میں عجیب سی افسردگی پھلی ہوئی تھی۔ گھر کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ وہ اپنا ٹرائل بیک تھینتی ہوئی صحن میں داخل ہوئی۔ ہر طرف جاسن اور کیکر کے درختوں کے پتے بکھرے ہوئے تھے۔ مونہ نے آج شاید مدر سے کی بچیوں سے صفائی نہیں کروائی تھی۔ سامنے برآمدے میں بڑی بڑی

چھین ڈلی ہوئی تھیں جو آپا صالحہ نے خصوصی طور پر ملتان سے منگوائی تھیں۔ وہ جیسے ہی برآمدے میں داخل ہوئی سامنے بے بے کے ساتھ عبداللہ کی بوڑھی والدہ کو دیکھ کر ٹھنک گئی اور بوکھلا کر سلام کیا۔  
 ”کیسی ہے دھی رانی۔“ عبداللہ کی والدہ نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر پیار دیا۔ انہیں عدینہ سے خصوصی لگاؤ تھا۔

”ٹھیک ہوں خالہ جی۔ آپ کیسی ہیں۔“ اس نے بھی تنجیدگی سے ان کا حال پوچھا اور وہیں جم کر بیٹھ گئی۔ شاید اس دشمن جان کی کوئی اطلاع مل جائے۔  
 ”عبداللہ کب آئے گا واپس؟“ بے بے نے عدینہ کے دل کی بات پوچھ ہی لی تھی۔

”آج تو ان کا گروپ چین جا رہا ہے وہاں سے ہو کر پھر آئیں گے وہ لوگ۔“ اس خبر نے عدینہ کو اداس کیا۔ پچھلے دس دن سے وہ سخت اذیت میں تھی، آپا کے ساتھ اس کی بات چیت نہ ہونے کے برابر تھی۔  
 ”صالحہ کو ناراض کر کے کیا ہے وہ۔“ بے بے نے شکوہ کیا تو اس کی والدہ ایک دم شرمندہ ہو گئیں۔

”کہہ رہا تھا آتے ہی آپا کے پیروں کو ہاتھ لگا کر معافی مانگے گا۔“ عبداللہ کی والدہ نے عدینہ کے ہاتھ میں امید کی ڈور تھمائی، وہ افسردہ سے انداز سے اٹھ کر اندر چلی آئی۔

”مشقی لڑکیوں کی محبتوں کے رنگ بھی عجیب ہوتے ہیں۔ اسے معاشرے کی اخلاقی اقدار و روایات کی بھاری چادر اوڑھنے، وہ محبت جیسا مشکل کام مشکل سے سہی، لیکن کرتی ضرور ہیں۔“ وہ ہیڈ پر لیٹے ہوئے سوچ رہی تھی۔

”آپ کو پتا ہے، آپا عبداللہ بھائی سے کیوں خفا تھیں؟“ مونہا کھانے کی رے لیے اندر چلی آئی، عدینہ نے نفی میں سر ہلایا۔

”انہوں نے عبداللہ بھائی سے کہا تھا کہ آپ سے فوراً شادی کر لیں۔“ مونہا کی بات پر وہ حیران ہوئی، لیکن چپ رہی۔

”جبکہ ان کا کہنا تھا کہ وہ آپ کو میڈیکل کی تعلیم

”ہمیں جن سے محبت ہو۔ ان سے رابطے کے لیے کسی جدید ٹیکنالوجی کی ضرورت نہیں ہوتی، محبت میں سچائی اور خلوص ہو تو دل کا دل سے رابطہ خود بخود ہو جاتا ہے۔ ایک دل کی پریشانی دوسرے دل تک نہ پہنچے تو سمجھو محبت میں کھوٹ نہ سہی، لیکن کچھ نہ کچھ کمی ضرور ہے۔“ عدینہ آنکھیں بند کیے بڑے افسردہ سے انداز سے بول رہی تھی۔

اس وقت دھڑام سے دروازہ کھلا۔ حواس باختہ انداز سے بے پے اندر داخل ہوئیں۔ ان کا بوڑھا وجود کانپ رہا تھا۔ وہ ہراساں نگاہوں سے عدینہ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اسے کسی انمولی کا احساس ہوا۔

”بے بے! کیا ہوا۔؟“ عدینہ بوکھلا کر ان کے پاس پہنچی۔

”عبداللہ مرگیا عدینہ۔“ بے بے نے اس کی سماعتوں میں پھٹکا ہوا صیغہ اندھا ملا۔

”اس کا جنازہ کہیں کر گیا۔“ بے بے کی بات پر عدینہ اور مونا دونوں کو لگا کہ پورا آسمان ہی ان کے سر پر آن گرا ہے۔ وہ دونوں پھٹی پھٹی نگاہوں سے بے بے کو دیکھتی رہ گئیں، جنہوں نے کمرے میں صور ہی تو بھونک دیا تھا۔ اس وقت ہرجیز روٹی کے کالوں کی طرح فضاؤں میں گھومتی نظر آرہی تھی۔ عدینہ کے بے آواز قیامت ہی کا تودن تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

کے دوران ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتے، بس آپنا ناراض ہو گئیں۔“ مونا نے وہ گھٹی آج سلجھا ہی دی۔

”آپ کا مطالبہ بھی تو نامناسب تھا بھلا میں اسٹڈی کے ساتھ کیسے منہج کر سکتی تھی؟“ عدینہ کو ایک دم ہی آپنا غصہ آیا۔

”لیکن عبداللہ بھائی کو بھی تو صاف انکار نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ مونا نے آپنا کی طرف داری کی۔

”آپ نے انکار نہیں کیا ہو گا بلکہ کچھ ٹائم مانگا ہو گا۔“ عدینہ عبداللہ کے مزاج کو سمجھنے کا ایسے ہی تو دعوام نہیں کرتی تھی۔

”ہاں انہوں نے کہا تھا تبلیغی دورے سے آکریات کریں گے۔“ مونا پھیکے سے انداز سے مسکرائی۔

”اور آپنا کی لٹانے اس بات کی اجازت نہیں دی ہو گی، ڈکٹریٹر تو وہ ہمیشہ سے رہی ہیں، کہاں کسی کے منہ سے اپنی بات سے انکار میں سکتی ہیں، اس لیے فوراً“

رشتہ ہی ختم کر دیا ہو گا۔“ اس کا بوجھ بخ ہوا۔

”وہ ساری دنیا کو اپنی اکلوتی اولاد ہی سمجھ لیتی ہیں، جیسے مجھ پر تمام عمر حکمرانی کی، اسی طرح سب پر کرتا چاہتی ہیں۔“ عدینہ نے ناراض سے ٹرے پیچھے کی تو مونا جھنجھلا سی گئی۔

”میں نے اس لیے تو نہیں بتایا تھا کہ آپ کھانا ہی اڑھو راجھو کریں۔“

”چاہ نہیں کہیں آج دل بہت عجیب سا ہے۔ نہ کچھ کھانے کو، نہ کرنے کو اور نہ ہی بولنے کو دل کر رہا ہے۔“ عدینہ خاموشی سے لیٹ گئی۔

”عبداللہ بھائی کی وجہ سے پریشان ہو۔“ مونا نے خاصا درست انداز لگایا تھا۔

”ہوں۔“ عدینہ نے بھی اعتراف کرنے میں عافیت جانی۔

”پریشان مت ہو، اللہ بہتر کرے گا۔“ مونا نے خلوص دل سے دلا سا دیا۔

”ایسا لگتا ہے جیسے کچھ ہونے والا ہے۔“ عدینہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”آپ کو کیسے پتا چل جاتا ہے؟“ مونا حیران ہوئی۔





# راشدہ رفعت

## ہے زندگی کتنی حسین

یہ شہر کا مشہور اور مہنگا ترین اسپتال تھا۔ اس اسپتال کے انتہائی نگہداشت وارڈ کے وی آئی بی روم میں اس وقت وہ مریض زیر علاج تھا جو دو روز قبل اسی اسپتال میں دوسرے مریضوں کا علاج کیا کرتا تھا۔ مریض کا نام ڈاکٹر مصطفیٰ حیات تھا، دو روز قبل وہ معمول کے مطابق اپنے مریضوں کا معائنہ کر رہے تھے جب بے تحاشا گھر کے ساتھ سینے میں بائیں جانب درد اٹھا۔ وہ ڈاکٹر تھے۔ سمجھ گئے دل دغا دینے کی تیاری پکڑ رہا ہے، انہوں نے ساتھی ڈاکٹر کو اپنی کیفیت سے مطلع کیا تھا۔ بے ہوش ہونے سے قبل انہیں آخری خیال اپنے بیوی بچوں کا آیا تھا اور جو نام انہوں نے آخری بار پکارا وہ ان کی شریک حیات عقیقہ کا تھا۔

”اللہ کا شکر ہے ماما، بابا کی حالت اب خطرے سے باہر ہے آپ پلیز گھر جا کر سوسا آرام کر لیں۔ انا بیس نے ماں کے ہاتھ تھام کر انہیں لمبا جت سے مخاطب

مکمل ٹاؤل









حالت سنبھلی ہے۔ وہ دھیرے سے مسکرائے تھے۔  
 ”آپ نے ہم سب کی جان نکال لی تھی مصطفیٰ،  
 عقیفہ سنگ پر دی تھیں۔ مصطفیٰ خاموش نگاہوں سے  
 بیوی کو تنکے رہے۔

”پاپا جان اور مرتضیٰ بھائی کو اطلاع کر دی تھی نا۔“  
 وہ پوچھ رہے تھے۔ عقیفہ نے تڑپ کر انہیں دیکھا گویا  
 کہہ رہی ہوں کہ یہ حق آپ نے مجھے دیا ہی کب۔  
 مصطفیٰ ان کی خاموش زحمتی نگاہوں کی تاب نہ لپائے  
 تھے۔

”میں تم سب کا مجرم ہوں عفی۔“ تم سے معافی  
 مانگے بنا میں مرتا نہیں چاہتا تھا۔ آئی ایم سوری عفی۔“  
 ”پلیز مصطفیٰ! آگے ایک لفظ نہیں، میں آپ کو  
 کیسے بتاؤں کہ آپ میرے لیے کیا ہیں۔“ انہوں نے  
 بے ساختہ شوہر کے ہاتھ لیوں سے لگا لیے تھے اجنبی  
 میں ہی انا ہیہ دروازہ کھول کر اندر آئی تھی۔ اگر مصطفیٰ  
 نے اب بھی آنکھیں موند رہی ہو تیں تو یہ منظر قابل  
 فہم تھا، وہ باپ کے لیے ماں کی دیوانگی کے بہت سے  
 مناظر بچھلے دو دنوں سے متواتر دیکھ رہی تھی لیکن  
 حیرت انگیز بات یہ تھی کہ مصطفیٰ مکمل ہوش و حواس  
 میں تھے اور محبت بھری نگاہوں سے بیوی کو تنک رہے  
 تھے۔

”پاپا۔“ انا یہ ایک کران کے قریب آئی۔ وہ جیسے  
 اب تک اس کی آمد سے لاعلم تھے نکارے جانے پر  
 یکدم چونکے۔ عقیفہ نے بھی جھل سا ہو کر ان کے ہاتھ  
 چھوڑے تھے۔

”پاپا کی جان۔“ مصطفیٰ نے بائیں بیٹی کے لیے وا  
 کر دیں۔ وہ ان کے سینے سے جا چٹی تھی۔  
 ”آپ نے ہم سب کی جان نکال دی تھی پاپا۔“ ان  
 کی بیٹی روتے ہوئے ماں والا فقرہ ہی دہرا رہی تھی۔  
 مصطفیٰ بے ساختہ مسکرائے تھے پھر بیٹی کی پیشانی چوم  
 لی۔

”پاپا نے ساری زندگی ہر کسی کو پریشان ہی کیا ہے  
 بیٹا۔ شاید قدرت نے ایک سلسلہ دے دی کہ جانے

کیا۔“ جب تک مصطفیٰ کو پوری طرح ہوش نہیں آتا،  
 میں کہیں نہیں جا رہی۔“ عقیفہ کا لہجہ نقاہت بھرا تھا  
 لیکن انداز اٹل تھا۔

”پاپا کو ہوش آگیا ہے ماما! اب صرف دواؤں کے  
 زیر اثر غنودگی میں ہیں۔“ اس نے ماں کو سمجھانا چاہا۔  
 ”میں نے کہا نا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم بھائیوں  
 کے پاس گھر چلی جاؤ۔ دونوں پریشان ہو رہے ہوں  
 گے۔“ عقیفہ نے بیٹی کو نرمی سے مخاطب کیا۔

صغریٰ بی ہیں ان کے پاس۔ رات کو بھی وہیں رہی  
 تھیں۔“ اس نے ملازمہ کی بابت بتایا تھا۔ عقیفہ نے  
 ہنکارا بھرا تھا۔ کچھ دیر کے لیے کمرے میں بے نام سی  
 خاموشی چھا گئی تھی۔

”میں خالد انکل سے مل کر آتی ہوں۔ پاپا کی صحت  
 کی کنڈیشن وہی صحیح طور پر رہتا ہے۔ وہ دھیرے سے  
 کبھی ڈاکٹر سے ملنے چلی گئی تھی۔ عقیفہ کی نگاہوں نے  
 پھر سے مصطفیٰ کے چہرے کا طواف شروع کر دیا تھا۔  
 اتنے میں ہی مصطفیٰ ذرا سا کسمسائے تھے۔ عقیفہ  
 ایک کران کے پاس پہنچی تھیں۔ مصطفیٰ نے ذرا کی ذرا  
 آنکھیں کھول کر پاس کھڑی بیوی کو دیکھا۔ پھر دوبارہ  
 آنکھیں موند لیں۔“

”پلیز مصطفیٰ! سلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔ عقیفہ  
 نے ان کے ہاتھ تمام کر جسے التجاسی کی جبکہ آنکھوں  
 سے آنسو گرنا شروع ہو گئے تھے۔

”میں اب ٹھیک ہوں ماما۔“ وہ آنکھیں کھولتے  
 ہوئے نقاہت زدہ لہجے میں بولے تھے۔ عقیفہ نے بے  
 یقینی سے انہیں دیکھا۔ برسوں ہوئے وہ اپنے لیے یہ  
 طرز مخاطب بھول چکی تھیں۔

”انا ہیہ کہاں ہے؟“ مصطفیٰ ان کو سب سے پہلے بیٹی کا  
 ہی خیال آیا تھا۔ بیس اسپتال میں ہی ہے، ڈاکٹر خالد  
 سے ملنے گئی ہے، بلکہ میں بلوائی ہوں خالد بھائی کو تاکہ  
 اگر آپ کا چیک اپ کر لیں۔“

”میں بھی ڈاکٹر ہوں عفی۔ کہہ رہا ہوں نا، اب



سے پہلے اپنی غلطیوں کی تصحیح کر لوں۔“ وہ دھیرے سے بولے پھر عقیقہ کی سمت دیکھا۔  
 ”مر تفتی بھائی کو اطلاع کرو عفی۔ اگر پہلے اطلاع کرویتیں تو یہ کڑا وقت تمہیں ایسے نہ گزارنا پڑتا۔ یہ ایسا وقت تھا کہ تم میری حکم عدولی کر سکتی تھیں۔ عقیقہ کچھ نہ بولی تھیں بس ذرا سا مسکرا کر اثبات میں گردن ہلا دی۔

”سلمان اور سنعان گھر پر ہیں؟“ وہ اب بیٹوں کے متعلق پوچھ رہے تھے۔

”جی ہاں، بہت مشکل سے انہیں گھر روکا ہے“ آنے کی ضد کر رہے تھے۔ ”جواب اتنا یہ نے دیا تھا۔ تب ہی ڈاکٹر خالد اور ڈاکٹر اکبر اندر آئے تھے۔

”مریض بن کر بیڈ پر لیٹے آپ بالکل اچھے نہیں لگ رہے ڈاکٹر صاحب جلدی سے صحت پکڑیں اور بستر کی جان چھوڑیں۔“ ڈاکٹر اکبر نے بشارت سے انہیں مخاطب کیا۔ مصطفیٰ مسکرا دے تھے اتنا یہ دل کی تسلی کے لیے باپ کی صحت یابی کے متعلق دونوں ڈاکٹرز سے چھوٹے چھوٹے سوال پوچھنے لگی۔ جبکہ عقیقہ

لینا میل فون ہاتھ میں لے کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔ انہیں نہ صرف گھر پر موجود بیٹوں کو باپ کی خیریت بتانا ہی بلکہ کہیں اور بھی فون کرنا تھا۔ اس دعا کے ساتھ انہوں نے غم ملایا تھا کہ کہیں اتنے برسوں میں لینڈ لائن کنکشن منقطع نہ ہو گیا ہو۔ نمبران کے دل پر نقش تھا۔ تیس برسوں بعد بھی انہیں نمبر یاد کرنے کے لیے ذہن پر زور نہ دینا پڑا تھا۔ میکا کی طریقے سے ان کی انگلیوں نے نمبر پر لیں کیا تھا۔ دوسری طرف تیل جاری تھی۔ عقیقہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔

تیسری تیل پر فون اٹھا لیا گیا تھا۔ عقیقہ نے کیکپاتی ہوئی آواز میں سلام کیا تھا۔

\*\*\*

”میں غلطی پر تھا بابا جان! اس کا اور اک مجھے برسوں

پہلے ہو گیا تھا، لیکن میری اتنا مجھے خود سے بھی یہ اعتراف کرنے کی اجازت نہ دیتی تھی۔ میں جھک نہ سکا اور آخر کار ٹوٹ گیا۔ میری غلطیوں کو معاف کر کے مجھے پھر سے اپنے دامن میں سمیٹ لیں۔“ وہ اونچا لہبا وجود ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ ڈرائیونگ روم میں جتنے بھی نفوس موجود تھے، سب کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔

”غلطی صرف تجھ سے نہیں ہوئی مصطفیٰ! قصور وار تو میں بھی ہوں۔ یہ اونچی ٹاک اور بے پناہ اتنا مجھے سے ہی تو رشت میں ملی ہے۔ بابا جان نے بیٹے کو خود سے پتلا لیا تھا۔ آنسوؤں سے ان کی ریش تر ہو چکی تھی۔

”جب زندگی مجھ سے روٹنے لگی تب اندازہ ہوا کہ میں نے تو اپنی زندگی کا بہت سی وقت فضول کی ہٹ دھری کی نذر کر دیا۔ گزرا وقت ٹوٹ نہیں سکتا بابا لیکن میں اپنی زندگی کا باقی وقت آپ سب کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔

”تو نے خود پر اور مجھ پر جو ظلم کیا سو کیا مصطفیٰ، لیکن میری بیٹی کو تو بغیر کسی قصور کے سب سے جدا کر دیا۔

# عقیدہ

حکومت پاکستان

قیمت - 400 روپے

ملکتہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر: 32735021

37، محمد ہاں، کراچی



قصہ دار میں اور تم تھے، سزا اس کو بھگتنا پڑی۔" بابا جان نے اپنا دوسرا بازو اکر کے عقیقہ کو اپنے ساتھ لگایا تھا۔ وہ جان سے پیارے تایا کا مس پا کر پھر سے سکھنے لگی تھیں۔

"جو ہو اسو ہو۔ سب کچھ بھول جائیں۔ آج خوشی کا دن ہے۔ یوں رونے دھونے اور منہ بسورنے کا نہیں۔ پلیز گرینڈ پاپا، زیادہ جذباتی ہو کر اپنی طبیعت تو خراب کریں گے سو کریں گے چاچو کے لیے بھی زیادہ ایمووشنل ہونا ٹھیک نہیں۔" شہیار نے دادا کو مخاطب کیا۔ ساتھ بیٹھے مرتضیٰ نے بھی بیٹے کی بات کی تائید کی۔ مرتضیٰ نے محبت سے کہتے ہوئے دیکھا جب انہوں نے حویلی اور حویلی والوں سے قطع تعلق کیا تو وہ فقط ساڑھے پانچ برس کا تھا اور اب وہ بھرپور خوبصورت جوان تھا۔

"آپ دونوں نے گرینڈ پاپا سے بہت لاڈ اٹھوا لیے اب جگہ خالی کریں۔ گرینڈ پاپا نے اپنی پوتی اور پوتوں کو بھی پیار کرنا ہے۔" شہیار نے مسکراتے ہوئے عقیقہ اور مرتضیٰ کو مخاطب کیا۔

"آپس انا بیہ صاحبہ اور سلمان، سنعان کو تیار کر دیں۔ اب کھڑے کیا شہیار ہے ہو۔ اس نے اب تینوں گزروں کو مخاطب کیا۔"

"میں مل چکی ہوں دادا جان سے۔" انا بیہ ذرا جھجکی تھی۔

"آؤ میرا بچہ۔ ابھی تو دادا کا تمہاری صورت دیکھ کر ہی دل نہیں بھرا ہے۔" حیات احمد نے پیار سے پوتی کو مخاطب کیا۔

"بالکل ہماری عفتی کا عکس ہے نا بابا۔" مرتضیٰ باپ سے مخاطب تھے۔

"اور ہم دونوں پیلا میں ملتے ہیں۔" سنعان، حیات بولا تھا سڈرائفنگ روم میں سب کا زور دار قہقہہ گونجا۔ سنعان بھی جھینپ کر ہنس پڑا تھا۔

\*\*\*

ڈاکٹرز نے ابھی مرتضیٰ کو مسلسل بیدار رکھنے کی

تائید کی تھی لیکن مصطفیٰ حویلی جانے پر بغض تھے۔ "ڈاکٹرز کے مطابق ابھی تمہارے لیے سفر کرنا ٹھیک نہیں ہے، مصطفیٰ، مرتضیٰ نے بھائی کو سمجھانا چاہا۔

"میں خود ایک ڈاکٹر ہوں مرتضیٰ بھائی! مجھے علم ہے کہ کیا چیز میرے لیے ٹھیک ہے اور کیا نہیں۔" مصطفیٰ مسکرائے تھے۔

"کون کتنا ہے تم بدل گئے۔ تم تو ابھی بھی اتنے ہی ضدی ہو۔" مرتضیٰ نے چھوٹے بھائی کو مصنوعی خطگی سے دیکھا تھا۔

"آپ جانتے ہیں مرتضیٰ بھائی! میں اب بونس پر جی رہا ہوں۔ جانے کب مہلت ختم ہو جائے، میں چاہتا ہوں اس سے پہلے۔"

"اچھا بس اب زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ عقیقہ سے آٹو سٹاپ باندھے۔ ہم آج شام کو ہی گاؤں کے لیے نکلتے ہیں۔" مرتضیٰ نے سرعت سے بھائی کی بات کالی تھی۔ مصطفیٰ نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے اثبات میں گردن ہلا دی۔

\*\*\*

وایسی کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ شہیار ان کی کارڈرائیو کر رہا تھا ان کا۔ بھتیجا کالی بدلہ منع تھا اس نے سفر کے آغاز میں کچھ خطے چھوڑے تھے لیکن مصطفیٰ اور عقیقہ دونوں ہی کسی کسی سڑک پر گم تھے۔ شہیار ان کی ذہنی کیفیت سمجھ گیا تھا۔ اس کے بعد اس نے چچا، چچی کو مخاطب نہ کیا تھا۔ وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے سنعان سے ہلکی پھلکی گپ شپ لگاتا رہا۔ انا بیہ اور سلمان وہ سری گاڑی میں دادا اور مایا کے ہمراہ تھے۔

"آپ نے اپنی میڈیسن تو رکھ لی نا مصطفیٰ۔" عقیقہ کو اچانک خیال آیا تو شہر کو مخاطب کیا۔ انہوں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ عقیقہ مطمئن ہو گئی تھی مصطفیٰ نے ایک نگاہ شریک حیات پر ڈالی۔ ان کی محبت کرنے والی ناک باز اور وفا شعار بیوی ان کے لیے قدرت کا عظیم تحفہ تھی۔ انہیں قدرت کی اس



عنایت کا نہ تو کوئی اور اک ہوا نہ ہی انہوں نے اس نعمت کی قدر کی۔ جس محبت کے نہ ملنے کا وہ تمام عمر غم مناتے رہے دل کی سرزمین پر اس قربت کے نقش تو ہم ہو کر جانے کب کے مٹ چکے تھے۔ اب وہاں صرف اور صرف عقیقہ کا راج تھا لیکن ان کی ضد اور انا نے انہیں کبھی خود سے بھی یہ اعتراف نہ کرنے دیا تھا۔

عقیقہ جو ہمیشہ ان کے لیے غمی تھی۔ ان کے مرحوم چچا چچی کی اکلوتی بیٹی اور ان کی بچپن کی دوست۔ عقیقہ کے والدین کا ایک ٹریفک ایکسیڈنٹ میں اس وقت انتقال ہوا تھا جب وہ محض تین برس کی تھی۔ ماں باپ سے اس کا تعارف تصویروں کے ذریعے ضرور تھا لیکن حقیقت میں تایا۔ تائی ہی اس کے لیے اس کے ماں باپ تھے۔

تایا کے بچوں میں سب سے بڑے مرتضیٰ تھے۔ وہ عقیقہ سے ویسا ہی پیار کرتے جیسے اپنی چھوٹی بہن ناعمہ سے لیکن مرتضیٰ بھائی کا چھوٹے بہن بھائیوں پر بڑے بھائیوں والا رعب بھی تھا۔

ناعمہ اور عقیقہ دونوں ہی ان سے ڈرتی تھیں اور بچہ مصطفیٰ تھا جو عمر میں عقیقہ سے تین برس بڑا تھا۔ ناعمہ عقیقہ سے ڈیڑھ برس چھوٹی تھی۔ عمروں کے اس تفاوت کے باوجود مصطفیٰ عقیقہ اور ناعمہ تینوں گہری دوستی کے بندھن میں بندھے ہوئے تھے۔ تینوں ساتھ ہیل کوڈل جوان ہوئے تھے۔ مصطفیٰ کی شوخیاں اور شرارتیں اب بھی برقرار تھیں وہ اب بھی عقیقہ اور ناعمہ سے پہلے کی طرح جھجھکاؤ کرتا تھا لیکن پہلے کے برعکس عقیقہ اسے دھندو جواب نہ دیتی تھی بلکہ مسکرا کر خاموش ہو جاتی۔ ذہین، لطیف، مصطفیٰ کو علم ہی نہ ہو سکا کہ اس کی بچپن کی دوست غمی اب اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے سے اس لیے کتراتے ہیں کہ کہیں مصطفیٰ ان آنکھوں میں اپنی محبت کا عکس نہ پالے۔ مشرقی لڑکی کی شرم و حیا نے اسے محبوب کو حال دل سنانے کی اجازت ہی نہ دی اور محبوب کسی اور کی زلف کا اسیر ہو گیا۔

مصطفیٰ میڈیکل کے تھرڈ ایئر میں تھا جب اسے اپنے دوست کی بہن حوریہ سے طوفانی قسم کی محبت ہو گئی تھی۔ اس محبت کا ہمارا اس نے سب سے پہلے عقیقہ کو ہی بتایا تھا۔ عقیقہ دل کی نیسوں کو دل میں دبا کر کسی اور کے لیے مصطفیٰ کی بے تابیوں کے قصے سن رہی۔ مصطفیٰ شہر میں میڈیکل کالج کے ہاسٹل میں رہائش پذیر تھا۔ اس کا دوست عدنان ڈے اسکالر تھا مصطفیٰ جب ہاسٹل کے بد مزہ کھانے کھا کر اوب جاتا تو عدنان اسے زیر دستی اپنے ساتھ گھر لے جاتا۔ اس کی فیملی خاصی ماڈرن اور روشن خیال تھی۔ عدنان کی بہن بھی مصطفیٰ کے ساتھ بے تکلفانہ ماحول میں گپ شپ لگاتی تھیں۔ سیاست، تاریخ، ادب، موسیقی، غرض کون سا ایسا موضوع گفتگو تھا جو ڈسکس نہ ہوتا۔ عدنان سے چھوٹی حوریہ جو خود خاصی انٹلکچوئل پرسنلٹی کی مالک تھی کب اور کیسے مصطفیٰ کے دل میں اترتی چلی گئی مصطفیٰ کو اندازہ تک نہ ہوا۔

اس محبت کا اور اک تب ہوا جب عدنان نے بتایا کہ گھر میں حوریہ کا ایک پرو پونڈل ڈسکس ہوا ہے۔ یہ بات سن کر مصطفیٰ کے دل کی دنیا زیر و زبر ہو گئی تھی اس نے کسی مناسب موقع کے انتظار میں مزید دیر کرنا مناسب نہ جانا اور سیدھے سبھاؤ حوریہ سے حال دل کہہ ڈالا۔ حوریہ تو شاید پہلے ہی اس خوبو شخص کے آگے دل ہار چکی تھی اس نے مصطفیٰ کو یقین دلایا کہ محبت کے اس سفر میں وہ جتنا نہیں ہے مزید یہ کہ مصطفیٰ تسلی رکھے حوریہ کے گھر والے اس کی مرضی کے بغیر اس کا رشتہ کہیں طے نہیں کر سکتے، مصطفیٰ یکسوئی سے اپنی تعلیم مکمل کرے تاکہ حوریہ کے گھر والوں کے آگے اس کے لیے دست سوال بلند کرنے کی پوزیشن میں ہو۔

حوریہ کے اس اعتراف اور اظہار کے بعد مصطفیٰ گویا ہواؤں میں اڑنے لگا تھا۔ محبت کی رہگزر پر وہ تنہا نہیں ہے، یہ احساس ہی کتنا خوش کن تھا۔ گھر میں عقیقہ کے سوا اس نے کسی سے بھی حال دل ڈسکس



نہ کیا تھا ہاں حوریہ کے گھر والوں کو کسی حد تک اندازہ ہو گیا تھا کہ حوریہ اور مصطفیٰ ایک دوسرے میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔ عدنان نے خود مصطفیٰ سے یہ معاملہ ڈسکس کیا تھا۔

”حوریہ ہم سب کی بہت لاڈلی ہے مصطفیٰ اور ہم سب تم دونوں کی چاہت سے بھی آگاہ ہیں۔ میں اس معاملے میں روایتی غیر متنبہائی والا رویہ نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ تم میرے دوست ہو اور مجھے بہت عزیز بھی ہو۔ تمہاری شرافت و نجابت پر بھی مجھے کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں لیکن۔“ عدنان نے گہرا سانس کھینچتے ہوئے بات اور حوریہ چھوڑی۔

”لیکن کیا عادی۔“ مصطفیٰ نے بے چین ہو کر اس کی بات مکمل کروانا چاہی۔

”لیکن تمہارے اور ہمارے فیملی بیک گراؤنڈ میں بہت فرق ہے مصطفیٰ! ہم لوگ خالص زمین دارانہ پس منظر رکھتے ہو۔ تمہاری ساری فیملی بھی گاؤں میں رہتی ہے۔ تم۔“ اگر حوریہ کو گاؤں میں رہائش رکھنے پر اعتراض ہو گا تو ہم شادی کے بعد کسی ہی رہ لیں گے۔ مصطفیٰ نے عدنان کی بات کاٹتے ہوئے اسے جھٹ لیتے ہوئے کہا تھا۔ عدنان اس کی جلد بازی پر ہونے سے ہنس پڑا۔

”مہرا کہنے کا یہ مقصد نہیں تھا مصطفیٰ۔ دراصل مجھے اور میری فیملی کو یہ خدشہ ستا رہا ہے کہ کیسے تمہاری فیملی اس بات کو پسند نہ کرے کیونکہ عموماً گاؤں میں بسنے والے چاہے جتنا مرضی پڑھ لکھ جائیں بچوں کی شادیوں کے وقت ذات پر اداری کو ترجیح دیتے ہیں اور ہماری تمہاری کاسٹ بالکل مختلف ہے۔“ عدنان آخری خدشہ زبان پر لے کر آیا تھا۔ مصطفیٰ جو یہ سوچ رہا تھا کہ جانے عدنان کیا کہنے والا ہے، عدنان کی بات سن کر اس کی کب سے رکی سانس بحال ہوئی۔ وہ کھل کر ہنس پڑا تھا۔

”تمہارا قصور نہیں ہے عادی۔ ہم زمینداروں کے بارے میں عمومی رائے یہی ہے کہ ہم بعض معاملوں میں بہت تنگ نظر ہوتے ہیں فلموں، ڈراموں اور حتیٰ کہ

ملکی ادب میں بھی ہمیں بہت دقیانوسی سوچ کا حامل دکھایا جاتا ہے۔ لوگ یہ ہی دیکھ پڑھ کر ہمارے بارے میں رائے قائم کر لیتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہوں گا عادی کہ یہ منظر کشی سو فیصد غلط ہے لیکن یہ سو فیصد صحیح بھی نہیں ہے، میں کم از کم اپنے خاندان کے حوالے سے مکمل گارنٹی دینے کو تیار ہوں میرے بابا تو ذات پر اداری کو قطعی اہمیت نہیں دیتے۔

مر قرضی بھائی کی شادی بابا جان نے اپنے دوست کی بیٹی سے کی۔ علیم الدین صاحب ہمارے گاؤں کے اسکول سے ہیڈ ماسٹر ریٹائر ہوئے ہیں انہوں نے ساری عمر گاؤں کے بچوں، بچیوں میں علم کی شمع روشن کی وہ میرے بابا کے گہرے دوستوں میں سے ہیں۔ قطعی مختلف برادری سے تعلق رکھنے کے باوجود بابا جان نے مر قرضی بھائی کے لیے ان کی بیٹی کا ہاتھ مانگا۔ لوگوں کو اس فیصلے پر تعجب بھی ہوا لیکن الحمد للہ بابا کا انتخاب بالکل درست ثابت ہوا مر قرضی بھائی اور میمونہ بھابھی بہت خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں۔“ عدنان کی تسلی کے لیے مصطفیٰ نے تفصیلی جواب دیا تھا۔ اس وضاحت کے بعد عدنان بھی مطمئن ہو گیا تھا۔

”ایک بات اور عادی اگر ذات پر اداری یا اسی طرح کا کوئی اور ایسا اثبات بھی میں ہر گز اپنی چاہت سے دستبردار نہ ہوتا۔ میں نے حوریہ سے محبت کی ہے اور میں پورے عزت و احترام سے اسے اپنی زندگی کا حصہ بناؤں گا۔“ مر قرضی نے دوست کو بھرپور یقین دلایا تھا۔ ”مجھے تم پر یقین ہے مصطفیٰ۔ بس حوریہ ہم سب کو بہت پیاری ہے یوں سمجھو کہ گھر بھر کی جان ہے اس میں۔ اس لیے اوپر کلشن جنس ہو رہے تھے کہ کبھی اسے کوئی جذباتی دھچکا نہ پہنچے۔ میری بہن بہت حساس ہے مصطفیٰ۔ اس کا ہمیشہ خیال رکھنا۔“ عدنان ذرا جذباتی ہوا تھا۔

”کہنے کی ضرورت نہیں۔“ مصطفیٰ دھیرے سے مسکرا کر بولا۔

اور پھر حوریہ کے گھر جانے اور اس سے ملنے میں جو تھوڑی بہت جھجک پیش آتی تھی اس کا خاتمہ ہو گیا۔



عدنان کے گھر اسے عدنان کا دوست نہیں بلکہ مستقبل کے دلاؤ والا برونو کو ملتا تھا۔ خوریہ کے ساتھ بیٹھ کر اس نے مستقبل کے کتنے سنری سپنے بن لیے تھے اور عقیقہ کے مشورے پر اب وہ اپنی ماں جی کو محبت کے راز میں شریک کرنا چاہتا تھا، لیکن اس سے پہلے وہ ماں کو کچھ بتانا اچانک حرکت قلب بند ہونے سے ماں جی راہی عدم سدھار گئیں۔ یہ مصطفیٰ کے لیے بہت بڑا جذبہ بانی دھچکا تھا۔

وہ ماں کا لاناؤ لائے بچہ تھا۔ ان کی موت کو وہ کسی طور قبول نہ کیا رہا تھا ایسے میں عقیقہ نے اس کی بہت بہت بندھائی حالانکہ وہ خود ماں جیسی مائی کے پھرنے کا غم نہ بھلا پارہی تھی لیکن گھر والوں کو سنبھالنے ہمیشے کے لیے اسے اپنا غم پس پشت ڈالنا پڑا تھا۔ بابا جان، مرتضیٰ بھائی، ناعمہ اور سب سے بڑھ کر مصطفیٰ، اس نے سب کی دل جوئی میں کوئی گم نہ تھوڑی تھی۔ مصطفیٰ ماں کی باتیں، ان کی یادیں دہرائے پر آتا تو گھنٹوں بولتا رہتا۔ ان دنوں اسے خوریہ کی یاد بھی نہ ملتی تھی خوریہ نے اس کی ماں کے انتقال پر اس سے بھروسہ نہ کیا تھا۔ اس کی ذہنی کیفیت سمجھتے ہوئے وہ اسے تسلی و آسائش کی حتی المقدور کوشش بھی کرتی لیکن یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ مصطفیٰ کی ماں سے اس کی کل جذباتی وابستگی نہ تھی وہ مصطفیٰ کو تسلی دیتی تو وہ ایک رکلی ہوتی۔ ان دنوں اسے صرف عقیقہ کے وجود سے ہی جذباتی ڈھارس ملتی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ غم زدہ دل کو قرار آ ہی گیا۔ اب اس کی ہاؤس جاب شروع ہو چکی تھی۔ انسانی فف شیڈول کے باوجود وہ خوریہ سے ملنے کا وقت نکال لیتا تھا۔ خوریہ کی خواہش تھی کہ اب مصطفیٰ کے گھر والے اس کا باقاعدہ رشتہ مانگ لیں۔ مصطفیٰ گاؤں گیا تو یہ سوچ کر گیا کہ بابا جان سے اس موضوع پر بات کرے گا۔ اسے ہرگز اندازہ نہ تھا کہ بابا جان بھی کچھ سوچے بیٹھے ہیں اور شدت سے اس کی آمد کے منتظر ہیں۔ رات کے کھانے کے بعد بابا جان نے اسے اپنے

کمرے میں بلوایا تھا۔  
”تمہاری بھابھی ناعمہ کے لیے اپنے بھائی کا رشتہ پیش کر رہی ہیں، تمہاری کیا رائے ہے اس بارے میں؟“  
”ماقب اچھا لڑکا ہے بابا جان! لیکن اس طرح تو وہ سٹہ نہیں ہو جائے گا۔“

”میں بھی یہ ہی سوچ کر متذبذب تھا لیکن میمونہ بہت سلجھی ہوئی بچی ہے اتنے برس ہو گئے ہیں مرتضیٰ کی شادی کو، کبھی بھی بچیوں کے ساتھ میمونہ کی منہ بھاری دلی چپقلش نہیں ہوئی پھر ماقب ہماری نظروں کے سامنے بلا برعاصے، ہیرا پچہ ہے۔ اس کا باپ علیم الدین تو ہے ہی، اجلری یار۔ جب میں نے مرتضیٰ کے لیے میمونہ کا ہاتھ مانگا تھا تو اس نے سوچنے کے لیے پانچ سیکنڈ کی بھی مہلت نہ لی تھی اور اب جب وہ لوگ اپنے بیٹے کے لیے ہماری بیٹی کے طلب گار ہوئے ہیں تو ہم چند بے بنیاد خدشات کا شکار ہو رہے ہیں۔ متذبذب ہیں۔ علیم الدین سنے تو کہہ دیا ہے کہ ہمارا جو بھی جواب ہو گا وہ اسے خوش دلی سے تسلیم کرے گا۔ میرا دل تو اس رشتے پر راضی ہے بیٹا۔ مرتضیٰ بھی راضی ہے بس مجھے تمہاری رائے کا انتظار ہے تاکہ ان لوگوں کو حتمی جواب دے دوں۔“ بابا جان نے طویل تمہید باندھی تھی۔

”ٹھیک ہے بابا پھر آپ علیم انکل کو ہاں کر دیں۔“  
ماقب واقعی ہر لحاظ سے ہماری ناعمہ کے قابل ہے۔ اللہ کا نام لے کر بات چلی کر دیں۔“ مصطفیٰ نے بھی مثبت عندیہ دے دیا۔

”بس پھر ٹھیک ہے علیم الدین کو ہاں کہہ دیتا ہوں۔“  
وہ تو جلد شادی کے خواہش مند ہیں مگر انہیں چند ماہ انتظار کرنا ہو گا۔ تمہاری ہاؤس جاب مکمل ہو جائے تو تمہارے دلہے والے دن ناعمہ کو رخصت کر دیں گے۔ الحمد للہ میں اپنی تینوں ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جاؤں گا۔ جب سے تمہاری ماں کا اچانک بلاوا آیا ہے یار۔ میں اپنی زندگی کے حوالے سے بہت خائف رہنے لگا ہوں۔ دن رات اللہ سے یہی دعا کرتا ہوں کہ



کم از کم میں اپنی دونوں بچیوں کو اپنی زندگی میں ہی گھر بار کا کروں۔

بابا جان بول رہے تھے اور مصطفیٰ نا سمجھی سے انہیں تک رہا تھا۔ ان کی اس بات کا جو مفہوم دکھاتا تھا مصطفیٰ کا، جن اسے تسلیم کرنے سے انکاری تھا۔

”ویسے ہم پر اللہ کا کتنا کرم ہے نا مصطفیٰ! ایک بیٹی رخصت ہو کر سسرال چلی جائے گی تو دوسری بیٹی رخصتی کے بعد بھی سدا جاری آنکھوں کے سامنے رہے گی۔ تمہاری ہمشین ماں کہتی تھی کہ عقیفہ۔“

”میں عقیٰ سے شادی نہیں کر سکتا بابا جان۔“ مصطفیٰ نے ایک لخت ان کی بات کالی تھی۔ بابا جان یہ بات سننے کی ہرگز توقع نہ کر رہے تھے۔ چند لمحوں کے لیے وہ کچھ نہ بول سکے۔

”میں کسی اور کے ساتھ نہ کرنا ہوں بابا جان! اور آج میں آپ سے اسی موضوع پر بات کرنا چاہتا تھا۔ میرے دوست عدنان کو تو آپ جانتے ہیں نا ایک بار وہ میرے ساتھ گاؤں بھی آیا تھا۔ حوریہ اس کی چھوٹی بہن ہے۔ ہم ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں بابا جان! وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ ہم دونوں کے درمیان بہت کچھ اسٹینڈنگ ہے بابا جان۔“ مصطفیٰ نے لجا جت سے بات مخاطب کیا۔

”کیا وہ لڑکی عقیفہ سے بھی اچھی ہے؟“ انہوں نے سر دے بے بس استفسار کیا۔

”عقیفہ کے ساتھ اس کا کیا موازنہ؟ مصطفیٰ قدرے جھنجھلا کر بولا۔

”ماں عقیفہ کے ساتھ کسی ایسی لڑکی کا موازنہ یا مقابلہ کیا بھی نہیں جاسکتا۔“ انہوں نے ہنکارا بھر کر کہا تھا۔

”ایسی لڑکی سے آپ کی کیا مراد ہے۔“ مصطفیٰ چیخ کر بولا۔

”میں فنڈول کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا مصطفیٰ! تمہاری شادی عقیفہ سے ہی ہوگی۔ یہ تمہاری مرحومہ ماں کی بھی خواہش تھی اور میرا بھی یہ ہی فیصلہ ہے۔“ انہوں نے بیٹے کو بے چکب انداز میں مخاطب کیا۔

کیا۔

”میں نے عقیٰ کو کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا بابا جان۔ وہ صرف میری گزن ہے اور بہت اچھی دوست۔“

”میں نے اور تمہاری مرحومہ ماں نے تمہارے بچپن میں ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ عقیفہ ہی تمہاری دلہن بنے گی لیکن اس بات کا اعلان کرنے کا وہ مناسب وقت نہ تھا۔ عقیفہ اسی گھر میں مل بیٹھ کر بڑی ہوئی ہے۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ تم دونوں کے بیچ کسی قسم کی جھجک پیدا ہو، لیکن اب احساس ہو رہا ہے کہ ہم غلطی پر تھے۔“

اگر تمہیں پہلے علم ہو تا کہ عقیفہ نے تمہاری شریک حیات بننا ہے تو تم کسی اور لڑکی کی جانب متوجہ ہی نہ ہوتے لیکن خرچ ہو اسو ہوا۔ ابھی بھی بہت دیر نہیں ہوئی ہے۔ جس رات پسندیدگی کو تم محبت کا نام دے رہے ہو، اس سے جلد از جلد پیچھا چھڑواؤ۔ تمہاری شادی عقیفہ سے ہی ہوگی یہ میرا اعلیٰ فیصلہ ہے اور میں دوبارہ اس موضوع پر بحث نہیں کرنا چاہوں گا۔“

کس بے نیازی سے بابا جان نے حکم صادر کیا تھا۔ مصطفیٰ بے بسی سے انہیں دیکھ کر رہ گیا۔ وہ سیدھا عقیفہ کے پاس گیا تھا۔

”تم جانتی ہو عقیٰ! بابا جان تمہارے اور میرے تعلق کیا سوچے بیٹھے ہیں میں حوریہ کے سوا کسی اور سے شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ حوریہ کے لیے میری چاہت اور دیوانگی سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ پلیز تم بابا جان سے بات کرو۔ انہیں سمجھاؤ۔ تم تو ان کی بہت لاڈلی ہو، وہ تمہاری کوئی بات نہیں ٹالتے۔“ مصطفیٰ کا لہجہ منت بھرا تھا۔ عقیفہ اسے خالی خالی نگاہوں سے دیکھنے لگی تھی۔

”بیٹا عقیٰ! تم بات کرو گی نا بابا جان سے؟“ وہ اس کا شانہ جھنجھوڑتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”تم فکر مت کرو مصطفیٰ! میں بات کروں گی تیا جان سے۔“ عقیفہ نے گہری سانس اندر کھینچتے ہوئے جواب دیا۔

مصطفیٰ مطمئن ہو کر پلٹ گیا تھا۔ یہ اس کی بھول



تھی کہ عقیقہ حیات احمد کا فیصلہ بدلوانے کی قدرت رکھتی ہے وہ اگلی بار گاؤں آیا تو سب سے پہلے عقیقہ سے ملنے اس کے کمرے میں گیا تھا۔ کچھ پوچھنے کی نوبت ہی نہ آئی تھی۔

”تایا جان میری بھی کوئی بات سننے پر تیار نہیں مصطفیٰ۔“ عقیقہ نے اسے بے بسی سے آگاہ کیا تھا۔ وہ مرتضیٰ کے پاس جا پہنچا۔

”میں آپ کو بتا رہا ہوں بھائی! حوریہ کے سوا میں کسی سے شادی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اگر بابا جان اس سے شادی پر راضی نہیں تو آپ کو میرے لیے اسٹینڈ لینا ہو گا۔ حوریہ کے گھر آپ اور بھابھی میرا رشتہ لے کر جائیں گے“ میں جلد از جلد اس سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔“ کسی انمولی کے خوف سے مصطفیٰ واقعی جلد از جلد حوریہ کو اپنے نکاح میں لانا چاہتا تھا۔ مرتضیٰ نے بھی پہلے تو اسے عقیقہ کے لیے قائل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ پھر آخر بار مان لی تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے یار! میں بابا جان کو سمجھانے کی اپنی کوشش کرتا ہوں۔“ انہوں نے اسے تسلی دی۔

حیات احمد سے یہ بات کرنے کی دیر تھی۔ وہ بری طرح آگ بولے ہوئے۔

”بھائے اس نے کہا کہ تم بھائی کو سمجھاؤ۔ اس کی وکالت کرنے میرے پاس بھی گئے۔ میں کسی ایسی لڑکی کو کیسے ہو بنا سکتا ہوں جس سے ایک غیر لڑکے کے ساتھ یار کی پیشکشیں برہا میں۔ اس کے عشق میں مبتلا ہو کر یہ باپ سے بات کرنے کی تمیز بھول گیا ہے۔ مجھے دھمکی دے رہا ہے کہ اگر اس لڑکی کے گھر ہم رشتہ لے کر نہیں گئے تو یہ گھر چھوڑ کر چلا جائے گا۔“

”اگر آپ حوریہ کے گھر میرا رشتہ لے کر نہیں گئے تو میں مرتضیٰ بھائی کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“ مصطفیٰ باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مخاطب ہوا۔

”مگر مرتضیٰ نے یہ کیا تو میں تمہارے ساتھ اسے بھی عاق کروں گا۔“ انہوں نے مرد لہجے میں باور

کرایا۔ مصطفیٰ نے مدد طلب نگاہوں سے بھائی کو دیکھا۔

”عفیٰ بہت اچھی لڑکی ہے مصطفیٰ! بابا جان کی بات مان لو یار۔ مرتضیٰ کی بات سن کر مصطفیٰ کے چہرے پر استنہزائیہ تاثرات ابھر آئے تھے۔ مرتضیٰ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کچھ سمجھانا چاہا تھا مگر مصطفیٰ نے مرد مری سے بھائی کا ہاتھ جھٹک دیا۔

”شادی تو میں حوریہ سے ہی کروں گا“ چاہے آپ لوگوں کی رضامندی شامل ہو یا نہ ہو۔“

مصطفیٰ کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ کچھ کرنے کی ٹھان چکا ہے۔ ناعمہ استثنائی متوحش ہو کر بھائی کے پاس آئی تھی۔

”یہ گھر میں لیا ہوا ہے بھائی۔ آپ نے عفیٰ سے شادی سے انکار کر دیا ہے۔ آخر کیوں بھائی۔ عفیٰ سے زیادہ آپ کو دنیا میں کوئی دوسرا نہیں چاہ سکتا۔ بابا کی بات مان لیں۔ عفیٰ کے لیے ہاں کریں۔“ ناعمہ نے لجاجت بھرے لہجے میں بھائی کو مخاطب کیا۔

”عفیٰ مجھے چاہتی ہے؟“ مصطفیٰ نے حیران ہو کر خود گھائی کی۔

”وہ آپ سے بہت محبت کرتی ہے بھائی! ایک آپ ہی اس کی جاہت سے واقف نہیں۔ آپ کو دیکھ کر اس کی آنکھیں ایسے جھک گئے لگتی ہیں۔ کاش آپ کبھی ان آنکھوں میں جھانک کر تو دیکھتے۔“

”وہ تو یعنی یہ بات ہے۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ بابا جان عفیٰ کے نام کی رٹ کیوں لگائے بیٹھے ہیں۔ اسے کوئی بھی اچھا لڑکا مل سکتا ہے۔ اب سمجھ میں آیا کہ بابا حوریہ سے میری شادی کیوں نہیں ہونے دے رہے۔ انہیں بیٹے سے زیادہ بیٹی عزیز ہے، وہ اسے اس کی جاہت دلوانے کے درپے ہیں چاہے اس کے لیے اس میں میرے خواب اجاڑنے پڑیں اور میں اتنا احمق کہ عقیقہ کو اپنا بہترین دوست جان کر اس سے اپنی ہر بات شیئر کرتا رہا اور بابا سے اپنی بات منوانے کے لیے بھی سب سے پہلے عفیٰ سے ہی مدد مانگی۔ اس روئے زمین پر مجھ سے بڑا گھامڑا اور کون ہو گا بھلا۔“ وہ استنہزائیہ



سکے گا۔" وہ بیٹے کو چیلنج کر رہے تھے۔ مصطفیٰ نے لبو رنگ آنکھیں اٹھا کر باپ کو دکھا۔

"ٹھیک ہے، آپ نکاح خواں کو بلائیں۔ میں نکاح کے لیے تیار ہوں۔" بابا جان کے لبوں پر مطمئن سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ان کی پلاننگ کامیاب ہوئی تھی۔

مصطفیٰ کو بات مانتے ہی بنی تھی چند لمحوں کے اندر اندر نکاح پڑھا دیا گیا تھا۔ لوگ دو لمبا سے گلے ملتے ہوئے اسے مبارکباد دے رہے تھے۔ مصطفیٰ میکا کی انداز میں ساری کاروائی نمٹاتا رہا اور جب کھانا تناول کر کے مہمان رخصت ہو گئے تو مصطفیٰ نے اپنا بیگ اٹھائے اور ڈالا اور عقیقہ کے کمرے میں جا کر اسے کھائی سے کھینٹا ہوا صحن میں لے آیا۔

"کہاں لے کر جا رہے ہو تم عقیقہ کو۔" بابا جان اس کے انداز پر غضب ناک ہوئے۔

"میں اپنی بیوی کو اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہوں بابا جان۔ اس حویلی اور اس کے مینوں سے اب میرا یا میری بیوی کا کوئی تعلق نہیں، آپ بیٹے کو عاق کرنے کی دھمکی دے رہے تھے نا۔ آپ نے بیٹے کے ساتھ ساتھ جان سے پیاری بیٹی کو بھی ہمیشہ کے لیے کھودیا ہے، آپ یہ سوچ کر خوش نہ ہوں کہ آپ بازی جیت چکے ہیں۔ آپ بہت بڑی مالت سے دوچار ہوئے ہیں بابا جان۔" وہ رہزندہ لہجے میں باپ سے مخاطب ہوا۔

"عقیقہ نہیں لے جائے گی۔" وہ دھماڑے تھے۔ "بھلے سے نہ جائے۔ مجھے طلاق کے تین حرف کہنے میں تین سیکنڈ بھی نہیں لگیں گے۔" وہ پرسکون لہجے میں گویا ہوا۔

عقیقہ نے زخمی نگاہوں سے مصطفیٰ کو دکھا۔ وہ تو اپنی محبت سے کب کی دست بردار ہو چکی تھی۔ اس نے ہمیشہ دل سے مصطفیٰ کی خوشیوں کی دعا کی تھی اور اب جب غیر متوقع طور پر وہ اس کی زندگی میں شامل ہو گئی تھی تو کس سنگ دلی سے وہ اسے چھوڑنے کی بات کر رہا تھا۔ بے قصور ہوتے ہوئے باپ، بیٹے کی اناؤں کی جنگ میں اس کا وجود پس رہا تھا۔

انداز میں ناعمد سے بولا۔

"ایسے تو مت کہیں بھائی!" مصطفیٰ کی اس درجہ بدگمانی پر ناعمد کو رونا آنے لگا تھا۔

"جا کر کہہ دو عقیقہ سے، میں کوئی کھلونا نہیں ہوں کہ اس کی خوشی کی خاطر اس کی زندگی میں شامل کر دیا جاؤں۔ بابا جان کو بھیجی یا بیٹے میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا۔" مصطفیٰ تن فرن کر تپا چلا گیا تھا۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ بابا جان کو منانے کے لیے اب اپنی توانائیاں خرچ نہیں کرے گا۔ اس بار جب جائے گا تو تب تک پلٹ کر واپس نہ آئے گا جب تک بابا جان اس کی ضد کے آگے گھٹنے نہ ٹیک دیں۔

اس پلان پر عمل درآمد کی نوبت ہی نہ آئی تھی۔ اگلے روز جمعہ تھا۔ نماز جمعہ کی ادائیگی کے لیے حویلی سے باہر نکلا تو جو لوگ درہمیں چڑھی ہوئی تھیں۔ یہ کوئی انوکھا منظر نہیں تھا۔ بابا جان باقاعدگی سے صدقہ خیرات کرتے تھے لیکن اس کے لیے عموماً "جمعرات کا دن مخصوص ہوتا تھا پھر بھی اس نے کوئی خاص دھیان نہ دیا۔ نماز جمعہ کی ادائیگی کے بعد مسجد کے پیش امام نے لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کیا تھا کہ کچھ دیر بعد ملک حیات احمد کی حویلی میں ان کے بیٹے اور بیٹی کا نکاح پڑھایا جائے گا اور اس خوشی کے موقع پر سب گاؤں والوں کے لیے دعوت عام ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں کے سر کردہ لوگ حویلی میں اکٹھے ہو چکے تھے۔ مصطفیٰ اپنے کمرے میں بیٹھا ہے کسی سے مٹھیاں بھیج رہا تھا۔ باہر لوگوں کا جم غفیر اکٹھا تھا۔ مبارک سلامت کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ مرتضیٰ بھائی اور میمونہ بھابھی بچھڑے ہوئے مصطفیٰ کو رام کرنے کی کوشش میں مصروف تھے جب بابا جان کمرے میں داخل ہوئے۔

"اگر آج میری عزت پاؤں تلے روند کر کم جانا چاہو تو جاسکتے ہو لیکن یاد رکھنا پھر جیتے جی میری شکل نہ دیکھ پاؤ گے۔ مجھ سے یا حویلی کے کسی بھی بندے سے تمہارا کوئی تعلق واسطہ نہ ہو گا۔ میں اخبارات میں اعلان لا تعلقی کے اشتہار چھپواؤں گا اور پھر دیکھوں گا کہ کوئی معزز گھرانہ تمہیں اپنی بیٹی کا رشتہ کیسے دے



مصطفیٰ کی دھمکی کے بعد حیات احمد کچھ نہ بول پائے تھے۔ مصطفیٰ فاتحانہ نگاہوں سے انہیں دیکھتا عقیقہ کو لے کر چلا گیا تھا۔ اس نے باب کی بازی ان پر الٹ دی تھی لیکن حقیقت یہی تھی کہ وہ خود بڑی شکست سے دوچار ہوا تھا۔ وہ عقیقہ کو دیکھتا تو اس کا خون کھولنے لگتا۔

وہ اپنی ساری فرسٹریشن اس پر ہی نکالتا تھا۔ شہر میں فوری طور پر اس نے ایک دوست کا پیار ٹمنٹ کرائے پر لیا تھا۔ اس کی شادی کی خبر چچی نہ رہی تھی۔ حوریہ کا رد عمل فطری تھا، وہ اس کی شکل دیکھنے کی بھی رولدار نہ تھی۔ عذابان نے بھی اسے سخت ست سنا لی تھیں۔ اس کے ماضی میں کیے گئے بلند و بانگ دعوؤں کو یاد کرواتے ہوئے طنز و تمسخر کا نشانہ بنایا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ وہ مرد ہی کیا جو وعدہ وفات نہ کر سکے۔ جب مصطفیٰ اس کی بہن کے خوابوں کو تعبیر نہ دے سکا تھا تو اس نے ان پیکوں پر خوش رنگ خواب سجائے ہی کیوں تھے۔ عدنان کی سب باتیں سنی تھیں۔ مصطفیٰ شرمیلی کی اتھاہ گمراہیوں میں ڈوب گیا تھا۔ یہ غم و غصہ عقیقہ کی بات پر ہی نکلتا تھا۔

ایک دن روتے ہوئے عقیقہ نے اس سے درخواست کی تھی کہ وہ اسے چھوڑ کر حوریہ سے شادی کر لے۔ مصطفیٰ نے جواب میں اسے زوردار تھپڑ رسید کیا تھا۔ اس نے عقیقہ کو یہ نہ بتایا کہ وہ حوریہ سے زبردستی کی ایک ملاقات میں اسے یہ تجویز پیش کر کے اس کے نرم و نازک ہاتھوں سے خود بھی تھپڑ کھا چکا ہے۔ محبت میں ناکامی سے زیادہ شدید بے بسی کا احساس مصطفیٰ کو مشعل کر رہا تھا۔

مرضی بھائی اس کے دوستوں سے اس کی رہائش گاہ کا اندیشہ لے کر اس سے ملنے پہنچے تھے۔ وہ چھوٹے بھائی کو پیار محبت سے منانا چاہتے تھے۔ مصطفیٰ اس وقت گھر پر نہ تھا اور اتنے دنوں بعد کسی اسے کو دیکھ کر عقیقہ کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے تھے، مصطفیٰ گھر پہنچا تو وہ مرضی بھائی کے سامنے بلک بلک کر رو رہی تھی۔

”میں کہہ کر آیا تھا کہ حویلی اور اس کے کینوں سے میرا بیا میری بیوی کا کوئی تعلق نہیں پھر آپ کیوں آئے ہیں یہاں؟“ سخت الجھی لہجے میں وہ بھائی سے مخاطب تھا۔

”تم غم و غصہ کرنے میں حق بجانب ہو مصطفیٰ! لیکن اس سب میں عقیقہ کا کیا تصور ہے بھلا۔“ عقیقہ کا ہچکچوں سے لرزنا وجود دیکھ کر مرضی سخت مضطرب ہو رہے تھے۔

”میں نے بھی تو سب تصور سزا بھگتی ہے اور بابا جان کی سزا بھی کو میرے ساتھ گزارے گئے ہریل کی سزا بھگتی نہ گئے گی۔ جا کر تادیں انہیں کہ میں نے ان کی لاڈلی کو کس حال میں رکھا ہے اور اگر آئندہ مجھے پتا چلا کہ حویلی والوں میں سے کسی نے اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی ہے تو پھر میں واقعی اسے فارغ کرنے میں دو سیکنڈ بھی نہ لگاؤں گا۔“ شفا کی سے مخاطب ہوا۔

”اللہ کا واسطہ ہے مرضی بھائی! آئندہ مصطفیٰ کی مرضی کے بغیر مجھ سے ملنے نہ آئے گا اب یہ میری زندگی کا سوال نہیں۔ میری زندگی کے ساتھ ایک اور زندگی جڑ چکی ہے۔“

عقیقہ نے نگاہیں جھپکا کر بھرائی ہوئی آواز میں مرضی کو مخاطب کیا۔ مرضی اٹھ گئے تھے۔ عقیقہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور مصطفیٰ کے چہرے پر ایک شاکی نگاہ ڈال کر پلٹ گئے۔

انابیس کی پیدائش کے بعد مصطفیٰ کے دوسرے میں اتنی تبدیلی ضرور آئی تھی کہ اب وہ حلق پھاڑ کر عقیقہ پر نہ چلاتا تھا۔ اس نے عقیقہ کے ساتھ مرد مری اور لا تعلق بھرا رویہ اختیار کر لیا تھا۔ اولاد سے محبت فطری ہے سودہ خود کو انابیس سے محبت کرنے سے نہ روک پایا تھا۔ وہ اس کی لاڈلی بیٹی تھی۔

انابیس سے دو برس چھوٹا سلمان تھا اور سلمان سے تین برس چھوٹا سنعان۔

گھر میں ہر طرح کی مالی آسودگی تھی لیکن بچے ایک غیر فطری ماحول میں پرورش پا رہے تھے۔

وہ دونوں ایک دوسرے کو انتہائی ضرورت کے وقت



انابہ کا انتظار انتظار ہی رہا۔ مصطفیٰ کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی، وہ باپ کے کٹھورین پر اس سے ٹھنڈی ٹھنڈی رہنے لگی تھی۔ مصطفیٰ بیٹی کی جھنجھکی سے لاعلم نہیں تھا۔ اس کی بھولی بیٹی یہ سمجھ رہی تھی کہ ڈائری کے چند ورق پڑھنے سے ان کی زندگی کے تمام مسئلے حل ہو جائیں گے، وہ اسے کیسے بتاتا کہ وہ اس کی ماں کی زندگی کے ہر ورق سے بہت اچھی طرح واقف ہے۔ بدگمانی کی دھند تو چند دن میں ہی بجھ گئی تھی۔

وہ جانتا تھا کہ جو ہوا اس میں عقیقہ کا کوئی قصور نہیں، لیکن اس کا چہرہ دیکھ کر اس کا احساس شکست تازہ ہو جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ناروا سلوک اپنانے پر ضمیر ملامت کرنا تو وہ ضمیر کو شت اب کال کرنے کے ساتھ عقیقہ سے اپنا رویہ مزید گھورا کر لیتا۔

دل و دماغ کی یہ جنگ برسوں سے اس کے اندر جاری تھی۔ اس کا غم و غصہ اب ندامت اور شرمندگی میں ڈھل چکا تھا ہاں، لیکن اب بھی اسے عقیقہ پر شدید ترین غصہ آتا تھا۔ وہ اس کی زیادتیوں کو جب چاہے برداشت کیوں کر رہی تھی۔ اس کی مسلسل چپ اطاعت اور فرمانبرداری نے مصطفیٰ کی زندگی کو بھی بے کیف بنا رکھا تھا۔ وہ اب اس کے ساتھ نارمل زندگی جینا چاہتا تھا، مگر انا آڑے آجاتی تھی پھر اسے مزید پچھتاووں میں مبتلا کرنے کے لیے سر راہ حوریہ مکر لگاتی، برسوں پہلے ان لوگوں کی فیملی امریکا شفٹ ہو گئی تھی۔ مصطفیٰ کا ان سے کوئی رابطہ نہ تھا۔ اتنے سالوں بعد وہ حوریہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا، وہ اب بھی اتنی ہی خوب صورت اور نرم و نازک تھی۔ حیران تو وہ بھی ہوئی تھی مصطفیٰ کو دیکھ کر۔

”تم نے کیا حال بنا لیا ہے مصطفیٰ! کتنے بوڑھے لگنے لگے ہو۔“ اس نے بہت اپنائیت اور بے تکلفی سے استفسار کیا تھا۔

”تم سے پچھڑنے کے آفٹر ایفکشنس ہیں یہ۔“ وہ کہے بنانہ رہ پایا تھا۔ حوریہ جو اب ”کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔“

مخاطب کرتے تھے۔ سلمان اور سنعان کم عمر تھے اور لڑکے ہونے کی وجہ سے قدرے لاپرواہ بھی، لیکن انابہ باں اور باپ کے بیچ فاصلوں کو شدت سے محسوس کرتی تھی، ان کا گھرانہ عجیب طرح کا گھرانہ تھا۔ اس کی سہیلیوں کے برعکس ان کے کوئی دودھیالی یا ننھیالی رشتہ دار موجود نہ تھے۔ وہ ذہن میں کھلبلاستے سوال ماں سے پوچھتی تو ماں کے چہرے پر بڑی بے بس سی مسکراہٹ پھیل جاتی۔ ماں کی پانیوں سے لبریز آنکھیں دیکھ کر انابہ چپ رہ جاتی اور باپ تو یہ سوال سن کر ہی ٹال جاتا تھا۔ بیٹی کا وہ بیان بنانے کے لیے اس کے پاس بہتری ترکیبیں تھیں، وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی ذہن بیٹی باپ کو مشکل سے دو چار دیکھ کر خود ہی اپنے سوال سے دستبردار ہو جاتی ہے۔

ماں اور باپ کا کوئی لگاؤ چھانہ ہونے سے انابہ کے ذہن نے ایک فرضی نتیجہ اخذ کر لیا تھا۔ دونوں نے گھر والوں کی مرضی کے بغیر لو میں نہ ہوگی، لیکن اگر ایسا ہی تھا تو وہ ”لو“ کہاں اڑ پھو ہو گیا، انابہ کا ذہن اس نکتے پر آکر الجھ جاتا تھا۔ پھر اتفاق سے عقیقہ کی ڈائری تک اس کی رسائی ہو گئی۔ ذہن میں کھلبلاستے سارے سوالوں کا جواب مل گیا تھا، اس روز اسے اپنی ماں پر جی بھر کر ترس آیا تھا۔ اس کی ماں نے ساری عمر اس کے باپ سے محبت کے سوا کچھ نہ کیا تھا۔

اس نے پورے غلو میں سے مصطفیٰ اور اس کی من چاہی لڑکی کے ملن کی بھی کوشش کی تھی، لیکن مصطفیٰ نے اس کے ہر عمل کو بدگمانی کی عینک چڑھا کر دیکھا تھا۔ اک عمر ہو گئی تھی اسے مصطفیٰ کی لا تعلقی سے سستے زبان پر ان کا ایک لفظ لائے بغیر وہ مردوں سے بدتر زندگی جیتی چلی آرہی تھی۔ اس کے اپنے اس سے چھوٹ چکے تھے اور جو سب سے بڑھ کر ”اپنا“ تھا، وہ اجنبیت اور لا تعلقی کا لبادہ اوڑھے رکھتا تھا۔ انابہ نے ماں کی ڈائری چپکے سے باپ کی رائٹنگ نیمبل پر دھری کتابوں میں رکھ دی تھی۔ اگر اس کے باپ کے سینے میں مل ٹیم کی کوئی چیز موجود تھی تو یہ سب پڑھ کر اس کے دل نے کچھ جانی تھا۔



”مذاق کی عادت نہیں گئی تمہاری۔“  
 ”یہ مذاق نہیں ہے حوریہ۔“ وہ تھکے تھکے لہجے  
 میں گویا ہوا حوریہ نے خیریت سے آنکھیں پھاڑ کر اسے  
 دیکھا۔

”تمہاری بیوی؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔

”ہوں سمجھ لو۔ ایک چھت تلے دو اجنبی رہتے  
 ہیں۔ میں اسے کبھی وہ حیثیت اور مقام نہ دے سکا جو  
 تمہیں دینا چاہتا تھا۔“ وہ شاید حوریہ کو یہ باور کروانا چاہ  
 رہا تھا کہ ماضی میں وہ اس کے ساتھ کتنا مخلص تھا اور  
 جس بے وفائی کا طعنہ مار کر حوریہ اس سے قطع تعلق کر  
 گئی تھی وہ الزام سچا نہ تھا۔

”دیکھو مصطفیٰ! تمہارا اپنی بیوی کے ساتھ جو بھی  
 ایثار ہے بیچ میں بیچھے مت گھسیٹو۔“ اس نے مصطفیٰ کو  
 سنجیدگی سے ٹوکا تھا۔

”میں نے تمہیں صرف حقیقت بتائی ہے۔“ وہ  
 کہے بنانہ رو پایا۔

”میں اس حقیقت کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ ہم  
 دونوں کے بیچ کوئی ہمیر رہنمائی والی محبت نہیں رہی تھی۔  
 مصطفیٰ۔ وقتی انزیکشن بھی پسندیدگی بھی اور شاید کسی  
 حد تک راسخینڈنگ بھی ہم دونوں کی بنا کسی رکاوٹ  
 کے شادی نہ ہو جاتی تو شاید ہم آج بہت کامیاب ازدواجی  
 زندگی گزار رہے ہوتے اور وقت گزرنے کے ساتھ  
 ہماری محبت مزید مستحکم ہ جاتی، لیکن پھر وہی بات  
 مصطفیٰ کہ ہماری محبت کوئی اتفاقی یا لازوال ٹائپ کی  
 محبت نہ تھی۔ یہ محبت وصل وصال پر مبنی تھی۔ جب ایک  
 دوسرے کو نہ مل سکے اور ایک دوسرے کی نگاہوں سے  
 او جھل ہو گئے تو آہستہ آہستہ محبت کا جذبہ بھی سوزنا  
 گیا۔ ہاں میں مانتی ہوں کہ شریعہ شریعہ میں نہیں ہے  
 پھر کریم بست ڈریس رہتی تھی مجھے لگتا تھا کہ یہ اینڈ  
 آف لائف ہے، لیکن پھر فرائز میری زندگی میں آگیا۔  
 اس نے نہ صرف مجھ سے محبت کی بلکہ پورے عزت و  
 احترام سے مجھے اپنی زندگی کا حصہ بنایا۔ یقین کرو، میں  
 اس کے ساتھ اتنی خوش گوار زندگی بسر کر رہی ہوں کہ  
 تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اگر مجھے بھی تمہارا خیال آتا

بھی ہے تو ذہن میں پہلی سوچ کی پیدا ہوتی ہے کہ اللہ  
 نے تمہیں میرے مقدر کا حصہ اسی لیے نہ بنایا تھا کہ  
 مجھے فراز کا ساتھ نصیب ہونا تھا اور پھر میں بے ساختہ  
 اللہ کا شکر بجالاتی ہوں۔ اس کی مصالحتیں سمجھنا ہم  
 انسانوں کے بس کی بات کمال۔“

حوریہ اس کے وجود کو بچھتاؤں کی بھیڑ میں جھونک  
 کر چلتی بنی تھی۔ اللہ کی جس مصلحت کو حوریہ اپنی  
 خوش نصیبی گردان رہی تھی وہ فہم و ادراک اسے  
 کیوں نصیب نہ ہو سکا۔ اللہ نے اسے بھی ایک ٹیکہ  
 باجیہ پاک باز اور خوب صورت بیوی کا ساتھ دیا تھا۔  
 خوب صورت اور سلجھے ہوئے بچے جن کی تربیت کا  
 کریڈٹ بھینا، ان کی ماں کو جاتا تھا۔ مالی آسودگی رزق  
 کی فراوانی، معاشرے میں قابل عزت مقام، شکر  
 کرنے کا کوئی ایک پہلو تھا، پھر اتنے برسوں سے اپنے  
 خونی رشتہ داروں سے خود کو قطع تعلق کیا ہوا تھا۔ بیوی  
 کو بھی اس کے اپنوں سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ بابا  
 جان نے زور زبردستی سے اس کی زندگی کا فیصلہ کر دی دیا  
 تھا تو ایک حد تک ناراضی دکھا کر اسے اپنی بہن بھری کا  
 خاتمہ کرونا چاہیے تھا۔ ناعصہ کی شادی کے موقع پر وہ  
 بے ہوش ہوئے کے باوجود جھک گئے تھے۔ اس کی منت کی  
 تھی کہ وہ خود ساختہ ناراضی ختم کر کے بسن کی ڈوبی کو  
 کندھا دینے آجائے۔ اس نے بنا جواب دیے فون  
 کٹ دیا تھا۔ انہوں نے دوبارہ کال کی۔ اس بار فون  
 عقیقہ نے اٹھایا تھا۔

”اگر تمہیں شادی میں جانے کا زیادہ شوق ہو رہا ہے  
 تو اپنے تایا جان سے کہو کہ تمہیں آکر لے جائیں،  
 لیکن پھر میرے گھر کے دروازے تمہارے لیے ہمیشہ  
 کے لیے بند ہو جائیں گے۔“ وہ اتنا تیز بولا تھا کہ فون  
 کے دوسری طرف اس کی آواز سن لی گئی اور پھر دوسری  
 طرف سے فون رکھ دیا گیا۔ اس روز کے بعد حوری  
 والوں کی طرف سے کوئی رابطہ نہ ہوا تھا۔ وہ اتنا کٹھور کہ  
 پلٹ کر کبھی باپ بھائی کی خبر نہ لی۔ لیکن اس کے  
 اپنوں کو اطلاع ملنے کی دیر بھی۔ وہ ایک کال پر دوڑے  
 آئے تھے۔ وہ ماضی کی غلطیوں کی معافی مانگنا چاہ رہا تھا



اور وہ لوگ اسے ماضی دوہرانے کی اجازت ہی نہ دے رہے تھے۔ اب واپسی کا سفر تھا اور گاڑی کی آرام وہ سیٹ سے پشت ٹکائے وہ مسلسل ماضی میں ہی گم تھا۔ جب حویلی کے پھاٹک کے آگے گاڑی جا رہی تو جیسے ماضی کے خیالات کی رو بھی منقطع ہو گئی، تکلیف وہ ماضی بیت چکا تھا۔ خوش گو اور حال منتظر تھا۔



حویلی آنے سے پہلے انا بیہ، سلمان اور منعان جو تھوڑی بہت جھجک محسوس کر رہے تھے اب اس کا لہر خاتمہ ہو چکا تھا۔ واوا، تالیا، تالی اور پھوپھو ان کے واری سدھتے جا رہے تھے۔ انہیں چٹا چٹا کر پیار کر رہے تھے، لیکن دل کی پیاس بجھنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ ”چلو بھی کزن! تمہاری تو بچپن کی خواہش پوری ہو گئی، اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیٹھے بٹھائے، تمہاری ہنم عمر بس عطا کر دی۔ اب مجھے اپنی سہیلی کے رتبے سے بنا کر اس سے اپنی دوستی گاتھ لو۔“ شہیار سے چھوٹے شہرام نے علیزہ کو مخاطب کیا۔

شہیار اور شہرام مرنٹھی کے بیٹے تھے جبکہ ناعمہ کے تین بچے تھے، سب سے بڑی علیزہ پھر موصد اور ممد۔ علیزہ ہمیشہ خاندان میں کسی لڑکی کے نہ ہونے کی وجہ سے اللہ سے شکوے کے موڈ میں رہتی تھی اور اس بات پر ناعمہ سے ڈانٹ بھی کھاتی تھی۔ شہرام سے اس کی بہت دوستی تھی اور شہرام نے رضا کارانہ طور پر اسے بطور سہیلی اپنی خدمات پیش کر رکھی تھیں۔ اب بھی وہ ہنستے ہوئے اس حوالے سے علیزہ کو چھیڑ رہا تھا۔

”بالکل بالکل اب مجھے چھ فٹ کے ”سہیلے“ نما سہیلی کی ضرورت بھی نہیں۔ مجھے میری سہیلی بہتر چاہیے۔“ علیزہ مزے سے بولی تھی۔ ”پھوپھو! آپ کی لاڈلی سے زیادہ طوطا چشم بندہ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔“ اس نے ناعمہ سے شکوہ کیا۔

”میں بندہ نہیں بندی ہوں جناب۔ اللہ کی نیک

بندی۔“

علیزہ ترنت بولی تھی۔ انا بیہ مسکراتے ہوئے ان کی نوک جھونک سن رہی تھی۔ زندگی کے ان رنگوں سے اس کی قطعی آشنائی نہ تھی، لیکن یہ سب اسے بہت دلچسپ اور اچھوتا لگ رہا تھا زندگی میں پہلی بار اس نے اپنے ماں باپ کے چروں پر اتنا سکون اور طمانیت محسوس کی تھی۔ ناعمہ پھوپھو اپنا گھر بار چھوڑ کر وہ دن سے حویلی میں ہی مقیم تھیں۔ علیزہ کی انا بیہ سے واقعی بہت اچھی دوستی ہو چکی تھی۔ سلمان اور منعان بھی ہر وقت موصد، محب کے ساتھ کھیل کود میں مصروف رہتے، شفیق اور پر خلوص سی میمونہ تالی بھی انا بیہ کو بہت اچھی لگی تھیں۔ اتنے برسوں بعد بھی انہیں کھانے پینے میں مصطفیٰ اور عقیفہ کی پسند ناپسند بخوبی یاد تھی۔ مصطفیٰ کے لیے برہیزی کھانا بنانا مجبوری تھی، لیکن وہ عقیفہ اور بچوں کے لیے کھانے کا اہتمام کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑتی تھیں پھر بھی ان کا دل مطمئن نہ ہوتا۔

”کوفتوں کے لیے اتنا بہترین قیمہ مل گیا تھا میں نے اور تم نے منع کر دیا۔“ میمونہ کو بھرے دسترخوان پر کوفتوں کی کمی کھلی تھی۔

”اس ہرے مسالے کے چکن، گاجر میتھی اور فروٹ براؤنل کے بعد کوفتوں کی گنجائش کہاں بچتی تھی بھئی! عقیفہ مسکرائی تھیں۔

”دراصل چینی جان! آپ شادی کے بعد پہلی بار میکے آئی ہیں نا اسی لیے امی اتنا اہتمام کر رہی ہیں۔“ شہرام نے مسکرا کر عقیفہ کو مخاطب کیا۔ انا بیہ کو اپنی زور سے ہنسی آئی تھی کہ اسے اچھو لگ گیا۔

”شہرام! یار کھانے کے ٹائم تو پھلچھڑیاں چھوڑنے سے گریز کیا کرو۔“ شہیار نے پانی کا گلاس بھر کر انا بیہ کو دیا، ساتھ ہی شہرام کو ٹوکا تھا۔ وہ سوری بھائی کہہ کر خاموش ہو گیا۔ شہرام انا بیہ کے عین سامنے بیٹھا تھا۔ انا بیہ نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی بھوری آنکھوں میں اب بھی شرارت چل رہی تھی اور ”تینا“ کوئی اور ہنستا مسکراتا جملہ اس کے ہونٹوں پر بھی چل





ڈاکٹر مریحہ وکیلیاں | MCPS, FCPS  
 ڈاکٹر مریحہ وکیلیاں | MCPS, FCPS

Butterfly  
 BREATHABLES



پاکستان میں پہلی بار سب سے زیادہ آرام دہ

بٹر فلائی Breathables ٹیکسٹائل

جسکی اوپری سطح کاٹن کی طرح سلاخ اور جھینٹیں

نہ نظر آنے والے ہارنیک سوراخوں کا مجموعہ ہے

آکسیجن با آسانی گزر کر آپکی جلد تک پہنچتی ہے

کرریشنز اور ناگوار بو سے محفوظ رکھتی ہے



یہ ٹوٹی کسی بھی دوسرے ٹیکسٹائل میں نہیں





رہا تھا کہ ابھی آپ دونوں صرف کئی سہیلیاں ہی بنی ہیں۔ میرے خیال میں اس حویلی میں صرف میں ہی ہوں جو ابھی تک آپ کی نظر عنایت سے بچا ہوا ہوں، لیکن میں آپ کو بتا دوں آپ کو بس بتانے کا میرا قطعاً کوئی ارادہ نہیں۔“ اس پر نگاہیں جماتے ہوئے بظاہر سنجیدگی سے بولا تھا، لیکن آنکھوں میں شرارت موجود تھی۔

”پندرہ بیس دن تک دادا جان دلہنیں آجائیں گے۔“

انابہ یہ بولکھلا کر فقط اتنا ہی کہہ پائی تھی۔ شہرام کو ہنس روکنادہ بھر ہو گیا تھا۔

\*\*\*

ایک عمر اپنوں سے دور رہنے کے بعد اب الگ ہونے کا کسی کا دل ہی نہ کر سکتا۔ مصطفیٰ پندرہ بیس دن بعد بچوں کو لے کر گاؤں چلے جائے وہاں سے بھی کسی نہ کسی کا آنا جانا گارنٹا۔ تاج کل ناعمہ پھوپھو اور ثاقب پھوپھا، مصطفیٰ ہاؤس ”آئے ہوئے“ تھے۔ ثاقب پھوپھا کا ارادہ تھا کہ گاؤں کی تھوڑی سی زمین پر فردخت کر کے شہر میں مناسب قیمت کا کوئی گھر خریدیں۔ بچوں کی تعلیم کی وجہ سے وہ لوگ شہر شفٹ ہونا چاہ رہے تھے۔ علیزہ نے گاؤں کے اسکول سے میٹرک کیا تھا پھر قریبی قصبے کے ہائیر سیکنڈری اسکول سے ایف اے، لیکن اسے لی اے پراسیورٹ ہی کرنا پڑا تھا کہ ناعمہ پھوپھو کا اسے ہائل سیٹجے کو دل نہ مانتا تھا۔ اب وہ میٹرز کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ مہد اور موجد کی بہتر اسکولنگ کا بھی مسئلہ درپیش تھا۔ انہوں نے اس مسئلے کا یہی حل نکالا کہ گاؤں چھوڑ کر عارضی طور پر شہر سکونت اختیار کر لی جائے۔

مصطفیٰ اور عقیقہ بغض تھے کہ ناعمہ کی فیملی ان ہی کے ساتھ رہائش اختیار کر لے، لیکن ثاقب وضع و آراء شخص تھے انہوں نے سیتھ سبھاؤ سے معذرت کر لی تھی، لیکن یہ ضرور کہا تھا کہ مصطفیٰ اپنے علاقے میں ہی ان کے لیے کوئی مناسب سا گھر دیکھ لیں۔ انابہ

رہا ہو گا، لیکن وہ خلاف توقع خاموش ہی رہا۔  
تایا کے بچوں میں انابہ کا پہلا تعارف شہیار سے ہوا تھا۔ مصطفیٰ کی طبیعت خرابی کا سن کر باپ اور دادا کے ساتھ وہ ہی شہر پہنچا تھا۔ انابہ کے دل میں ہمیشہ سے ہی یہ ارمان رہا تھا کہ کاش اس کا کوئی بڑا بھائی ہو۔ اس نے شہیار کو فوراً ”بڑے بھائی کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا۔ وہ بھی اس کا چھوٹی بہنوں کی طرح ہی خیال رکھ رہا تھا۔

حویلی پہنچ کر اندازہ ہوا کہ ہنس مکھ سے شہیار بھائی کا چھوٹا بھائی تو ان سے بھی زیادہ ہنسوڑ، چلبلا اور شوخ مزاج ہے۔ شہیار بھائی حویلی میں تایا جان کے قائم مقام کی حیثیت رکھتے تھے۔ زمینوں کا سارا انتظام و انصرام انہوں نے سنبھال رکھا تھا۔ شہرام بڑے بھائی کا کا خاصہ لحاظ اور ادب کرتا تھا۔ جبکہ شہرام ہی کیا شہیار کے سامنے تو علیزہ بھی بہت ادب اور نمیز سے رہتی تھی۔ مزے سے بھر پور چند دن گاؤں میں گزار کر وہ واپس آگئے تھے، لیکن اس بار دادا جان بھی ان کے ہمراہ تھے۔ یہ انابہ کی فرمائش تھی جس کو حیات احمد نے کر سکتا۔ شہرام نے البتہ خوب شور مچایا۔

یہ واقعہ ہے انابہ بی بی، حویلی کی سب چیزوں پر آپ نے پکا قبضہ جما لیا۔ میری اگلوٹی سیملی مجھ سے چھین لی، اب یہ ہر وقت آپ سے راز و نیاز میں مشغول رہتی ہے۔ میرے بڑے بھائی جو ہر وقت میرے توکان کھینچنے کے درپے ہوتے ہیں۔ آپ کے اصلی دوڑے بھائی بن گئے ہیں۔ امی، ابو وہ چوڑیں گھنٹے آپ کے واری صدقے جاتے رہتے ہیں۔ باقی بچے کے تھے دادا، انہیں آپ ساتھ لیے جا رہی ہیں۔ ”شہرام خاموشی سنجیدگی سے اس سے لڑنے آیا تھا۔ انابہ کا چہرہ فوری ہو گیا۔ فوری طور پر شہرام کے شکوک کا اسے کوئی جواب نہ سوچا تھا۔

”شہرام کے بچے پریشان کر کے رکھ دیا میری بہن کو۔“ علیزہ نے انابہ کی بولکھلائی شکل دیکھ کر شہرام کو لڑاؤ۔

”کوئی، یعنی کہ یہاں بھی بہنپا کا نگہ لیا۔ میں تو سمجھ



کریں۔ پتا نہیں یہاں کس ڈاکٹر سے علاج کروا رہی ہو۔“ انابہ بولی تھی۔

”ماموں کو تکلیف مت دینا۔ میں کل خود آجاؤں گی۔ چیک اپ بھی کروالوں گی ماموں سے اور اب تم میری فکر چھوڑو۔ یہ بتاؤ کتنے دن کے لیے آئے ہو۔“

واپسی کب کی ہے؟“ اس نے پوچھا تھا۔  
”موسم صبح نکل لیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ کل کا دن تو ہے نا۔ کل میں صبح آجاؤں گی اور شام تک حویلی ہی رکوں گی اور ہاں شہرام لایا ابھی نہیں پہنچا؟“

علیہ کو جیسے اچانک یاد آیا تو پوچھ بیٹھی۔ شہرام کی انجینئرنگ مکمل ہو چکی تھی اور وہ پچھلے تین ماہ سے لاہور میں جا رہا تھا۔ اب انابہ کا اس سے حویلی میں سامنا کم ہی ہوتا تھا اور وہ اس بات پر شکر بھی مناتی تھی۔ انابہ جانے کیوں اس شخص کی بھوری شرارتی آنکھوں سے گھبرا سی جاتی تھی۔

”یعنی اس ویک اینڈ پر موصوف نے بھی گاؤں آنا ہے۔“ انابہ نے علیہ کا سوال سن کر برا سامنا بنایا تھا۔

”اس کا مطلب ہے نہیں پہنچا۔“ علیہ ہنس پڑی تھی۔

”ویسے مجھے تو لگتا ہی نہیں کہ شہرام شہر یا بھائی کا بھائی ہے شہر یا بھائی کتنے سوبر ڈسٹ اور میجیور ریسٹیلنٹ کے مالک ہیں۔ ہر طرح کی ذمہ داری بھی شہر یا بھائی کے سر پر ہے تو کس میں ماسٹرز کرنے کے باوجود زمینیں سنبھال رہے ہیں۔ شہرام کو دیکھ کر تو لگتا ہی نہیں کہ اس میں بھی کسی قسم کا احساس ذمہ داری پایا جاتا ہے۔ بس وہ تو باتیں بنانے کا ماہر ہے۔“ انابہ نے دونوں بھائیوں کا تقابل کیا تو علیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

”اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شہر یا بھائی جیسا شان دار شخص کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ تم نے ان کی جو خوبیاں گنوائی ہیں، ان میں چار پانچ خوبیاں مزید بھی شامل کی جاسکتی ہیں، لیکن یار! شہرام بھی کسی سے کم تو نہیں۔“

پھوپھو کی فیملی کے اپنے پاس آنے پر بہت پر جوش اور خوش ہو گئی تھی۔ کچھ ہی عرصے میں اس کی اور علیہ کی ایسی دوستی ہو گئی تھی جیسے وہ بچپن سے ساتھ بل بڑھ کر جوان ہوئی ہیں۔



بابا جان نے مصطفیٰ کو کسی اہم بات پر مشورے کی غرض سے بلوایا تھا۔ عقیقہ اور بچوں کو لے کر وہ حویلی پہنچ گئے۔ خلاف توقع علیہ ان لوگوں کی آمد کی خبر پر کچھ بھی ملنے نہ پہنچی تھی۔ اس نے ناعمہ پھوپھو سے استفسار کیا تو انہوں نے اس کی طبیعت خرابی کا بتایا تھا۔ انابہ فوراً اس سے ملنے جا پہنچی۔ پھوپھو کا گھر بھی قریب ہی تھا۔

”کیا ہوا ہے علیہ؟“ چواتنا کیوں اترا ہوا ہے، کیا طبیعت زیادہ خراب ہے۔“

انابہ اسے دیکھ کر صحیح معنوں میں پریشان ہوئی تھی۔ ابھی میں دن پہلے تو وہ ناعمہ پھوپھو اور شاقب پھوپھو کے ہمراہ شہر آئی تھی جب بالکل ٹھیک تھا کہ اب اس کی شکل دیکھ کر لگ رہا تھا جیسے وہ بے ہوش ہو۔ رنگت زرد ہو رہی تھی آنکھوں کے گرد حلقہ بھی نمایاں تھے۔

”بس یار! بخار ہو گیا تھا۔“ علیہ نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

”بخار میں تو کسی کی اتنی سی شکل نہیں نکلتی۔“ انابہ کی تشویش کم نہ ہوئی۔

”میرا یہ ہی حال ہو جاتا ہے یار! تو کئی کئی سال معمولی سافلو تک نہیں ہوتا اور ایک بار مار بڑ جاؤں تو تندرست ہونے میں عرصہ لگ جاتا ہے۔“ انابہ نے کھا کر منہ کا ذائقہ خراب ہے بھوک اڑ گئی ہے۔ راتوں کو نیند نہیں آتی طبیعت بے چین رہتی ہے۔ بس اسی لیے تمہیں ڈھیلی ڈھیلی لگ رہی ہوں۔“ علیہ نے اس بار تفصیلی جواب دے کر اسے مطمئن کرنا چاہا۔

”میں پاپا سے کہتی ہوں، وہ اگر تمہارا چیک اپ



ذرا اس کا تعلیمی ریکارڈ اٹھا کر دیکھو۔ اتنے ذہین اور قابل انجینئر کو کہہ رہی ہو کہ وہ صرف باتیں بٹانے کا ماہر ہے۔ وہ اگر سن لے تو تمہیں جتنا سناے گا، تمہیں اس کا اندازہ ہی نہیں۔“

علیحدہ مسکراتے ہوئے اسے ڈرا رہی تھی۔ انابہہ ہنس پڑی تھی۔

\*\*\*

رات کھانے کے بعد حیات احمد نے مصطفیٰ عقیقہ اور انابہہ کو اپنے کمرے میں بلوایا تھا۔ کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ اصل موضوع پر آئے تھے۔

”تمہیں یاد ہے مصطفیٰ! برسوں پہلے اسی کمرے میں ایک خاص بات کرے کے لیے میں نے تمہیں اپنے پاس بلوایا تھا۔“ بابا جان مصطفیٰ سے مخاطب تھے۔ وہ خاموشی سے سر جھکا کر رہ گئے۔

”جب میں تمہاری زندگی سے متعلق اہم فیصلہ کرنے جا رہا تھا لیکن میں نے اس بارے میں تم سے مشاورت کی ضرورت تک محسوس نہ کی اور تمہیں سیدھے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اس سنگین غلطی کا خمیازہ تمہیں برسوں بھگتنا پڑا اب میں ماضی والی غلطی دہرانے کا قصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس لیے جو بات میں اب کرنے لگا ہوں، ہے میرا فیصلہ نہ سمجھو۔ فیصلہ تم لوگوں نے ہی کرنا ہے۔“

”بابا جان! آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔ کھل کر کہیں نا۔“ مصطفیٰ نے خیرالی سے باپ کو مخاطب کیا۔ حیات احمد مسکرائے تھے۔

”مرتنضی اور میمونہ شہرام کے لیے انابہہ کا ہاتھ مانگ رہے ہیں۔ بولو کیا کہتے ہو۔ یہ سوچ کر اقرار نہ کرنا کہ انکار سے بھائی بھالوج کے دل کو بھیس پڑے گی۔ مرتنضی نے کہہ دیا ہے کہ تمہارا ہر فیصلہ اسے خوش دلی سے قبول ہو گا۔“ حیات احمد رمانیت بھرے لہجے میں مخاطب ہوئے۔ مصطفیٰ اور عقیقہ نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں کی آنکھوں میں خوشی نمی بن کر چمکنے لگی

تھی۔

”مرتنضی بھائی نے یہ سوچا بھی کیسے کہ ہمارا جواب انکار میں ہو سکتا ہے۔ انابہہ کے لیے شہرام سے بہتر انتخاب اور کیا ہو سکتا ہے بابا جان۔“ مصطفیٰ نے سوچنے کے لیے ایک منٹ لمبی نہ لیا تھا۔ عقیقہ نے بھی گردن ہلانے کی تائید کی۔

”وہ غلطی مت کرو مصطفیٰ! جو میں نے کی تھی۔“ بابا جان مسکرائے تھے۔ مصطفیٰ نے نا اچھی سے انہیں دیکھا۔

”انابہہ کو میں نے اسی لیے بلوایا ہے تاکہ اس کی رائے اور مرضی بھی جان سکوں۔ اپنی زندگی کے متعلق ہر طرح کا فیصلہ کرنے کا اختیار انابہہ کے ہی پاس ہے۔ ہاں بیٹا! بغیر شہرام کے تم مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دو۔ تم پر کوئی زور نہیں ہے۔ سوچنے کے لیے وقت لینا چاہتی ہو تو لے لو۔ اپنے ماں باپ کی رائے کو ایک طرف رکھتے ہوئے اپنی دلی آواز کو مد نظر رکھو اور پھر کوئی فیصلہ کرو۔“ حیات احمد انابہہ سے پیار سے مخاطب ہوئے۔ انابہہ کیا کہتی اس کے دماغ و گمان میں بھی نہ تھا کہ دادا جان نے یہ بات کرنے کے لیے بلوایا ہے۔

”بابا جان! آپ نے شہرام سے اس کی مرضی پوچھی ہے؟“ کچھ لمحوں کے توقف کے بعد انابہہ نے ذرا جھجکتے ہوئے پوچھا تھا۔

”دیکھ لیا مصطفیٰ! تم سے زیادہ عقل مند میری پوتلی ہے۔“ حیات احمد خوش ہوتے ہوئے بولے۔

”مصطفیٰ دھیرے سے ہنس پڑے تھے۔ دل میں ایک بار پھر احساسِ ندامت جاگا تھا۔ یہ ان کا ماضی تھا جس سے خائف ہو کر باپ نے اتنی لمبی تمہید باندھی تھی اور بیٹی کا ذہن بھی ان ہی خطوط پر سوچ رہا تھا۔“

”اس رشتے میں مرتنضی اور میمونہ کے ساتھ ساتھ شہرام کی پسندیدگی کا بھی عمل دخل ہے بیٹا۔ تم ہر طرح کا خدشہ ذہن سے جھٹک ڈالو۔ تمہیں صرف اپنے دل سے پوچھ کر اپنی مرضی معلوم کرنی ہے۔“ حیات احمد مشتاقانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولے تھے۔ انابہہ



کے گلوں پر حیا کی لالی پھیلی تھی۔

”آپ لوگ جو بھی فیصلہ کریں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”جیتتی رہو۔ خوش رہو۔“ حیات احمد بے پناہ خوش ہو گئے تھے۔ ”پھر مرتضیٰ اور میمونہ کو خوش خبری سنا دوں کہ شہیار کے ساتھ ساتھ شہرام کے سر پر بھی سرا باندھنے کی تیاری کریں۔“ وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

”تو شہیار کا رشتہ اوکے ہو گیا۔ مجھے مرتضیٰ بھائی تو کچھ متذبذب لگ رہے تھے۔“ مصطفیٰ نے پایا جان سے استفسار کیا تھا۔ انابہ نے حیرت سے انہیں دیکھا، اس کے تو علم میں ہی نہ تھا کہ شہیار بھائی کا رشتہ بھی کہیں طے ہونے جا رہا ہے۔

”ہاں مرتضیٰ کچھ چلچلا رہا تھا، لیکن میں اسے وہ غلطی نہیں دہرانے دوں گا جو ماضی میں مجھ سے سرزد ہوئی۔“ حیات احمد ٹھوس لہجے میں بولے تھے۔ مصطفیٰ ایک بار پھر شرمندہ سے ہو گئے تھے۔

”شہیار میرا بہت سمجھ دار اور فرماں بردار پوتا ہے۔ چھوٹی عمر سے ہی اس نے اپنے کندھوں پر بھاری ذمہ داریاں اٹھا رکھی ہیں۔ زمینوں کا انتظام و انصرام سنبھالنا اسے مرتضیٰ کے بس کی بات نہیں تھی اور میں تو عرصہ ہو اسب کچھ چھوڑ چکا ہوں۔ شہیار چاہتا تو تعلیم مکمل کر کے اپنی مرضی کی نیا چیز لیتا، لیکن اس نے تو تعلیم کے ساتھ ساتھ بھی باپ کا بھرپور ہاتھ بٹایا۔ شوق کی خاطر ڈگری تو لے لی، لیکن عملی طور پر تو وہ زمین دار ہی ہے نا۔ وہ خاندان کے مفاد میں اپنی خواہش سے دستبردار ہو گیا حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ سزیت کرنا اس کا جنون تھا۔ اسے تو اس کا لرشب بھی مل رہا تھا، لیکن اس نے آگے پڑھائی جاری نہ رکھی۔ جب وہ ہمارے لیے اپنی خواہش چھوڑ سکتا ہے تو ہمیں بھی فرائض کو ثبوت دیتے ہوئے اس کی ایک جائز خواہش کو پورا کرنے میں تعاون کرنا چاہیے۔ حالانکہ مرتضیٰ اور میمونہ اس کے لیے کچھ اور سوچے بیٹھے تھے، لیکن میں نے سمجھایا تو بات ان کی عقل میں سما ہی گئی۔“ حیات

احمد ثقافت انداز میں مسکرائے تھے۔

”میمونہ بھابھی نے مجھے سین کی تصویر دکھائی ہے۔ مجھے بھی بچی بہت پسند آئی ہے۔ پھر واقعی جب وہ شہیار کی پسند ہے تو ہم سب کو بھی خوشی خوشی اس کی پسند کو اپنالینا چاہیے۔“ عقیفہ نے سر کی بات کی تائید کی۔

انابہ کے لیے آج کا دن دہرے انکشاف کا دن تھا۔ شہیار بھائی اپنی کلاس فیلو میں انٹرنلڈ تھے، ان کا وہاں رشتہ طے ہونے جا رہا تھا اور شہرام اس کا تصور کر کے ہی انابہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ دادا جان نے بتایا تھا کہ اس رشتے میں شہرام کی پسندیدگی کا بھی بڑا اثر عمل دخل ہے اور ان کی بات سن کر وہ بری طرح شامی ہو گئی۔

آج کی رات بھی انوکھی تھی۔ وہ بستر پر گڑبڑا رہے تھے، مگر نیند نہ آ رہی تھی۔ جیسے ہی آنکھیں بند کرتی تھیں، شہرام کی بھوری آنکھیں ذہن کے پردے پر مسکرانے لگتی۔ اس کے دل کی یہ کیفیت انابہ کے لیے خود بھی حیران کن تھی۔ جب دادا جان نے اس کے لیے شہرام کا رشتہ پیش کیا تو وہ شدید ترین حیرت سے دوچار ہوئی تھی، لیکن وہ خوش گوار حیرت تھی۔ دل میں ایک لحظے کے لیے بھی شہرام کے لیے کوئی ناپسندیدگی نہ ابھری تھی۔ اس کا یہ ہی مطلب تھا کہ دل کے نہال گوشوں میں پہلے ہی اس کے لیے پسندیدگی موجود تھی۔ انابہ سوچے جا رہی تھی اور دھیمی مسکان ہونے پر پچھیلی جا رہی تھی۔

رات کا وہ سراپا بھی گزر نے کو تھا، مگر نیند ہنوز آنکھوں سے دور تھی پھر دل میں چائے کی طلب جاگی تھی۔ وہ دبے پاؤں کچن کی طرف آئی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ رات کے اس پر بھی کوئی باورچی خانے میں موجود ہو گا۔ وہ شہرام تھا جو فریج کھنگالنے میں مصروف تھا انابہ نے واپس پلٹنا چاہا، مگر قدموں کی آہٹ پر شہرام سر اٹھا چکا تھا۔

”واپس تو ایسے مڑ رہی تھیں انابہ بی بی جیسے کچن میں کوئی بھوت کھڑا دیکھ لیا ہو۔“ وہ مسکرایا تھا۔



”میں وہ نہیں تو۔ میں تو چائے پینے آئی تھی۔“  
اس نے ہنکراتے ہوئے وضاحت دی۔

”تو بی بیجی۔ کس نے روکا ہے۔“

”نہیں۔ کوئی خاص طلب نہیں۔ صبح بی لوں گی۔“  
اس کے بوکھلائے ہوئے انداز پر شہرام کو ہنسی روکنا  
دوبھر ہو گیا۔

”صبح تو سب ہی پیئیں گے، لیکن آپ کا دل تو  
اس وقت کر رہا ہے جب ہی تو رات کے اس پر آپ  
باورچی خانے کی طرف نکلتی ہیں۔“

”آپ بھی تو رات کے اس پر باورچی خانے میں  
میں موجود ہیں۔“ انابہ نے بھی بڑا خفا ہو کر بتایا تھا۔

”ہاں تو آپ کی سولہ آٹے پی پی ہے، لیکن قصہ کچھ  
یوں ہے کہ میں لاہور سے رات گیارہ بجے گھر پہنچا۔

امی نے کھانے کا پوچھا، مگر سفر میں سینڈویچ وغیرہ لے  
چکا تھا سو اس وقت بھوک محسوس نہیں ہوئی۔ امی

منطقی ہو کر سونے چلی گئیں، مگر مجھے تھوڑی دیر میں  
بھوک لگنا شروع ہو گئی۔ پہلے تو بھوک برداشت کی

جب برداشت سے باہر ہوئی تو یہاں آگیا۔ اب مسئلہ یہ  
ہے کہ قریح میں تین طرح کے سالن تو موجود ہیں، مگر

ہاٹ پاٹ میں ایک روٹی تک نہیں۔ آپ اتفاق سے  
اُدھر نہیں گئی ہیں تو بلکہ ایک روٹی تو ڈال دیجیے۔“

شہرام نے بے تکلفی سے نمائش کی۔  
”روٹی؟“ انابہ نے تھوک نکالا تھا۔

”مجھے روٹی نہیں بنانی آتی۔“ اس نے شرمندہ سے  
لہجے میں بتایا۔

”گناہ گنا، آپ کو روٹی نہیں بنانی آتی۔“ شہرام بولا تھا  
اور کیا نہیں تھا اس کے لہجے میں۔ حیرت، افسوس

یعنی قصہ۔۔۔  
”ہاں، لیکن میں سیکھ لوں گی۔“ انابہ نے بوکھلائے

ہوئے لہجے میں یقین دلایا۔ اس معصومیت کے اظہار  
پر شہرام فدا ہی تو ہو گیا، مگر کچھ لاہر واسالہ بنا کر بولا۔

”بھئی، آپ روٹی بنانا سیکھیں یا نہ سیکھیں۔ میری  
صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔“ انابہ بھی اپنی بوکھاہٹ پر

دل ہی دل میں خود کو کوس رہی تھی۔

”مجھے غینہ آرہی ہے، میں سونے جا رہی ہوں۔“  
آپ بھی سو جائیں، فجر کے وقت تائی جان انھیں گی تو  
آپ کو ناشتہ بنا دیں گی۔“

وہ کہہ کر رکی نہ تھی اور پیچھے کھڑے شہرام کے لبوں  
پر دلکش مسکراہٹ پھیل گئی۔ رات گھر پہنچنے کے بعد  
وہ سیدھا دادا کے کمرے میں پہنچا تھا۔ وہ سونے کی

تیاری کر رہے تھے پوتے کو دیکھ کر مسکرائے۔  
”بتائیے، گرینڈیا کیا بنا میری عرض کا؟“ اس نے

پوچھتے ہی استفسار کیا۔  
”حقیقتہ طور پر منظور کر لی گئی ہے۔“ انہوں نے

مسکرا کر بتایا تھا۔  
”گرینڈ گرینڈیا؟“ اس نے بے ساختہ ان کے ہاتھ

چوم لیے تھے۔  
دل میں اسی وقت سے خواہش بے دار ہو رہی تھی

کہ کاش انابہ کی ایک جھٹک دکھال دے جائے، لیکن  
وہ اپنے کمرے میں سونے جا چکی تھی، کیا خبر تھی کہ

رات کے اس پر دعا قبولیت کا درجہ پا جائے گی۔ انابہ  
کا گھبراہٹ، بوکھلایا اور شرابا سا روپ دل کو اندر رات

میں گھس کر گیا تھا۔ شہرام گنگلاتے ہوئے اوڈن میں  
سالن گرم کرنے لگا پھر سکون سے بیٹھ کر سیر ہو کر

کھانا کھایا تھا۔ وہ روٹی کھا لینے کے بعد بھی ہاٹ پاٹ  
میں ڈیڑھ روٹی باقی بچی تھی۔

\*\*\*

عقیفہ اپنی کسی سہیلی سے ملنے جا رہی تھیں۔ انابہ  
بھی ان کے ساتھ ہوئی۔ وہ آج کم سے کم شہرام کا سامنا

کرنا چاہ رہی تھی۔ دو ڈھائی گھنٹے بعد ان کی پوایسی ہوئی تو  
ناعمدہ آئی ہوئی تھیں۔

”علیحدہ آج بھی نہیں آئی پھو پھو۔“ انابہ نے  
پھونکتے ہی استفسار کیا۔

”آئی ہے بیٹا! شاید پایا جان کی اسٹڈی سے کوئی  
کتاب لینے گئی ہے۔ تم مجھو میرے پاس۔ میں نذیراں

کو بھیج کر بلوالی ہوں اسے۔“ ناعمدہ پھوپھو نے اپنے  
قریب اس کے بیٹھنے کی جگہ بنائی۔



غم اور غصے کی شدت سے اسے اپنے قدموں پر کھڑا ہونا دشوار ہو گیا۔ ہنا کچھ مزید سنے وہ واپس پلٹ آئی تھی۔ ایک رات میں ہی جو شخص دل کے اتنا قریب ہو گیا تھا وہ اب نگاہوں تک سے گر گیا۔ کتنا بڑا مبالغہ! دعا باز اور ہر جانی شخص تھا وہ۔ انا بیہ لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔

کل جب اس نے دادا جان سے پوچھا تھا کہ کیا اس رشتے میں شہرام کی مرضی بھی شامل ہے تو دادا جان نے کتنا خوش ہو کر اس کی عقل مندی کو سراہا تھا، لیکن اس سے زیادہ نادان بھلا کون ہو سکتا تھا۔ علیزہ اور شہرام کی دوستی اور بے تکلفی اس سے ڈھکی چھپی تو نہ تھی، آخر اس کے ذہن میں یہ خیال کیوں نہ آیا کہ علیزہ اور شہرام کے درمیان دوستی کے علاوہ کوئی اور رشتہ بھی ہو سکتا ہے۔ محبت کا وہ رشتہ جس کو شہرام نے تو مزے سے بچپن کی حماقت قرار دے دیا تھا۔ کتنا بے مولیٰ کر دیا تھا اس نے علیزہ کے جذبات کو انا بیہ کا دل اپنی سہیلی کے لیے رو رہا تھا۔

ٹھوڑی دیر بعد جب علیزہ اسے ڈھونڈتی ہوئی اس کے کمرے میں آئی تو انا بیہ کو اس سے نگاہیں ملانے دشوار ہو گیا۔

”جیکے جیکے بات بچی کروانی اور ہمیں خبر تک نہ ہونے لگی۔ مبارکوں! بھئی مبارک!۔“ علیزہ ٹانگی سے کہتے ہوئے اس سے پٹ گئی تھی۔ انا بیہ اس کے حوصلے اور طرف پر شدید ر رہ گئی۔

”میرا خیال ہے کہ تمہیں ابھی تک یقین ہی نہیں آیا کہ شہرام سے تمہارا رشتہ طے ہو گیا ہے۔“ علیزہ اس کی ٹھوڑی چھوتے ہوئے مسکرائی تھی۔

”یہ سب کچھ اچانک ہوا ہے علیزہ۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کل دادا جان ممایا سے یہ بات کریں گے۔“ انا بیہ وضاحت دیتے ہوئے روہا سی ہو رہی تھی۔

”تو پاگل لڑکی! اس میں اتنا پریشانی ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ خوش قسمت ہو تم تو جو کسی کی چاہت پر اس کی زندگی کا حصہ بننے جا رہی ہو۔“

”ایک منٹ پھوپھو۔ میں علیزہ کو لے کر آتی ہوں۔“ وہ فوراً علیزہ کی تلاش میں نکلی۔ اپنے دل کی بدلتی کیفیات سننے کے لیے اسے ایک راز دان درکار تھا اور بہنوں جیسی کزن سے زیادہ اس کا راز داں اور کون ہو سکتا تھا بھلا۔ دھیمی مسکان لبوں پر سجائے وہ اسٹڈی کی طرف آئی تھی۔ اندر سے آتی شہرام کی آواز سن کر وہ ٹھٹھک کر رکی تھی۔

”رو کر تم نے یہ اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔ پلیز علیزہ! چپ ہو جاؤ۔“

وہ منت بھرے لہجے میں علیزہ سے مخاطب تھا۔ علیزہ کی سسکیاں تھمے کا نام نہ لے رہی تھیں۔ انا بیہ دروازے کی اوٹ میں ہو گئی۔ یہ ایک اضطرابی فعل تھا۔ پتا نہیں وہ شہرام کا سامنا نہ کرنا چاہ رہی تھی یا پھر علیزہ کے یوں بری طرح رونے کا سبب دریافت کرنا چاہتی تھی، کل علیزہ نے اسے تو ٹال دیا تھا، لیکن اس کی اجڑی شکل دیکھ کر کوئی بھی ادا نہ لگا سکتا تھا کہ معاملہ کچھ اور ہے جس کی وہ پردہ پوشی کر رہی ہے۔

”میرے سامنے میرا محبوب کسی اور کا ہو رہا ہے اور تم کہتے ہو میں اُنسو بھی نہ بہاؤں۔ ایک آنسو بہانا تو میرے اختیار میں ہے شہرام۔ پلیز آنسو بہانے سے تو مت رو۔“ وہ منت بھرے لہجے میں بولی۔

”خود کو بھلا علیزہ۔ عقیقہ چچی کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ بغیر چاہت کے کسی کی زندگی کا حصہ بنا جائے تو اپنا آپ مٹا دے اور محبت پانے میں ایک عمر لگ جاتی ہے۔ عقیقہ چچی میں پھر بہت صبر برداشت اور حوصلہ تھا۔ تم کبھی اتنا انتظار نہیں کریاؤ گی۔“ شہرام نے اسے سمجھانا چاہا تھا۔

”تم کہتے سنگ دل ہو شہرام۔ یہ خواب تمہارے خود میری آنکھوں میں سجائے تھے جب میں اس راہ پر چل پڑی تو مجھے مثالیں دے کر سمجھانے چلو ہو۔“ علیزہ بھڑکی تو گئی تھی۔

”وہ میرا بچپنا تھا علیزہ! میری حماقت تھی۔“ شہرام بظاہر افسردہ سے لہجے میں مخاطب ہوا تھا، مگر باہر کھڑی انا بیہ کے رگ و پے میں اشتعال کی شدید لہر دوڑ گئی۔



چاہتی تھی سو سب کچھ وقت کے دھارے پر چھوڑ دیا۔



اس کے فائنل سمسٹر کے فوراً بعد شادی کی تاریخ رکھ دی گئی تھی، پہلے شہریار کی بارات سین کے گھر گئی تھی۔ اگلے روز وہ شہرام کے سنگ رخصت ہو کر حویلی پہنچ گئی تھی۔ علیزہ نے شادی کی تمام رسموں میں بھرپور شرکت کی تھی لیکن انابیہ نے بہت بار اسے اپنی بیگلی پلکیں صاف کرتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ بلا کا ضبط تھا اس لڑکی میں۔ اس نے انابیہ کی بہن بن کر شہرام سے ملنا سناٹا بھی وصول کیا تھا اور اس وقت اس کی لہجہ سناٹا نہیں عروج پر تھیں۔

انابیہ میں اس جتنا ضبط نہ تھا۔ وہ مسلسل روئے جاری تھی۔ سب اس روئے کو دلہن کے روایتی روئے پر محمول کر رہے تھے مگر وہ تو جیسے آج سارے آنسو بہا رہا تھا چاہتی تھی شاید اسی طرح دل پر دھرا بوجھ کچھ کم ہو جائے۔

”انابیہ میری جان! میرے بچے کیوں درد کر خود کو مکان کر رہی ہو بیٹا، اس طرح تو کل سین بھی نہیں روئی تھی۔ تم تو اپنوں میں آتی ہو۔ ہم سب ہیں نا تمہارے پاس۔ کل صبح سویرے تمہارے ماما پاپا اور سلمان سنعان بھی آجائیں گے۔“ ناعمدہ پھوپھو نے اسے بانسوں میں بچھ کر خوب پیار کیا تھا۔

”سب رسمیں چھوڑو۔ ناعمدہ! میری بیٹی کو اس کے کمرے تک لے جاؤ۔ اس نے تو درد کر اپنا برا حال کر لیا ہے۔ بابا جان نے دیکھ لیا تو وہ بھی پریشان ہو جائیں گے۔“ میمونہ بیگم نے ناعمدہ کو مخاطب کیا۔ ناعمدہ اسے کمرے تک چھوڑ آئی تھیں۔

”میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے پھوپھو! یہ پیو لری آثاروں؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔ ناعمدہ اس کا سوال سن کر کچھ پریشان ہوئی تھیں۔

”کچھ دیر رک جاؤ۔ بس ہم ابھی شہرام کو تمہارے پاس بھیجتے ہیں۔“ وہ اسے موقع محل کی نزاکت سمجھاتا چاہ رہی تھیں۔

علیزہ مسکرا کر بولی تھی، لیکن اس کا بیجا بھگا لہجہ انابیہ کے دل کو چیر گیا تھا۔ کاش وہ علیزہ کے لیے کچھ کر سکتی، مگر وہ علیزہ کے لیے کیا کر سکتی تھی۔ آنے والے دنوں میں یہ ہی سوچ اسے بری طرح ہلکان کرتی رہی تھی۔ میمونہ مائی نے بہت پیار سے اس کی انگلی میں شہرام کے نام کی انگوٹھی پہنا دی تھی۔ اس وقت حویلی میں ہر شخص کے چہرے پر بڑی واضح خوشی دیکھی جاسکتی تھی۔ انابیہ کا بس نہ چلنا کہ وہ حویلی کے ایک ایک شخص کو پکڑ کر شہرام کی حقیقت سے آگاہ کر دے، لیکن شہرام جیسے ڈھیٹ شخص سے کچھ بعید نہ تھا ہو سکتا ہے وہ صاف مکر ہی جا تا کہ اس نے کبھی علیزہ کو بھی اپنی محبت کا یقین دلایا ہے، جب وہ علیزہ کے منہ پر کمرہ سلکتا تھا کہ وہ محبت، بچپن کی حماقت تھی تو سب کے سامنے بھی وہ یہ بات ہنسی مذاق میں اڑا سکتا تھا۔ باتوں کا تو ویسے بھی کھلاڑی تھا۔

انابیہ ہرگز نہ چاہتی تھی کہ علیزہ کی بات کا بھرم ٹوٹے جب اس نے خود کسی کے سامنے صدائے احتجاج بلند نہیں کی تو انابیہ بھی یہ کیسے کر سکتی تھی۔ کبھی خیال آتا کہ وہ علیزہ کا نام لیے بغیر شہرام سے جڑا رشتہ تو درجے تو ہو سکتا ہے شہرام علیزہ کو اپنا لے لیکن پھر شہرام کی سفاکی یاد آجاتی۔ وہ علیزہ کو جتا رہا تھا کہ بغیر جاہت کے کسی کی زندگی میں شامل ہوا جائے تو زندگی عقیدہ کی طرح گزرتی ہے۔ شہنہ اور نا آسودہ۔“

اپنی ماں کی پوری زندگی انابیہ کی نگاہوں کے سامنے گھوم جاتی۔ آبلہ پانی کا یہ سفر اختیار کرنا واقعی علیزہ کے بس کی بات نہ تھی۔

انابیہ سوچتی جاتی اور دماغ پھٹنے کو ہو جاتا۔ سب کچھ جانتے ہو جیتے شہرام کی زندگی میں شامل ہونا اس کے بس سے باہر تھا لیکن اپنے ماں باپ کے خوشی سے دکتے چہرے دیکھتی تو بے بسی کا احساس سوا ہو جاتا۔ اس نے زندگی میں کبھی انہیں اتنا مطمئن اور خوش باش نہ دیکھا تھا۔ اس کا ایک جذباتی قدم خاندان بھر کی خوشیوں کو داؤ پر لگا سکتا تھا۔ برسوں کے پھڑے ہوئے اب جا کر ملے تھے وہ پھر سے ان میں کوئی دراڑ نہ ڈالنا





Pakistan's ONLY  
Baking Soda  
Toothpaste



دانت سفید چاک



اتنے میں میسونہ دووہ کا فلاسک لیے آگئی تھیں۔  
ناععہ نے دھیرے سے بھانج کو اس کی طبیعت سے  
آگاہ کیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے بیٹھی تھی۔  
چہرے پر شدید تکلیف کے آثار تھے۔

”مائی جان پلیز۔ کوئی ایزی ساڈریس نکال دیں۔  
میں ریلیکس کرنا چاہتی ہوں۔ اسی حالت میں رہی تو  
مجھے خدشہ ہے کہ بے ہوش ہی نہ ہو جاؤں۔“ وہ تھکے  
تھکے لہجے میں بولی۔ ناععہ اور میسونہ نے بے بسی سے  
ایک دوسرے کو دیکھا۔

”ٹھیک سے میرے نیچے! تم پریشان نہ ہو۔ ناععہ  
وارڈوب سے کوئی سوٹی جوڑا نکال دو انا بیہ کو“ میں  
سرور کی کوئی دوا لاتی ہوں۔“ میسونہ نے ناععہ کو  
خائب کیا۔ ناععہ کی مدد سے اس نے جیولری باؤں  
اور دوپٹے میں انگلی پنوں سے نجات حاصل کی بھی پھر  
کپڑے تبدیل کر کے وہ بیسٹریئم دراز ہو گئی۔ اور  
شہرام کے آنے سے پہلے وہ غیند کی داری میں اتر چکی  
تھی۔

\*\*\*

صبح اس کی آنکھ کھلی تو چند لمحوں کے لیے تو سمجھ  
میں نہ آیا کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ پھر گردو پیش پر  
نگاہ ڈالی۔ بچان پر پھینکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ نہ  
چاہنے کے باوجود وہ آخر شہرام کے نام سے جڑ کر اس  
کے بیڈ روم میں پہنچ چکی تھی۔ قسمت کے سامنے کس  
کا زور پڑتا ہے بھلا۔ وہ گہری سانس لیتی ہوئی اٹھ بیٹھی  
تھی۔ اتنے میں ڈرنگ روم سے شہرام برآمد ہوا۔  
انابہ نے صرف ایک نگاہ اس پر ڈالی پھر جامد احساسات  
کے ساتھ اپنی جگہ بیٹھی رہی۔

”صبح بخیر زندگی۔“ شہرام اسے دیکھ کر بہت محبت  
سے مسکرایا تھا۔ انابہ نے اس پر دوبارہ نگاہ تک ڈالنے  
کی زحمت گوارا نہ کی تھی۔

”اب کیسی طبیعت ہے تمہاری۔“ وہ نرمی سے  
استفسار کر رہا تھا۔

”ٹھیک ہوں۔“ اس نے اٹھ بار انداز میں مختصر سا

جواب دیا۔

”چھی بات ہے۔ ویسے میں تاریخِ عالم کا پہلا دو لہا  
ہوں جس کی سلاگ رات بیوی کا سر دباتے ہوئے  
گزری ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے اسے چھیڑ رہا تھا۔

اگر وہ شہرام کی اصلیت سے آگاہ نہ ہوتی تو اس  
وقت دل میں اس کی اطلاع کی قائل ہو چکی ہوتی۔  
گزری رات اس نے شہرام کا انتظار تک نہ کیا تھا۔ مانا  
اس کی طبیعت خراب تھی لیکن جس طرح وہ کپڑے  
تبدیل کر کے لمبی تن گرسو گئی تھی کوئی اور ہوتا تو زندگی  
کی حسین رات کو اس بے وردی سے ضائع کرنے پر  
نکلی کا اظہار تو کرتا، لیکن وہ بنا کچھ جنائے بہت ہستے  
مسکراتے اس کی مزاج پر سی کر رہا تھا۔

”چلو تم فریش ہو لو پھر سب کے ساتھ مل کر ناشتہ  
کرتے ہیں۔“ شہرام کے کہنے پر وہ اٹھ گئی تھی۔ اس کا  
اصل مسئلہ شہرام تھا۔ وہ گھر کے باقی لوگوں کو اپنے  
روئے سے پریشان نہ کرنا چاہتی تھی۔ پھر گھر میں ایک  
اور دلہن بھی موجود تھی۔ انا بیہ جانتی تھی کہ اگر وہ  
سر جھاڑ نہ پھاڑ حلیے میں کمرے سے نکلے تو فوراً اس  
کا مقابلہ جی سنوری بین بن بھابھی سے کیا جائے گا۔

شیخ سی مائی جان کی رات والی مہربانی ہی بہت تھی۔  
وہ اب انیس شکایت کا موقع نہ دینا چاہتی تھی۔ نہادھو  
کر اس کے ہکا فیوزی کالڈانی کا سوٹ پہنا تھا۔ کندن کی  
نازک سی جیولری اور لائٹ سامیک اپ۔ آئینہ گواہی  
دے رہا تھا کہ وہ بہت خوب صورت لگ رہی ہے۔ اگر  
وہ کمرے میں موجود اپنے شہر کی آنکھوں میں جھانک  
لتی تو گواہی کے لیے آئینے کی ضرورت نہ پڑتی۔ شہرام  
بہت فرصت سے اس کے چہرے کے حسین نقوش  
تک رہا تھا۔ انا بیہ اسے لاکھ نظر انداز کرنے کی کوشش  
کرتی مگر اس کی نگاہوں کی قیش سے اس کی ہتھیلیاں  
پینہ پینہ ہو رہی تھیں۔

”بہت پیاری لگ رہی ہو۔“ ڈرنگ ٹیبل کے  
شیشے میں اپنے پیچھے کھڑے شہرام کا عکس دیکھ کر وہ سٹپٹا  
جی تھی۔

”معلوم ہے مجھے۔“ اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے



ہوئے اس نے سرد مری سے جواب دیا اور بیڈ پر بیٹھ کر سیٹل ہنسنے لگی۔

”ایٹی پر اب کم اتا بیہ؟ تمہاری طبیعت ٹھیک ہے نا۔“ شہرام اس کے سر و سپاٹ روئے پر قد رے الجھا تھا یہ دو لہنوں والی روایتی شرم نہ تھی، اس کا رویہ ناقابلِ غم سا تھا۔

”میں نے کہا ناں، ٹھیک ہے میری طبیعت۔ آئیں چلیں، ناشتے پر سب انتظار کر رہے ہوں گے۔“ اتا بیہ نے اسی سپاٹ سے کچے میں شہرام کو مخاطب کیا۔

”جلتے ہیں، پہلے اپنا رو نمائی کا تحفہ تو لے لو۔“ شہرام نے مسکراتے ہوئے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر دھری مٹلی ڈیا اٹھائی تھی پھر اس کے قریب بیٹھا تھا۔ اتا بیہ ٹھس انداز میں دونوں ہاتھ گود میں دھرے بیٹھی رہی۔ شہرام نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں کیتے ہوئے نازک سی ڈانمزد رنگ اس کی انگلی میں پٹائی تھی۔ انگوٹھی پس لینے کے بعد اتا بیہ نے ایک تخت اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑایا تھا۔

”تم مجھ سے کس بات پر خفا ہو اتا بیہ؟“ شہرام اس کے انداز پر شدید رہ گیا تھا۔ اتا بیہ نے ایک مٹلی ٹکا اس کے چہرے پر ڈالا۔

”مجھ بھوک لگی ہے، میں ناشتا کرنے جا رہی ہوں۔“ شہرام کی بات کا جواب دیے بنا وہ اٹھ گئی تھی۔ شہرام نے ایک گہری سانس اندر کھینچی۔ وہ پھیلیاں بوجھنے کا ہیٹ سے ہی بہت شوقین تھا لیکن جو پہلی بار اپنی شاوی شدہ زندگی کی اولین صبح بوجھنی پر رہی تھی دماغ میں دور دور ملک اس کا کوئی ممکنہ جواب موجود نہ تھا۔

\*\*\*

”تم بہت خوش قسمت ہو اتا بیہ۔! سب تمہارے اپنے ہیں، تم سب کو اچھی طرح جانتی ہو۔ کوئی شرم جھجک یا گھبراہٹ نہیں۔ میں تو بہت کنفیوز ہو رہی ہوں یار۔“ ولیمے کی تقریب میں دولسن بنی سبین اس سے مخاطب تھی۔

”شروع شروع میں تو یہ شرم اور گھبراہٹ فطری ہے سبین بھابھی۔ کچھ وقت لگے گا پھر آپ بھی سب میں تھل تھل جا میں گی۔“ اس نے سبین کو دوستانہ انداز میں تسلی دی۔

”ہاں، کل شہیار بھی مجھے یہی سمجھا رہے تھے۔“ شہیار کا ذکر کرتے ہوئے سبین کے لبوں پر شرمیلیں مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

چند لمحوں پہلے سبین اتا بیہ پر رشک کر رہی تھی اور اب اتا بیہ کو اس کی قسمت پر جی بھر کر رشک آ رہا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں سبین کی خوشیوں کے سدا قائم رہنے کی دعا کی تھی۔

\*\*\*

شہرام ہرگز توقع نہ کر رہا تھا کہ آج بھی اس کی دلہن دھلے دھلائے چہرے کے ساتھ بیڈ پر نیم دراز ملے گی۔ اتا بیہ نے شہرام کے قدموں کی چاپ سنی تو لحاف منہ تک تان لیا تھا۔ کچھ لمحوں تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی وہ شاید فریش ہوئے دھواں روٹ گیا تھا۔ ذرا دیر بعد کمرے میں کچھ کھٹو پڑ ہوئی تھی اور پھر دوبارہ خاموشی چھا گئی۔ اتا بیہ نے لحاف کا ذرا سا کنارہ جیسے سے ہٹایا۔

شہرام جائے نماز بچھائے قبلہ رو کھڑا تھا۔ وائٹ کپڑوں کے شلووار قمیص میں وہ رات کے اس پہر بھی کتنا فریش اور تروتازہ لگ رہا تھا۔ جس اسٹاک سے وہ نماز پڑھ رہا تھا، اتا بیہ چند لمحوں کے لیے اس پر سے نگاہیں نہ ہٹائی۔

”اؤنہ! صرف حقوق اللہ کی ادائیگی سے کیا ہوتا ہے۔“ اتا بیہ نے خود کو متاثر ہونے سے روکا تھا۔ شہرام نے پورے سکون سے نماز کی ادائیگی کی تھی۔ اتا بیہ کا خیال تھا کہ وہ کل کی طرح ایسے سوتا جان کر خود بھی سو جائے گا لیکن یہ اس کی بھول تھی۔

”مجھے علم ہے تم جاگ رہی ہو۔ سونے کی ایکٹنگ چھوڑو اور اٹھو، مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“ شہرام کی سنجیدہ سی آواز اتا بیہ کے کانوں سے ٹکرائی



”بعض اوقات اپنوں کی محبت آپ سے وہ کام کروالیتی ہے جو شاید کوئی عمن پوائنٹ پر بھی نہیں کرواسکتا۔“ اس بار انابیہ جھکے جھکے لہجے میں بولی تھی۔

”تمہیں میری زندگی کے ساتھ یہ مذاق کرنے کی جرات بھی کیسے ہوئی۔؟“ شہرام جھنجھے لہجے میں چیخا۔ شہرام کے تیور دیکھ کر ایک لمحے کو تو انابیہ کا دل بھی پسلیوں میں زور سے دھڑکا تھا۔ مگر وہ چہرے کو بے تاثر رکھنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ کچھ لمحوں تک شہرام اسے قہر مارنگاہوں سے تلکمارہا پھر اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا تھا۔ اسے یوں بے سکون دیکھ کر انابیہ کے رگ و پے میں سکون اتر گیا تھا۔

”تو شہرام صاحب! آپ علیحدہ کو میری ماں کی مثال دیتے ہوئے کبھار ہے تھے کہ بغیر چاہت کے کسی کی زندگی کا حصہ بنا جائے تو زندگی کتنی نا آسودہ اور غیر مطمئن گزرتی ہے۔ اب یہ ہی نا آسودہ زندگی آپ کو جینی پڑے گی۔ میں اپنے بہوں کو ذہنی اذیت سے بچانا چاہتی تھی اس لیے ان کے سامنے آپ کی اصلیت نہ کھول پائی جس طرح یہ رشتہ جوڑنا میری مجبوری تھی ویسے ہی یہ رشتہ نبھانا آپ کی مجبوری ہے شہرام! وہ رہ خند مسکراہٹ چہرے پر سجائے دل ہی دل میں اس سے مخاطب تھی۔

”تم سو سکتی ہو۔“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد شہرام سپاٹ سے انداز میں اس سے مخاطب ہوا۔ انابیہ پھر سے لحاف میں گھس کر سونے کی کوشش کرنے لگی تھی۔



رواج کے مطابق سیمین بھابھی کے میکے والے نہیں ساتھ لے گئے تھے اس کی ماں کا تو میکہ ہی یہ تھا۔ مفیدہ سلطان، سلطان کے ساتھ دو روز نہیں رکی تھیں۔ مصطفیٰ کو اسپتال کی مصروفیت کی وجہ سے جانا پڑا تھا۔ وہ اور شہرام سب کے سامنے ایک خوش باش پس کا تاثر پیش کرنے میں کامیاب ٹھہرے تھے۔ داتا

تھی۔ وہ پھر بھی اپنی جگہ بے حس و حرکت پڑی رہی تو شہرام نے اس کا لحاف پکڑ کر کھینچا تھا۔

”کیا بد تمیزی ہے شہرام۔“ انابیہ ناگواری سے کہتی اٹھ بیٹھی تھی۔

”بد تمیزی یہ نہیں، بد تمیزی وہ ہے جو تم کر رہی ہو۔“ وہ حق سے گویا ہوا۔

”مجھے غیبت آرہی ہے۔ سونا ہے مجھے۔“ انابیہ کی بیزارگی کا عجب ہی عالم تھا۔

”تم مجھے مسلسل ایواؤنڈ کر رہی ہو۔ کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ انابیہ۔! مسئلے بات چیت سے ہی سولو ہوتے ہیں۔“ وہ بہت قہل مزاحی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ انابیہ نے ایک تیکھی نگاہ اس کے خوبو چہرے پر ڈالی۔

”میں تو پہلے ہی تمہاری محبت میں گھاگل ہو چکا ہوں۔ یوں نگاہوں کے تیر بہت چلاؤ یار۔“ وہ بے بسی سے مسکرایا تھا۔ ایک فضا مری مسکراہٹ انابیہ کے لبوں پر پھیل گئی تھی۔

”اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو یہی سب کچھ تم اس شادی پر راضی نہیں تھیں اور تمہیں زبردستی اس

بندھن میں باندھا گیا ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ رشتہ سو فیصد تمہاری مرضی پر طے ہوا ہے پھر اس طرح کی باتوں کو کر رہی ہو۔؟“

”اب غلط ہے تمہیں شہرام! میں اس رشتے کے لیے قطعاً“ راضی نہ تھی۔ تب کی زندگی کا حصہ بننے کے لیے مجھے اپنے دل پر جتنا جبر کرنا پڑا ہے آپ اس کا تصور

تک نہیں کر سکتے۔“ وہ حق کی بات بولی تھی۔

شہرام اس کی بات سن کر بھونچکا گیا تھا۔

”تم جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو۔“ وہ اس کی بات پر اٹھیں کرنے کو تیار نہ لگتا تھا۔

”سچ ہی کہہ رہی ہوں شہرام۔“ اس کے چہرے کی بکھری اذیت دیکھ کر انابیہ کے دل میں ٹھنڈک سی اتری تھی۔

”اگر تم اس رشتے پر راضی نہیں تھیں تو ہاں کیوں کی تھی کسی نے عمن پوائنٹ پر تو مجبور نہیں کیا تھا تمہیں؟۔“ وہ غصے سے لب جھنجھے استفسار کر رہا تھا۔



تھی ہفتے دس دن کی چھٹی اور لے لیتے۔ کہیں گھومنے پھرنے ہی چلے جاتے۔ شہریار اور ستین بھی تو جا رہے ہیں۔ ساتھ تم بھی چلے جاتے بیٹا۔ اس بار مشکل میں ڈالنے والی میمونہ تھیں۔

”نی اٹھال مزید چھٹی ملنا مشکل ہے امی۔ ان شاء اللہ کچھ عرصے بعد چھٹی لے کر تارن اسیا زکی طرف گھومنے نکلیں گے۔ جب موسم بھی خوشگوار ہوگا۔ کیوں اٹا بیہ۔“ بات کے اختتام پر اس نے اٹا بیہ سے بھی رائے طلب کی۔

”جی جی بالکل۔“ وہ اچانک مخاطب کیے جانے پر چونکی مگر پھر تابعداری سے اس کی بات کی تائید کی تھی۔ میمونہ کو سو کی تابعداری برٹوٹ کر بیار آیا تھا۔ ”محبوبہ ٹھیک ہے جیسے تم لوگوں کی مرضی۔“ وہ مطمئن ہوئی تھیں۔

شہرام لاہور چلا گیا تھا۔ اٹا بیہ کا خیال تھا کہ وہ اس کے جانے کے بعد خود کو مطمئن محسوس کرے گی مگر حیرت انگیز طور پر آج کمرے کے ساتھ ساتھ اس کا دل بھی خالی خالی ہو رہا تھا۔ وہ دس دن تک ایک جھٹ تیلے دو اجنبیوں کی طرح رہے تھے۔ اب شہرام بھی اسے مسلسل نظر انداز کرنے کی پالیسی اپنائے ہوئے تھا۔ اٹا بیہ اس بات پر شکر مانتی تھی کہ اس نے غصے اور ضد میں اگر انتقام کی کوئی اور راہ نہیں اپنائی تھی۔ اگر اس کی فطرت کے ہر جانی بن کو نظر انداز کر دیا جاتا تو وہ بظاہر بہت ڈسینٹ اور سلیجی ہوئی عادات کا مالک تھا۔

اٹا بیہ اسے یاد کرنا نہ چاہ رہی تھی مگر لا شعوری طور پر اسی کو سوچے جاتی تھی۔ سب گھر والوں کو وہ باقاعدگی سے فون کرنا مگر اٹا بیہ کے ہیل فون پر اس کی کبھی کوئی کال نہ آئی۔ اسے خود پر شدید غصہ آتا تھا کہ وہ اس کے کسی منہج یا کال کا انتظار ہی کیوں کر رہی ہے۔ غصے کی جس آگ میں جلتے ہوئے وہ اس کی زندگی میں شامل ہوئی تھی، آخر وہ آگ سو کیوں پڑتی جا رہی

جان، تیا ابو، تالی جان سب اس کے واری صدقے جا رہے تھے۔ ستین صحیح کہتی تھی، وہ خوش قسمت تھی جو اتنے محبت کرنے والے اینوں کے درمیان تھی۔ ناعصا پھوپھو اور علیزہ آج کل گھر کا سامان بیک کرنے میں مصروف تھیں۔ وہ لوگ بس اب شہر شفٹ ہونے ہی والے تھے۔

”قسمت کی ستم ظریفی ہی ہے نا اٹا بیہ! پہلے تم وہاں اور میں یہاں اور اب میں وہاں اور تم یہاں۔ اپنی قسمت میں ایک دو بجے کے پاس رہنا تو لکھا ہی نہیں۔ علیزہ جاتے سے او اس ہو رہی تھی۔

”میں جب مانا پایا کے پاس کیا کروں گی تو پھر تم بھی ہمارے پاس رہنے آجایا کرنا۔“ اٹا بیہ نے اپنی پیاری سی سہیلی کو تسلی دی تھی۔

”تم لاہور سے اتنی جلدی جلدی تھوڑی آسکو گی۔“ علیزہ مسکرائی تھی۔

”لاہور کون جا رہا ہے؟“ اٹا بیہ لا پرواہی سے بولی تھی۔

”کیا مطلب کون۔ کیا شادی کے بعد بھی شہرام بے چارہ چیخڑا چھانٹ بن کر زندگی گزارے گا۔ لی لی! تیار رہی پکڑ لو، تمہیں اس کے گھر کی چولہا چکی سنبھالی ہوئے گی۔“ علیزہ نے اسے شرارت سے چیخڑا اس وقت اٹا بیہ محض مسکرا کر رہ گئی مگر اگلے دن وہ سر کے کھانے کے وقت ہنگو کا یہ ہی موضوع چھیڑ گیا تھا۔

”شہرام بیٹا! اب بڑائی ہے تمہاری۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ پہلے خدام، سہیل کو ساتھ لے جاؤ۔ ایار ٹمنٹ وغیرہ سیٹ کرو پھر اٹا بیہ کو ساتھ لے جانا۔“ مرنٹنی نے گھر کی ملازم کا نام لیتے ہوئے شہرام کو مشورہ دیا تھا۔ تیا کے مشورے پر اٹا بیہ گڑبگڑ گئی تھی۔

”اتنی چیخڑیوں کے بعد آس جو امن کروں گا بابا! کاموں کا انبار جمع ہوگا۔ ایار ٹمنٹ وغیرہ سیٹ کرنا تو خاصی فرصت میں کرنے والا کام ہے۔“

شہرام نے غدر تراشا تو اٹا بیہ نے سکون کا سانس لیا۔

”اتنی جلدی تم واپس جا رہے ہو۔ میں تو کہہ رہی



”آپ رات کے اس پہر ان سے چار جر لینے جائیں گے۔“ انابہ اچھل ہی تو پڑی۔ دروازے کی تاب گھماتے گھماتے شراب پلٹا تھا۔

”انتہا پاگل نہیں ہوں کہ اس ٹائم سین بھابھی کو جگا کر ان سے چار جر مانگوں۔ اسی کو جگانے جا رہا ہوں۔ سخت بھوک لگی ہے مجھے۔ اسی کھانا دے دیں گی۔“

”اس ٹائم مائی جان کو بے آرام کریں گے پھر کہہ رہے ہیں انتہا پاگل نہیں ہوں میں۔“ انابہ نے اس کے لمبے کی نقل اتاری۔

”تو لیا بھوکا سو جاؤں۔“ وہ تنک کر بولا تھا۔

”ویسے تو ایک رات بھوکا سونے سے بھی بندہ فوت نہیں ہو جاتا لیکن لادیتی ہوں کھانا۔“ انابہ جیسے اس کی سات بستیوں پر احسان کرتے ہوئے انھی تھی۔

”روٹی بنا کیجھنی؟“ شراب نے یقیناً ”طنزیہ“ کیا تھا وہ بنا جواب دیے کمرے سے نکل گئی تھی۔ شراب نے صوفے کی پشت سے سرنگا لیا ایک بے بس سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ دل بھی انسان کو کسے کیسے خوار کرواتا ہے۔ اس لڑکی کی ایک جھٹک دیکھنے کو آج دل اتنا بے تاب ہوا کہ وہ بنا کسی پروگرام کے اچانک گاؤں کے لیے نکل پڑا۔ تھکاوٹ اس کا جسم چور چور ہو رہا تھا۔ رات کی ڈرائیونگ اسے ہمت ہی بہت مشکل لگتی تھی مگر آج یہ مشکل کام اس نے برضا اور رغبت کیا تھا۔

صوفے کے سرنگائے ٹکائے ہی اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ جانے کتنا وقت گزرا تھا کہ برتنوں کی کھٹو پڑے آنکھ کھلی۔ انابہ بہاڑی سائز بیڈ کے ایک سرے پر دسترخوان بچھا کر کھانا چن رہی تھی۔

”اب آج بھی جائیں بھوک بھوک کا شور مچا رہے تھے اور بنا کھانا کھائے سو بھی گئے۔“ شراب نے تھکاوٹ اور نیند سے بوجھل ہوئی سرخ سرخ آنکھوں سے انابہ کو گھورا پھر ہاتھ دھونے وائش روم چلا گیا۔

انابہ صوفے پر جا بیٹھی تھی۔

”یہ کیا ہے؟“ شراب کھانے بیٹھا تو ہاٹ پاٹ میں سے روٹی سے ملتی جلتی چیز نکال کر حیرت سے استفسار

تھی۔ شراب کا جرم ابھی بھی اس کی نظر میں ناقابل معافی تھا پھر اسے کیوں لگتا تھا کہ جو سزا اس نے شراب کے لیے منتخب کی ہے، اس کی اذیت شراب سے زیادہ اسے بھگتنی پڑ رہی ہے۔ ابھی تو اس نے شراب کے ساتھ فقط دس دن گزارے تھے پھر کیوں اس کا دل موسم کی طرح پگھلتا جا رہا تھا۔

ہر روز اسے جواب میں بھوری آنکھوں والا ہنستا مسکراتا شراب نظر آتا تھا وہ ایسی ہی ایک رات بھی جب دروازے کی زوردار دستک پر اس کی آنکھ کھلی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔ گھڑی پر نگاہ ڈالی تو رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ اس ٹائم کون دروازہ بجا سکتا تھا اسے تھوڑا ڈر لگا تھا۔ اتنے میں دوبارہ دروازہ بجا تھا ساتھ ہی شراب کی آواز بھی سنائی دی۔ انابہ نے لپک کر دروازہ کھولا تھا۔

”کیسے گھوڑے بچ کر موتی ہو تم۔ کب سے دروازہ بجا رہا تھا۔“ وہ خفگی سے سرے میں داخل ہوا۔

”آپ اچانک کیسے۔ مائی جان نے تو نہیں بتایا تھا کہ آپ کے آنے کا کوئی پروگرام ہے۔“ انابہ نے حیرت سے استفسار کیا تھا۔

شراب نے ایک تیکھی نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی مگر جواب دینے کی زحمت نہ کی۔ انابہ کو اپنے بے نی جاؤں پر خود ہی غصہ آ گیا۔ ضرورت ہی کیا تھی اس شخص کے منہ لکھنے کی۔ وہ دوبارہ بستر میں گھس گئی تھی لیکن اب دوبارہ منہ آنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوا تھا۔

شراب نے سفری جیک صوفے پر رکھا۔ سائینڈ ٹیل پر دھرے جگ سے گلاس میں پانی اٹھایا۔ صوفے پر بیٹھ کر گھونٹ گھونٹ پانی پیا پھر مہربان ہاتھ میں لے کر چار جر کی تلاش میں نگاہیں دوڑا میں۔

”میرا چار جر کہاں ہے؟“ آخر انابہ سے ہی پوچھنا پڑا تھا۔

”سین بھابھی کے فون میں بھی وہ ہی چار جر لگتا ہے۔ ان کو اپنے والا نہیں مل رہا تھا میں نے آپ کا دے دیا۔“ انابہ نے اس بار سیاٹ سے انداز میں ہی جواب دیا۔ شراب نے گہری سانس اندر کھینچی تھی پھر دروازے کی سمت بڑھا۔



رکے تھے۔  
”اب اتنی تکلیف بھی نہیں ہو رہی ہوگی انابہ! پھر  
ایسے کیوں رو رہی ہو۔“ وہ اس پر خفا ہوتے ہوئے  
بولی۔

”یا گل ہوں اس لیے۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں  
بولی تھی۔

شرام خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر دسترخوان  
سمیٹ کر کچھ برتن سائیڈ ٹیبل پر اور کچھ ڈسک ٹیبل  
پر رکھ دیے۔ انابہ چپ چاپ اٹھ کر اپنے لحاف میں  
گھس گئی۔ ابھی بے آواز آنسوؤں نے بہت دیر تک  
اس کا تکیہ بھگونا تھا۔

\*\*\*

عجیب سی کیفیت نے اس کے وجود کا احاطہ کر رکھا  
تھا۔ شرام کو دس گئے کئی روز ہو چکے تھے۔ وہ اسے  
سوچنا نہیں چاہتی تھی مگر پھر بھی سوچے ہی جاتی۔ کبھی  
سوچتی کہ کاش اس روز وہ علیہ کو ڈھونڈ لی ڈھونڈ لی  
اسٹڈی تک نہ جاتی تو آج زندگی میں یہ بے سکونی اور  
خالی پن نہ ہوتا۔ بھلے سے شرام علیہ سے بے وفائی  
کر لیتا مگر یہ بات اس کے علم میں نہ آئی۔ شرام جب  
اس سے اپنی محبت کا اظہار کرتا تو وہ فوراً اس محبت پر  
ایمان لے آئی مگر اگلے ہی پل ایسی سوچوں پر وہ خود کو  
لتاؤ رہی ہوتی، ایک دھوکے باز اور ہر جالی شخص اس کی  
زندگی کا جھٹکا تو بن گیا تھا مگر وہ اسے اپنے دل میں کوئی  
جگہ نہ دینا چاہتی تھی۔ ہاں وہ اس کے دل میں کہیں نہ  
بستا تھا وہ اس بارے میں یقین بھی گمراہ اپنے دل میں  
جھانکنے سے ڈرتی بھی تھی۔

وہ اپنا دھیان بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتی۔ کبھی  
دادا جان کے پاس جا کر ان سے بچھلے وقتوں کے  
قصے سنتی۔ مرحومہ دادی کی باتیں، پایا اور تایا جان کی  
بچپن کی شرارتیں۔ کبھی سبین بھابھی کے پاس بیٹھتی تو  
وہ عمر گیس مسکراہٹ کے ساتھ اپنی اور شریار کی محبت  
کے قصے سنانے لگتیں۔

یونیورسٹی لائف کی باتیں۔ کیسے ان کی محبت کی

”یہ صحیح نہیں لگ رہی تو دوسری کھالیں۔ اس کے  
کنارے اتنے مونے نہیں ہیں اور گول بھی ہے۔“

انابہ کے کہنے پر اس نے دوسری روئی نکالی تھی۔  
اس روئی کے کنارے واقعی زیادہ مونے نہیں تھے،  
پہلی لمبوتری سی روئی کی نسبت وہ واقعی بیضوی شکل کی  
روئی تھی۔ شرام وہ کھا بھی لیتا اگر وہ اس بری طرح جلی  
نہ ہوتی۔“

”امی نے تمہیں ابھی تک روئی بنانا بھی نہیں  
سکھائی۔“ وہ خاصی بے چارگی سے پوچھ رہا تھا۔  
”کھیر پکوائی سے پہلے تالی جان مجھ سے روئی کیسے  
پکوا سکتی ہیں۔“ اس نے جیسے شرام کی عقل پر ناسف  
کا اظہار کیا۔

”امی کو مشورہ دیا کہ کھیر پکوائی کے بعد بھی تم  
سے روئی پکوائی مت کرو۔“ وہ صاف صاف مذاق  
اڑا رہا تھا۔

”زیادہ نخرے آرہے ہیں تو مت کھاؤ۔“ ایک تو  
اتنی زور سے میرا ہاتھ جل گیا، اوپر سے مجھے آپ کی  
باتیں بھی سننا پڑ رہی ہیں۔“  
رونے والی بات نہیں تھی مگر جانے کیوں انابہ کی  
بری طرح رونا آگیا۔ شرام گھبرا کر اٹھا تھا۔

”دھکاؤ ہاتھ۔“ وہ اس کے قریب بیٹھا پھر خود اس کی  
کھائی تھام کر جانے لگا۔

”یہ والا جلا ہے۔“ انابہ نے دائیں ہاتھ کی کھائی  
اس کے سامنے کی بہت بری طرح نہ سہی مگر جھٹنے کا  
نشان واضح تھا۔

”ایک دم پھوٹ لڑکی ہو تم اور برتاؤ وغیرہ کیوں نہ  
لگائی۔“ وہ ڈانٹتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ انابہ نے کوئی  
جواب نہ دیا۔ وہ تو بس بے تحاشانہ نے والے آنسوؤں  
کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شرام اٹھ کر واضح  
روم تک گیا تھا۔ وہ وہاں سے ٹوتھ پیسٹ اٹھا لیا۔  
اسے مخاطب کیے اس نے انابہ کی کھائی تھامی تھی اور  
جلی ہوئی جگہ پر ٹوتھ پیسٹ کا لپ سا کر دیا۔ جلی ہوئی  
جگہ میں ٹھنڈک سی اتر گئی تھی پھر بھی اس کے آنسو نہ



اس کی آنکھیں سب کی محبت پر نم ہوئی تھیں۔



گھر آکر واقعی اس کا دل بہل گیا تھا۔ سب سے پہلے تو علیزہ نے ہی اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔  
”کب سے تمہاری منت کر رہی تھی کہ شہر کا چکر لگاؤ۔ مجھے تمہارے ساتھ شاپنگ کرنی ہے اور ڈھیروں کام ہیں جنہیں نمٹانے کے لیے تمہارا ساتھ درکار ہے اور تمہارا وہاں انتقال لگا کہ یہاں آنے کا نام ہی نہ لے رہی تھیں۔“ علیزہ خفا ہو رہی تھی۔

”اب آگئی ہوں نا۔ کاموں کی لسٹ بناؤ۔ سارے کام تمہارا کر جاؤں گی۔“ اس نے اسے تسلی دی تھی اور پھر واقعی اس کا آدھا دن اپنے گھر تو آوہا نامہ پھوپھو کے ہاں گزرنا۔

اس روز بھی وہ علیزہ کے ساتھ شاپنگ پر نکلی تھی۔ خوب تھک بار کر دو دنوں ”مصطفیٰ باؤس“ نوٹے۔

”لگتا ہے ممد اور موحد بھی یہاں پہنچے ہوئے ہیں۔“ لان میں برپا ہونے والا شور شرابا گیت کے باہر بھی سنا جاسکتا تھا۔

”فٹ بال کا میچ ہو رہا ہو گا آج کل ہمارے بھائیوں کو فٹ بال کا جنون چڑھا ہوا ہے۔“ انابہ مسکرا کر بولی۔

اس کا اندازہ درست تھا ”اندر فٹ بال میچ جاری تھا لیکن لان میں ایک دراز کھڑا ڈی ایسا بھی تھا جس کی موجودگی کی توقع وہ کر ہی نہ سکتی تھی۔

”شہرام۔ واٹ آسیر رائزن۔“ انابہ سے پہلے علیزہ رجوش ہو کر چیخی۔ شہرام نے گردن موڑ کر دونوں کو دیکھا، مسکرایا اور پھر سیدھے ہوتے ہوئے فٹ بال کو زوردار گنگ لگائی تھی وہ شاید پینلٹی اسٹروک لینے کھڑا تھا۔ ان دونوں کی آمد سے گول کیپر بنے موحد کی توجہ ہٹی تھی جس کا اس نے فائدہ اٹھالیا۔

”یہ فاول ہے شہرام بھائی۔!“ موحد اور سلمان چیخنے لگے۔

شروعات ہوئی، کسے سین بھا بھی نے اپنے گھر والوں کو شہر بار بھائی کے لیے قائل کیا۔ ان کے پاس سنانے کو بہت سے قہقہے تھے اور انابہ کے پاس بہت سا فاسرغ وقت۔ اور پھر کبھی انابہ میمونہ سے کوئنگ سیکھنے کے ورے ہو جاتی۔ ہانڈی پکانے میں وہ پھر بھی زیادہ دلچسپی نہ لیتی تھی۔ ہاں کسی طرح تائی جان جیسی گول روئی بنانا وہ بھی سیکھ جائے اسی کو شش میں لگی رہتی۔ لیکن پھر اس کا سب کاموں سے جی اچاٹ ہونے لگا۔ اس کی طبیعت پر مچھائی مردنی سب کے نوٹس میں آنے لگی۔

”کیا بات ہے بیٹا۔ اتنا چپ چپ کیوں رہنے لگی ہو۔“ تائی مائی کے بعد جب دادا نے بھی یہی استفسار کیا تو اس کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

”اس گدھے کا نمبر لاؤ اس سے کہوں گا کہ فوراً آئے اور تمہیں اپنے ساتھ لاؤ ورنہ لے کر جائے۔“ مجھے گھر یاد آ رہا ہے دادا جان۔“ وہ روتے روتے بھی ترنت بولی تھی۔

”تو پھر دادا اپنے باپ کا نمبر۔ وہ بھی کم گدھا نہیں ہے۔“ دونوں میاں بیوی ہر دس دن بعد نم سے اپنے

یہاں پہنچ جاتے ہیں انہیں تمہارے احساسات کی پروا ہی نہیں۔ شادی کے بعد لڑکی کا دل صرف ماں باپ سے ملنے کے لیے ہی اواس نہیں ہوتا اسے اپنا گھر گھر کی چیزیں اپنا کمروں سے یاد آتا ہے کہتا ہوں مصطفیٰ سے کہ آئے اور تمہیں ساتھ لے جائے۔ کچھ دن گھر گزار آؤ تو دل بہل جائے گا۔“ دادا جان مشفقانہ انداز میں بولے تھے اتنے میں شہر بار وہاں آگئے۔

”ارے ارے یہ بن موسم کی برسات کیوں ہو رہی ہے۔“ وہ ٹھٹھک کر رکا۔

”گھر یاد آ رہا ہے۔ میں مصطفیٰ کو فون کرنے لگا ہوں کہ پہلی فرصت میں آئے اور انابہ کو ساتھ لے جائے۔“ دادا جان نے بتایا تھا۔

”یہ بھی کوئی پریشان ہونے والی بات ہے۔ میں صبح خود چھوڑ آؤں گا۔“ شہر بار نے پیار سے اس کا سر تھپکا تھا۔ وہ سب واقعی اس سے محبت کرتے تھے اس بار



”کوئی ناؤل نہیں۔ میں نے مقابلہ برابر کر دیا۔

”دو چھوٹوں کو ایک ٹیم میں ڈال کر تم ان سے مقابلہ کر رہے تھے۔ آئندہ ٹیم ہمنائے وقت یہ بے ایمانی مت کرنا۔“ شہرام نے سلمان کے بال بکھیرے تھے۔ پھر علیزہ اور انابہ کی طرف بڑھ آیا۔

”مجھے دیکھ کر میری مسز ہمیشہ ہوش و حواس کھو بیٹھتی ہیں۔ سلام تک کرنا بھول جاتی ہیں۔ السلام علیکم زوجہ محترمہ اینڈ بیسٹ فرینڈ آف زوجہ محترمہ۔“ وہ شرارت بھرے لہجے میں بولا تھا۔

”صرف تمہاری زوجہ محترمہ کی ہی بیسٹ فرینڈ نہیں ہوں۔ کسی زمانے میں تمہاری بھی بیسٹ فرینڈ تھی۔ تم نے تو مجھے ایسے بھلا لیا کہ مجھے یقین ہی نہیں آتا۔ نہ کوئی فون نہ مہیج، سچ اگر تمہاری شادی انابہ سے نہ ہوئی ہوتی تو میں کی جھپٹتی کہ بیوی آنے کے بعد تم نے آنکھیں بدل لیں۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہاری اس طوطا چٹھی کو کیا نام دلاؤ۔“

علیزہ اس پر بگڑ رہی تھی۔ بے تکلفی کا یہی پرانا انداز۔ انابہ چاہ کر بھی اس کے لہجے میں کسی قسم کی نرمی محسوس نہ کر سکی۔ شہرام بھی اسے مٹتے ہوئے چھین رہا تھا۔ اس وقت وہ صرف اتنے دوست لگ رہے تھے۔ اگر شہرام کو وہیٹ تصور کر بھی لیا جاتا تو علیزہ کے اتنے ناراضی ہو کر وہ کس کھاتے میں ڈالتی۔

انابہ نے اسے شہرام کے سامنے، شہرام کے ہی لیے بلک بلک کر روئے دیکھا تھا۔ شادی کی تمام تقریبات میں علیزہ کی بھیگی جلیں انابہ کی نگاہوں سے او جھٹل نہ رہ پائی تھیں، لیکن وہ جب بھی شہرام کو مخاطب کرتی تھی تو اس کا لہجہ اور انداز بالکل ناراض ہوتا۔ کوئی شخص اتنی شان دار اور جان دار ایکٹنگ کیسے کر سکتا تھا۔ انابہ کا دل بڑی طرح الجھ رہا تھا۔

”کھڑے کھڑے کہاں کھو جاتی ہو۔ چچی جان آواز دے رہی ہیں۔“ شہرام نے اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا۔ وہ جیسے یکدم جو کئی علیزہ پہلے ہی رہائشی حصے کی جانب بڑھ چکی تھی وہ بھی شہرام کی معیت میں آگے بڑھ گئی۔

\*\*\*

”اور لوٹا شہرام۔ یہ پالک پیئر تو خصوصاً تمہارے لیے ہی بنایا ہے تمہیں بہت پسند ہے نا۔“ واما دیکھی یاد گھر آیا تھا اور عقیقہ اسے قل پر دو ٹوکول دے رہی تھیں۔

”کھانا بہت لاجواب بنا ہے چچی جان۔! بہت دن بعد اتنا سیر ہو کر کھایا ہے اور روٹیوں کا تو جواب ہی نہیں۔ کیسی گول روٹی ہے ہمنارے بھی موٹے نہیں اور جلی ہوئی تو بالکل نہیں۔“ اس نے سانس پر پیچنگیر میں سے ایک روٹی اٹھا کر بے ساختہ تعریف کی۔

”لاہور میں بازار کی روٹی کھانا پڑتی ہوگی نا اسی لیے گھر کی روٹی کی قدر آ رہی ہے۔“ عقیقہ مسکرائی تھیں۔

”نہیں۔ گھروالی کی روٹی یاد آگئی تھی اسی لیے اس روٹی کی قدر آ رہی ہے۔“ وہ بڑھاپا تھا مگر بد رہا ہٹ اتنی بلند ضرور تھی کہ ساتھ والی چیمبر پر بیٹھی انابہ کی سماعتوں تک با آسانی پہنچ گئی تھی۔

”مما! یہ پائے والا ڈونگہ بھی تو ادھر کھینچے نا۔ شہرام کو کمرے کے سرے پائے بھی بہت پسند ہیں۔“ انابہ نے زوری بدل لیا تھا۔

”اے نہیں نہیں۔ میں پہلے ہی بہت کھا چکا۔ یہ پھر کبھی۔“ شہرام نے فوراً ”منع کرنا چاہا۔

”دھوڑا سا توڑا کئی کبھے شہرام۔ ممّا کے ہاتھوں کی بنی نرم نرم روٹی پائے کے شور بے میں بھگو کر کھا میں گے تو کھانے کا لطف دو بالا ہو جائے گا۔“ انابہ نے اسے مسکرا کر مخاطب کیا۔ شہرام بس اسے بے بسی سے دیکھ کر رہ گیا تھا۔

\*\*\*

ناراض تم  
ناراض ہم  
کیسے میں یہ دوریاں  
ہم خنجر  
تم بے خبر



دونوں کی ہیں مجبوریاں

گاڑی میں دھجے سروں میں جنید جمشید کا بہت پرانا گانا چل رہا تھا۔ وہ شہرام کے ساتھ واپس گاؤں جا رہی تھی۔ یہ شہرام کے ساتھ اس کا پہلا سفر تھا۔ بظاہر اس کی توجہ باہر کے نظاروں پر بھی لیگن اگر اس سے چند سیکنڈ پہلے گزرنے والے منظر کے بارے میں پوچھا جاتا تو وہ کوئی جواب نہ دے سکتی۔ "ناراض" سوگن ختم ہوا تو جنید کا بی ایک اور گانا چل پڑا تھا۔

دل دروازہ کھولے کب سے کھڑا ہوں

آؤ میرے مہماں آؤ

گھر میں اندھیرا کسے کب سے پڑا ہوں

چاند ستارے لیے آؤ

آؤ میرے دل کی پہلی دھڑکن

"اکتنا سفر بانی رہ گیا ہے شہرام۔" انابہ نے گاڑی میں چھایا فیسوں توڑنا چاہا تھا۔ شہرام نے ایک گرمی نگاہ اس پر ڈالی۔

"میں نے کچھ پوچھا ہے؟" وہ اس کی نگاہوں کی پیش سے تھوڑا جڑبڑھولی تھی۔

"میں نے بھی کچھ پوچھا تھا۔ پہلے اس کا جواب تو دو۔" شہرام نے اسے سنجیدگی سے مخاطب کیا تھا۔

"آپ نے کب پوچھا؟" وہ حیران ہوئی۔

"میں یہ دیریاں مزید نہیں سہہ سکتا انابہ۔! پلیز خود کو اور مجھ کو مزید سزا مت دو۔" وہ بے چارگی بھرے لہجے میں بولا تھا۔ انابہ کچھ لمحوں کے لیے کچھ نہ بول سکی تھی۔

"میں یقین کر رہی نہیں سکتا انابہ کہ تم نے مجھ سے جو بندھن جوڑا ہے وہ زبردستی کا بندھن ہے ہاں لیکن جب تم نے مجھے یہ بتایا تھا تو میں نے اپنے جذموں کی سخت توہین محسوس کی تھی میری انا نے گوارا ہی نہ کیا کہ میں دوبارہ تم سے اس موضوع پر بات کروں۔ آہستہ آہستہ مجھے اندازہ ہوا کہ محبت اور انا اکٹھے چل ہی نہیں سکتے ہر گزرتے دن کے ساتھ تم سے میری محبت بڑھتی جا رہی ہے اور انا۔" وہ دل شکستہ انداز میں ہنسا۔

"انا کا کوئی وجود ہوتا تو میں اس وقت اتنے عاجزی بھرے انداز میں تم سے مخاطب نہ ہوتا۔" شہرام کی بات سن کر بھی انابہ بے اثر چہرے کے ساتھ بیٹھی رہی۔

"میں تم سے یہ سوال نہیں کروں گا انابہ! کہ تم نے ماضی میں میرے ساتھ وہ رویہ کیوں اختیار کیا تھا۔ ہو سکتا ہے تمہارا جواب میری مروانہ انا کو گوارا نہ ہو۔ بس ہم ماضی کو فراموش کر دیتے ہیں اور ایک نئی زندگی کی شروعات کرتے ہیں۔ میں فی الحال تم سے تمہاری محبت نہیں مانگ رہا بس تم میری محبت کا یقین کر لو۔ میں تمہیں خود محبت کرنے کا ہنر سکھا دوں گا۔"

شہرام بول رہا تھا اور انابہ اپنے دل کے دروازے بند کرتے کرتے تھک چکی تھی اسے خود کو یاد دلانا پڑا تھا کہ وہ شخص انوں کا بہت بڑا کھلاڑی ہے۔

"خاموش کیوں ہو۔ کچھ تو بولو۔" شہرام کے انگ انگ سے اضطراب بھٹک رہا تھا۔

"میں آپ کی محبت کا اعتبار کر لوں شہرام اور کچھ عرصے بعد آپ محبت کا کوئی اور جزیرہ دریافت کر لیں۔ میں آپ کو آپ کی محبت یا دلاؤں تو آپ کہیں کہ وہ محبت نادانی اور حماقت کے سوا کچھ نہ تھی۔ ایک دیر تک مسکراہٹ چہرے پر سجا کر اس نے شہرام کو مخاطب کیا۔

شہرام کا باؤں یک لخت ہریک پر جا پڑا تھا۔ "اس بلوں کی وجہ دریافت کر سکتا ہوں۔" وہ مسلسل اس کے جذموں کی توہین کر رہی تھی۔ طیش میں آنا فطری امر تھا۔ انابہ کو اس کے غصے سے زیادہ اس کی اڑھٹالی پر تعجب ہوا تھا۔ کوئی اور شخص ہوتا تو اتنا کھلا طنز سن کر گڑبڑا کر رہ جاتا۔ وہ اس کے ماضی سے واقف تھی یہ جان کر بھی اس کے چہرے کا رنگ نہ بدلا تھا۔ اس کے چہرے پر صرف بے تحاشا غصہ اور دکھ جھلک رہا تھا۔

"گاڑی چلا میں شہرام! پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔" اس نے آگے کر شہرام کو مخاطب کیا۔ اس نے بنا کچھ مزید کہے گاڑی اشارت کر دی تھی۔ باقی کا پورا سفر



وہ لب بھینچے ڈرائیونگ کرتا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

پھر وہی بے کیف دن تھے اور بے چین راتیں۔

شہرام لاہور چلا گیا تھا اور اس بار آنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ گھر والے اس سے سخت خفا تھے وہ آخر اثابہ کو اپنے پاس کیوں نہیں بلوا رہا۔

”میری جاب بہت ٹف ہے امی۔ کوئی اسپیسنگ ڈیوٹی اور رز نہیں۔ اثابہ یہاں ایسی کیسے رہ پائے گی۔“ ہریار اس کا ہمانہ یہ ہی ہوتا۔

”تو ٹھیک ہے کچھ دنوں کے لیے میں اثابہ کے ساتھ آجاتی ہوں۔ اس کا دل لگ جائے گا تو میں واپس آجاؤں گی۔“ میمونہ اب اس کا کوئی عذر سننے کو تیار نہ تھیں۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ بس کچھ دنوں کی مہلت دے دیں۔ ایک بہت اہم پراجیکٹ چل رہا ہے وہ مکمل ہو جائے تو پھر میں آتا ہوں“ تب اس موضوع پر بات کریں گے۔“ شہرام نے ماں کو پھر ٹال دیا تھا۔

قون بند ہونے کے بعد بھی میمونہ دیر تک بیٹھتی ہی تھیں۔ پاس بیٹھی اثابہ کے دل پر بوجھ مزید بڑھ گیا تھا۔ شہرام اس پر کوئی بات نہ آنے دے رہا تھا وہ خود ماں کی بات اور داد کی ناراضی کا سامنا کر رہا تھا لیکن آخر وہ کب تک بھانسنے بنا کر سب کو ٹال سکتا تھا۔ یہ سوچ اثابہ کے دماغ کو مزید الجھانے کا باعث بن رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

”مصطفیٰ ماموں کے دوست ڈاکٹر خالد اپنی فیملی کے

ساتھ ہمارے ہاں کے دو چکر لگا چکے ہیں۔“

اثابہ نے علیزہ کی خیر خبر پر ہنسنے کو قون کیا تو اس نے روکاسی ہو کر اطلاع دی تھی۔ ڈاکٹر خالد کا شمار مصطفیٰ کے بہت ہی قریبی دوستوں میں ہوتا تھا۔ دونوں

کی فیملیز کا بھی ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا تھا اس لیے علیزہ کی بات سن کر اثابہ کو کوئی تعجب نہ ہوا۔ آئی روز نہ بہت جلد دوستیاں گانٹنے والی خوش مزاج خاتون تھیں ضرور انہوں نے ناعمہ پھوپھو سے بھی

دوستی گانٹ لی ہوگی اور ان سے ملنے ان کے گھر چلی گئی ہوں گی۔ ناعمہ پھوپھو کا گھر مصطفیٰ ہاؤس سے زیادہ دور تھوڑی تھا اور یہ ہی بات اس نے علیزہ سے بھی کہہ دی تھی۔

”صرف تمہاری روزیہ آنٹی ہی نہیں آئیں۔ ان کے ساتھ ان کے سسپینڈ اور ان کا وہ لمبو ڈاکٹر بیٹا بھی ہوتا ہے۔“ علیزہ نے جل بھن کرتا تھا۔

”اسامہ بھائی کی بات کر رہی ہو۔“ اثابہ کو ڈاکٹر اسامہ کے لیے لمبو ڈاکٹر کی اصطلاح سن کر خوب ہی ہنسی آئی تھی۔

”ہنس لو! ڈالو مذاق۔ یہاں میری جان پر بنی ہوئی ہے۔ مجھے اس لمبو ڈاکٹر کے ارادے ٹیک نہیں لگتے۔“

سب سے بڑا ہنس بجا کر وہ مجھے خوب ہی گھورتا ہے۔ لبوں پر مسکراہٹ بھی چمکی رہتی ہے۔ میرا بس نہیں چلتا اس بندے کو اٹھا کر اپنے ڈرائیونگ روم سے باہر پھینک دوں۔“ علیزہ سخت سی بیٹھی تھی۔

”ہائے اللہ علیزہ! ایسے تو مت کہو۔ اگر میں خود اسامہ بھائی کو اچھی طرح نہ جانتی ہوتی تو تمہاری باتیں سن کر کسی چھپوڑے سے بندے کا خاکہ قائم کر سکتی۔ وہ تو بہت ڈسینٹ اور ڈیشننگ سے شخص ہیں۔“ اثابہ نے ڈاکٹر اسامہ کی وکالت کی تھی۔

”بھلے سے ہوتا رہے ڈسینٹ اور ڈیشننگ ہیں اس کی فیل کی بار بار آمد مجھے تشویش میں مبتلا کر رہی ہے۔ میں بڑھ لکھ کر اپنا کیریئر بنانا چاہتی ہوں اگر ان لوگوں کی طرف سے کوئی ایسا ویسا سلسلہ شروع ہو گیا تو میرا کیا بنے گا۔“ علیزہ سخت تشویش میں مبتلا ہو رہی تھی۔

”اچھا تم فکر مت کرو میں ماما سے پوچھتی ہوں کہ کیا چکر ہے۔ ہو سکتا ہے یہ سب تمہارا ڈھم ہو۔ خالد انکل بیابا کے بہت اچھے دوست ہیں ہو سکتا ہے بس اسی لیے وہ لوگ بیابا سے ملنے گھر آتے ہوں تو تم لوگوں کی طرف بھی چکر لگا لیتے ہوں آخر ناعمہ پھوپھو بھی سگی بہن ہیں بیابا کی۔“

”کاش ایسا ہی ہو۔“ علیزہ نے ٹھنڈی سانس بھری



ہوئی نہیں ہو سکتی۔“ اس نے شہرام کی تسلی کروائی تھی۔

”ٹھیک ہے، بس یہ ہی ہو چکا تھا۔“ شہرام نے لائن منقطع کر دی اور وہ کتنی دیر تک بے جان ہاتھوں میں سیل فون لیے بیٹھی رہی۔



”ایسا جان، دادا جان اور ثاقب پھوپھا کی فیملی کے دو چار بندے ڈاکٹر اسامہ سے مل کر اس کے حق میں فیصلہ دے چکے تھے۔ خالد انکل کی فیملی کی خواہش پر باضابطہ منگنی کی رسم لوا کی جا رہی تھی۔ انابہ کے پاس علیزہ کے فون پر فون آرہے تھے۔ وہ اسے فوراً اپنے پاس بلا رہی تھی۔ باقی لوگوں نے رسم سے ایک دن پہلے ہی پتہ چلا تھا کہ وہ دادا جان اور ڈرائیور کے ہمراہ چار پانچ دن پہلے ہی مصطفیٰ ہاؤس چلی گئی تھی۔ دادا جان تو فوراً ہی بیٹی اور نواسی سے ملنے چلے گئے۔ اس کا کچھ ٹر کر جانے کا ارادہ تھا۔

”ماموں جان اس دفعہ آپ کی بیٹی میری مہمان ہے اس لیے برائے مہربانی اسے ٹیگ سمیٹ مارے گھر چھوڑ جائیے۔“ علیزہ نے مصطفیٰ کو فون لہڑکا دیا تھا۔ حکم کی فوری تعمیل کر دی گئی تھی۔ ناعمہ کو بھی کچھ کیلک سے خاصی ڈھارس ملی تھی۔

”بازاروں کی خاک چھاننے سے غنی کی بھی جان جاتی ہے اور میری بھی۔ اب تم آگئی ہو تو اپنی سہیلی کی شاپنگ خود ہی سناؤ۔“ ناعمہ نے شاپنگ کا ڈیپارٹمنٹ اس کے سپرد کر دیا۔

”میں کہتی تھی نا تم سے، اس گھونچو ڈاکٹر کی نیت میں فتور ہے ایسے ہی تو گھوریاں نہیں مارتا تھا مجھے۔“ رات کو جب تنہائی میسر آئی تو علیزہ نے اس کے سامنے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

”شہرام کا فون آیا تھا۔ اسامہ بھائی کے متعلق انویسٹی گیشن کر رہے تھے۔ پوچھ رہے تھے کہ وہ ہندہ تمہیں ڈیزرو کرنا بھی ہے یا نہیں۔“ انابہ علیزہ کے چہرے پر نگاہیں پڑاتے ہوئے

تھی۔ لیکن آئندہ آنے والے دنوں نے ثابت کر دیا کہ علیزہ کے خدشے بے بنیاد نہیں تھے۔ ڈاکٹر خالد نے واقعی اپنے لائق فائق ڈاکٹر بیٹے کے لیے علیزہ کا رشتہ مانگ لیا تھا۔ اور آج کل ثاقب پھوپھا اپنی فیملی میں اس حوالے سے صلاح مشورے کرنے میں مصروف تھے۔ امید تھی کہ جلد ہی یہ نکل منڈھے چڑھ جائے گی۔



رات کافی دیر تک بھی جب بستر کر نہیں بدلنے کے باوجود نیند مہمان نہ ہوئی تو وہ اٹھ بیٹھی۔ آج شام کو ہی دادا جان کی اسٹڈی سے لطاف فاطمہ کا ناول اٹھا لائی تھی اب اسی کی ورق گردانی شروع کر دی۔ اتنے میں سائیڈ ٹیبل پر دھرا موبائل گنگنایا تھا۔ اس نے موبائل اٹھایا۔ سکرین پر شہرام کانگ کے الفاظ دیکھ کر اسے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ یہ اس کے سیل پر آنے والی شہرام کی پہلی کال تھی۔ دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے کال ریسیو کی تھی۔

”یہ ڈاکٹر اسامہ کا کیا حدود اربعہ ہے۔ تم جانتی ہو اسے؟“ اس کے سلام کا جواب دے کر شہرام نے سوال یہ ہی پوچھا تھا۔ انابہ جانے اس کے لبوں سے کیا سے کی مٹی تھی، اس کے ارماتوں پر اس کی پڑ گئی۔

”پاپا کے بہت اچھے دوست ہیں خالد انکل۔ اسامہ بھائی ان ہی کے بیٹے ہیں۔“ اس نے مختصراً جواب دیا۔

”یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ تم یہ بتاؤ بندہ کیسا ہے۔ کیسی عادتیں ہیں کیا وہ ہماری علیزہ کو ڈیزرو کرتا ہے؟“ شہرام کے پوچھنے پر پھسکی سی مسکراہٹ انابہ کے لبوں پر پھیل گئی۔ علیزہ کے لیے شہرام کا اتنا احساس ہونا اس کے گلٹ کو ظاہر کرتا تھا۔

”بظاہر اسامہ بھائی کی شخصیت میں کوئی خالی نہیں۔ پاپا بھی ان کے متعلق ہر طرح کی گارتی دینے کو تیار ہیں۔ خالد انکل پاپا کے اتنے اچھے دوست ہیں کہ ان کے گھریاں ان کے بچوں کی کوئی بات پاپا سے چھپی



دھیرے سے بولی تھی۔ علیزہ کے چہرے پر زخمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”میں نے شہرام جیسے مخلص دوست کو بہت ستایا ہے، ایویں اتنے دن اسے ٹینشن میں مبتلا رکھا۔ اسے تسلی دے دینا کہ اسامہ واقعی بہت اچھا بندہ ہے، امید ہے وہ علیزہ کے دل کو پھر سے دھڑکنے لگے گا۔“

علیزہ دھیرے سے بولی تھی۔ انا بیہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ علیزہ سے اس قسم کی بات کی ہرگز توقع نہ کر رہی تھی۔ کیا علیزہ کو علم تھا کہ انا بیہ کو سب پتا ہے، وہ کتنی آسانی سے اس کے سامنے اظہار کر گئی تھی۔

”انتا حیران کیوں ہو رہی ہو، کیا شہرام نے آج تک تمہیں کچھ نہیں بتایا۔ وہ تو تمہیں اپنی زندگی کہتا ہے، تم سے کب کوئی بات چھپائی ہوگی۔“ علیزہ مسکراتے ہوئے اس سے مخاطب تھی۔ انا بیہ نے نفی میں گردن ہلا دی۔ علیزہ اب آگے کیا کہنے لگی تھی وہ دم سادھے اس کی بات سننے لگی۔

”پھر تو واقعی شہرام بہت وفادار اور بااعتماد دوست ثابت ہوا ہے اسے دوستی نبھانے پر سو بیس سو نمبر ملنے چاہیے۔“ علیزہ نے شہرام کی تعریف کی۔ انا بیہ اسے تا جی بے شک لگی۔

”لیکن شاید میں اتنی اچھی دوست نہیں ہوں۔ کہنے کو تو تمہیں اپنا بہت بڑا فریڈ کہتی ہوں، لیکن اپنی زندگی کا ایک گوشہ تم سے بھی چھپایا۔“ علیزہ نے گہری سانس اندر کھینچتے ہوئے خود گلائی سی کی۔

”لیکن آج مجھے تمہاری ضرورت ہے انا بیہ! مجھے ایسا کندھا چاہیے جس پر سر رکھ کر میں اپنی گزشتہ محبت کے لیے سارے آنسو برالوں، شہرام جیج اٹھاتا تھا، وہ محبت بچپن کی حماقت کے سوا کچھ نہ تھی لیکن میرے دل میں اس محبت کی جڑیں بہت دور دور تک پھیل چکی تھیں۔“ علیزہ کے آنسو گالوں پر بہہ نکلے تھے۔ وہ اس وقت خود لڑتی کی انتہائی پرکھی اس کی کھوئی کھوئی باتوں میں ربط نہ تھا لیکن انا بیہ کا رواں رواں اس کی طرف متوجہ تھا۔

”شہرام نے بہت بچپن میں کبھی مرضی ماموں اور میمونہ پھوپھو کی باتیں سن لی تھیں۔ وہ باتیں میرے اور شہرام کے مستقبل سے متعلق تھیں۔ میں میمونہ پھوپھو کی جیتھی بھی تھی اور ایک لحاظ سے بھانجی بھی۔ وہ مستقبل میں میرے ساتھ تیسرا رشتہ جوڑنے کی خواہشمند تھیں۔ مرضی ماموں تو خیر میرے پیارے ماموں تھے ہی، بیوی کی بات برا نہیں کیا اعتراض ہونا تھا انہوں نے ہنستے ہنستے پھوپھو کی تجویز کی تائید کر دی۔ کاش شہرام اس روز اپنے امی، ابو کی وہ باتیں نہ سنتا۔ وہ میرے بچپن سے ہی بہت اچھا دوست تھا۔ شہرام بھائی اور میرے رشتے کے متعلق ماموں اور پھوپھو نے جو بھی باتیں کیں، وہ شہرام نے مجھے من و عن بتا دیں۔ کبھی عمر میں جو خواب آنکھوں میں بس جائیں، وہ اتنی آسانی سے انسان کا بچپن نہیں چھوڑتے۔ یہ جان کر کہ مجھے شہرام کی زندگی کا قصہ پتا ہے، میں شہرام کو چاہنے لگی۔ شہرام بھی اس حوالے سے مجھے خوب ہی چھیڑتا مگر وہ میری نسبت جلد مہجور ہو گیا۔ مصطفیٰ ماموں اور عقیقہ مائی کے حالات زندگی سے آگاہی کے بعد وہ مجھے سمجھانے لگا تھا کہ میں شہرام کے حوالے سے انتا بیہ نہیں نہ ہوں۔ گھر میں یہ قصہ دوبارہ نہیں چھیڑا گیا تھا۔ شہرام کو پتا تھا کہ اگر یہ رشتہ طے نہ پایا تو میرے دل کو بہت دھچکا لگے گا اور اس کا خدشہ صحیح ثابت ہوا۔ شہرام نے بہمن کو بیرون سنا بھی کے طور پر منتخب کر لیا اور میں خالی ہاتھ رہ گئی۔“

علیزہ کے رونے کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ انا بیہ کا چہرہ شہرام کی مانند مفید ہو رہا تھا۔

”شہرام مجھے سمجھاتا تھا کہ اللہ نے میرے مقدر میں کسی بہت اچھے بندے کا ساتھ لکھا ہو گا۔ مگر میرے دل کو قرار نہ آتا تھا۔ میں اپنی فرسٹریشن میں اس پر چڑھ رہی تھی۔ اس کی وجہ سے میرے دل میں شہرام بھائی کی چاہت بیدار ہوئی۔ میں قسمت کی ستم ظریفی کو بھی اس کا تصور بتا کر اس کے کندھوں پر تھوپ دیتی تھی، لیکن وہ مجھے ہمیشہ لیپن دلاتا کہ میں محبت کے معاملے میں تھی داناں نہیں رہوں گی۔ شہرام کی محبت



میری قسمت میں نہیں ہے تو نہ سہی اللہ مجھے کسی اور شخص کی چاہت سے ضرور سرفراز کرے گا اور دیکھو اس کا کیا سچا ثابت ہوا۔ "علیزہ کی بھیگی آنکھیں مسکرائی تھیں۔

"تم لوگوں کے لان میں ڈاکٹر صاحب سے ایک حادثاتی ٹکرا ہو گئی اور وہ کہتے ہیں کہ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں ان کے دل کے ساتھ ہاتھ ہو گیا۔ ڈاکٹر اسامہ کی سب سے اچھی بات ہی مجھے یہ لگی کہ اس نے مجھے پسند کیا اور سیدھے سبھاؤ اپنے والدین کو ہمارے گھر بھیج دیا۔ مجھے اس کی سچائی پر یقین آ گیا دعا کرتا ہوں کہ محبت پر بھی یقین آجائے اور اس کی محبت مجھے پھر سے محبت کرنا سکھا دے۔" علیزہ دھیرے سے بولی تھی۔

"تم ان شاء اللہ ڈاکٹر اسامہ کے ساتھ بہت خوش رہو گی علیزہ۔ میری دعا میں تمہارے ساتھ ہیں۔" انابیہ کی اپنی آنکھیں پھلکنے کو بے تاب تھیں مگر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے علیزہ کے ہاتھ تھام کر اسے بہت خلوص سے دعا دی تھی۔ علیزہ اب واقعی پرسکون تھی اس نے اپنے سارے آنسو انابیہ کے کندھے پر سر رکھ کر بہا لیے تھے۔ اب انابیہ علیزہ کے سونے کی منتظر تھی۔ ابھی اسے بھی اپنی بے وقوفیوں اور حماقتوں پر جی بھر کر آنسو بہانے تھے لیکن وہ یہ آنسو کسی اور کے سامنے نہ بہانا چاہتی تھی کم از کم علیزہ کے سامنے تو بالکل نہیں۔

\*\*\*

منتقلی علیزہ کی ہو رہی تھی اور تیاری پر سارے ارمان انابیہ نکال رہی تھی۔ بازہ ترین اطلاع یہ تھی کہ شہرام منتقلی کانسٹیشن اینڈ کرنے پہنچ چکا ہے۔ وہ بالی ایر آ رہا تھا۔ انابیہ کا رواں رواں اس کا منتظر تھا۔ قدرت نے کتنے پیارے شخص کو اس کا ہم سفر بنایا تھا اور وہ کتنے عرصے سے اس پیارے شخص کے پیار کی توہین کرتی آ رہی تھی۔ وہ کتنا وسیع القلب اور اعلا ظرف تھا اس کی بدتمیزیاں نظر انداز کر کے مسلسل اسے اپنی چاہت کا یقین دلانے میں مصروف رہا۔

کتنا غلط سمجھتی رہی وہ اسے۔ اس کے بارے میں کیسے کیسے اندازے اور قیاس لگائے۔ چند اوصوری باتوں کا غلط مفہوم اخذ کر کے کس قدر حماقت کا ثبوت دیا اور اب وہ کس منہ سے اپنی حماقتوں کا اعتراف کرے گی۔ وہ بہت اچھا سا تیار ہونا چاہتی تھی علیزہ کی منتقلی کے لیے نہیں بلکہ اپنے محبوب اور اپنے شوہر کے سواگت کے لیے۔ اس کی نگاہیں بے مانی سے شہرام کو کھوج رہی تھیں اور پھر وہ آگیا تھا، لیکن آن وہ ہمیشہ کی طرح فریض نہ لگ رہا تھا۔ وہ بہت تھکا تھا اور بذحال سا لگ رہا تھا۔ انابیہ منتظر رہی کہ اسے دیکھ کر شہرام کی نگاہوں میں ستائش ابھرے گی۔ وہ جانے یہ کیوں بھول گئی کہ اس نے شہرام کو ایسا کوئی حق دیا ہی کب تھا۔ وہ اس سے ملا ضرور تھا۔ سلام دعا ہوئی حال احوال بھی دریافت کیا اور بس۔

انابیہ کی ذات کے لیے اس کا یہ احسان ہی بہت بڑا تھا وہ گھر والوں کے سامنے اس کی ذات کا بھرم قائم رکھتا تھا۔ اس نے علیزہ اور اسامہ کو جو گفتگوں دیے ان پر مسٹر اینڈ مسز شہرام لکھا تھا۔ انابیہ کی چلیں بھیگ گئیں۔ وہ خود منتقلی ال میمنڈ تھی۔ اپنی ہی سوچوں کے تانے بانے میں گم یہ خیال تک نہ آیا کہ اس موقع پر علیزہ اور اسامہ کو کوئی گفت بھی دینا چاہیے۔ اپنے گھر میاں پر اسے اس وقت بہت پیار آیا تھا کانسٹیشن بھر پور رہا تھا۔ ڈنر کے بعد مہمان رخصت ہونے لگے تو انابیہ کی سلاخی نگاہوں نے شہرام کو ڈھونڈنا چاہا۔ وہ اسے بہت دیر سے منتظر نہ آیا تھا اور جب گرد و پیش میں وہ اسے کہیں تلاش نہ کر پائی تو اس نے شہرام بھائی سے شہرام کی بابت استفسار کیا۔

"وہ تو چلا گیا۔ تمہیں نہیں پتا۔" شہرام بھائی النا حیران ہوئے تھے۔

"جلے گئے پر کہاں۔" انابیہ کی آنکھوں میں پانی تیرنے لگا۔

"اتفاق سے لاہور واپسی کی فلائٹ مل گئی۔ کل اس کی بہت امپورٹنٹ میٹنگ ہے۔ لیکن کیا وہ تمہیں بتا کر نہیں گیا۔" شہرام بھائی حیران ہو کر پوچھ رہے



تھے۔

”بتایا تھا میں نے سمجھا مذاق کر رہے ہیں۔“ انابیہ نے پتلیں جھپک جھپک کر آنسو روکے۔  
”میں فون کر کے کان کھینچوں گا اس کے تم فکر ہی نہ کرو۔“

شہریار بھائی نے اسے تسلی دی۔ وہ آنسو پینے کی کوشش کرتے ہوئے محض سر ہی ہلایا کرتی تھی۔

\*\*\*

اگلے ویک اینڈ تک اس نے شہرام کا شدت سے انتظار کیا تھا مگر انتظار ”انتظار ہی رہا۔“  
”مجھے لاہور جانا ہے آیا جان۔“ اتوار کے دن جب پوری فیملی دوپہر کے کھانے پر اکٹھی تھی اس نے مرتضیٰ کو مخاطب کیا۔

”ہاں مینا! اس بار شہرام آئے گا تو ہم نے تمہیں اس کے ساتھ بھیجنا ہی ہے۔ میں نے اور تمہاری مائی جان نے فیصلہ کر لیا ہے۔“ آیا جان مہنگن سے انداز میں بولے تھے۔

”مجھے کل ہی جانا ہے۔“ وہ دھیرے سے بولی تھی۔  
”آنسوؤں کا گولہ حلق میں اٹکا تھا۔“

”کل مگر مینا۔“ میمونہ نے تعجب سے اسے دیکھا پھر کچھ سمجھانا چاہا۔

”ہم دونوں کی بس سخت لڑائی ہو گئی ہے۔ وہ مجھ سے سخت خفا ہو کر گئے ہیں۔ مجھے انہیں منانے جانا ہے۔“ وہ بتاتے بتاتے رو پڑی تھی۔ دسترخوان کے گرد بیٹھے لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”اس کی یہ مجال کہ وہ تم سے لڑائی لڑے۔ ذرا آنے دو اسے، خوب کان کھینچوں گا اس کے۔“ مرتضیٰ نے اسے تسلی دی۔ اس گھر کے لوگ اس کے میاں کے کان کھینچنے کے ہی درپے رہتے تھے۔ انابیہ کو مزید رونا آگیا۔

”اچھا تم پریشان مت ہو۔ شہریار تمہیں لاہور چھوڑ آئیں گے اس طرح شہرام کو بھی اچھا سرپرائز ملے گا۔“ ہمدرد فطرت کی مالک سمین نے فوراً اس کی

تجویز کی تائید کر دی۔

”پر امس شہریار بھائی! آئندہ کہیں آنے جانے کے لیے آپ کو بالکل ٹھک نہیں کروں گی۔“ انابیہ نے جھٹ آنسو پونچھ ڈالے تھے۔  
”بالکل ہو بالکل۔“ شہریار بھائی فیس پڑے تھے۔

\*\*\*

علی الصبح وہ اور شہریار بھائی گاؤں سے نکل پڑے تھے۔ گاڑی ملتان شہر کی حدود میں داخل ہوئی تو شہریار بھائی نے اس سے گھر جانے کے متعلق پوچھا۔  
”مصطفیٰ ماموں وغیرہ سے ہائے یلگو کرنی ہے تو تھوڑی دیر کے لیے چلیں وہاں۔“

”نہیں شہریار بھائی! بہت لمبا سفر طے کرنا ہے میں مزید دیر نہیں کرنا چاہتی۔“ وہ دھیرے سے بولی تھی۔

ایک طویل تھکا دینے والے سفر کے بعد جب وہ لاہور پہنچے تو انابیہ کو آج صبح مہنگن میں شہرام کی تھکن کا خیال آیا۔ کتنی تھکا دینے والی ڈرائیو کے بعد وہ حویلی پہنچتا تھا اور انابیہ اسے پانی کا گلاس دیتا تو وہ دکی بات سیدھے منہ بات تک نہ کرتی تھی۔ پچھتاوؤں کا کوئی انت نہ تھا۔

”اب تو لاہور کی حدود میں داخل ہو چکے۔ اب انقارم کر دوں اسے۔“ شہریار نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”اگر ہم سیدھے لار ٹرنٹ چلیں تو؟“ انابیہ نے دھیرے سے پوچھا۔

”گھر لاکھ ہو گا۔ چالی شہرام کے پاس ہوگی اور شہرام ابھی تک آفس میں ہو گا۔“ شہریار بھائی نے صورت حال واضح کی۔

”بس پھر پہلے ان کے آفس چلیں۔ چابی لے کر گھر چلیں گے۔“

انابیہ نے فوراً فیصلہ کیا۔ شہریار بھائی نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ آدھے گھنٹے کی مزید ڈرائیو کے بعد وہ اس کے آفس پہنچ چکے تھے۔ شہریار بھائی نے شہرام کو کال ملائی۔



کیا تلاش کرنے میں مصروف تھی۔

\*\*\*

یہ ایک انتہائی پھوڑ شخص کا اپارٹمنٹ تھا۔ بے ترتیبی اور بدسلوکی کی کوئی حد ہی نہ تھی۔ ان لوگوں کے گھر پہنچنے کے ٹھیک پچیس منٹ بعد شرام بھی گھر پہنچ چکا تھا اور اب بو کھلائے ہوئے انداز میں گھر کی چیزیں سمیٹ رہا تھا۔ شریار بھائی لمبی ڈرائیونگ کے بعد تھک چکے تھے اور اب صوفے پر نیم دراز تھے۔ انابہ سبکل صوفے پر مطمئن انداز میں بیٹھی اپنے شوہر کی پھرتیاں ملاحظہ کر رہی تھی۔

”گھر کی چیزیں بعد میں سمیٹ لینا یا ر! پہلے کچھ کھانے کو لاؤ، بہت بھوک لگی ہے۔“ اسے خود سے آواز میں بھائی بھائی کا خیال نہ آیا تو شریار بھائی کو ہی اس جانب توجہ مبذول کروائی پڑی۔

”کیا کھائیں گے؟“ شرام نے بے چارگی سے پوچھا۔

”انابہ سے پوچھو۔“ شریار بھائی نے لمبی سی جہالتی کی۔

”کیا کھاؤ گی۔“ شرام نے کھلے انداز میں اسے مخاطب کیا۔

”جو بھی گھر میں پکا ہو گا۔“ انابہ یکدم مخاطب کیے جانے پر گڑبڑا سی گئی تھی۔

”میں نے کچھ پکا ہوا ہے نہ کچھ پکتا ہے جو کھو گی، بازار سے لا دوں گا۔“ وہ چبا چبا کر بولا تھا۔

”اونسوں شرام! میں سویا نہیں ہوں، بچی کو کیوں ڈانٹ رہے ہو۔“ انہیں موندے شریار بھائی شرام کو نوکے بنانا رہ پائے۔ شرام جھنجھلا تا ہوا کھانا لینے چلا گیا تھا۔

کھانے کے بعد انابہ نے ازراہ مہربانی برتن سمیٹ دیے تھے لیکن جب یہ برتن کچن میں رکھنے گئی تو کچن کی حالت دیکھ کر سرچکرا گیا۔ پورے گھر میں جواہتری پھیل ہوئی تھی، کچن میں اس سے ڈبل اتھری تھی۔

”ایسے کھڑی کیا آپدیکشن کر رہی ہو۔“ یکدم شرام

”ہم تمہارے آفس کے نیچے پارکنگ میں موجود ہیں۔ نیچے آرہے ہو یا ہم اوپر آجائیں۔ ہمیں تمہارے اپارٹمنٹ کی چابی درکار ہے۔“ شریار بھائی متبسم لہجے میں چھوٹے بھائی سے پوچھ رہے تھے۔ یہ ساری پتویشن انہیں بھی مزہ دے رہی تھی۔

”ہم کا مطلب ہمہ۔“ دوسری جانب سے کچھ ہستفاد کیا گیا تو شریار بھائی مسکرا کر بولے تھے۔

”اے یار! مذاق نہیں کر رہا۔ میں انابہ کو لے کر آیا ہوں، سخت تھکے ہوئے ہیں۔ فنانٹ چابی لے کر آؤ نیچے۔“ شریار بھائی نے آؤر دے کر کال ڈسکنکٹ کر دی۔

”ابھی دیکھنا، سر کے بل چلتے ہوئے آئیں گے سرکار تمہارے۔“ وہ اب انابہ کو چھین رہے تھے انابہ جینپ کر بس پڑی۔

دو منٹ کے اندر اندر وہ واقعی ہانپتا کانپتا پارکنگ میں موجود تھا۔ شریار بھائی گاڑی سے اتر کر اس سے گلے ملے تھے، وہ بے یقینی سے کبھی شریار بھائی کو اور کبھی گاڑی کے اندر بیٹھی انابہ کو دیکھ رہا تھا۔ انابہ نے اسے فارمل ڈریسنگ میں بہت کم دکھا تھا اور اس وقت وہ اسے حد سے زیادہ ڈشنگ لگ رہا تھا۔

”آنے سے پہلے انفارم تو کر دیتے۔“ وہ ابھی تک ان کی آمد پر بے یقین سا تھا۔

”گھر سے کسی نے فون کر کے پچھ نہیں بتایا۔“ شریار بھائی ہستے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

”صبح سے سب مجھے باری باری فون کر چکے ہیں لیکن آپ لوگوں کے آنے کا کسی نے نہیں بتایا۔“ وہ کچھ ناراضی سے گویا ہوا۔

”اچھا چابی دو یا ر! باقی باتیں گھر جا کر ہوں گی۔“ شریار بھائی کے کہنے پر اس نے انہیں چابی تھمائی تھی۔

”آپ لوگ چلیں۔ میں بھی بس تھوڑی دیر تک پہنچتا ہوں۔“ اس نے مخاطب شریار بھائی کو کیا تھا اور تکی بھی نگاہ انابہ کے چہرے پر ڈالی تھی۔ اور وہ تو اس پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد اس کی طرف متوجہ ہی نہ ہوئی تھی۔ اب بھی ہینڈ بیک کی زپ کھولے جانے میں



انہوں نے صبح صبح واپس جانا ہے۔ زمینوں کا کوئی مسئلہ ہے کہہ رہے تھے فجر پڑھتے ہی نکل لیں گے۔ ”انا بیہ نے اسے آگاہ کیا تھا۔ شہرام اسے لب بچھے گھورنے لگا تھا۔

”مجھے بھی نیند آرہی ہے۔ میں سونے لگی ہوں۔“ اس کی نگاہوں کی تاب نہ لا کر انا بیہ نے سونے کی ہی ٹھالی تھی۔ شہرام بھناتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔



صبح شہرام نے اسے جھنجھوڑ کر اٹھایا تھا۔ ”ختم واقعی گھوڑے گدھے بیچ کر سوتی ہو۔ کب سے آوارہ دے رہا تھا تمہیں۔“ وہ سخت جھنجھلا یا ہوا لگ رہا تھا۔ انا بیہ کے لبوں پر پھکی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اسے بتا رہی تھی کہ کتنے عرصے بعد رات کو اسے ایسی گہری اور پرسکون نیند آئی ہے۔

”میں آفس جا رہا ہوں۔ ناشتے کا سامان بچن میں رکھا ہے، ناشتہ کر لیتا۔“ شہرام نے پیانے پر انا بیہ نے ذرا چونک کر اس کا جائزہ لیا۔ وہ واقعی آفس جانے کے لیے تکسک سے تیار تھا۔

”شہریار بھائی نے ناشتہ کر لیا؟“ اس نے پوچھا تھا۔

”کلیں کس بات اور بھی آج سے وہ واقعی گھر کی ذمہ داریاں نبھانے کا عزم کئے ہوئی تھی۔“

”شہریار بھائی جیسے مجھے اور اب آپ بھی آفس جا رہے ہیں۔“ ایک لمحے کو انا بیہ یہ سوچ کر گھبرا گئی تھی کہ اب اسے گھر میں اکیلے رہنا پڑے گا۔

”ظاہر ہے مجھے آفس ہی جانا ہے۔“ اس نے سپاٹ لمبے میں بتایا تھا۔

”تو ٹھیک ہے نا، آپ جائیں۔ در کیوں کر رہے ہیں۔ میں ناشتہ کر لوں گی۔“ وہ ایسے اطمینان سے بولی جیسے شہرام اس کے ناشتے کے انتظار میں ہی کھڑا ہے۔

شہرام اسے گھورتا ہوا چلا گیا تھا۔ اس کے جانے کے

پچھے سے آکر غرایا۔ انا بیہ ڈر کر پیچھے ہٹی۔

”چائے بنانے کا سوچ رہی تھی“ سر میں درد ہو رہا ہے۔“ نرم خوش شہرام کے یہ بگڑے اکھڑے تیور انا بیہ کا دل دہلا رہے تھے۔

”جتنی حتم ہے لی بھگڑ بھی نہیں ہیں۔ سو جاؤ جا کر سر کا درد خود ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے انا بیہ کو رکھائی سے مخاطب کیا۔ انا بیہ لب کلیتی ”آنسو پتی بچن سے باہر نکل گئی۔“

”کوئی فالٹو میٹرس ہے تو مجھے یہاں لاؤنچ میں ڈال دو یار۔“ شہریار بھائی اب سونے کے موڈ میں تھے۔

”ایک منٹ بھائی۔ ذرا نیچے مارکیٹ سے چائے کی تتی لے آؤں پھر آپ کے سونے کا انتظام کرتا ہوں۔“ شہرام کہہ کر پھر گھر سے نکل گیا تھا۔ انا بیہ نے میٹرس ڈھونڈ کر لاؤنچ میں شہریار بھائی کے سونے کا انتظام کر دیا تھا اور خود ہیڈ روم میں چلی آئی۔

بیڈ روم نسبتاً صاف تھا۔ اس نے سکون کا سانس لیا۔

”کیوں آئی ہو تم یہاں۔؟“ تھوڑی دیر میں شہرام کے کپڑے میں سجائے بیڈ روم میں پہنچ گیا تھا۔ انا بیہ نے تصویر واپس سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور

”رُے میں سے ایک چائے کا کپ اٹھا لیا۔ شہرام کا سوال گویا اس نے سنا ہی نہ تھا۔

”گھر والوں سے دعوت کیوں بولا کہ میں نے تم سے بگڑا کیا ہے۔ صبح سے ہر کار ہر بندہ فون کر کے مجھے ڈانٹ پلا چکا ہے۔“ وہ اس پر مزید بگڑا تھا۔ انا بیہ چپ کر کے چائے کی چسکیاں لیتی رہی۔

”کھل میں آفس سے چھٹی لے لوں گا۔ تمہیں مینار پاکستان اور بادشاہی مسجد کی سیر کروادوں گا اور کل ہی تم شہریار بھائی کے ساتھ واپس جاؤ گی۔ رات۔“

”میں یہاں مینار پاکستان کی سیر کرنے نہیں آئی۔“

اس بار انا بیہ کو بھی غصہ آگیا۔

”پھر کس لیے آئی ہو؟“ شہرام جواباً اس سے زیادہ غصے میں آیا۔

”آہستہ بولیں، باہر شہریار بھائی سو رہے ہیں۔“



بعد انا ہیہ کتنی دیر تک سر پکڑے بیٹھی رہی۔ جو فاصلے ان دونوں کے درمیان حائل ہو چکے تھے انہیں مٹانا اتنا بھی آسان نہ تھا۔ پھر وہ گہری سانس لیتے ہوئے اٹھی بھی ہاتھ منہ دھو کر کچن کا رخ کیا۔ ناشتے کے سب لوازمات موجود تھے۔ ڈسٹ کرنا شستہ کرنے کے بعد اس نے گھر بیٹھا شروع کر دیا۔ دھانی تین گھنٹے کی محنت کے بعد بکھری چیزیں کسی حد تک ٹھیکانے لگی چکی تھیں۔ گھر کے ہر کونے کھد رے سے کوئی نہ کوئی ان دھلا کپڑا ملا تھا۔ شکر ہے سرف بھی موجود تھا۔ وہ نب میں سرف کا جھاگ بنا کر شہرام کی شرٹس، موزے اور بنیائیں دھونے لگی تھی اور جب ہی شہرام چلا آیا۔

”یہ کیا کر رہی ہو تم۔“ وہ ناراضی سے گویا ہوا۔

”وارڈوب میں آپ کی ایک بھی دھلی بنیان نہیں نہ ہی کوئی موزے کی جوڑی ہے۔ میں نے سوچا، میلی جرابیں اور بنیان دھو کر ڈال دوں۔ پھر یہ دو تین شرٹس ملیں تو یہ بھی بھگو دیں۔“ اس نے تفصیلی جواب دیا۔ شہرام کچھ نہ بولا بس اسے گہری نگاہوں سے دیکھتا رہا تھا۔

”آپ آفس سے اتنی جلدی کیسے کی گئی؟“ انا ہیہ اس کی نگاہوں سے خائف ہوئی۔

”ہاتھ دھو کر فوراً“ تو میرے پاس۔“ وہ اس کی بات کا جواب دے کر چلتا بنا تھا۔ انا ہیہ نے صدمہ لے کر تھپکی۔

”اب بتانا میں آئی ہو۔ امی نے بھیجا ہے نا۔“ وہ اس پار نرمی سے افسوس کر رہا تھا۔ انا ہیہ نے دھیرے سے نفی میں گردن ہلا دی۔

”پھر یقیناً“ گریڈ پائے مجبور کیا ہو گا تمہیں یہاں آنے پر۔“ وہ قیاس کے گھوڑے دوڑا رہا تھا۔

”مجھے کسی نے نہیں بھیجا۔ میں خود آئی ہوں۔“ انا ہیہ نے اس کے اندازوں کی نفی کی۔

”وہی تو پوچھ رہا ہوں کیوں؟“ وہ پھر تیز ہوا۔

”میں نے گول روٹی بنانا سیکھ لی ہے۔ میں آپ کے لیے کھانا بنایا کروں گی۔ آپ کے کپڑے پر مٹی گروں گی۔ گھر کی چیزیں سیٹے سے سمیٹ کر رکھوں گی بس

آپ مجھے اپنے پاس رہنے کی اجازت دے دیں۔ مجھے واپس چھوڑ کر آنے کی بات مت کیجیے گا۔“ انا ہیہ جیسے اس کے دل کی بات پاگئی تھی۔

”میرے اعصاب کا مزید امتحان مت لو انا ہیہ! میں پہلے ہی بہت ٹوٹ چکا ہوں۔ تمہارے ایک روپ سے تم مجھ کو مارتا کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ تم دو سرار روپ لیے سامنے آ جاتی ہو۔ میں یہ پسیلیاں بوٹھنے کے مزید موڈ میں نہیں ہوں۔ آج تم اپنے دل کی ہریات مجھ سے صاف صاف کہہ ڈالو۔ سننے کا حوصلہ ہے مجھ میں۔“ وہ ٹوٹے پکھڑے لہجے میں بولا۔

انا ہیہ کے ضبط کے بندھن بھی ٹوٹ گئے۔ وہ چپ رہ کر اپنا مزید نقصان نہ کر سکتی تھی اس نے روئے روئے اپنی حماقتوں اور بے وقوفیوں کی الف سے بے تک ساری تفصیل سنادی تھی۔

”مجھ سے زیادہ احمق اور بے وقوف اس روئے زمین پر اور کوئی نہیں شہرام! مجھے آپ کے ظرف پر حیرت ہوتی ہے، مجھ جیسی عورت کو تو چوٹی سے پکڑ کر گھر سے نکال باہر کرنا چاہیے تھا اور آپ میرے ناز نخرے برداشت کرتے ہوئے مجھے مٹانے کی کوششوں میں ہی لگے رہے۔“ وہ ہلک ہلک کر رو رہی تھی اپنی حماقتوں پر خود کو ملامت کر رہی تھی اور شہرام اس کے آنسو دیکھ کر بے چین ہوئے جا رہا تھا۔

”اب بس کرو اور کتنا بلکان کرو گی خود کو۔“ شہرام نے اس کے آنسو پونچھے تھے۔

”آپ مجھے معاف کر دیں گے نا شہرام۔“ وہ بہت آس سے پوچھ رہی تھی۔

”ایک شرط پر۔“ وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔

”وہ کیا؟“ انا ہیہ ہمد تن گوش تھی۔

”آئندہ میں تمہارے منہ سے ایسی کوئی فضول بات نہ سنوں۔“ اس نے تنبیہ کی۔

”کیسی فضول بات۔“ انا ہیہ قطعاً نہ سمجھی تھی۔

”وہی چوٹی سے پکڑ کر گھر سے نکالنے والی بات۔ تم میرے دل کی ہر دھڑکن میں بہتی ہو۔ تم سے محبت کرنا میرا اختیاری فعل نہیں۔ میں مجبور ہوں تم سے



صفائی ستھرائی کے بعد اس کا حلیہ خاصا ملگا جاتا رہا تھا۔  
چہرے اور بالوں پر بھی گرد کی لمبی سی تہہ جم گئی تھی۔  
اچھی طرح دُریس آپ ہوئے شہرام کے سامنے تو یہ  
رف حلیہ زیادہ ہی واضح ہو رہا تھا۔

”میں منہ دھو کر آئی ہوں۔“ اس نے اٹھنا چاہا۔  
”خبردار جواب منہ دھونے کا نام لیا۔“ شہرام نے  
اسے کھینچ کر پھر سے اپنے قریب بٹھایا۔  
”ابھی آپ کے کپڑے بھی دھونے ہیں۔“ وہ  
منمنائی۔

”پھر کھوگی کھانا بھی بنانا ہے۔“ وہ ہولے سے ہنسا۔  
”بالکل بنانا ہے۔ اب میں رست اچھی روٹی بنانا سیکھ  
گئی ہوں۔“ اس نے ذرا اتر کر بتایا تھا۔

”ہوں تو کیا اپنے گھڑ پائے سے مجھے امیر پس کرنا  
چاہتی ہو۔“ وہ اس کے بال چھیڑتے ہوئے بولا۔

”جی بالکل۔ سیانے جتنے ہیں کہ مرد کے دل کا راستہ  
اس کے معدے سے ہو کر گزرتا ہے۔ میں بھی آپ کو  
اچھے اچھے کھانے کھلا کر آپ کے دل پر راج کرنا چاہتی  
ہوں۔“ وہ اپنی لانگ ٹریمپلائنگ سے آگاہ کر رہی تھی۔  
”میرا کیش مختلف ہے زوجہ محترمہ! تمہارے ہاتھ  
کی جلی ہوئی روٹیاں کھانے کے بعد تم سے میری محبت  
میں اضافہ ہی ہوا تھا۔“ شہرام نے اعتراف کرنے میں  
عارف نہ بھلا۔

”یعنی محبت میں اضافے کے لیے آئندہ بھی آپ کو  
وہی روٹیاں کھانی پڑیں گی۔“ وہ معصومیت سے  
استفسار کر رہی تھی۔

”آئندہ وہی روٹی کھلائی تو پھر نیوگی بھی، مجھ سے۔“  
شہرام نے وارننگ دی۔ اتنا یہ کھلکھلا کر ہنس  
پڑی تھی۔ شہرام بھی ہنس پڑا۔ زندگی کے اس نئے موڑ  
کی اس قدر حسین شروعات پر دونوں کا رواں رواں  
کپنے رب کا شکر گزار تھا۔



محبت کرنے پر اور میں ہمیشہ سے یہ بھی جانتا تھا کہ محبت  
کے اس سفر میں میں تنہا نہیں ہوں۔ میں تمہاری  
آنکھوں میں جب بھی جھانکتا تھا مجھے اپنا ہی عکس نظر  
آتا تھا۔ تمہارے اپنی ٹیوڈ کی صرف ایک ممکنہ وجہ  
میرے ذہن میں آتی تھی، مجھے لگتا تھا کہ تم اپنے  
پیرنس کی ان اسٹبل لائف کی وجہ سے عدم تحفظ کا  
شکار ہو۔ مصطفیٰ چاچو نے جوانی میں عقیقہ چچی کو ان کا  
جائز حق نہ دیا، مجھے لگتا تھا کہ تم ہر مرد کو اسی کسوٹی پر  
پرکھتی ہو۔ تمہاری اس نفسیاتی گرہ کو کھلوانے کے  
لیے میں عنقریب کسی سائیکالٹرسٹ سے رجوع کرنے  
لگا تھا۔“

”یعنی دوسرے الفاظ میں آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں  
کہ آپ مجھے بالکل سمجھنے لگے تھے۔“ اس نے تیوریاں  
چڑھا کر شہرام کو گھورا۔

”بالکل تو تم نے مجھے ہمارا کھانا۔“ پہلے ہوش اڑاتی  
تھیں پھر منہ دھو کر مزے سے سو جاتی تھیں شادی پر  
میرے ساتھ یہ کیا۔ ویسے والی رات پھر کی ہو اور  
علیحدہ کی منگنی پر میں اگلے روز کی چھٹی لے کر آتا تھا  
لیکن اس روز تم اتنی حسین لگ رہی تھیں کہ مجھے  
خوشہ ستایا کہ اگر میں رات بھر گیا اور منہ دھونے والی  
ریٹیکل جاری رکھی گئی تو میں چاچو کے گھر کوئی بڑا  
گھراٹا پھیلاؤں گا بس اسی لیے امپورٹنٹ میٹنگ کا  
بسانہ کر کے واجبی کی ٹالی حالانکہ مجھے واپسی کی فلاسٹ  
نہیں مل سکی تھی۔ بابے روڈ آتا پڑا تھا۔“ وہ ہنستے  
ہوئے بتا رہا تھا۔

”میں اس روز سر سے پاؤں تک آپ کے لیے بھی  
سنو ری تھی۔“ اتنا یہ نے اس کے کندھے سے سر ٹکا  
کر اعتراف کیا۔ اس اظہار پر شہرام قہقہہ اٹھ گیا۔  
”تم مجھے ہر روپ میں ہی بہت پیاری لگتی ہو۔“ یقین  
کرو اس وقت اس سڑے بسے حلیے میں تم کوئی کام  
کرنے والی ماسی لگ رہی ہو پھر بھی سیدھا دل میں اتر  
رہی ہو۔“

اب شہرام اسے چھینز رہا تھا لیکن اتنا یہ شرمندہ  
ہوتے ہوئے اس سے کچھ پرے ہٹی تھی۔ گھر کی





”کیا؟“ دونوں عورتوں کے حلق سے چیخ نما آواز نکلی۔

”ماسی! اللہ کا نام لے! اتنی صبح اتنا بڑا الزام۔ تجھے پتا ہے رب سنا کتنا ناراض ہوتا ہے کسی پرستان لگانے پر۔“ پہلی عورت نے ذرا سنبھل کر کہا۔

”تو بھلا مجھے کیا ضرورت پڑی ہے جھوٹ بولنے کی۔ میں خود دیکھ کر آئی ہوں۔“

”ماسی بس کر بھائی آفاق کی بچیاں کتنی نیک اور باحیا ہیں پورا محلہ جانتا ہے صومہ و صلوة کی پابند ہیں۔

اپنے ہاتھوں میں تولی ہیں۔ گھر کی دہلیز پر کبھی کھڑی نہ ہوتی۔ اسکول کالج عبا میں گئیں اور نظر جھکا کر گئیں اور تو کیا صبح صبح بیکواس کر رہی ہے۔“ دونوں عورتوں کو شدید برا لگتا تھا۔

”تم لوگوں کو عین نہیں آئے گا۔ خود جا کر دیکھ لو۔ صفا تم کو بھی ہوتی ہے رانا آفاق کے گھر۔“

”ماسی جب کر جا یہ ساتھ والی گلی میں تو آفاق بھائی کے بھائی کا یعنی طاہرہ کا سسرال ہے۔ طاہرہ کے منگیتر نے سن لیا تو قیامت آجائے گی۔“ پہلی عورت نے پھر دلی آواز میں سمجھانا چاہا تھا لیکن چنگاری لگے تو آگ تو مستعد رہتی ہے۔

”میں وہی تو بیٹا رہی ہوں عاصم کے چھوٹے بھائی فاخر کے ساتھ تو بھاگی ہے طاہرہ۔“

”ماسی نذیراں! لگتا ہے تو رات کو کوئی خواب دیکھتی رہی ہے اور اب وہی ذہن میں اٹک گیا ہے۔ بھائی آفاق کی دونوں بیٹیاں اپنے تایا کے گھر جا رہی ہیں بیاہ کر اور ایک ہفتہ ہی تو رہتا ہے شادی میں۔ طاہرہ کیوں جانے لگی اپنی چھوٹی بہن کے منگیتر کے ساتھ؟

اور کتنے سالوں سے تو رشتے طے تھے اور اب شادی سے ایک ہفتہ پہلے گھر سے بھاگے گی۔ طاہرہ تو اپنے نام کی طرح حاکیزہ ہے۔ ایسے الزام نہیں لگاتے ماسی!

وہ اپنی بات مکمل کر کے پلٹنے ہی والی تھیں جب رانا آفاق کے بڑے بھائی رانا آفتاب اور ان کی بیوی راحیلہ آفتاب روتے ہوئے رانا آفاق کے گھر کی

دھول آکر ملی کی اڑ رہی ہو تو منظر کچھ پل کے لیے دھندلا سا جاتا ہے! آنکھیں کچھ لکھوں کے لیے منظر سے مانوس نہیں ہوتیں پھر آہستہ آہستہ دھول بندھ جاتی ہے اور منظر پہلے جیسا صاف ستھرا نظر آنے لگتا ہے لیکن اگر دھول عزت کی اڑ جائے تو؟

پھر کچھ پل تو کیا کچھ سال بھی بیت جائیں تو منظر شفاف نہیں ہوتا۔ نفرت زدہ نظریں کئی سال جھپٹی رہتی ہیں۔ ملنے ملاسنے والوں کی زبانیں کبھی ہمدردی تو کبھی ترس بھری گفتگو میں ڈھل جاتی ہیں۔ اور ناکردہ گناہوں کی سزا سسل در سسل چلتی رہتی ہے۔ وہ عزت جسے سالوں لگ جاتے ہیں بنانے میں معاشرے میں سراٹھا کر چلنے میں لیکن اک لمحہ لگتا ہے عزت کی دھول اڑنے میں۔ بالکل یوں جیسے کوئی چاول بھری تھال میں سے باریک باریک کنکر چن رہا ہوں اور جب چن لے تو کوئی شرابی بچہ تھال میں ہاتھ مار کر تھال گرا دے۔

”اللہ خیر کرے ماسی نذیراں! آج صبح ادھر آرہی ہے۔“ دونوں عورتوں نے ایک ساتھ ادھر دیکھا۔ اتنے میں ماسی نذیراں پھولے ہوئے سانس کے ساتھ ان کے قریب آکر رکی۔

”کیا ہو ماسی! اتنی صبح کہاں سے آرہی ہو؟“

”اگر سے نہ پوچھو کیا ہوا ہے سمجھو قیامت آگئی ہے۔“ ماسی نذیراں گھبرائی ہوئی تھی۔

”کیسی قیامت ماسی؟“

”رانا آفاق کی بڑی بیٹی گھر سے بھاگ گئی ہے۔“





طرف جاتے نظر آئے۔  
 ”ماسی نذیراں! کیا تو واقعی سچ کہہ رہی ہے؟“ دونوں  
 عورتیں حیرت سے رک گئیں۔  
 ”میں نے پہلے کبھی جھوٹ بولا ہے؟“ ماسی نذیراں  
 بگڑ کر بولی۔  
 ”لیکن۔“ وہ دونوں حیرت سے نکل نہ پا رہی  
 تھیں۔

”بھئی میں تو صاف بات کروں گی۔ شادی تو رانا  
 آفاق اور رانا آفتاب کی آنکھی ہوئی تھی۔ بیویاں بھی  
 دونوں کی ہیں تھیں! آفتاب کے ہاں پہلے عاصم آیا پھر

درمیان گئے دس بچے فوت ہو گئے، پھر نازی اور آخر میں  
 فاخر۔ جبکہ رانا آفاق کی شادی کے دس سال بعد اولاد  
 ہوئی! پہلی بیٹی طاہرہ جو فاخر کی ہم عمر تھی۔ اس سے  
 چھوٹا اطہر اور اس سے چھوٹی فارہ آفتاب کی نازی اطہر کو  
 بیابھی گئی! اکلوتے بیٹے کی خوشی آفاق نے پہلے کر لی! کیا  
 ہوا جو نازی تھوڑی بڑی تھی اطہر سے، وہ اپنی بیٹیاں تو

بڑے کو بڑی دے دی اور چھوٹے کو چھوٹی! آفتاب  
 کا بڑا بیٹا عاصم طاہرہ سے دس سال بڑا ہے جبکہ فاخر ہم  
 عمر! ممکن ہے وہ اپنے ہم عمر کو پسند کرتی ہو۔ جب کوئی  
 راستہ نہ ملتا تو گھر سے بھاگ گئے ہوں۔“ ماسی نذیراں  
 نے جیسے دل میں سوچا من و عن وہی بیان کر دیا۔

”لیکن ماسی۔۔۔ میرا دل نہیں مانتا۔ طاہرہ تو بہت  
 ٹیک بچی تھی۔ آنکھوں کے جانے رہی ہے۔ معصوم  
 چہرہ معصوم باتیں۔ پھر اپنی چھوٹی بہن کا گھر کیوں برباد  
 کرتی۔ جبکہ میں نے سنا تھا فاخر فارہ کو بہت پسند کرتا  
 تھا۔“

”رب سو بنا خیر کرے۔ کیا زمانہ آگیا ہے۔۔۔ آفتاب  
 کا سوچا نہ تاپا کا بچہ چھوٹی بہن کا۔ شکل سے شریف  
 دکنے والیاں ہی ایسے کر قوت کی نکلتی ہیں۔ سارے  
 رشتے برباد کر کے گئی ہے۔“

جہاں کچھ دیر پہلے طاہرہ کی پاکیزگی کی باتیں ہو رہی  
 تھیں اب وہیں برائیاں ہو رہی تھیں۔



”ہاں کہاں گئی ہے اور کہاں گھر سے بھاگی ہے۔ ورنہ  
 میں تیری جان لے لوں گا؟“  
 رانا آفاق کا بے بسی اور غصے سے بُرا حال تھا۔

بے بسی میں ان مردوں کا عورتوں پر ہی بس چلتا ہے  
 ”ابو جی مت ماریں امی تجی کو! تمہیں بھی آپ کی  
 طرح کچھ نہیں پتا۔“

رانا آفاق نے سمجھ کر ایک تھپڑ فارہ کو دے مارا۔  
 ان کا رخ اب اس کی طرف ہو گیا تھا۔

”پھر تجھے پتا ہو گا۔ ہر وقت ایک ساتھ ہوتی تھیں۔“  
 رانا آفاق سرخ انگارے آنکھیں لیے فارہ سے پوچھ



رہے تھے۔

تلاش کرنے کی کبھی کوئی کوشش نہ کی جائے۔“ کسی دو لائیں طاہرہ نے لکھی تھیں۔ حیرت کی بات تھی گھر سے وہ کچھ بھی نہیں لے کر گئے تھے۔ سوائے ایک تصویروں کے البم کے۔

عاصم و حارثا ہوا اندر آیا تھا۔

وہ آسان نکل گیا ہے انہیں۔

کسی کو کچھ نہ بھی پتا ہوا اسے تو سب کچھ پتا ہوگا، آخر اس کے یار کے ساتھ بھاگی ہے اس کی بہن۔“ عاصم کی — آنکھوں میں انگارے چلنے لگے۔

اس نے بالوں سے پکڑ کر فارہ کو کھڑا کیا تھا۔

”پتا کہاں ہے جو ہماری عزت کی وصولی اڑا کر مٹی ہے۔“ فارہ نے آنسوؤں سے لبریز آنکھیں سختی سے بند کیں۔

بند کیں۔ انمول کرنے والا ہے مول کر گیا تھا اور اس کی بہن طاہرہ اپنے عمل سے ان سب کو بدنام کر گئی تھی۔

”فارہ! خود تباہی ویرہہ مجھے اگلوٹا آتا ہے۔“ عاصم کا سخت ہاتھ فارہ کے نازک رخسار کو سرخ کر گیا تھا۔

عاصم کو آج تک کسی نے بھی اس انداز اور لمبے میں بات کرنے نہیں دیکھا تھا لیکن چوٹ شاید شدید تھی۔ اسی لیے وہ اس قدر مشتعل تھا۔

”ہاں یہ سچ ہے ہم دونوں ایک دوسرے سے ہر بات غیر کرتے تھے لیکن یہ بات انہوں نے نہیں بتائی اور رہی بات فاخر کی تو وہ مجھ سے ملنے کے لیے اصرار کرتا تھا لیکن میں اب بکے ڈر سے کبھی نہیں ملی۔ تاریخ والے دن بھی اس نے سختی سے کہا تھا کہ اگلے دن طاہرہ آیا اور خالہ کو بازار بھیج دینا۔ میں آؤں گا۔ گھر میں نے ڈر کے مارے آیا کو بتایا۔ انہوں نے کہا میں فاخر کو سمجھا دوں گی پھر اس دن آپا کے بجائے میں اور امی بازار چلے گئے۔ بعد میں فاخر آیا تھا۔ آپا نے مجھے اتنا ہی بتایا۔ میں نے بہت پوچھا لیکن انہوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔“ فارہ نے روتے ہوئے ساری بات تفصیل سے بتائی۔

”اس کا مطلب ہے ضرور فاخر کے پاس ایسی کوئی بات تھی جس نے طاہرہ کو گھر سے بھاگنے پر مجبور کیا۔ لیکن کون سی بات؟“ رانا آفتاب بولے۔

”دیکھ فارہ! تیرے باپ کی عزت تیرے قدموں میں پڑی ہے۔ مجھے بتاؤ وہ کون سے شہر گئے ہیں۔

میں وعدہ کرتا ہوں تجھ سے۔ طاہرہ کی شادی فاخر سے ہی کروں گا اور تو جس سے چاہے گی۔ کارڈ بانٹ دیے گئے ہیں۔ ایک ہفتے بعد مہمان آجائیں گے۔ اور تیرے باپ تایا کی عزت کا جنازہ نکل جائے گا۔ چالیس سال کی کمائی ہوئی عزت لکھوں میں لٹ جائے گی۔“ رانا آفتاب بے بسی سے رونے لگے تھے۔

فارہ ان کے قدموں میں گر کر رونے لگی۔

”ابو جی! مجھے بھی کچھ نہیں پتا۔ آپا نے ایسا کیوں کیا۔ وہ تو عاصم بھائی سے بہت محبت کرتی تھیں۔“

کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اسی وقت رانا آفتاب اور ان کی بیوی راحیلہ روتے ہوئے داخل ہوئے۔

”آفتاب! یہ کیا ہو گیا ہمارے بچوں نے ہمیں کن گناہوں کی سزا دی ہے؟“ دونوں بھائی گلے لگ کر رونے لگے تھے جبکہ راحیلہ بیگم اپنی بہن رضیہ کو سنبھالنے لگیں۔

”عاصم کی آنکھوں میں تو خون اتر آیا ہے۔ پولیس کو فون کر دیا ہے زندہ یا مردہ پکڑ لائیں۔ سارے دوستوں کو مارو گرد بھیج دیا ہے۔ آفتاب! جوان بیٹے کی لاش دیکھنے کی جگہ میں ہمت نہیں۔ تم۔ تم عاصم کو سمجھاؤ۔ اپنے بھائی سے انتقام نہ لے۔“

”لیکن انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ ان کی بات تو سناؤں سے ملے ہے فاخر کے اصرار پر ہی فارہ کو مانگا تھا اور طاہرہ عاصم کا جھکاؤ بھی ایک دوسرے کی طرف تھا۔ طاہرہ کو تو کبھی فاخر سے مذاق کرتے نہیں دیکھا کہاں یہ انتہائی قدم اٹھا لیتا۔ بات کچھ اور ہے۔ وہ بہن کی آنسو صاف کرتے ہوئے بولیں۔

”یہ دو لیٹران دونوں کے بیڈ روم سے ملے ہیں۔“ رانا آفتاب نے غصے سے راحیلہ بیگم کی طرف وہ خط پھینکے۔ جس پر لکھا تھا۔ ”میں یعنی فاخر اور طاہرہ اپنی مرضی سے گھر سے ہمیشہ کے لیے جا رہے ہیں۔ ہمیں



ہے رحمہاں دیکھا منہ ہوتا ہے جو پورے خاندان کو اندر ہی اندر لٹل کر دیتا ہے۔

آٹھ دن بر لگا کر اڑ گئے عاصم بھوکے شیر کی طرح خونخوار پھر تانسمان آنے شروع ہو گئے تھے۔ دونوں بھائیوں کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ راحیلہ بیگم اور رضیہ بیگم تو ہوش سے ہی ریگانہ ہو رہی تھیں۔ اطہر اور نازی تھے جو بھانت بھانت کے مسانوں کو سنبھالنے میں لپکان ہو رہے تھے۔ عاصم سرے سے غائب تھا اور فارہ کو بالکل چپ لگ گئی تھی۔ وہ خالی نظموں سے سب دیکھ رہی تھی۔ جتنے منہ اتنی باتیں ہو رہی تھیں۔ کسی عورت کے منہ سے نکلنے والی ایک چنگاری رانا آفتاب کے کان میں بھی پڑی تھی۔

”ارے بڑی بھانگ گئی تو کیا ہوا چھوٹی تو ہے نا۔ اس طرح کی ذلت کے بعد اور تو کوئی بیانیے آئے گا نہیں۔ گھر کی بات گھر میں رہ جائے گی پھر بیٹا بھی تو بھائی کے خون کا بیاسا ہوا ہے۔ اس طرح کرنے سے اس کا غصہ بھی جھانگ بن کر بیٹھ جائے گا۔“ رانا آفتاب نے یہ سب بہت غور سے سنا تھا اور ایک لمحے میں فیصلہ کیا۔ عاصم اس بات کے لیے راضی نہیں ہو رہا تھا۔

”دیکھ عاصم! ایسا کرنے میں ہمارا بہت بھلا ہے بلکہ ناکہ ہے۔ ایک تو اتفاق پر یہ احسان کر کے دیا ہے رکھیں گے کیونکہ ہماری نازی ان کے گھر بیانی ہے۔ دوسرا نکاح کر کے تم فارہ سے ہر وہ راز اگلا سکتے ہو جو وہ طاہرہ کے بارے میں جانتی ہے۔ تمہارا انتقام پورا ہو جائے گا۔ اور پھر لوگوں کی زبانیں بند ہو جائیں گی۔“ یہ ساری باتیں عاصم کی سمجھ میں آگئی تھیں۔ فارہ سے کسی نے نہیں پوچھا۔

اطہر اتفاق نے دیا دیا سا احتجاج کیا تھا کہ یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔ ایک تو عاصم فارہ سے بہت بڑا ہے۔ دوسرا وہ اس صورتحال میں فارہ کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ وہ اپنی دونوں بہنوں سے بہت پیار کرتا تھا مگر رانا اتفاق نے یہ کہہ کر بات ہی ختم کر دی تھی۔

”کیا چاہتے ہو تم کہ دوسری بھی رات کے اندھیرے میں منہ کالا کر کے چلی جائے؟“ اور رانا اطہر

”وہ بات بھی یہی نہیں بتائے گی۔ اس کو پتا ہے سب۔“ عاصم نے ایک بار پھر جھنجھوڑ کر فارہ کو سامنے کیا وہ شدت سے رونے لگی۔

”عاصم بھائی مجھے اتنا ہی پتا ہے۔“

عاصم نے پوری قوت سے اٹنے ہاتھ کا ایک اور تھپڑ فارہ کو مارا۔ وہ دور جا گری۔

”عاصم! تم بھول رہے ہو بھگ کر لے جانے والا تمہارا اپنا بھائی ہے۔“ عاصم نے دونوں مٹھیاں سختی سے بند کر لیں۔

”یہی بات میرے تن من میں آگ لگا رہی ہے۔ میری سنگ کو میری عزت کو میرے بھائی نے لوٹ لیا۔ میری غیرت پر یہ بات تازیانے لگا رہی ہے۔ میرے جسم میں خون کے شرارے پھوٹ رہے ہیں۔ میں آپ سب کو بتاؤں جس طرح اس نے میری ذلت کی ہے میری عزت کی دھول اڑائی ہے میں جب تک اس کے سینے میں انتقام کی گولیاں نہیں اڑاؤں گا چین سے نہیں بیٹھوں گا۔“

عاصم کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ خونخوار تھا۔ وہ سب پر ایک تیز نظر ڈال کر ہر نکل گیا۔ وہاں موجود ہر نفس کو سناپ گیا تھا۔ وہ ہی تو بھائی تھے! عاصم کا غصہ اگر ٹھنڈا نہ ہوا تو۔ ایک بیٹا مارا جائے گا اور دوسرا ساری زندگی کے لیے جیل چلے جائے گا۔ اتنی ذلت بھری زندگی وہ کیسے جی پائیں گے۔ سب کے دلوں پر ہاتھ پڑا تھا۔ بعض اوقات غلطی کوئی اور کرتا اور سزا بہت سے لوگوں کو بہت سارے سال بھگتی پڑتی ہے۔ ایسا ہی کڑا وقت رانا آفتاب کے خاندان پر آیا تھا۔ بیٹا اپنا تھا وہ کس کا گریبان پکڑتے سزا کا سوچتے تب ہی اپنا ہی جگر کلٹنا ہے یہی سے دونوں بھائی دیواروں میں سر مار رہے تھے۔

\*\*\*

کہتے ہیں غرت کے دن آجائیں تو مبر و شکر سے کٹ جاتے ہیں لیکن اگر ذلت کے دن آجائیں تو نہ ہی صبر نیکی بنتا ہے نہ ہی شکریہ کیا جاتا ہے۔ بس اک



خاموش ہو گیا۔

جیسے تیسے عورتوں نے اسے دلسن بنا دیا تھا۔  
رخصتی کے وقت رانا آفاق نے اسے پیار نہیں کیا  
۔ ایک بیٹی نے اعتبار توڑا تھا اور وہ دوسری سے بھی  
نفرت کرنے لگے تھے۔ اس دنیا کا دستور رہا ہے غلطی  
کوئی کرتا۔ ہے سزا کسی کو جھیلنی پڑتی ہے۔

اس کھرکی دلیز پار کرنے سے پہلے اپنی خواہشوں  
محببتوں اور اعتبار کو فارہ آفاق وہیں چھوڑ آئی تھی۔  
جانتی تھی! اسے طاہرہ کی بسن ہونے اور فخر کی منگنی  
ہونے کی سزا بھگتنی ہے۔

\*\*\*

طاہرہ کا سارا جینز بھی اسے دے دیا گیا تھا۔ عاصم  
آفتاب کا پورا گھر اس کے جینز سے سج گیا تھا۔ بس ایک  
دیہی پتھر کی مورت بن گئی تھی۔ تازک جذبے اور ارمان  
مر گئے تھے۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی جب عاصم  
دروازے کو ٹھوکر مارا اندر آیا تھا۔

”اوہ تو انتظار کیا جا رہا ہے۔ لیکن کس کا؟“  
زہریلے لہجے کا ہر فارہ کے کانوں میں اترا۔ وہ خود میں  
منہ سمٹ گئی۔

ایک سے ایک گرا ہوا لفظ استعمال کرتا وہ خود میں  
نہیں رہا تھا۔

”ہیٹا کس کا انتظار کر رہی تھی۔“ بے دردی سے  
اس کا دہنٹا اتار پھینکا۔ زہرات نونچ نونچ کراتا رہے۔  
تھپڑوں سے چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ روئی بھگتی اپنا بچاؤ بھی  
نہیں کیا رہی تھی۔

”اگر تم یہ سوچ کر آئی ہو کہ میں تمہیں اپنی بیوی  
بنا کر رکھوں گا۔ تمہارے حقوق ادا کروں گا تو یہ بات  
ابھی سے اپنے ذہن سے نکال دو۔ میں تمہیں اپنی بیوی  
کے برابر بھی نہیں سمجھتا۔ جتنا بڑا گناہ ان دونوں کا ہے  
اس سے بڑا گناہ تم نے ان کے بارے میں سمجھ نہ بتا کر کیا  
ہے۔ اگر تم بتا دیتیں تو تم بچ جاتیں۔ لیکن اب تم روز  
جیو کی روز مرو گی۔“ وہ اس کا چہرہ سختی سے دبوچے ہوئے  
تھا۔ فارہ کے خاموش آنسوؤں سے عاصم کے دونوں

ہاتھ تر ہو گئے تھے۔

”اگر اب بھی تم مجھے سچ بتاؤ تو تھوڑی بہت منجائش  
نکال جاسکتی ہے! بتاؤ شہباز کب لگے ہیں اور کیوں  
لگے ہیں؟“ فارہ کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔

”مجھے کچھ نہیں بتا۔“ وہ جھکتے رکی تھی اور عاصم  
اس پر لوٹ پڑا تھا۔ پھپھڑوں سے ٹھوکر دے مارا کر  
اسے بے جان کر دیا تھا۔ عاصم کا غیظ و غضب سن کر  
رانا آفتاب اور راحیلہ بیگم دوڑتے اندر آئے تھے۔  
اندر کے منظر نے ان کے اوسان خطا کر دیے تھے۔ فارہ  
بے جان پڑی تھی۔

رانا آفتاب نے بمشکل عاصم کو پکڑا۔ جبکہ اس بے  
ہوش وجود کو راحیلہ بیگم نے سنبھالا تھا۔

فارہ کے ہونٹوں اور پیشانی سے خون نکل رہا تھا۔  
اور بھی کئی جگہ سے لڑھی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر  
راحیلہ بیگم کے آنسو بہنے لگے۔ فارہ سب سے چھوٹی  
تھی اور دونوں گھروں کی لادلی تھی خود عاصم نے کتنے ہی  
تاز خمرے اور فرمائشیں پوری کی تھیں۔ انہوں نے  
اپنے بیٹے کو دیکھا۔ جس کی زندگی میں انہیں برس بعد  
بہار آئی تھی تو کس انداز میں ان کا فرمان بردار بننا دلتے  
وقت کے ساتھ کیسے بدل گیا تھا۔

رانا آفتاب نے تقریباً ”بے سدھ پڑی فارہ کو گلے  
سے لگا لیا۔ وہ ان کا سارا پاتے ہی اور شدت سے  
رونے لگی۔

”اب اگر تم نے اسے ہاتھ لگایا تو مجھ سے برا کوئی  
نہیں ہو گا۔“ رانا آفتاب نے انتہائی غصے سے اسے  
کہا۔ عاصم نے زوردار ٹھوکر کرسی کو ماری اور کمرے  
سے چلا گیا۔

\*\*\*

گلے دینا رسم کے مطابق رانا آفاق کی فیملی فارہ کو  
لینے آئی تھی مگر عاصم نے صاف انکار کر دیا۔  
”عاصم بھائی! آپ طاہرہ آپا کی سزا فارہ کو نہیں دے  
سکتے۔“ ”طہر غصے سے بولا۔“

”طہر! تم خاموش رہو! فارہ اب عاصم کی ذمہ داری



ہو گئے تھے



وقت اور مقدار نہ تو کسی کے ہاتھ میں آتے ہیں اور نہ ہی کسی کی مرضی سے ملتے ہیں۔ مقدر تو انسانوں کو ایسے نچاتا ہے کہ انسان قتلوں سے اٹھ کر سڑک پر آجائے اور محبتوں سے کھیلا نفرتوں میں گر جائے۔ سارا گزر جانے کے بعد بھی رانا آفتاب اور رانا آفاق کے گھر کا ہر فرد حیرت زدہ کھڑا تھا۔ وقت نے ایسی شطرنج ان کے ساتھ کھیل رکھی تھی کہ مقدر کی بساط پر نیچے مہرے سب دھول ہو گئے تھے۔ وقت تو گزر گیا تھا لیکن عاصم کا رویہ نہیں بدلا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شرارے پھونکتے رہتے۔ ظاہرہ اور فاخر کا ان گزرے پانچ سالوں میں کچھ ہوا نہیں چلا تھا۔ یہی بات عاصم کی مردانگی اور انا پر ضرب لگاتی تھی۔ اس کی سوچ بہت متغی ہو گئی تھی۔ ہر رشتے کو غلط ہی لے رہا تھا۔ یہاں تک کہ فارہ کی بے لوث خدمت اور وفا بھی اس میں ذرا سی سی ٹپک نہ لاسکی اور لوگ بھی کب بھولتے ہیں ایسی باتوں کو۔ وہ اسی شہر اور نگلی میں رہتا تھا جہاں سب ہی ظاہرہ اور فاخر کو جانتے تھے۔ گھر سے نکلتے وقت کوئی عورت یہ پوچھ لیتی تھی کہ تمہیں چلا ظاہرہ کا۔ یا فاخر کے ملنے جلنے والے فاخر کا پوچھتے۔ پوچھنے والا تو پوچھ کر اپنی راہ لیتا اور شامت فارہ کی آجاتی۔ وہ خاموشی سے مار سستی رہتی، راحیلہ بیگم ہاتھ بولا ہوا کر اسے بجاتیں۔ رانا آفاق نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ان کے لیے فارہ بھی مرگئی تھی۔ جبکہ اطہر اپنی ماں کے ساتھ کئی بار آیا تھا لیکن اسے ساتھ لے جانے کی نہ ہی عاصم نے اجازت دی نہ ہی فارہ راضی ہوئی۔ اب بہن کے ساتھ بیٹھ کر رہتا اسے منانا اور تھک کر دلہاں چلا جاتا۔

ایک دن راحیلہ بیگم فاخر کا کمر صاف کرنے اور اس کی چیزوں کو چھونے میں مصروف تھیں وہ ماں تھیں انہیں فاخر دن رات یاد آتا تھا۔ چیزیں رکھتے وقت ایک ڈائری ان کے ہاتھ لگی۔ وہ خود تو پڑھی لکھی

ہے وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ چلو اٹھو چلتے ہیں۔“ رانا آفاق نے گہمتی رضیہ بیگم کو چلنے کا اصرار کیا۔ ”لیکن ابو جی! میں فارہ کو لیے بغیر نہیں جاؤں گا!“ اطہر کا دل اپنی معصوم سی بہن کے لیے تڑپ رہا تھا! جبکہ رانا آفاق نے اپنا دل پتھر کا کر لیا تھا۔

”بھائی پلیز! آپ جائیں ابو جی جیسے کہہ رہے ہیں، ٹھیک ہے۔“ فارہ کی آنسوؤں بھری کانپتی آواز اطہر اور اس کی ماں کا دل چیر گئی تھی۔

”فارہ ابھی تمہارا بھائی زندہ ہے!“ اطہر چیخ رہا تھا۔ ”بھائی! آپ چلے جائیں پلیز!“ فارہ نے کچھ اس لہجے میں کہا تھا کہ اطہر کو اپنے قدم باہر کی طرف موڑنے ہی پڑے۔

”شاباش اسی طرح تمہیں اپنی سزاؤں کو اپنے لیے مضبوط کرنا ہو گا۔“ وہ وہ دم بھرا کر اس تک آیا تھا۔ ”اور کان کھول کر سن لو! آج کے بعد گیٹ تو کیا صحن میں بھی نظر نہ آو! نہ موبائل کو ہاتھ لگاؤ گی! اور نہ ہی گلی محلے کی کسی عورت سے ملو گی! بات دہرانے کی مجھے عادت نہیں ہے، کبھی بھولنا مت۔“ عاصم نے اسے بانوؤں سے سختی سے پکڑ کر کہا تھا اور پھر دھکا دے کر اپنے پرچہ دیا تھا۔

رانا آفتاب اور راحیلہ بیگم گم صم سے بیٹھے رہ گئے تھے۔ آخر کیا کرتے ایک ہی تو بیٹا رہ گیا تھا ان کے پاس۔ رانا آفتاب نے بہت دور کی سوچی تھی کہ فارہ کو اپنے گھر لا کر سب کچھ ان کے ہاتھ میں آجائے گا۔ ان کی بیٹی نازلی بھی محفوظ رہے گی اور فاخر بھی۔ رانا آفتاب اتنا تو جان گئے تھے عاصم جتنا بھی فارہ پر تشدد کرے فارہ اپنی زبان نہیں کھولے گی۔ یقیناً بات درمیان میں کچھ اور ہے اور غلطی بھی اپنے بیٹے کی ہی نکلے گی! مگر ان کو کیا خبر عاصم اس پھول جیسی فارہ کو اتنا تار چر کرے گا کیونکہ انہوں نے فارہ اور ظاہرہ کو بھی باپ بن کر ہی پالا تھا۔

اطہر ڈاکٹر تھا۔ اس کی پوسٹنگ ملتان میں تھی! لوگوں کے طعنوں سے بچنے کے لیے رانا آفاق سب کچھ چھوڑ کر اطہر اور نازلی کے ساتھ ملتان شفٹ



نہ تھیں فارہ کو توازیں دینے لگیں۔ فارہ اس کمرے میں آنا نہیں چاہتی تھی کہ عاصم نے سختی سے منع کر رکھا تھا۔ راحیلہ بیگم کی بار بار توازیں دینے پر چلی آئی۔

”جی خالہ! آپ بلاری تھیں؟“

”فارہ! کھنایہ فاخر کی ڈائری ہے شاید اسی سے کچھ پتا چل جائے!“ فارہ نے ابھی ڈائری کھولی ہی تھی کہ عاصم آگیا اور آتے ہی گرجنے لگا تھا۔

”جب میں نے تمہیں منع کیا ہے تو تم کیوں اس کمرے میں.....؟“ فارہ کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ کلائی پکڑ کر

کمرے میں لے گیا تھا اور دروازہ بند کر دیا۔ باہر راحیلہ بیگم فریاد کرتی رہ گئیں۔ لاتوں سے ہاتھوں سے اس کے پورے وجود کو ٹیل ڈیل کر دیا۔ جسم پر جو پہلے کے زخم تھے ان میں خون رہنے لگا تھا۔ اسی شام اطہر آفاق چلا آیا۔ فارہ کی حالت دیکھ کر اس کا دل پھٹ گیا۔

”یار بس کر! بس کروے کیا تجھے خدا کا خوف نہیں میں بھی تو نازلی پر تشدد کر سکتا تھا کہ تمہارا بھائی میری بہن کو ورغلا کر لے گیا ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ اس میں نازلی کا کوئی قصور نہیں۔ اسی طرح فارہ کا بھی کوئی قصور نہیں۔ وہ مر جائے گی۔ کہیں اس کا اصرار ہمارے لیے ناسور نہ بن جائے پانچ سال کم تو نہیں ہوتے وہ پتھر تو نہیں انسان ہے۔ اتنا نارجرا کر کسی جانور پر بھی کرتے تو وہ بھاگ جاتا۔ باغی ہو جاتا۔ یہ وہی فارہ ہے جس کی ہم ہر فرمائش منہ سے نکلنے سے پہلے پوری کرتے تھے! اس وقت اس میں اتنا صبر بھی صبر نہیں تھا۔

ذرا اسی بات پر روٹھ جاتی تھی ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی ہے۔ دھول ہوئی جارہی ہے۔“ اطہر بیگم جیسے اسے یاد کروا رہا تھا عاصم کے اندر ندامت کا سمندر بچنے لگا تھا اطہر اسی شام چلا گیا تھا اور عاصم کو سوچنے کا موقع نہ مل سکا تھا۔

\*\*\*

فارہ ٹھنڈے فرش پر دوہری ہو کر لیٹی۔ گردے میں اٹھنے والے شدید درد سے نڈھال ہو رہی تھی۔ درد

بھی کتنی شکلیں بدلتے ہیں۔ ظاہر کا دیا ہوا درد اس کی پیشانی پر لگ گیا تھا۔ اور رانا آفاق کی نفرت کا درد دل میں جم گیا تھا۔ شوہر کا دیا درد اس کے اندر باہر سے رستا تھا۔ اب پچھلے چند ماہ سے پیٹ میں شدید درد اٹھتا تھا۔

جو اسے نڈھال کر دیتا تھا! اور وہ کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی! پہلے آزیائشیں کم تھیں جو اب اندرونی اردنے بھی جگہ گھیر لی تھی!

عاصم بیڈ پر لیٹا لیوی دیکھ رہا تھا۔ بار بار چینل سرچ کرتا! شعوری طور پر فارہ پر نظر نہ جاتی! جو کمرے میں لیٹ کر زمین پر لیٹی مسلسل ہل رہی تھی۔ عاصم نے اسے اپنے برابر بھی جگہ نہیں دی تھی۔

”فکر نہیں نیچے غیند نہیں آ رہی تو صوفے پر لیٹ جاؤ۔“

فارہ جو پیٹ پر ہاتھ رکھے دوہری ہو رہی تھی! حیرت زدہ سی عاصم کو دیکھنے لگی۔ وہ خود کو مصروف ظاہر کرنے کے لیے لیٹی ہوئی پر نظریں جماتا کر بیٹھا تھا۔

”میں۔ میں۔ ٹھیک ہوں۔“ کچھ دیر بعد فارہ نے حیرت پر قابو پا کر آہستہ سے کہا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔ عاصم نے چونک کر اسے دیکھا۔

”خبرے دکھانے کی ضرورت نہیں ہے جتنا کہا ہے اتنا کرو۔“

وہ پیشانی پر ہل ڈالے بولا تھا۔ اب فارہ اسے کیا بتاتی وہ پیٹ میں اٹھنے والے شدید درد سے نڈھال ہے۔ اتنی ہمت ہی نہیں ہے کہ اٹھ کر صوفے تک جاسکے۔ پہلے راحیلہ بیگم کو بتا دیتی تھی اور وہ گولی دے دیا کرتی تھیں۔ اور اب تو وہ گھر پر ہی نہیں تھیں۔ نازلی کے ہاں بیٹا ہوا تھا۔ رانا آفتاب اور راحیلہ بیگم وہاں گئے ہوئے تھے! اور فارہ کی سمجھ نہیں آ رہا تھا اس سنگدل ہم سفر سے کیا کہے۔ وہ سسکیوں کو اپنے اندر دباتی اسی کمرے میں چھپ گئی تھی۔ عاصم نے رد عمل کے طور پر غصے سے ریڈیو ٹیوٹا تھا۔ لیوی لائٹ ایک ساتھ بند کیا اور خود سیدھا ہو کر لیٹ گیا۔

”عاصم۔ عاصم پلیز مجھے کہیں سے چمن کلر لادیں۔“ رات کا نہ جانے کون سا پر تھا جب عاصم کو



اپنے قدموں پر سسکتی فارہ کی آواز سنائی دے گی عاصم نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر لائٹ آن کی تھی! فارہ کی آنکھوں سے گرنے والے آنسوؤں سے عاصم کے پاؤں بھگ گئے تھے۔

”عاصم! میرے پیٹ میں بہت درد ہو رہا ہے۔ میں مرجاؤں گی۔ مجھے کہیں سے ٹیبلٹ لادیں۔“ وہ روئے جا رہی تھی شاید جسم میں اٹھنے والے درد میں صبر نہیں تھا عاصم نے گھبرا کر بے جان وجود کو بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

”چلو اسپتال لے کر چلتا ہوں۔“

فارہ شاید بے ہوش ہو گئی تھی۔ وہ اسے گاڑی میں ڈال کر اسپتال لے آیا تھا۔

”جب مریض ختم ہو جاتا ہے تب ادھر لے آتے ہیں۔ گلے کا طوق بننے کے لیے۔ پہلے کیا سوئے ہوئے تھے۔“ پیشہ ور ڈاکٹر کا انداز سخت تھا۔

”یونیس کیس بنتا ہے۔ کس نے کیا ہے اس پر اتنا تشدد؟“ ڈاکٹر نے فارہ کے زرد چہرے پر پڑے ہوئے زخموں کے نشان دیکھتے ہوئے کہا۔

”ڈاکٹر! تفتیش بعد میں کرنا۔ میری بیوی کو جیک کر دو۔“

اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں چھوٹوں گا نہیں کسی کو۔“ عاصم شدید غصے میں آگیا تھا جب دوسری طرف سے آنے والے ڈاکٹر کی نظر بے ہوش پڑی فارہ پر پڑی تھی۔

”میتا میری مریض سے اور تم لوگ یہاں کھڑے ہو کر بحث کر رہے ہو۔ جلدی اندر لے کر چلو۔“

اور وہ پوری رات فارہ کے آنکھوں سے ریورٹس بلڈ گروپ اور دوسرے ٹیسٹ کروانے لگے۔ فارہ ہوش میں آگئی تھی۔ اسے ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ فارہ کی ضد پر وہ اسے گھر لے آیا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا ریورٹس آنے کے بعد ہی وہ اصل بیماری کا پتا سنیں گے۔

فارہ میڈیسن کے زیر اثر مگرمی خیند میں سوئی ہوئی تھی۔ اور عاصم اس کے زرد چہرے پر نظریں نکائے مگرمی سوچ میں گم تھا۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟ اتنا ظالم

کیسے بن گیا تھا؟ کیا اس پر تشدد کرنے کی وجہ طاہرہ تھی؟ طاہرہ سے محبت تو اسے کبھی بھی نہیں رہی! ہاں البتہ نسبت طے ہونے کی وجہ سے اک خاص قسم کا لگاؤ ہو گیا تھا۔ اسے محبت تو نہیں کہا جاسکتا۔ کیا وجہ تھی جو میں سب کچھ جان کر بھی اپنا سارا غصہ تم پر نکالتا رہا! شاید سبب فاجر تھا! ہاں یہی وجہ تھی! وہ سوچتے ہوئے خود چونکا تھا۔

طاہرہ فاجر کے ساتھ بھاگی تھی اور فارہ فاجر کی منگ تھی۔

”ہاں فارہ تم سے نکاح کے بعد میرے احساسات بدلے تھے لیکن افسوس میں اس ذلت پر جذبات کو سوچ کر ہر رشتے کو منفی طور پر لے رہا تھا میں نہیں غلطی ہوئی، میرے دل و دماغ پر یہ بات حاوی تھی کہ تم فاجر سے محبت کرتی ہوگی اور یہ اک اذیت دینے والی سوچ تھی جو تم پر تشدد کرنے پر اکساتی تھی۔ میں لاشعوری طور پر تمہیں ہر اس چیز سے دور رکھنا چاہتا تھا جس میں فاجر کا ذکر ہوتا۔ میرے اندر یہ بات جڑ پکڑ گئی تھی کہ میں جتنا بھی فاجر کے حوالے سے تمہیں نارج کروں گا۔ تم فاجر سے نفرت کروگی مگر میں بھول گیا تھا کہ ایسا کرنے سے میں اپنا نقصان کر رہا ہوں۔ مجھے معاف کر دو فارہ۔“

عاصم نے اس کے نازک ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیا تھا اور اسی مل فارہ کی آنکھ کھلی تھی۔ فارہ کی آنکھوں میں خوف اتر آیا۔

”درو نہیں۔ اگر وہ دوبارہ ہو رہا ہے تو بتا دو میں ابھی تمہیں اسپتال لے چلتا ہوں۔“ فارہ نے نفی میں سر ہلایا البتہ وہ ابھی تک شاکہ تھی۔

”کیا بتایا ڈاکٹر نے کیا ہوا ہے مجھے۔“ فارہ کے لہجے میں صدیوں کی جھلک تھی۔ عاصم نے چونک کر اسے دیکھا۔

”ریورٹس ملنے پر۔ بتائیں گے۔ فارہ! میں بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے کیا حق تھا میں تمہیں کسی اور کے گناہوں کی سزا دیتا۔ حق تو تمہارا بھی چھینا گیا۔ یہ بات مجھے بہت دیر کے بعد سمجھ میں آئی، میں تمہارے



کہ پاس کوئی جواب نہیں تھا۔  
 ”بھائی! ابو جی سے کہیں مرنے سے پہلے ایک بار  
 مجھ سے مل جائیں۔“  
 ”پاگل ہوئی ہو تم فارہ!“ عاصم تڑپ کر اس کے  
 قریب آیا تھا۔

”ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو ہم سب ہیں تمہارے  
 پاس۔ میں خود لے کر آؤں گا چچا جی کو۔“ وہ اس کے  
 ہاتھ تھام کر محبت سے بولا تھا۔ وہ سب جب سے آئے  
 تھے عاصم یونسی فارہ کا خیال کر رہا تھا۔ اپنے ہاتھ سے  
 دوا اور سوپ پلاتا تھا اور اس کی ذرا سی پکار پر بھاگا  
 چلا آتا۔ وہ سب عاصم کے بدلے ہوئے روئے کو دیکھ  
 کر حیرت زدہ بھی تھے اور خوش بھی۔

”اطہر بھائی!“ فارہ نے آہستہ سے پکارا۔ وہ کسی کو  
 نہیں بتا پائی تھی کہ اسے اس وقت بھی شدید درد ہو رہا  
 ہے۔ سب ہی اس کے اندر اٹھنے والے درد سے بے  
 خبر تھے۔ وہ تکیے کے سارے سے زخموراز تھی۔

”کیا بات ہے فارہ!“ اطہر اٹھ کر قریب آیا تو  
 عاصم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”اطہر! تم اس کے پاس بیٹھو میں اس کی رپورٹیں  
 لے کر آتا ہوں۔“ عاصم نے نرمی سے اس کے  
 ٹھٹھے کے ہاتھ کو چھوڑا اور باہر نکل گیا۔

”بھائی!“ وہ اطہر کا سارا ملنے ہی شدت سے رونے  
 لگی تھی۔

”فارہ!“ اطہر سے بھی بولا نہیں جا رہا تھا۔  
 آنسوؤں کا گولہ ساحلق میں اٹک گیا۔

”اطہر بھائی! ابو جی سے کہیں۔ میں ان سے بہت  
 محبت کرتی ہوں۔ اتنی کہ اگر وہ عاصم سے شادی کے  
 بجائے مرنے کا بھی کہتے تو میں مرجاتی۔“ کمرے میں  
 موجود سب ہی لوگ بے بسی سے رو رہے تھے۔

”میں نے نازی کو فون کیا ہے وہ جیسے بھی ہو ابو جی کو  
 لے کر آئے گی۔“ اطہر نے دلا سا دیا۔

”بچے غلطیاں کریں تو ماں باپ انہیں ڈانٹتے ہیں  
 انہیں سمجھاتے ہیں ان کی غلطی سدھارتے ہیں  
 کیونکہ وہ ماں باپ ہوتے ہیں پھر وہ ہمارے باپ کیوں

درد کا مدا بھی نہیں کر سکتا، لیکن میں تمہارے  
 صدقے طاہرہ اور فاخر کو معاف کرتا ہوں۔“ فارہ جو  
 ساکت لہجی حیرت سے عاصم کو سن رہی تھی چوکی۔  
 ”عاصم! صم! آپ!“ فارہ کے آنسو بے اختیار  
 ہوئے تھے۔

”فارہ! میں نے تم پر بہت ظلم کیا اور تم نے ثابت  
 کر دیا۔ طاہرہ جیسی بھی بیٹی ہوئی تمہاری جیسی باوفا  
 یا کردار بھی بیٹیاں ہی ہوا کرتی ہیں۔ تم نے انتہا کا صبر  
 کر کے تمام بیٹیوں پر دلغ لگنے سے بچالیا۔ مجھے تم پر فخر  
 ہے۔“ فارہ کو لگا تھا تمام زخموں پر مرہم لگ گیا ہو۔

”میں تمہارے زخموں کا ازالہ نہیں کر سکتا فارہ!  
 مجھے معاف کرو۔ میں بہت برا ہوں۔“ عاصم کی  
 آنکھوں میں ندامت کے آنسو تھے۔

”فارہ میں۔۔۔“  
 ”بس بھی کریں اب۔“ فارہ کا نرم دل اپنے ہم سفر  
 کے لیے تڑپ اٹھا۔

”تو تم نے مجھے معاف کر دیا۔“ عاصم نے حیرت  
 سے پوچھا۔

”نمایاں بیوی کے رشتے میں نہ اٹا ہوتی بچہ نفرت ہے۔  
 میرے ماں باپ نے مجھے یہی سکھایا ہے۔“ فارہ نے  
 اپنے ماں باپ کے جھکے سر کو بلند کر دیا تھا۔ عاصم نے  
 فارہ کو بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

”میں جانتا ہوں میں بہت برا ہوں اور غلطیاں بھی  
 ساری میری ہیں، لیکن تم کسی بھول میں مت رہنا۔  
 تمہیں تو میں پھر بھی بخشے والا نہیں ہوں۔“ وہ اس کے  
 چہرے پر جھک آیا۔

عاصم اس رات فارہ سے معافی پا لگتا رہا۔ محبت کا اعتبار  
 دیتا رہا وہ رات بہا رہن کراڑی تھی۔

\*\*\*

اگلے دن رانا آفتاب زاحیلہ بیگم کے ہمراہ اطہر اور  
 رضیہ بیگم بھی آئے تھے، لیکن فارہ کی پاسی نظریں  
 اپنے باپ کو تلاش کر رہی تھیں۔ ”می! ابو جی نہیں  
 آئے؟“ وہ نرم آنکھوں سے بولی تھی اور اس بات کا کسی



عاصم کمرے کی چوکھٹ پر کھڑا دکھ سے فارہ کو دکھاتا ہوا گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اس کے ہاتھ میں اس کی ریپور میں تھیں اور اس سے چند قدم دور طاہرہ کھڑی تھی۔ بے آواز روتی ہوئی اور اس کے پیچھے فاخر کوئی نہیں جانتا تھا ان دو بھائیوں کے درمیان کھڑی طاہرہ آفاق دونوں کے دلوں میں نہیں ہے۔

”عاصم نے مجھ سے بہت پوچھا طاہرہ آپ کہاں ہیں اور کیوں گئیں؟ مجھے یہ تو نہیں پتا وہ کہاں ہیں۔ لیکن میں یہ جانتی تھی وہ کیوں گئیں۔“

فارہ کی بات پر کمرے میں موجود سب ہی افراد چونک کر اسے دیکھنے لگے تھے اور باہر کھڑی طاہرہ کہنا چاہتی تھی۔

”نہ بتاؤ لیکن فارہ اب میری بے گناہی ثابت مت کرو۔ مجھے گناہ مل رہا ہے دو۔“ پانچ سال سے بستے آنسوؤں میں اتنا درد اور خوف نہیں تھا جتنا آج تھا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر بمشکل سسکیں کو روک سکی تھی اور فاخر وہاں موجود ہو کر بھی وہاں نہیں تھا۔ کمرے سے آتی فارہ کی آواز سینے میں موجود دل کو سنا کر ہی تھی رُلا رہی تھی۔

”طاہرہ آپ اپنے نام کی طرح آج بھی پاکیزہ ہیں اور کل بھی پاکیزہ تھیں۔ بس کبھی آنکھوں کو کھانچ نہیں ہوتا تو کبھی کانوں سے انا فارہ۔ وہ انسان جس کو مجھ سے محبت کا دعوا تھا اور وہ مجھ سے محبت کرتا تھا، لیکن محبت میں جنونی بھی تھا۔ وہ تمام رسم رواج توڑ دینا چاہتا تھا اپنے اور میرے درمیان تمام۔ دیواریں توڑنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اس کے ساتھ ہو فلنگ کروں۔ شاپنگ پر جاؤں لاٹک ڈرائیو پر جاؤں۔ اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر پارکوں میں گھوموں، لیکن میں ایسا کیسے کر سکتی تھی میں رانا آفاق کی بیٹی تھی اور مجھے میرے اسلام نے بھی اپنی حدود توڑنے کی اجازت نہیں دی، لیکن اسے تو اپنی جوائی پر مان تھا۔ وہ مجھے شادی سے پہلے زیر کرنا چاہتا تھا۔ جھگانا چاہتا تھا۔ جب اس نے مجھے زیادہ تنگ کیا تو طاہرہ آپا درمیان میں آ گئیں۔ میرے لیے ڈھال بن گئیں اور فاخر کو لگنے لگا تھا کہ

نہیں بنے۔ انہوں نے ہمیں اتنے مان اور لاڈ سے کیوں پالا تھا؟ انہیں اپنی بیٹیوں کی پہچان کیوں نہیں ہے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی بیٹیاں ایسی نہیں پھر انہوں نے لوگوں کے ساتھ مل کر پتھر کیوں اٹھالیے؟ کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

”لوگوں نے اگر پتھر اٹھائے تو انہوں نے ہاتھ میں خنجر اٹھالیے تھے۔“ کمرے کی چوکھٹ پر رانا آفاق نے قدم رکھا تھا۔ وہ اطہر کے فون کرنے سے پہلے ہی چل پڑے تھے۔ پیچھے نازلی اور سچے عاصم ہاتھ میں ریپور میں لیے بے جان قدموں سے نازلی کے پیچھے آکر رکھا تھا۔ فارہ کی کمرے میں ڈوبی ہوئی آواز سب کو سنائی دے رہی تھی اور اسی لمحے دروازے کی چوکھٹ پر دھول اڑاتے دو نفوس اور بھی اندر آئے تھے۔

”اپنے نادان باپ کو محاف کرو میری بیٹی! رانا آفاق بے اختیار آگے بڑھ کر بولے۔ کمرے میں موجود سکوت ٹوٹ گیا تھا۔

”میں بھول گیا کہ میں تمہارا باپ ہوں میں نے اپنی عزت اور ذلت کی تمام قیمت سو سمیٹ کر اسے وصول کی اور تمہیں دھول ہونے کے لیے چھوڑ دیا۔“ فارہ اپنے باپ کے سینے سے لگ کر بری طرح سسک اٹھی۔

ستون کے قریب کھڑی طاہرہ نے بمشکل ستون کو تھاما۔

”پوچھو عاصم سے میں نے اسے کتنے فون کئے؟ کتنی مرتبہ تمہارا پوچھا۔ کتنی مرتبہ اس سے التجا کی میری فارہ کو اذیت دینا چھوڑ دو میں بس تمہارے سامنے آنے سے ڈرتا تھا۔ کل رات تمہیں بار بار روتے خواب میں دکھاتا رہا۔ صبح اتنا دل پریشان ہوا کہ ان کے پیچھے ہی چل پڑا۔“ وہ فارہ کو بار بار پیار کر رہے تھے۔ فارہ کے چہرے پر زخموں کے نشان تھے جن پر وہ نرمی سے ہاتھ پھیر رہے تھے۔

”ابو جی! آپ سے ناراض نہیں ہو سکتی۔“ فارہ نے ان کے دونوں۔ ہاتھ تھام کر روتے ہوئے کہا تو رانا آفاق کے سینے میں اٹھتی ٹیس ذرا سی کم ہوئی تھی۔



ظاہرہ کیا مجھ پر سختی کر رہی ہیں اور مجھے اس سے ملنے نہیں دیتیں۔ بس بیس سے غلطی کا آغاز ہوا۔ شادی کی تاریخ رکھ لینے کے باوجود وہ اپنی بے جا خواہشات سے دستبردار نہیں ہوا تھا۔ اس نے مجھے باہر ملنے کے لیے بہت بلایا، میں نہیں گئی اور اس کی بے بسی، غصہ، انتقام میں بدل گیا اور وہ ہمارے گھر آگیا اس دن میں اور امی بازار گئے تھے اور ابو جاب۔ پر ظاہرہ آپا نے یہ سوچ کر اسے اندر بلایا کہ وہ اسے سمجھا میں گی۔

مگر وہ تو انتقام لینے آیا تھا۔ ظاہرہ آپا نازک سی لڑکی۔ اور وہ اک بھر پور مرد۔ وہ اپنی مدد کے لیے کسی کو پکار بھی نہ سکیں اور وہ اپنے بھائی کی عزت لوٹ کر چلا گیا۔

عاصم کے ہاتھ سے رپور نہیں نیچے جا گریں سب ساکت بیٹھے رہ گئے۔ ابھی تک کسی کو یقین ہی نہ آیا ہو۔ بھائیوں کو اپنی عزت کو بھی لوٹا کرنا ہے۔

”گناہ تو گناہ ہی ہوتا ہے چاہے اندھیرے میں کیا جائے یا روشنی میں۔“ رانا آفتاب کا تھا ہوا سر مزید جھٹک گیا۔ وہ مرموم نہیں تھی جس کی گواہی آسمان سے آتر آتی۔ وہ تو ظاہرہ آفاق تھی جسے باپ کا بھی خیال تھا اور بہن کا بھی۔ پھر وہ عاصم سے محبت کرتی تھی اور

محبت کرنے والے دھوکا نہیں دیا کرتے۔ اس مشکل وقت میں نہیں جو مناسب لگا اسی پر عمل کر ڈالا۔ خاموشی سے گھر سے نکل گئیں۔ انہیں کیا پتا گھر سے نکل جانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ اپنے تو قدم زخمی کیے۔

پیچھے رہ جانے والوں کو بھی ہولمان کر دیا۔ وہ گھر سے اکیلی گئی تھیں۔ میں نے ان کی ڈائری پڑھی تو مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا، میں کیا کروں، میں نے شدید غصے میں فاخر کو فون کیا اور بہت برا بھلا کہا۔ فاخر نے کہا میں اسے تلاش کرنے جا رہا ہوں اگر وہ مل گئی تو واپس لے آؤں گا اور اگر اس سے نکاح کر لوں گا۔ اگر نہ ملی تو میں بھی کبھی نہیں آؤں گا۔ فاخر نے اپنی طرف سے ایک

لیٹر لکھ کر چھوڑ دیا، میں نے بالکل ویسا ہی لیٹر آپا کی رائٹنگ میں لکھ دیا۔ مجھے پتا تھا ظاہرہ آپا اگر فاخرہ کو مل بھی گئیں تو لوٹ کر کبھی نہیں آئیں گی۔ ”مگرے

میں موجود ہر انسان ہی سکتے ہیں تھا۔

”میں نے یہ سب اس وقت اس لیے نہیں بتایا کہ ہماری عزتیں تو برباد ہو ہی گئی تھیں۔ میرے بتانے پر ظاہرہ آپا شاید بچ جائیں، لیکن فاخر یا تو پولیس کے ہاتھ لگ جائیگا پھر عاصم کے ہاتھوں قتل ہو جاتا پھر کیا بچتا۔ تایا جی نے بھی شاید یہی سوچ کر میرا نکاح عاصم سے کروایا تھا تو پھر میں کیسے اپنے ہاتھوں اپنا خاندان ختم کرتی۔ اس لیے میں نے اپنی قربانی بڑے دی“

”بس کرو فارہ۔ خدا کے لیے بس کرس۔“ باہر کھڑا فاخر پوری قوت سے چیخا تھا اور شدت سے روتا ہوا دیوار میں سر مارنے لگا تھا۔ کمرے میں موجود تمام لوگ جواب تک ساکت تھے، آواز سن کر اپنی جگہ سے مل گئے تھے عاصم کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ ظاہرہ اور اس کے پیچھے جنونی حالت میں روتا ہوا فاخر۔ سب سے پہلے راحیلہ بیگم بھاگ کر آئیں۔

بچوں کی طرح روتا ہوا فاخر ماں سے لپٹ گیا۔ جبکہ ظاہرہ باپ اور بھائی کے قدموں میں گر کر معافی مانگنے لگی تھی۔ سب ہی جان گئے تھے وہ بے قصور ہے۔ سب نے کھلے دل سے اسے قبول کر لیا عاصم ساکت کھڑا تھا۔

”ای جی۔ فارہ سے کہیں مجھے معاف کر دے، میں اپنے غلط وجود کو سزا دیتے تھک گیا ہوں۔ میں نے پورے پانچ سال کانٹوں پر گزارے ہیں۔ ظاہرہ سے بھی ہر دن، ہر لمحہ معافی مانگتی ہے لیکن اس نے مجھے معاف نہیں کیا۔ اس نے اپنے والے سچے سے بھی جس نے اک سال بھی دنیا میں لینا گوارہ نہ کیا۔ فارہ سے کہیں مجھے معاف کر دے۔ میں بہت تکلیف میں ہوں۔ میں شیطان کے ہتھکڑیوں میں آ گیا تھا۔ میں آج بھی اس سے بہت محبت کرتا ہوں۔“ فارہ کی آنکھوں سے کئی آنسو ٹوٹ کے بکھرے تھے یہ کیسی محبت تھی جو ذلت کی آخری انتہا بھی پار کر گئی۔

فاخر نے اپنا سر دیوار پر مار مار کر زخمی کر لیا تھا اور راحیلہ بیگم اسے منہ جانے میں ناکام ہو گئی تھیں۔ عاصم کے قدموں میں گری رپور میں اظہار نے اٹھائی



تھیں۔  
 ”امی جی۔ میں نے رب کی رضا کے لیے فاخر کو معاف کیا۔“ فارہ کا سانس اٹک رہا تھا۔

طاہرہ نے فارہ کے ہاتھ تھام لیے اور غم آنکھوں سے کہا۔

”میں نے بھی اسے معاف کیا۔“ مزید کسی کے کہنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ فاخر کچھ بل سر اٹھا کر عاصم کو دکھاتا رہا۔ وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔ فاخر نے اپنے درد کو ماں سے بانٹ لیا۔ اک نظر شرمندگی کی سب پر ڈالی اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ کوئی نہیں جانتا تھا اب وہ واپس کبھی آئے گا یا نہیں؟

”بجگر کا کینسر اور گردے ختم ہو چکے ہیں، مرض آخری اسٹیج پر ہے۔ علاج صم۔ یہ کس کی رپورٹ لے آئے ہو۔“

اطہر نے بے یقینی سے عاصم سے پوچھا اور عاصم کی آنکھوں سے سفید موتی برسے۔ کپڑے بسی کی انتہا تھی۔ کمرے میں موجود سب ہی لوگ اک بار پھر بل صراط سے گزر رہے تھے۔

”نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ فارہ ہمیں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ اب اسے خوشیاں دیکھنی ہیں۔“ فارہ کی ماں روتے ہوئے اس سے لپٹ گئی جبکہ فارہ بمشکل اپنا سانس کھینچ رہی تھی بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ۔

”عاصم۔“ اس نے عاصم کو پکارا۔ وہ جلدی سے اس کے پاس آیا تھا۔

”فارہ! تم فکر مت کرو۔ یہ رپورٹ میں جھوٹ ہیں۔ میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ ہم نے رات ہی وعدہ کیا ہے ایک ساتھ رہنے کا۔ ساتھ چلے گا۔“ عاصم روتے ہوئے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیے بے تلی سے کہہ رہا تھا جب کہ فارہ کے ایک ہاتھ میں طاہرہ کا ہاتھ تھا۔

”طاہرہ۔۔۔ کیا تمہاری امانت ہیں۔“ طاہرہ جو عاصم کی تڑپ دیکھ کر بے جان ہو رہی تھی پوچھی۔

”نہیں! فارہ۔“ اور فارہ کے پاس وقت ہی کب تھا۔ سب پکارتے رہ گئے اور وہ۔۔۔ چلی گئی۔ آنے والی

نسلوں پر سے داغ مٹانے کے لیے کسی اک کو توغنا ہی تھا۔

\*\*\*

”فارہ۔ فارہ پلیز مت جاؤ! میں تمہیں کبھی نہیں ماروں گا۔ مجھے معاف کرو میرے پاس آ جاؤ۔ فارہ۔“ وہ گری نیند سویا ہوا تھا۔ اچانک ڈر کے اٹھا۔

”عاصم۔ عاصم کیا ہوا؟“ طاہرہ جو قریب ہی سوئی ہوئی تھی۔ اس کی آواز سن کر اٹھی عاصم نے اس کی آنکھوں کو چھوا تھا۔

”تم فارہ ہو! تم۔ جاؤ گی تو نہیں تا میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔ میں تمہارے بنا نہیں رہ سکتا۔“

وہ نیم اندھیرے میں طاہرہ کے دونوں ہاتھ تھامے کسی بچے کی طرح دلی سارا مانگ رہا تھا۔

فارہ کی موت کو کتنے سال بیت گئے تھے، لیکن عاصم آج تک اس کی موت کو قبول نہیں کر پایا تھا۔ فارہ سے

کیا گیا آخری عہد تو پورا کر لیا تھا اور ان کی ایک چار سالہ بیٹی بھی تھی۔ مگر وہ جاتے ہوئے عاصم کا دل

ساتھ لے گئی تھی۔ وہ دن بھر کتنا بھی مصروف رہتا، لیکن رات کو سوتے ہوئے وہ فارہ کو پکارنے لگتا رہتا

لگتا اور پھر فارہ کی محبت میں اس طرح تڑپا کہ طاہرہ کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ طاہرہ نے بھی اس سے عشق کیا تھا۔

رشتوں پر مبنی دھول کو طاہرہ نے آخری سانس تک جھاڑا تھا۔ رانا آفتاب کے دونوں بیٹوں نے رانا

آفتاب کی دونوں بیٹیوں کے ساتھ انتہائی سلوک کیا تھا۔ اور ان دونوں لڑکیوں نے ہی اپنی عزت اور جان پر

کھیل کر خاندان کی لالچ رکھی تھی۔ ایک اپنے حصے کا کام کر گئی۔ دوسری بھی خود کو امر کرنے کی کوشش میں

تھی۔ دوسری طرف رانا آفتاب کے بیٹے بھی اپنی انتہا پسندی کا خمیازہ بھگت رہے تھے۔ ایک رشتوں سے

جڑنے کے بعد بھی۔ ایک رشتوں سے کٹنے کے بعد بھی۔





## نبیلہ عزیز



ماورا مرتضیٰ عافیہ بیگم کی اکلوتی بیٹی ہے۔ فارہ کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ عافیہ بیگم اس کا اپنی سہیلیوں سے زیادہ ملنا جلتا پسند نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ بھی اس پر بہت ساری پابندیاں لگاتی ہیں، جبکہ ماورا خود اعتماد اور اچھی لڑکی ہے۔ عافیہ بیگم اکثر اس سے ناراض رہتی ہیں۔ البتہ بی بی گل اس کی حمایتی ہیں۔

فارہ اپنی شہینہ خالہ کے بیٹے آفاق یزدانی سے منسوب ہے۔ دو سال پہلے یہ نسبت آفاق کی پسند سے ٹھہرائی گئی تھی مگر اب وہ فارہ سے قطعی لا تعلق ہے۔

منہرہ، شہینہ اور نیرہ کے بھائی رضا حیدر کے دو بچے ہیں۔ تیمور حیدر اور عزت حیدر۔ تیمور حیدر بزنس میں ہے اور سب سے حد شان دار رہنمائی کا مالک ہے۔ ولید رحمٰن اس کا بیسٹ فرینڈ ہے۔ اس سے خشیت میں کم ہے مگر دونوں کے درمیان اسٹیٹس حائل نہیں ہے۔ منہرہ کے بیٹے سے فارہ کی بہن حسد بیاہی ہوئی ہے۔

عزت اپنی آنکھوں سے تیمور شہینہ میں ہم دھماکا ہوتے دیکھ کر اپنے خواس کھورتی ہے۔ ولید اسے دیکھ کر اس کی جانب لپکتا ہے اور اسے سنہال کر تیمور کو لون کرتا ہے۔ تیمور اسے اسپتال لے جاتا ہے۔ عزت کے ساتھ یہ حادثاتی ملاقات ولید اور عزت کو ایک خوشگوار حصار میں باندھ دیتی ہے۔ تاہم عزت کھل کر اس کا اظہار کر دیتی ہے۔ ولید ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔

آفاق فون کر کے فارہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فارہ روتی ہے۔ اشتیاق یزدانی آفاق سے جدوجہد سے خفا ہو کر اس سے بات چیت بند کر دیتے ہیں۔ آفاق مجبور ہو کر شادی پر راضی ہو جاتا ہے۔ فارہ دل سے خوش نہیں ہو پاتی۔

رضا حیدر تیمور کو فارہ کی شادی کے سلسلے میں فیصل آباد بھیجتے ہیں۔ فارہ اپنی تاریخ میں ماورا کو بصد اصرار مدعو کرتی ہے۔

## بیسویں قسط









وہ زیر لب ہر اکے رہ گیا تھا۔

”ہاں۔ ہاں۔ میں داوی بننے والی ہوں۔ میرے مالک نے مجھ پہ کرم کر دیا ہے۔ اپنی رحمت سے نوازا دیا ہے مجھے۔ میری جھولی بھر دی ہے۔“ شینہ یزدانی خوشی کی انتہا میں پاگل ہوئی جا رہی تھیں اور فارہ کے چہرے پہ زندگی سے بھرپور رنگ دوڑ گئے تھے۔

جبکہ آفاق کے چہرے کے تاثرات ہنوز وہی کے وہی تھے۔ عجیب گم صمم سے۔ اور کھوئے ہوئے۔  
”اب ہم نے رکنا ہے یا گھر جانا ہے؟“ فارہ کو اک نئی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ وہ جلد سے جلد گھر جانا چاہتی تھی۔  
”ظاہر ہے بیٹا! رکنا پڑے گا۔ تمہیں ابھی مکمل ٹریٹمنٹ کی ضرورت ہے۔“ شینہ یزدانی اس کی سمت پلٹتے ہوئے بولیں۔

”لیکن آئی۔! میں گھر جانا چاہتی ہوں۔ مجھے کوفت ہو رہی ہے اسپتال سے۔ میری طبیعت اور زیادہ خراب ہو جائے گی۔“ فارہ بے زار اور روپاسی سی ہو رہی تھیں۔

”ارے نہیں میری جان۔ گھر آؤ مست۔ میں ابھی تمہاری ڈاکٹر سے مشورہ کرتی ہوں۔ اگر انہوں نے گھر جانے کی اجازت دے دی تو ہم ابھی گھر چلے جائیں گے۔ آؤ آفاق تم بھی میرے ساتھ آ جاؤ۔“

شینہ یزدانی دوبارہ دروازے کی طرف مڑتے آفاق سے مخاطب ہوئی تھیں اور آفاق کسی رویوت کی طرح سر ہلا کر ان کے پیچھے چل دیا تھا وہ دونوں ماں بیٹا آگے پیچھے چلتے راہداری میں نکل آئے تھے۔

”یہ خوش خبری تمہارے دل پہی نے سن لی تو سارے کام چھوڑ چھاڑ کے فوراً اسپتال پہنچ جائیں گے۔ جانتے ہو کتنی خوشی ہوگی ان کو۔؟“ شینہ یزدانی اپنے دھیان میں چلتے ہوئے بول رہی تھیں اور گھر اچانک چلتے چلتے رک گئی تھیں اور یک دم پلٹ کر اپنے پیچھے چلتے آفاق کو دیکھا تھا۔

ان کے اس طرح اچانک رکنے اور اچانک دیکھنے۔ وہ بھی رک کر دیکھنے لگا تھا۔ اسے شینہ یزدانی کی تنقیدی اور تشویش بھری نظریں سر سے پاؤں تک محسوس ہوئی تھیں۔

”کیا بات ہے آفاق۔؟ میں کچھ غلط نوٹ کر رہی ہوں؟ یا تم خود کچھ غلط نوٹ کر رہے ہو؟“ شینہ یزدانی کافی سوچنے والے انداز سے بولی تھیں۔ مگر وہ کچھ نہیں سمجھا تھا۔

”ایسا مطلب۔؟ میں کیا غلط نوٹ کر رہا ہوں؟“ اس کے انداز میں بھی ہٹا سمجھی تھی۔

”میری کہ تم یہ خوش خبری سن کر خوش نہیں ہوئے بلکہ گم صمم ہو گئے ہو۔؟ تمہاری ہوائیاں اڑ گئی ہیں؟“ شینہ یزدانی نے جو محسوس کیا تھا کہ وہ بھی دیا تھا اور آفاق ان کی بات سن کر چند ثانیے کے لیے خاموش سا ہو گیا تھا۔

”بھئی بھئی کوئی وقت کوئی چوبیٹن ایسی ہوتی ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی انسان کی ہوائیاں اڑ جاتی ہیں اور دیکھنے والوں کو صحیح بھی غلط نظر آتا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ اس وقت مجھ پہ بھی ایسی ہی چوبیٹن ہے میرے چہرے کی ہوائیاں اڑی ہیں تو یہاں تک کہ اس وجہ سے اڑی ہیں؟ اور آپ کو یہاں تک نہیں کیا وجہ نظر آ رہی ہے؟“

آفاق نے ذرا توقف سے بڑا ٹھہرا ہوا اور سنہلا ہوا جواب دیا تھا اور شینہ یزدانی ہمیشہ کی طرح اس بار بھی چپ ہو گئی تھیں۔

”مسز یزدانی۔! آپ کو ڈاکٹر ہمارے ہیں۔ پھر انہوں نے ٹریٹمنٹ دینا ہے۔“

سامنے سے آتی نرس ان کے قریب آ کر رک گئی تھی اور وہ دونوں ماں بیٹا چونک کر متوجہ ہوئے تھے۔  
”ہوں۔! میں ان ہی کی طرف جا رہی ہوں۔“ شینہ یزدانی سر ہلا کر کہتے ہوئے آگے بڑھ گئی تھیں اور آفاق بھی مجبوراً ان کے پیچھے چل پڑا تھا۔



تیمور صبح آنس جانے کے لیے گھر سے نکلنے ہی والا تھا کہ رضا حیدر کی آواز پہ اس کے قدم ٹھٹک کر رک گئے تھے۔

”آج ذرا جلدی گھر آ جانا۔“ ان کی بات پہ تیمور یک دم پلٹا تھا۔

”خیریت۔؟“ اس کا لہجہ نجانے کیوں ٹیکھا ہو گیا تھا۔

”قیام مرزا کی فیملی آرہی ہے۔ عزت کو انگوٹھی پہنانے کے لیے۔“ وہ بڑے سکون سے بولے تھے۔

”انگوٹھی۔؟“ تیمور کے ماتھے پہ بل بڑ گئے تھے۔

”ہاں۔۔۔ ابھی صرف انگوٹھی پہنانے آئیں گے، باقاعدہ انگیجمنٹ کی رسم چند دن بعد اریج کریں گے اور ساتھ ہی نکاح کی رسم بھی ادا ہو جائے گی۔“

رضا حیدر بالائی بالاسب کچھ طے کر چکے تھے اور تیمور کو ان کے فیصلے پہ بے انتہا حیرت، اچنبھا اور دکھ ہوا تھا کہ وہ کیوں ایسا کر رہے ہیں؟

اپنے ہی بیٹے کو دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال کر بیٹھ رہے ہیں؟ اور بیٹی کا بھی ذرا خیال نہیں۔ وہ بھی وہ بیٹی جو ان کی بہت لاڈلی، چمیتی اور نازوں پکی تھی۔

”بابا جان۔۔۔ ایک بات پوچھوں آپ سے۔۔۔؟“ تیمور نے کوئی بھی غصہ کرنے کے بجائے بہت ہی مدہم اور دھیمے لہجے میں بڑا عاجزانہ سوال کیا تھا۔

”پوچھو۔۔۔؟“ انہوں نے بھی جواباً ”کوئی رعایت نہیں بخشی تھی بڑا شاہانہ بنو اب رہا تھا۔“

”آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ کیا آپ کو عزت کی پسند ناپسند کا بھی خیال نہیں ہے؟ آخر وہ آپ کی لاڈلی بیٹی ہے، جس نے ہمیشہ ہر چیز اپنی پسند سے استعمال کی ہے۔ وہ آج یہ کام ناپسند ہوتے ہوئے بھی کیسے کر سکتی ہے؟“

تیمور ان کے چہرے پہ نظریں جمائے پوچھ رہا تھا۔

”کر سکتی ہے۔ ضرور کر سکتی ہے۔ ہم نے ہر کام اس کی پسند کے مطابق کیا ہے ہمیشہ خیال رکھا ہے تو وہ یوں نہیں کر سکتی؟ اسے بھی ہماری پسند کا خیال رکھنا پڑے گا۔ مونس مرزا ہماری پسند ہے اور اسے یہ پسند قبول کرنا ہوگا۔ ہر حال میں۔۔۔“

رضا حیدر کا لہجہ اٹل تھا اور تیمور نہ چاہتے ہوئے بھی اس اٹل نشان سے ٹکرانے کا ارادہ باندھ بیٹھا تھا۔

”کبھی نہیں۔ میں اسے یہ پسند ضرور سستی قبول نہیں کروانے دوں گا۔ کسی قیمت پر بھی نہیں۔“ تیمور کا لہجہ ان سے بھی زیادہ اٹل ہو چکا تھا اور رضا حیدر پہلی بار تیمور کا یہ روپ دیکھ کر چوٹے تھے۔

”تم میری ہی بیٹی کے لیے مجھے ہی چیلنج کر رہے ہو؟ مجھ سے ٹکر لے رہے ہو؟“

ان کا انداز اور لہجہ رفتہ رفتہ ٹیکھا ہوا جا رہا تھا۔ بل میں اتار چڑھاؤ آ رہا تھا۔

”بات بیٹی کی نہیں ہے اور نہ ہی کسی ضد کی ہے۔ بس بات ایک انسانی دل کی ہے، جس پہ آپ بلاوجہ جبر کرنا چاہتے ہیں، لیکن میں بھی جبر اور زور زبردستی کے حق میں نہیں رہا۔ نہ ہی ایسا کرنے دوں گا۔“

تیمور کے تیمور زندگی میں پہلی بار سامنے آئے تھے اور وہ دونوں باپ بیٹا زندگی میں پہلی بار یوں دوہو ہوئے تھے۔

”میں کسی انسانی دل کو نہیں جانتا۔ نہ ہی ان چیزوں پہ بھروسہ رکھتا ہوں۔ یہ دل سب بے کار ہے۔ بس بریکٹیکل لائف ہی سب کچھ ہوتی ہے اور آج کل کی بریکٹیکل لائف پیسہ مانگتی ہے، دولت مانگتی ہے، دل نہیں مانگتی۔ دل کے قصیدے پڑھنا غریب اور بھوکے ننگے لوگوں کا کام ہے۔ ہماری کلاس میں یہ نہیں دیکھا جاتا اور یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔ میں عزت کی زندگی سنوارنے کا سوچ رہا ہوں اور تم عزت کی زندگی بگاڑنے کا سوچ رہے ہو، اپنی سوچ کو بدلو اور وہ سوچ جو میں سوچ رہا ہوں۔“



رضاحیدر نے آخر میں اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ جس پہ تیمور بے ساختہ بدک گیا تھا۔  
 ”واشے؟ میں کیا سوچوں؟ یہ کہ پریکٹیکل لائف کے لیے پیسہ ضروری ہے بل نہیں؟ یہ بھوکے بچے لوگوں کا  
 مشغلہ ہے؟ ہونٹہ بابا۔ اگر آپ کی یہ سوچ درست ہے تو پھر مجھ سے زیادہ بھوکا نہ گنا تو اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا جو  
 اپنی بھوک اور غربت کا کشکول لیے روز مارا مرتضیٰ کے در پہ پہنچا ہوا ہوتا ہوں۔“  
 تیمور نے رضاحیدر کے اعصاب پہ ایک اور ہم پھوڑ دیا تھا اور رضاحیدر نے کسی زہریلے سانپ کی طرح چھٹکار  
 کر اسے دیکھا تھا۔

”یعنی کہ تم دونوں، حسن بھائی ایک ہی لائن پہ چل رہے ہو؟“  
 ”یہ لائن ہمیں ہے بابا جان۔ یہ عطا ہے۔ اللہ کی عطا۔ تحفہ ہے، توفیق ہے، یہ ہر ایک کو نصیب نہیں  
 ہوتی۔ ہم دونوں، حسن بھائی خوش قسمت ہیں کہ اللہ نے یہ تحفہ ہمیں عطا کیا ہے۔ ہمیں توفیق دی ہے اس کی۔  
 اور اگر اللہ نے توفیق دی ہے تو ان شاء اللہ اس کو نبھانے کی ہمت بھی دے گا۔“  
 تیمور کہہ کر پلٹ گیا۔

”ایسا نہیں ہو گا۔“ رضاحیدر دھاڑاٹھے تھے۔  
 ”ایسا ہو گا۔ اور آج ہی ہو گا“ اس کا نتیجہ رات کو ہی دیکھ لیجیے گا۔ جب قیام مرزا کی فیملی یہاں آئے گی۔“  
 اس نے جاتے جاتے پلٹ کر دوبارہ ان کو جواب دیا تھا۔  
 ”تیمور! تم مجھ سے غرے رہے ہو؟“

”میں فکر نہیں لے رہا۔ اپنی جان کی بھلائی سوچ رہا ہوں۔ اگر آپ بد مزگی نہیں جانتے تو ان کی فیملی کو رنگ  
 پہنانے سے روک دیں۔ منع کر دیں گھر کے سے۔ ورنہ میرے رو عمل کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔“  
 تیمور نے کوئی بھی لگی لپٹی رکھے بغیر صاف اعلان کر دیا تھا۔

اور رضاحیدر نے چند سیکنڈز کے لیے ہونٹ اور ٹھکانا بھینچ لی تھیں۔  
 ”ٹھیک ہے۔ میرا تہ نہیں دیکھا۔“ رضاحیدر جبا کر بولے تھے۔  
 ”زندگی یہی تو ہے دیکھ لوں گا۔ خدا حافظ۔“ تیمور بھی کہہ کر باہر نکل گیا تھا اور یوں باپ اور بیٹے کی جنگ کا  
 باقاعدہ آغاز ہو گیا تھا۔



تیمور بہت ہی تھکے ہوئے اعصاب لے کر اپنے آفس میں داخل ہوا تھا اور کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے  
 اپنا بیگ اور اپنا کوٹ انتہائی کوفت سے صوفے پہ اچھال دے تھے اور اپنی کرسی پہ بیٹھتے ہوئے اپنے سر کو دونوں  
 ہاتھوں میں تھام لیا تھا یوں جیسے سر کے بال ٹھپوں میں بھینچ لیے ہوں۔  
 آج پہلی بار اس کے گھر کی سیشن اس کے آفس تک اس کے ساتھ آئی تھی ورنہ ہمیشہ وہ اپنے آفس بڑے  
 خوش گوار موڈ کے ساتھ آتا تھا۔

”لب کیا ہو گا؟ بابا جان جیسے پہاڑ سے ٹکرایا ہو گا؟“ اس نے یونسی سوچتے ہوئے سر زرا سا اونچا کیا تو نظریں  
 اپنے سامنے ٹیبل پر رکھے سفید لفافے پہ جا بڑی تھیں۔

”ماورا مرتضیٰ۔“ لفافے پہ لکھا نام پڑھ کے تیمور کے اعصاب اور کھنچ گئے تھے اور ذہن مزید جوکنا ہو گیا تھا۔

”ماورا کالیٹر۔“ اس نے زیر لب دہراتے ہوئے وہ لفافہ اٹھا لیا تھا اور فوراً ”چاک بھی کر ڈالا تھا۔“



”مسٹر تیمور حیدر۔ میں۔ مس ماورا مرتضیٰ۔ آپ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ تمام کاغذات تیار کروالیں۔ میں نکاح نامے پر سائن کروں گی۔ مجھے یہ پروپوزل قبول ہے۔“

سفید کاغذ پر لکھا ماورا کا یہ اقرار نامہ بڑھ کے تیمور سچ سج تھوڑی دیر کے لیے ساری پریشانیاں بھول گیا تھا۔ اور اس کا دل ملو اچھلا تھا اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا تھا۔

آج بڑی مدت اور بڑی ریاضت کے بعد یہ چند لفظ اس کے نصیب میں آئے تھے اور اس نے اپنے اندر کی شدت سے مجبور ہو کر بے اختیار وہ لفافہ اور وہ کاغذ ہاتھوں میں بھیج لیے تھے۔

”آئی لو یو ماورا۔ آئی لو یو سوچ۔“ اس کے منہ سے نکلے ایک ایک لفظ سے اس کی محبت کی شدت جھلک رہی تھی۔



حسب توقع ماورا کا موبائل گنگنا رہا تھا۔ اور حسب توقع کال کرنے والا تیمور حیدر ہی تھا۔

”وعلیکم السلام علیکم۔“ ماورا نے کال ریسیو کی۔

”وعلیکم السلام۔ کیسی ہیں مس ماورا مرتضیٰ۔“ اس کا لہجہ اندر کی خوشی کے احساس سے تھک بھی رہا تھا اور کھٹک بھی رہا تھا۔ ماورا نے فوراً ”محسوس کیا تھا۔“

”بالکل ٹھیک۔ ہمیشہ کی طرح۔“ اس نے البتہ اپنے آپ کو ہمیشہ کی طرح کنٹرول میں ہی رکھا تھا۔

”تھوڑی دیر کے لیے ملاقات ہو سکتی ہے؟“ اس نے بڑے اطمینان سے پوچھا تھا۔

”ہاں۔ کیوں نہیں؟ اس نے بڑے صبر سے ہونے انداز سے جواب دیا۔

”نہیں۔ یہاں نہیں۔ کہیں باہر۔ کسی ڈسٹورنٹ میں۔“ تیمور اس سے کچھ معاملات پر بات کرنا چاہتا تھا۔

”یہ ضروری ہے کیا؟“ اس نے کافی سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

”میرے خیال میں تو بہت زیادہ ضروری ہے۔“ تیمور کے لہجے میں سنجیدگی اور شرارت کا ملا جلا تاثر تھا۔

”اوکے۔ اگر اتنا ضروری ہے تو مل لیتے ہیں، آپ جگہ بتا دیجیے۔“ ماورا نے زیادہ بحث و تکرار میں وقت ضائع نہیں کیا تھا اس لیے جگہ کا پوچھنے کے بعد کال بند کر دی تھی۔



وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے ایک دوسرے کے بولنے کا انتظار کر رہے تھے کیوں کہ دونوں کے بیچ متواتر خاموشی حاکم تھی۔

ماورا لاپرواہی سے اپنے سامنے رکھے جوس کے گلاس میں اسٹرا ہلا رہی تھی اور وقفے وقفے سے کھڑکی سے باہر بھی دیکھ رہی تھی۔ تیمور کو پتا تھا کہ وہ بہت کمزور لڑکی ہے، خود سے کبھی کچھ بھی نہیں کہے گی، اسی لیے اسے خود ہی بولنے میں پہل کرنا پڑی تھی۔

”میں آج بہت خوش ہوں۔“ تیمور بمشکل اپنی خوشی کے اظہار کے لیے اپنے اندر ہمت مجتمع کر پاتا تھا۔

”جانتی ہوں۔“ ماورا نے بہت اعتماد سے اس کی بات سے اتفاق کیا تھا۔

”مگر میں اپنی اس خوشی پہ پوری طرح سے خوش نہیں ہو پا رہا۔“ تیمور کی اگلی بات پہ ماورا کو بے اختیار ٹھنکنا پڑا تھا۔



”کیوں؟“ اس کا یہ ”کیوں“ بھی بہت بے ساختہ ادا ہوا تھا۔  
 ”کیوں کہ گھر میں بابا جان نے ایک اور مسئلہ کھڑا کر رکھا ہے؟“ تیمور اس سے سب کچھ شیئر کرنا چاہتا تھا۔  
 ”مسئلہ؟ کیا مسئلہ؟“ ماورا کو اندر ہی اندر تشویش ہوئی تھی مگر اس نے کھل کے ظاہر نہیں کیا تھا۔  
 ”عزت کے پروپوزل کا مسئلہ۔ وہ اپنے دوست قیام مرزا کے بیٹے موس مرزا کا پروپوزل فائل کرنا چاہتے ہیں۔ جبکہ عزت۔۔۔ تیمورات اوہوری چھوڑ کر چپ ہو گیا۔  
 ”کسی اور کو پسند کرتی ہے۔“ ماورا نے اس کا ادھورا جملہ پورا کر دیا تھا مگر تیمور نے چونک کر دیکھا تھا۔

”آپ جانتی ہیں۔؟“  
 ”ہی کل کہتی ہیں کہ محبت خوشبو ہے اور خوشبو چھپ نہیں سکتی۔“  
 ماورا نے اتنے اچھے طریقے سے بات بیان کی کہ تیمور بھی دیکھا رہ گیا تھا۔  
 ”آپ عزت کے حوالے سے کیا ارادے رکھتے ہیں؟ کیا سوچا ہے۔؟“ اس نے تیمور کی نظروں کی محویت توڑتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔  
 ”میں اس کی پسند کا احترام کرتا ہوں اور موس مرزا کے پروپوزل پر عزت کی پسند کو ترجیح دیتا ہوں۔“ وہ بھی سنجیدگی کے لہجے میں آگیا تھا۔  
 ”ہوں۔۔۔ ایش گریٹ۔ ولید رحمان واقعی بہت اچھا لڑکا ہے۔“ ماورا نے سراہا تھا اور تیمور ایک بار پھر حیران ہوا کہ وہ واقعی سب کچھ جانتی ہے۔ اس کے بتانے سے بھی پہلے۔؟  
 ”لیکن یہ بات بابا جان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ ولید رحمان اچھا ہے یا بابا؟“ اس نے کوئی سروکار نہیں ہے۔ تیمور نے غلطی سے سر جھٹکا۔

”تو آپ کے بابا جان کے نزدیک کیا چیز اہمیت رکھتی ہے؟“ ماورا کا سوال کافی جھکیا اور نپا تلا سا تھا۔  
 ”کلاس۔“ تیمور نے کچھ بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔  
 ”دوسرے لفظوں میں دوست۔۔۔ ہے نا۔۔۔؟“ ماورا نے تصدیق چاہی۔  
 ”ہاں۔۔۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”مگر وہ تو میرے پاس ہے نہ ولید رحمان کے پاس۔ آپ کے بابا جان ہمیں قبول کیسے کریں گے؟“ اب کی بار اس نے سوال ٹھونڈا بدل دیا تھا اور ولید رحمان کے ساتھ خود کو بھی شامل کر لیا تھا۔  
 ”بابا جان قبول نہیں کریں گے تو ہمیں دو سرا راستہ اختیار کرنا ہو گا۔“ تیمور جیسے کچھ سوچے بیٹھا تھا۔  
 ”دو سرا راستہ؟“ وہ پوچھی۔  
 ”کورٹ میں ج۔۔۔“ اس نے مختصر ”کہا۔

”کورٹ میں ج۔۔۔؟“ ماورا نے بے اختیار زیر لب دہرایا تھا۔  
 ”ہاں۔ اس مسئلے کا آخری حل یہی ہو گا کہ میں عزت اور ولید کی کورٹ میں ج کروانے کے بعد خود بھی کورٹ میں ج کر لوں گا۔ میرے ساتھ کورٹ میں ج کرنے میں آپ کو تو کوئی اعتراض نہیں ہو گا نا۔؟“ اس نے ماورا کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

وہ چند ٹانھے چپ رہی تھی اور اس کی چپ پہ تیمور کو بے چینی ہوئی تھی۔  
 ”ماورا۔۔۔؟“ تیمور کے اس طرح پکارنے پہ ماورا نے بے ساختہ اس کی سمت دیکھا تھا دونوں کی نظروں کا برا نرم سا تصادم ہوا تھا۔  
 ”مجھے اس نازک مرحلے پہ آپ کے ساتھ کی ضرورت ہے۔ ہماری شادی کبھی بھی دھوم دھام سے نہیں



# Italiano<sup>®</sup>

Permanent Hair Colour Cream

Colour Your  
Life

*Esha Gupta*

- ✓ Gives strength to hair
- ✓ Soft and glossy hair
- ✓ Even coverage
- ✓ No greys



**Nourishment for Hair With Silk Protein, Vitamin E & Hair Conditioner**

\*Available in 10 Different Shades





ہوگی۔ اس لیے ہمیں کورٹ میں ہی کرنا پڑے گی۔ اگر آپ کو برا نہ لگے تو۔۔۔“ وہ بہت نرمی سے کھل سے بڑے گھبراؤ سے بوجھ رہا تھا، اور اس کی بات پر گہری سانس کھینچ کے رہ گئی تھی۔  
 ”اوکے۔! جیسا آپ کو مناسب لگے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ اس نے رضامندی سے دی تھی اور تیمور کے چہرے پر خوشیوں کی بارش اتر آئی تھی۔

”تھینک یو ماور! تھینک یو سوچی۔“ تیمور نے میز پر رکھا اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں دیا لیا تھا اور ماور ایک دم بدک گئی تھی۔  
 ”تیمور! اس نے اپنا ہاتھ کھینچا چاہا اور تیمور نے اس کے چہرے کے اڑے ہوئے رنگ دیکھ کر مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

”گستاخی معاف۔۔۔ بے اختیاری میں ایسا کر گیا۔۔۔“ تیمور کے لہجے اور نظروں سے شرارت پھوٹ رہی تھی۔  
 ماور کا چہرہ نہ چاہتے ہوئے بھی سرخ ہو گیا تھا۔

”آپ عزت اور ولید کی بات کر رہے تھے غالباً۔“ اس نے بات بدلنے کی کوشش کی۔  
 ”ہاں۔۔۔ آج قیام مرزا کی فیملی عزت کو رنگ پرستانے کے لیے ہمارے گھر آ رہی ہے اور میں فائنلی بات طے کرنے ولید کے گھر جا رہی ہوں۔ اس لیے اس کو کہتے ہیں کہ رزلٹ کیا آتا ہے۔؟“  
 تیمور بات ختم کرتے ہوئے کھڑا ہو گیا تھا کیونکہ ماور ابھی اپنا بیگ بند کر رہی تھی۔  
 ”اچھی بات ہے۔ آپ کے ساتھ ساتھ میرا وٹ بھی ولید رحمان کے حق میں ہے۔ اگر آپ میں یہ جنگ لڑنے کی ہمت ہے تو ضرور لڑیے۔ ان شاء اللہ جیت آپ کی ہی ہوگی۔“  
 ماور ابھی کہتے ہوئے اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی اور تیمور اس کی ایسی حوصلہ افزائی پر مزید مضبوط ہو گیا تھا۔



”ولید! سنبھل کے۔“ وہ اپنے بستر سے اٹھ کر اشک کے سہارے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا مکرے سے صحن میں نکل آیا تھا۔

”اب کئی بستر ہوں امی۔! آپ پریشان نہ ہوں۔“ ولید آج بڑے فریش موڈ میں نظر آ رہا تھا۔ کیوں کہ آج بڑے دنوں بعد اس نے زمین پر قدم جمائے تھے۔

”ککو۔ وحید! ہرنگلو۔ بھائی کو سہارا دو۔“ زبیدہ خاتون نے ولید کے پیچھے نکلتے ہوئے باقی دونوں کو آواز دی تھی اور وہ دونوں اپنا اپنا موم و رک پھوڑ کر ہا ہر بھاگے آئے تھے۔

”واؤ۔ بھائی آج خود چل رہے ہیں۔؟“ ککو اور وحید خوشی سے چیخ اٹھے تھے۔  
 ”آئیے۔ ہم آپ کو واک کرواتے ہیں۔“ ککو لیک کے اس کے قریب آئی تھی اور ولید کا بازو تھام لیا تھا۔

”ارے میری جان۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ تجھے چلے دو۔ سہاروں کی عادت بڑ جائے تو اچھا بھلا آدمی بھی اپنے قدموں پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔“ ولید نے مسکراتے ہوئے چھوٹی ہنسن کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

”ہنسن بھائی سہارا نہیں ہوتے۔ بازو ہوتے ہیں اور شکل وقت میں انسان کے بازو ہی اسے سنبھالتے ہیں اور اس کے کام آتے ہیں۔“ زبیدہ خاتون کام کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں سمجھا بھی رہی تھیں۔

”کیا صرف ہنسن بھائی ہی بازو ہوتے ہیں۔؟ کوئی اور بازو نہیں بن سکتا۔؟“ تیمور حیدر کی آواز پر وہ چاروں ہی چونک گئے تھے اور ایک دم دروازے کی طرف پلٹ کر دیکھا تھا۔

ان کے گھر کا دروازہ خلاف معمول کھلا ہوا تھا اور ادھ کھلے دروازے سے ولید کو صحن میں آہستہ آہستہ چل



قدی کرتے دیکھ کر تیمور بغیر اجازت کے ہی اندر آگیا تھا۔

”میں نے کچھ پوچھا ہے آپ سے۔“ تیمور نے پھر انہیں متوجہ کیا۔

”ارے بیٹا۔ کیوں نہیں۔ کچھ رشتے تو بس بھائیوں سے بھی بڑھ کر عزیز ہوتے ہیں۔“ زبیدہ خاتون سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اس کی سمت بڑھی تھیں۔

”تو پھر آپ کے اس خوددار بیٹے کے لیے میں کیوں عزیز نہیں ہوں؟“ تیمور کا اشارہ ولید کی طرف تھا ولید بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

”ارے یا۔ میرے دوست ہو تو دوست ہی رہو۔ محبوبہ مست ہو۔ تم سے محبت کا اظہار میں بیابانگ دہل کرنے سے تو رہا۔“

”میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔“ تیمور کے چہرے پر ناراضگی کا عنصر تھا اور ولید ککھو کو پیچھے ہٹا کے اسٹک کا سہارا لیتے ہوئے اس کے مقابل آکھڑا ہوا تھا۔

”فرمایے جناب خادم حاضر ہے۔“ ولید نے سر خم کرتے ہوئے بڑی سعادت مندی کا مظاہرہ کیا تھا۔

”نہیں یا۔! سر خم کرنے تو میں آیا ہوں۔“ تیمور کی بات ایسی تھی کہ ولید چونکے بغیر نہیں رہا تھا۔

”کیا مطلب۔؟ سر خم کرنے آئے ہو۔“ ولید کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

”تو بیٹھو بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔“ تیمور نے اسے اپنے بازو کا سہارا دیتے ہوئے کہا اور پھر آہستہ آہستہ چلے اندر آگئے تھے۔

”غیرت تو ہے نا تیمور۔“ ولید کی بیٹانی دیدنی تھی۔

”نی الحال تو غیرت ہی ہے، لیکن اسے بھی غیرت ہی ہوگی اس کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔“

”پلیز تیمور۔ مجھے پسلیاں مت بھجواؤ صاف صاف بتاؤ مسئلہ کیا ہے؟“ ولید کی بے چینی حد سے سوا بچکی تھی کیوں کہ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ معاملہ کس سے متعلق ہے؟

”تو کھو ولید۔! میں جانتا ہوں کہ عزت تمہیں پسند کرتی ہے اور اس کی اس پسند پہ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ ولید کا سر خود بخود جھک گیا تھا۔ اسے امید نہیں تھی کہ تیمور اس طرح بلا جھجک اس سے بات کر لے گا۔

”لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید میں بھی عزت کا ساتھ نہ دے پاتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے تم پر اعتبار ہے۔ میری نظر میں تم مجھ سے بھی زیادہ عزت دار غیرت مند اور خوددار ہو۔“

”مجھ کو سمجھ دار ہو اور عزت کے لیے اس سے بہتر ہم سفر اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ میں کسی دوسرے پہ بھروسہ نہیں کر سکتا۔ تم پہ بھروسہ ہے۔ بس یہی کافی ہے۔“ تیمور خود ہی بات کر رہا تھا اور ولید سر جھکائے سب سن رہا تھا۔

”اور اسی بھروسے کے بل بوتے پہ میں چاہتا ہوں کہ تم سے پہلی اور آخری بار بات کروں اور کھل کے بات کروں۔“ ولید نے یک دم سراٹھا کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

”عزت سے کورٹ میں ج کر سکتے ہو۔“ تیمور نے بڑے بڑے تپے سے انداز میں ایک ہم ولید کے سر پہ پھوڑ دیا تھا۔

”تیمور؟ یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔؟“ ولید ششدر رہ گیا تھا۔

”میں جو کہہ رہا ہوں بہت سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔ کیوں کہ مجھے پتا ہے کہ ہمارے گھر میں ایک عظیم جنگ کا آغاز ہونے والا ہے اور اس جنگ کے نتیجے میں نقصان بھی عظیم ہی ہوگا۔“

تیمور کے لہجے کی سنجیدگی اور آواز گہرے پن ولید کے ارد گرد خطرے کی کھینٹاں بجانے کے لیے بہت تھیں۔



”نقصان۔؟ کیا نقصان۔؟“ وہ ابچھا۔

”یہ تو مجھے بھی نہیں پتا۔“ تیمور نے کندھے اچکائے۔

”تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔؟“ ولید نے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں چاہتا ہوں کہ اگر میں عزت کے لیے کوئی اسٹینڈنوں تو تم میرا بازو بن کر میرا ساتھ دو۔“ تیمور نے مسکرا کر دیکھا۔

”دوں گا یا۔ ضروروں گا۔“ ولید نے اس کا ہاتھ زور سے تھپکتے ہوئے اپنے بھرپور قسم کے ساتھ کا اعلان کیا تھا۔

”صرف ساتھ ہی دینا ہو گا یا جان بھی دینی ہوگی۔؟“ ولید نے اسے چھیڑنے کی کوشش کی تھی۔

”میں تمہارا ساتھ مانگنے آیا ہوں، جان مانگنے نہیں آیا۔ جان دینے کی فورت آئی تو اکیلا دوں گا۔ تم سے اس کام میں ساتھ نہیں مانگوں گا۔ اس کام کے لیے اکیلا ہی بہت ہوں۔“

تیمور نے بھی جواباً اس کا کندھا تھکا تھا۔

”فہم اللہ معافی دے۔ آپ لوگ کتنی دل دہلا دینے والی باتیں کر رہے ہیں۔“ ککو ان کے لیے چائے

لے کر آئی تھی اور کمرے میں آتے ہی کانوں کو ہاتھ لگانے لگی تھی۔

ولید اور تیمور اس کے انداز پہ بیک وقت قہقہہ لگا کر خستے تھے۔

”تیمور بھائی۔۔۔ یہ بات پوچھوں آپ سے۔؟“ ککو نے چائے کا کپ تیمور کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں ضرور۔“ تیمور کا انداز لڑا لڑا تھا۔

”آپ ماورا بھائی کو دلہن کب نکال رہے ہیں۔؟“ ککو نے تو حد کر ڈالی تھی تیمور کو کہ ہم اچھو لگ گیا تھا۔

”ماورا بھائی۔؟“ تیمور حیران پریشان رہ گیا۔

اور اس کی اس حیرانگی پہ ولید بھی ہنس پڑا تھا۔

”ماورا۔۔۔ یہ زمانہ بہت فاسٹ ہے۔ انسان کے اندر کی باتیں بھی شیشے کی طرح نظر آ جاتی ہیں۔“

”بھائی۔ آپ کو برا لگا ہے میرا پوچھنا۔؟“ ککو نے جھجھک کر پوچھا۔

”ارے نہیں سویت بارتھ۔! تم بس ماورا بھائی کو دلہن بنانے کی تیاری کرو۔ بہت جلد تمہاری خواہش

پوری ہونے والی ہے۔“ تیمور نے ککو کو اپنے قریب بٹھالیا تھا۔

”اچھا۔۔۔ وہ کیسے۔؟“ اب کی بار ولید نے استفسار کیا۔

”وہ ایسے کہ اس نے اقرار کیا ہے کہ وہ اس کام کے لیے تیار ہے۔ میں جب چاہوں اسے دلہن بنالوں۔“ تیمور

نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے بہت مزے سے بتایا تھا اور ولید اچھلتے اچھلتے رو گیا۔

”واٹ۔؟ یہ کام بھی ہو چکا ہے۔؟“

”ہاں جی۔! یہ کام بھی ہو چکا ہے۔“ تیمور مسکرایا۔

”کب۔؟“ ولید کو حیرت پہ حیرت ہو رہی تھی۔

”آج ہی۔۔۔ تیمور کی خوشی پھپھائے نہیں چھپ رہی تھی۔

”لوہ تو یہ معاملہ ہے۔؟“ ولید نے بڑے ذہنی انداز سے کہا تھا اور جواباً تیمور قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔



”السلام علیکم نبی گل۔! قارہ کال ریسیو ہوتے ہی پہچان گئی تھی کہ وہ سری طرفہ لی گل ہیں۔“



# Medora

Perfumed Talc

خوشبو جو دل کو پہنائے  
تازگی جو ہر کوئی چاہے

Joy

Cherish



میدورا پرفیومڈ ٹالک  
کی تازگی جگاتی  
خوشبو سے  
ملے آپ کو مہکتا فریش  
احساس جو رہے دل سے ہر  
آپ کے ساتھ



8 مختلف دلچسپ خوشبوؤں میں دستیاب ہے

Pleasure, Cherish, Joy, Season, Passion

Salute اور Dignity, Greetings شامل ہیں

MEDORA OF LONDON



”وعلیکم السلام۔ کون فارہ بات کر رہی ہے۔“ بی گل نے پچاننے کی کوشش کی۔

”جی ہاں۔ فارہ بات کر رہی ہوں۔“

”کیسی ہو بیٹا۔“ بی گل نے اس کا حال احوال پوچھا۔

”ٹھیک ہوں اللہ کا کرم ہے۔ ماورا کہاں ہے۔“

”ٹھہرو بیٹا۔ آرہی ہے وہ۔ شاور لے رہی تھی۔“

”اچھا۔! آنٹی کاشائیں وہ کیسی ہیں؟“ اس نے عافیہ بیگم کا پوچھا۔

”وہ تو ٹھیک ہے مگر اپنے میاں کا ساتھ دے کیسا ہے؟ کوئی خوش خبری وغیرہ نہیں ہے کیا؟“

بی گل کی بات پر فارہ یک دم قہقہہ لگا کر ہنسی تھی اور اس کے اس طرح ہنسنے پر بی گل کھٹک گئی تھیں۔

”لگتا ہے کہ خوش خبری ہی ہے جو تمہیں اس طرح ہنسنے پر مجبور کر رہی ہے؟“ انہوں نے بالکل درست انداز

لگایا تھا۔

”سو۔۔۔ سو بی گل۔۔۔ بہت سی ذہین ہیں آپ۔“ فارہ مسلسل ہنس رہی تھی۔

”ماشاء اللہ جیتی رہو۔ خوش رہو۔۔۔ اللہ کو دہری رکھے۔“ انہوں نے ڈھیروں دعائیں دے ڈالی تھیں۔

”یہ لو ماورا آگئی ہے اس سے بات کر لو۔“ انہوں نے قریب آئی ماورا کو موبائل تھما دیا تھا۔

”ہیلو۔!“

”ہائے کیسی ہو۔“ فارہ کا لہجہ چمک رہا تھا۔

”بڑی کھٹک ہے آج ایریز میں۔“ ماورا نے حیرت کا اظہار کیا۔

”آئی بیو اے گڈ نیون۔“ فارہ کی آواز خوشی سے لبریز ہوئی جاری تھی۔

”کیا۔۔۔؟“ اس نے بے ساختہ پوچھا۔

”تم خالہ بننے والی ہو۔“ فارہ نے بڑی رنگ میں بتایا تھا۔

”رہی۔۔۔؟“ ماورا کو بھی حقیقتاً سن کر خوش گوار حیرت ہوئی تھی۔

”آف کورس یا۔۔۔! ہم لوگ آج ہی اسپتال سے گھر آئے ہیں۔“ فارہ کی خوشی ماورا کی خوشی تھی۔

”مبارک ہو یا۔۔۔ بہت بہت مبارک ہو۔“ ماورا بھی مسکرا رہی تھی۔

”تم کہاں آ رہے؟“ فارہ کو اس کے آفس کا خیال آیا۔

”گھر پر۔“ ماورا پر سکون تھی۔

”کیوں۔۔۔؟“

”بس آج جلدی گھر آئی تھی۔“

”خیریت۔۔۔؟“ فارہ سوال پر سوال کے جاری تھی۔

”ہاں۔۔۔ آئی بیو اے گڈ نیون۔“ ماورا کے انداز میں شجیدگی اتر آئی تھی۔

”گڈ نیون۔۔۔؟“ فارہ ٹھٹکی۔

”ہاں۔۔۔ گڈ نیون۔“

”کیا۔۔۔؟“

”میں تیمور حیدر سے کورٹ میں ج کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میں نے ہامی بھری ہے۔“ ماورا نے بڑے سکون

سے انکشاف کیا تھا۔

”کورٹ میں ج۔۔۔؟“



”ہاں۔۔۔ وہ کورٹ میں ج چاہتا ہے تو مجھے کیا اعتراض ہے بھلا۔۔۔؟ کورٹ میں ج ہی سہی۔ آخر میں ج تو ہے نا۔۔۔؟“ اس کے انداز میں لاسروائی تھی۔  
 ”مگر کب۔۔۔؟“ فارہ کو اپنی گڈ نیوز بھول گئی تھی۔  
 ”یہ ابھی طے نہیں ہوا۔۔۔ تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔ پھر مجھے دلسن بھی تو بنانا ہے نا؟“  
 ماورا نے اسے چھیڑا تھا اور فارہ نے کم صدم سے انداز میں فون بند کر دیا تھا۔



دن بھر تمام کام نپٹانے کے بعد تیمور قیام مرزا کی فیملی سے پہلے ہی گھر پہنچ گیا تھا۔ شاور لے کر کپڑے تبدیل کیے تیار ہوا اور پیچھے آگیا تھا۔  
 ”السلام علیکم تیمور بھائی۔!“ ساشا کی آواز پہ وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے رک گیا تھا۔  
 ”و علیکم السلام کیسی ہو۔۔۔؟ آج اچانک کیسے۔۔۔؟“  
 تیمور ساشا کی بے وقت آمد پہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔  
 ”ماموں نے بلایا تھا۔ عزت کی انجمن منٹ کے لیے۔“ ساشا نے قدرے دھیسے لہجے میں بتایا۔  
 ”اوکے۔۔۔ تم جاؤ۔ عزت اپنے بیڈ روم میں ہی ہوگی۔“ تیمور سر ہلا کر مائے سے ہٹ گیا تھا اور ٹھیک آٹھ بجے مونس مرزا کی فیملی ان کے گھر پہنچ گئی تھی۔  
 رضا حیدر بڑے والہانہ انداز سے ان کا استقبال کرنے کے لیے آگے بڑھے تھے۔ وہ لوگ باقاعدہ شنگن لے کر آئے تھے ان کے ملازم فروٹ اور مچھالی کے ٹوکے لے کر اندر داخل ہوئے تھے اور تیمور ان لوگوں سے ملنے کے لیے اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔!!!  
 (باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے پیش کیے لیے 4 خوبصورت ناول

ساری بھول  
ہماری تھی



راحت جمیل

قیمت 300/- روپے

شریک سفر



زحرہ ممتاز

قیمت 550/- روپے

کسی راستے کی  
تلاش میں



میمونہ خورشیدی

قیمت 350/- روپے

میرے خواب  
کو تارو



نگہت عبد اللہ

قیمت 400/- روپے

فون نمبر  
32735021

منشور ہے  
مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار، کراچی



# چاندنی کی گلی

گھاس پر برس رہی تھیں۔ لان میں پھیلی ہلکی سی روشنی میں بارش کی بوندیں ننھے منے موتیوں کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ ان سے نظر ہٹا کر اس نے اپنی مخروطی انگلیوں کی مدد سے چہرے پر پھیلی نمی کو صاف کیا اور ہٹ کر اپنے ہینڈ پر آگئی اور آنکھیں موند لیں مگر گلے ہی پل ساری کو ششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ وہ مضطرب سا چہرہ اور روئی روئی سی بے خواب آنکھیں ایک بار پھر اس کے تصور کے پروے پر لہرا رہی تھیں۔ وہ اس شخص یعنی زرارہ ارسلان شاہ کے لیے آج سے نہیں بلکہ پچھلے سات سالوں سے یونہی مضطرب ہوتی آ رہی تھی۔ اس شخص کی اواس آنکھیں اور اضطراب میں لپٹا ہوا ہر ایک انداز مشاہد کو اکثر ہی مضطرب کر دیتا تھا۔ لیکن آج شام ڈاکٹر زرارہ

ہمارے بس میں ہوتی جو زخم دل کی جھلک ہم آئینے کو بھی اپنی طرح رلا دیتے۔ ہمیں بھی جو روشنیوں پر دسترس ہوتی کبھی چراغ جلاتے، کبھی بجھا دیتے۔ ”ہمارے بس میں ہوتی جو زخم دل کی جھلک۔“ اف کتنا درد تھا اس شخص کے لیے میں آخر آج اس درد کو الفاظ کی صورت دے ڈالی آپ نے زرارہ ارسلان سے وہی درد جو اکثر آپ کی آنکھوں میں نمی کی صورت بلکور سے لیتا دکھائی دیتا تھا۔ آج الفاظ کی شکل میں ڈھل کر اپنا اضطراب شکار کر گیا۔ مشاہد نے شام میں ہونے والی پارٹی کا وہ منظر یاد کرتے ہوئے سوچا پھر گلاس وال کے اس پار دیکھنے لگی۔ جہاں بارش کی بوندیں کن کن کرتی لان کی

سجھناؤں









ارسلان نے اپنی برتھ ڈے پارٹی میں وہ غزل گنگنا کر اسے ایک نئے اضطراب سے آشنا کر دیا تھا۔ زرار شاہ کے لہجے میں چھپے وردے اس کو وہ رات یاد دلا دی تھی۔ جس نے آج سے سات سال پہلے مشارب سلطان کو زرار ارسلان کے کرب سے آگاہ کیا تھا۔



ان دنوں وہ سی ایم سی (چانڈ کا میڈیکل کالج) کی

اسٹوڈنٹ تھی۔ جب خاندان میں معاذ بھائی اور حرا آپلی کی شادی کا ہنگامہ جاگ اٹھا تھا یہ اطلاع اسری نے فون پر مشارب کو دی تھی اور وہ حیران رہ گئی تھی۔ ”بٹ اسری! حرا آپلی تو زرار لالہ سے انکھ جلد ہیں ناں۔؟“

”ارے۔۔۔ تمہیں نہیں پتا!“ اسری اس کی بے خبری پر ہنس پڑی۔

”حرا آپلی معاذ لالہ میں انٹرنلڈ تھیں اور انہوں نے پچھلے دنوں خود کشی کی کوشش کی تھی تاہم اس کی وجہ سے وادی جان اور بڑے بابا وغیرہ کو اپنا برسوں پرانا میلہ یاد آ رہا۔“

”اوہ یہ بات ہے۔۔۔ یار کمال ہے۔ اتنا کچھ ہو گیا اور مجھے کسی نے بتایا بھی نہیں۔“ اس نے شکوہ کیا۔ ”سوری مشی! اصل میں حالات ایسے تھے کہ تمہیں فون پر کیا بتاتی ہیں کہ کیا ہوا ہے!“ اسری نے معذرت خواہ انداز میں کہا۔

”ہاں۔ یہ تو ہے۔“ اس نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔

”پھر تم کب آرہی ہو؟“ اسری نے پر جوش لہجے میں استفسار کیا۔

”در اصل ان دنوں اسٹڈیز کا بہت بڑا ہو گیا ہے اس لیے شاید شادی سے ایک دو دن پہلے ہی پہنچ پاؤں گی۔“

”کیا! مشارب کی بچی ایہ کیا کہہ رہی ہو۔۔۔؟ رو میل لالہ تو یہ سن کر ہی تمہارے پیچھے لاڑکانہ پہنچ جائیں گے

۔۔۔ تمہیں پتا بھی ہے ان کا۔ وہ تو چھٹیاں لے کر کل ہی پہنچ رہے ہیں۔“ وہ شروع ہو گئی تو مشارب اس کے انداز پر ہنس پڑی تھی۔

”آفہ۔۔۔ زرار ک کر سانس تو لے لیا کرو مجھے پتا ہے رو میل کا۔ میں سمجھا لوں گی۔ کیا کروں مجبوری ہے ڈاکٹر بننے کے لیے قربانی تو دینی پڑتی ہے ناں۔“

”ہاں بالکل کیوں نہیں۔“ اسری نے غصے سے کہہ کر کال کاٹ دی تھی اور وہ جیسے سروں میں ہنس دی۔

جس دن اس نے قصر سلطان میں قدم رکھا تھا اس رات حرا آپلی کی مندی تھی۔ قصر سلطان کی رونقیں دیکھنے سے علق رکھتی تھیں۔ ہاں۔ اسری اور مشارب کچھ زیادہ ہی پر جوش نظر آرہی تھیں کیوں کہ یہ ان کے شعور میں خاندان میں ہونے والی پہلی شادی تھی۔ سو مندی کے فنکشن کے لیے اپنی باقی تینوں کزن کی طرح مشارب سلطان بھی خوب ہی لگا کر تیار ہوئی تھی۔ اس کے لیے شاپنگ مہمانی کی تھی چونکہ وہ بیٹی کی پسند جانتی تھیں سو یہ ہی وجہ تھی مشارب کو اپنے لیے خریدی ہوئی ان کی ہر چیز پسند آتی تھی اور اس وقت بھی وہ مہمان کے لائے گئے سفید غرارہ سوٹ میں نفیس سی جیولری کے ساتھ کلاسیوں میں ڈھیر ساری چوڑیاں چڑھائے بے حد معصوم و خوب صورت لگ رہی تھی۔

”اوہ ہو! یہ آج وائٹ فیری قصر شاہ کا رستہ کیسے بھول گئی۔؟“ وہ میڑھیاں اتر کر جیسے ہی نیچے آئی۔ رو میل نے اس کا رستہ روک لیا۔ وہ صرف اس کا کزن ہی نہیں ہسٹ فرینڈ بھی تھا۔ اس کے تعریف کرنے پر وہ کھل کر مسکرائی۔

”تھینک یو مسٹر کزن!“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ گئی تھی۔ جبکہ اس کی اس درجہ بے نیازی پر رو میل اس کی پشت کو تکتا رہ گیا تھا۔

مہمان کی رشتہ دار خواتین سے ملنے کے بعد وہ مثال اور اسری کی طرف آگئی تھی جو اس وقت مندی کی پلیٹیں



مشارب کا پورا بدن پسینے سے شرابور ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے کب آنسو رواں ہوئے اسے پتا نہ چل سکا اور پھر وہ دبے پاؤں اس شکست خوردہ شخص کے کمرے سے نکل آئی تھی۔ بیچے لان سے آئی چیز میوزک کی آواز اسے زہر لگ رہی تھی۔ زرارہ سلمان کے آنسو اور سسکیاں اپنے کمرے میں آنے کے بعد بھی مشارب کی سماعتوں میں گونج رہی تھیں۔ بیڈ پر گرنے کے انداز میں بیٹھتے ہوئے دونوں گھٹنوں پہ اپنی پیشانی ٹکا کر وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

سجائے میں مصروف تھیں۔  
 ”مشارب! ہم ذرا وادی کے کمرے سے کینڈا لڑا اور  
 شانہرو وغیرہ کے پیکٹس تو اٹھا لاؤ۔“ بڑے سے تھکن  
 میں سے مندی نکل کر رہن سے جچی پلیٹ میں منتقل  
 کرتے ہوئے منزل نے اس سے کہا۔ وہ ”او کے میں  
 ابھی آتی“ کہتی وہیں سے پلیٹ گئی مگر جب وادی کے  
 کمرے سے مطلوبہ چیزیں اٹھانے کے بعد وہ باہر نکل  
 رہی تھی تو گاؤں کے سے ٹیک لگائے بیٹھی وادی جان  
 نے اسے نیا حکم دے ڈالا تھا۔  
 ”مشارب! ذرا راکو تو بھیجنا میرے پاس!“

”جی بہتر دلاوی جان“ اس نے سعادت مندی کا مظاہرہ کرتے جھٹ سے سر ہلا دیا تھا اور مثال کو موم بٹیاں پکڑانے کے بعد وہ زرارہ کے کمرے میں پہنچی تو سکت رہ گئی۔

کمرے کے بیچوں بیچ قالین پہ گھٹنوں کے بل بیٹھے  
وہ مکمل خود فراموشی کے عالم میں اللہ تعالیٰ سے مخاطب  
تھے۔ شکوہ کر رہے تھے۔

کیوں اے اللہ! کیوں میرے ساتھ ہی کیوں نہیں  
ایسا ہوتا ہے؟

میرے نصیب کا تارہ ہی کیوں ہمیشہ ٹوٹ کر خاک میں جا ملتا ہے۔

”یہ ادا سی یہ اضطراب میرے لیے اسی کیوں؟“ پہلے  
 کہا چھین لیں آپ نے یہ سب خراب بھی۔“

”میں دیوانگی کی سرحدوں پہ کھڑا تھا۔ میں نے بھی تو خرا کو ہی چاہا تھا۔۔۔ تمام تر شدتوں کے ساتھ میں نے اس کا ساتھ مانگا تھا۔“

”مگر ہوا کیا؟ ملا کیا؟ میری ہر دھاریں گاہ چلی گئی،  
 ہلکا دیا اس نے مجھے سب کے سامنے۔ میرا سر جھکا  
 یا اس نے۔ ہر نگاہ طعنیہ انداز میں میری طرف اٹھتی  
 ہے۔ میری شخصیت کا غرور، میرا سارا وقار حراشاہ کے  
 نکار نے خاک میں ملا دیا۔

دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں میں سر کے بال جکڑے وہ  
پوری شدت سے کہہ رہے تھے۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے

بہنوں کے لیے خوب صورت ٹاؤلز

300/-	راحت جبین	ساری بھول ہماری تھی
300/-	راحت جبین	اوسے پروا تھیں
350/-	خزلیہ ریاض	ایک میں اور ایک تم
350/-	ضمیمہ قریشی	بڑا آدمی
300/-	صاحدہ اکرم چوہدری	دیکھ زور محبت
350/-	میسونہ خورشید علی	کسی راستے کی تلاش میں
300/-	شمرہ بخاری	ہستی کا آہنگ
300/-	سائرہ رضا	دل موم کا دیا
300/-	نفیسہ سعید	ساڑا چڑا دا چنبا
500/-	آمنہ ریاض	ستارہ شام
300/-	نمرہ احمد	صحف
750/-	فوزیہ یاسمین	دست کوزہ گر

بذریعہ ایک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37. اسد پٹا، کراچی



غصہ آیا تھا۔ جو اپنی خوشی کے حصول کے لیے اک شخص کو اس قدر اذیت میں مبتلا کر چکی تھیں۔

وہ فطرتاً بے حد حساس لڑکی تھی، بچپن سے دوسروں کی تکلیف پر تڑپ اٹھنے والی، مشارب کے سامنے اب اس کے اپنے تئیا زاد تھے وہ ان کے غم پر کس طرح نہ تڑپتی جو بچپن سے لے کر اب تک محرومیوں کا شکار ہونے آرہے تھے۔

اپنی ماما کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد سوتیلی ماں اور سوتیلی بھائی بہنوں کی نفرتوں کا شکار ہوئے آئے تھے مشارب کو زرار شاہ پر بے حد دکھ ہو رہا تھا وہ اس کا دکھ نہیں بانٹ سکتی تھی۔ ایک تو عمروں کا فرق تھا اور کچھ زرار اور سلمان کا رویہ اپنے تمام کزنز کے ساتھ ہمیشہ سے ہی لیا کا سا تھا۔ جس کی وجہ سے کبھی مشارب کی ان سے بے تکلفانہ انداز میں بات نہ ہوئی تھی۔

پھر شادی والے دن بھی وہ بے چین تھی کیوں کہ اسے اسریٰ کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ زرار لالہ کو بہت تیز بخار ہو گیا ہے اور وہ نیم بے ہوشی میں پڑے ہیں۔ قصر سلطان سے سب لوگ شاوی ہال میں آئے تھے۔ وہ قصر سلطان کی تنہا فضاؤں میں ماتم مٹا رہے ہوں گے۔ اس نے تصور کی آنکھ سے زرار اور سلمان کو لان کے پیچوں پہنچ کر تنہا کھڑے روتے ہوئے دیکھا تو وہ اشک اس کی چاک کناروں سے ٹوٹ گرے اسے کچھ خبر ہی نہ ہو سکی۔

چونکی تب جب رو میل اور سلمان کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرانی تھی۔

”خیریت؟ خج حرا آئی کی ہونے والی ہے اور آنسو آپ ہماری ہیں۔ میرے خدا یہ ماجرا کیا ہے۔“

”رو میل! مجھے گھر جانا ہے۔!“ مشارب نے فرمائش کی۔

”اس! یہ کیا فرمان جاری کر دیا۔؟“ رو میل نے حیرت سے آنسو پونچھتی مشارب کو دیکھا تو وہ نروٹھے انداز سے بولی۔

”بس میں کچھ نہیں جانتی روی! مجھے گھر واپس جانا

ہے۔“

”لیکن مشی ہو کیا؟“ وہ اس کی ضد پر حیران ہوا۔

”اُف! مشارب۔ اپنی دونوں گتھیاں دباتے ہوئے بہانہ کیا تھا۔

”میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے رو میل۔ اس شور و ہنگامے میں تکلیف زیادہ ہو رہی ہے۔ سو پلیز نو آرمائی ہیسٹ فرنڈ۔ تم مہربانی کر کے مجھے گھر چھوڑ آؤ۔“ اس نے وجہ بیان کی۔

”کیس تمہیں بخار تو نہیں ہے۔؟“ اس کے لحاظ سے بھرے انداز میں کہنے پہ وہ منتظر سا ہو کر اس کی طرف بڑھا تھا۔

”ہاں مجھے بھی یہی لگ رہا ہے۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”اوکے تو ایک منٹ بیس وٹ کرو میں شعیب لالہ سے ان کی گاڑی کی چابی لے کر آتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ شعیب لالہ کی تلاش میں چل دیا تو وہ وہیں پر کھڑی ہو کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ لیکن صرف چند منٹ بعد ہی وہ بچھا چہرے واپس آ گیا تھا۔

”کیا ہوا لالہ نے چابی نہیں دی کیا؟“ مشارب نے اس کا تڑا چہرہ دیکھ کر سوال کیا تھا۔

”نہیں۔“ رو میل کالجہ سرد تھا۔

”کیوں؟“ کیوں نہیں دی؟“ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

”تمہارے لال صاحب یہاں پہ ہوں گے تو دس گے نا گاڑی کی چابی۔ وہ کب کے اپنی گاڑی لے کر یہاں سے نکل چکے ہیں کیونکہ زرار صاحب نے بخار کا ڈر لیا کیا ہے۔“

ہمیشہ کی طرح اپنے سوتیلے بھائی کا ذکر کرتے ہوئے رو میل کالجہ زہریلا ہو چکا تھا۔

”اس اوکے رو میل“ اس نے اس کا اشتعال کم کرنا چاہا اور دل ہی دل میں یہ سن کر مطمئن ہو گئی تھی کہ شعیب لالہ اس وقت زرار لالہ کے پاس تھے۔

”چلو مشارب! میں چاچو کی گاڑی میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔“ رو میل نے سوچوں میں گھری مشارب



چھوڑنے کے بعد آرام کرنے کا مشورہ دے کر خود واپس چلا گیا تھا۔

مشارب سلطان نے قصر سلطان کے لان سے لاؤنج تک کا سفر بہت تیزی سے طے کیا۔ لاؤنج میں داخل ہوتے ہی اس کی پہلی نظر باقر کا کاپڑی تھی۔

”باقر کا کا! شعیب لالہ کہاں ہیں۔؟“ اس نے شعیب لالہ کے متعلق استفسار کیا۔

”بی بی جی! وہ تو جی زرارہ سائیں کو لے کر اسپتال گئے ہیں، ہمیں بہت تیز بخار تھا نا جی اس لیے۔“

”اچھا کب گئے وہ؟“ مشارب کے لمبے سے اضطراب جھٹکا۔

”بی بی جی! دو گھنٹے ہو گئے ہیں ان کو گئے ہوئے۔ اب تو آنے والے ہوں گے۔“

”او کے۔ ایک کپ چائے بنا دیں میرے لیے اور ہاں کوئی پین کلر بھی چائے کے ساتھ ضرور لائیے گا۔“

میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ ”جو بہانا دیاں رو میل کے سامنے جھوٹ موٹ میں تراش بیٹھی تھی وہ سچ ہو گیا تھا اس کے سر میں واقعی بہت شدید درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔“

”اف میرا سر۔“ مخروطی انگلیوں سے اپنی پیشانی مسلاتے ہوئے اس نے سرعت سے سیڑھیاں طے کیں اور اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ بھاری کپڑوں سے خود کو آزاد کرنے کے بعد اس نے ایک بلکا پھلکا سوٹ زیب تن کیا تھا۔ چائے کے ساتھ سر درد کی گولی لے کر وہ کھڑکی کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ کھڑکی کے اس پار نظر آتے گیٹ کو نظروں کی گرفت میں لیے مشارب شدت سے شعیب لالہ کی آمد کی منتظر تھی۔

تب اچانک ہی گیٹ کھلا تھا اور ڈھول تاشوں کی گونج میں قصر سلطان میں معاذ شاہ کی بارات داخل ہوئی تھی۔ محض چند منٹوں میں ہی پھولوں کی بارش اور مودی کمرے کی روشنیوں کی زد میں آکر قصر سلطان کا لان ایک ایک محک اٹھا تھا۔ ہر سمت رنگ برنگے آنچل لہراتے نظر آرہے تھے۔ ہر نظر دہلادہ لہسن کی جوڑی کو سراہ رہی تھی مگر مشارب بہت جلد اس سارے منظر

سلطان کا ہاتھ تھام لیا تو وہ اس کے ساتھ ہوئی۔

”ارے! مشارب تم کہاں تھیں اور یہ تم میرے معصوم بھائی کو لے کر کہاں غائب ہونے کے چکر میں ہو؟“ منال اور اسریٰ سے سامنا ہوا تو اسریٰ نے شریر انداز میں اس کو چھیڑا تھا۔

”ہا۔۔۔ ہا!“ رو میل بسن کی بات سن کر ہنس پڑا مگر مشارب خامے سنجیدہ موڈ میں تھی۔ اس لیے ہنسکرا بھی نہ سکی۔

”ارے یہ مشی کی شکل پر بارہ کیوں بچ رہے ہیں خیریت ہے نا؟“ منال نے اس کی سنجیدگی نوٹ کرتے ہوئے ٹوکا تھا۔

”اھکچو کلی منال اس کے سر میں درد ہے۔“ جو اب مشارب کے بجائے رو میل کی طرف سے آیا تھا۔

”اوہ!“ اسریٰ نے ہنستے ہوئے بھائی کو دیکھا۔

”اس کا مطلب ہے آپ نے میری دوست کو نظر لگائی ہے۔“

”ارے نہیں بھئی۔ یہ خواہ مخواہ کا الزام ہے مجھ پر۔“ رو میل جھینپ کر بولا مشارب کو اس وقت ان تینوں کی نوک جھونک میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہاں سے بھاگ جاتی۔

”رو میل! جلدی کرو نا۔“ مشارب نے بے زاری سے کہا۔

”ارے۔ ہاں بابا! بس ابھی چلتے ہیں“ وہ فوراً اس کی جانب متوجہ ہوا۔ پھر منال اور اسریٰ کو مخاطب کرتے بولا۔

”تم لوگ ماما اور آئی کو بتا دینا مشی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ میں اس لیے اسے قصر سلطان چھوڑنے جا رہا ہوں۔ میں اس کو ڈراپ کر کے فوراً واپس آ جاؤں گا۔“

”او کے فائن لالہ۔! میں کہہ دوں گی۔“ مشارب کی طبیعت کے پیش نظر اسریٰ نے جھٹ سے سر ہلا کر بھائی کو اطمینان دلایا دونوں تیز قدموں سے چلتے ہوئے پارکنگ ایریا کی طرف آگئے رو میل اسے وہاں



سے اکتا کر کھڑکی سے ہٹ گئی تھی۔

بید کر اؤں سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندتے ہوئے اس نے شدت سے غیند کی خواہش کی تھی۔ تب دو ستارے اس کی بند آنکھوں سے ٹوٹ کر رخساروں کو نم کر گئے تھے۔ اسے وہ کر زرار لالہ کی فکر ستا رہی تھی یقیناً ان کی حالت مزید بگڑ گئی ہوگی تب ہی انہیں ایڈمٹ کر لیا گیا ہو گا۔ اس نے متحیر ہوتے سوچا تھا۔

\*\*\*

اگلی صبح مشارب کی لاڈکانہ کے لیے فلاٹ تھی اس لیے رات کو کھانے سے فارغ ہونے کے بعد داوی جان کو خدا حافظ کہنے کے لیے ان کے کمرے میں آگئی تھی۔

تب اس نے پورے چار دن بعد وہاں زرار ارسلان کو دیکھا تھا۔ سر قمی رنگ کے کاشن کے سوت میں سفید شمال کندھوں پر لیے سرخ آنکھوں کے ساتھ وہ نیچے کاریٹ پر داوی جان کے پٹنگ کے بالکل قریب آنکھوں کے بل بیٹھے ہوئے تھے۔

مشارب کے قدم وہیں چوکھٹ پر جم گئے تھے اور آنکھوں کی سطح تیزی سے گیلی ہوتی چلی گئی تھی۔ وہ جھٹکتے ہوئے وہاں سے پلٹ جانا چاہتی تھی مگر زرار ارسلان کی لڑائی آواز نے اس کے پاؤں میں زنجیر ڈال دی تھی۔

”میں ہار گیا واؤ۔۔۔ میں ہار گیا۔ وہ مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی گئی۔ وہ کل گئی میری زندگی سے واؤ! آپ کے زرار کو ٹھکرا کر پل کی ہے۔“

”میں۔۔۔ میں یہ اذیت نہیں سہیاؤں گا واؤ! میں مر جاؤں گا۔“

”زرار میرے بیٹے۔۔۔ خود کو سنبھالو۔ مجھے اس طرح اذیت مت دو۔“ داوی نے التجائی انداز میں کہا تھا اور پھر تڑپ کر انہیں اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ وہ ان کی چھاتی میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے تھے۔

”دنیا حرا پر ختم تھوڑی ہوئی ہے میری جان۔۔۔ دیکھنا میں اپنے سوہنے کے لیے کتنی پیاری دامن لاؤں

گی۔“

”واؤ! انہیں اب نہیں۔۔۔ خرا نہیں تو کوئی اور ہرگز نہیں۔“

”آپ دوبارہ یہ بات کیجئے گا بھی مت۔۔۔ میں اب کبھی شادی نہیں کروں گا۔۔۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔“

”ارے باؤلا ہو گیا ہے کیا؟“ داوی جان کی آنکھیں صدمے سے پھٹنے کو تھیں۔

”ہاں واؤ! یہ میرا خود سے کیا گیا عہد ہے آپ پلیز مجھے فورس مت کیجئے گا نہ ابھی نہ پھر کبھی۔“

”زرار! مجھے یہ دکھ بھی دے گا اب تو؟“ وہ بہت دیر بعد کچھ کہنے کے قابل ہوئی تھیں جس کو محسوس کرتے ہوئے زرار شاہ کے لب تلخی سے مسکرا اٹھے۔

مگر وہ بوئے کچھ نہیں تب بہت اچانک داوی جان کی نظر دروازے میں سائست کھڑی مشارب پر گئی تھی۔

”ارے مشارب میری بچی آؤ نا اندر وہاں کیوں کھڑی ہو۔۔۔؟“

”وہ جی داوی۔۔۔“ داوی نے اپنی طرف متوجہ ہونے پر وہ دفعتاً ”ہڑ ہڑ سی گئی تھی۔ پھر مرے مرے قدم اٹھاتی داوی کے قریب آگئی۔

”وہ دراصل داوی جان! میں کل صبح کی فلائیٹ کے لاڈکانہ جا رہی تھی۔ اس لیے سوچا آپ کو خدا حافظ کہہ دوں۔“ ان کے ہنڈ کے قریب رک کر اس نے اپنی آمد کی وجہ بتائی اور گمن آنکھیوں سے زرار شاہ کی طرف دیکھا تھا۔

جانے وہ واقعی اسے خبر دے تھے یا پھر اس ہو کر ایسے دکھائی دیے تھے مشارب سمجھ نہ پائی تھی۔

”تو میری بیٹی جا رہی ہے؟“ انہوں نے مشارب کی پیشانی چومتے ہوئے الوداعی بوسہ دیا تو وہ مسکرائی۔

”جی داوی! پانچ دن کی چھٹی لے کر آئی تھی میں۔ پہلے ہی اسٹنڈرڈ کالنی حرج ہو چکا ہے۔“ اس نے بتایا تو داوی جان مسکراتے ہوئے گویا ہوئیں۔

”ہاں میری جان! خوب دل لگا کر پڑھو اور کامیاب ڈاکٹر بنو بالکل میرے زرار کی طرح۔“ انہوں نے قریب بیٹھے زرار ارسلان کی جانب دیکھا جو بھیگی پلکیں



جھکائے جانے کیا کارہٹ پہ ڈھونڈ رہے تھے۔  
کوئی تعویذ ہو رد بلا کا  
میرے پیچھے محبت پڑ گئی ہے



اور یوں وہ زرار لالہ کی وجہ سے اپنے دل میں  
ڈھیروں ڈھیر لڑائیوں سے لڑتا رہا۔ واپس چلی آئی تھی۔ اور  
پھر یہاں آنے کے محض چند ماہ بعد ہی اسے اسری کی  
زبانی معلوم ہوا تھا کہ زرار شاہ ہائیر اسٹڈیز کی غرض سے  
لندن روانہ ہو چکے ہیں اور وہاں سے واپس لوٹنے کے  
بعد ان کا ارادہ واوا جان کا تعمیر کردہ پرائیوٹ ہسپتال  
دار الشفاء سنبھالنے کا تھا۔ زرار ارسلان کا ارادہ جان کر  
مشارب کو بے حد خوشی ہوئی تھی اور اس نے بھی اپنی  
پڑھائی مکمل ہونے کے بعد وہیں جاب کرنے کا فیصلہ کر  
لیا تھا۔

اور پھر وقت کی گاڑی اتنی تیزی سے آگے بڑھتی گئی  
تھی کہ اگر کبھی وہ پیچھے پلٹ کر دیکھتی تو گھر سے ہوئے  
سالوں پہ جی وقت کی ویز سمجھ کر دیکھ حیران رہ جاتی۔ جس  
سال وہ اپنی اسٹڈیز مکمل کر کے ہاؤس جاب کر رہی تھی  
اس سال زرار ارسلان بھی لندن سے واپس آ گئے تھے  
پھر پاکستان آنے کے فوراً بعد ہی انہوں نے اپنے پلان  
کے مطابق دار الشفاء کو سنبھال لیا تھا۔ اور پھر ماہر سرجن  
زرار ارسلان کی وجہ و محبت نے محض دیر ۲۰ سال  
کے عرصے میں دار الشفاء کو شہر کے مشہور پرائیوٹ  
ہسپتالوں کی صف میں لاکھڑا کیا تھا۔ اپنی ہاؤس جاب  
مکمل کر چکنے کے بعد سلطان شاہ سے اجازت لے کر  
مشارب نے بھی دار الشفاء جوائن کر لیا تھا۔ جبکہ  
رومیل ارسلان نواب شاہ میڈیکل کالج سے تعلیم  
مکمل کرنے کے بعد مزید تعلیم کے حصول کے لیے  
بیرون ملک روانہ ہو چکا تھا۔ اس دوران شعیب سلطان  
کو بھی اپنی پسند کی لڑکی مل گئی تھی۔ جس سے متعلق ہو  
جانے کے بعد عنقریب وہ شادی کا ارادہ رکھتے تھے۔  
منال اور اسری نے ایم اے انگلش کے بعد پڑھائی کو  
خیر یاد کہہ دیا تھا۔ خاندان میں ہی دونوں کی نشستیں ملے

تھیں۔ جلد ہی ان کی شادیاں ہونے والی تھیں۔  
لندن جانے کے بعد رومیل مشارب کو بھولا نہیں  
تھا۔ اس کی جانب سے ڈھیر سارے کارڈز چاکلیٹس  
اور دوسرے چھوٹے موٹے گفٹس اسے اکثر ملنے  
رہتے تھے۔ ہر ایک اینڈ پر وہ اس کو کال ضرور کرتا تھا۔  
اور وہ کال گھنٹہ گھنٹہ بھری ہوئی۔ اس کی اتنی طویل  
کال پر مشارب چڑ جاتی تھی۔ مگر وہ بغیر برائے ہنستا چلا  
جاتا تھا۔



دار الشفاء جوائن کرنے کے بعد مشارب کو زرار  
ارسلان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ اس پانچ  
سال کے عرصے میں پہلے سے زیادہ ہینڈ سم اور گرینس  
فل ہو چکے تھے۔ مگر وہ وقت آنکھوں میں ہلکورے  
لیتی اداسی اور وجہ سے یہ چھایا اضطراب مشارب کو  
آج بھی بے چین کر رہا تھا۔

دار الشفاء میں ڈاکٹر زرار کا ڈاکٹر زرار سب اور  
ڈاکٹر آصف کے ساتھ اس کی اچھی خاصی دوستی ہو چکی  
تھی۔ ان کا پورا اسٹاف فمہ دار اور اپنے پیسے سے  
مخلص نظر آتا۔ مشارب بھی اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے  
کی پوری کوشش کرتی تھی مگر جانے کیا بات تھی زرار  
ارسلان کے سامنے ہمیشہ ایسی کوئی نہ کوئی غلطی ہو جاتی  
جس پر وہ اس کو سرو نظروں سے گھورتے ہوئے پیسے  
سے تخلصی پر وہ کچھ سناتے کہ جیسے سننے کے بعد  
مشارب کے چوہ غریق روشن ہو جاتے تھے۔  
”پیس سر! پس سر“ کی گویا ان اس کے ہونٹوں پر  
رہتی تھی۔

”آخر مجھے ہو کیا جاتا ہے زرار لالہ کے سامنے؟  
میں اس قدر بوکھلا کیوں جاتی ہوں۔ اگر وہ مجھے غائب  
بلاغ سمجھتے ہیں تو ٹھیک ہی سمجھتے ہیں۔ مجھ جیسی اسٹوڈنٹ  
کوئی ہے ہی اس قابل۔“ کتنی ہی دیر خود پہ غصہ  
کرنے کے بعد وہ اگلی بار زرار سر کے سامنے پر اعتماد  
رہنے کا حتمی فیصلہ کرتی، مگر اس فیصلے پر وہ ڈاکٹر زرار  
کے سامنے کبھی عمل نہ کر پائی تھی۔



لیتے ہوئے ڈاکٹر ارب نے استفسار کیا تھا۔  
جبکہ ڈاکٹر رجا اسے گھور کر رہ گئی تھی اور پھر خود کو  
مزید شرمندگی سے بچانے کے لیے جھٹ سے گویا  
ہوئی۔

”سرا کچھو کلی بنی روز ڈاکٹر مشارب کے ہاتھ  
سے دوا پیتے ہیں۔“

”میں انہیں بلا کر لاتی ہوں۔“ رجا یہ کہتے  
وارڈ سے باہر نکل گئی۔ ڈاکٹر زرارہ ارسلان کی آنکھوں  
میں استعجاب کے رنگ اتر آئے انہوں نے  
استفسار سے نظروں سے ڈاکٹر ارب کو دیکھا تو وہ جس  
پڑا۔

”یار میرے بچیاں نہ ہو، واصل تمہارے پیچھے  
ڈاکٹر مشارب سلطان نے دار الشفاء کے مریضوں پر جانور  
سا کر دیا ہے جسے دیکھو انہیں کام بھرتا نظر آتا ہے۔“

وی آئی پی وارڈ کی سبز شاہان سے لے کر چلڈرن  
وارڈ کی بنی اور ردا تک سب ڈاکٹر مشارب کے ہاتھ  
سے ہی میڈیسن لیتے ہیں۔ کیونکہ وہ دوائی میں محبت  
کے ساتھ اپنے میسرں کبھی کی مٹھاس بھی چھوٹی دیتی  
ہیں اس لیے گڑے سیرپ کا ذائقہ بھی جام میسرں  
جیسا ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر ارب مصطفیٰ یونیورسٹی فیلو  
ہونے کے ساتھ ساتھ زرارہ شاہ کا قریبی دوست بھی تھا  
اس نے بہتے ہوئے ان کو ساری روداد بتائی۔

”اور تو اور تمہاری غیر موجودگی میں میں نے دو  
آپریشن میں انہیں انسٹ کے طور پر اپنے ساتھ رکھا  
تھا۔ ماشاء اللہ بہت اکیٹو ہیں۔“ ڈاکٹر ارب نے  
مسکراتے ہوئے مزید بتایا تو اک بے اختیار مسکراہٹ  
نے زرارہ ارسلان کے چہرے کا احاطہ کر لیا۔ تب ہی  
گھبرائی ہوئی مشارب اندر داخل ہوئی۔

”سرا! آپ نے بلایا تھا؟“ مشارب سلطان کی  
کرزئی آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی تو ارب پر سے  
نگاہ ہٹا کر وہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

سفید رنگ کے اسٹائلیش سوٹ جس کی لمبی شرٹ  
کے دامن پر کڑھائی کی گئی تھی سفید اوور آل پہنے کبے  
بالوں کی چوٹی اپنی نازک پشت پر ڈالے وہ کچھ فاصلے پر

اب جب کبھی ان سے سامنا ہوتا یا وہ کچھ استفسار  
کرتے وہ اعتماد کے ساتھ جواب دینے کے بجائے ”سر  
یہ سرورہ سر۔“ کی رشتہ لگائے رکھتی۔

اسپتال میں ڈاکٹر مشارب اور ڈاکٹر زرارہ کے رشتے  
سے فقط ڈاکٹر ارب ہی واقف تھے اس بات کا کسی  
اور کو علم نہیں تھا ایک تو وہ دونوں اسپتال اپنی اپنی  
گاڑیوں میں آتے تھے دو سرانہ کے بیچ کزن وائی کوئی  
بے تکلفی کبھی نظری نہیں آتی تھی۔ اب تو مشارب  
کو دار الشفاء میں جاب کرتے ہوئے سات ماہ سے زائد  
عرصہ ہونے کو تھا۔ مگر وہ ڈاکٹر زرارہ کی نظروں میں ایک  
قابل ڈاکٹر بننے کی خاطر دن رات محنت کرتی جاتی۔

اس کا رویہ اپنے تمام مریضوں کے ساتھ بہت ہی  
دوستانہ تھا۔ وی آئی پی وارڈ میں ایڈمیٹ بنی اور  
نہیں ہی ردا سے اس کی پی دیتی ہو چکی تھی۔

”نہیں مجھے نہیں چینی دوا“ میں نہیں پیوں گا۔“ بنی  
نے تیسری بار سرنفی میں ہلاتے ہوئے سیرپ چینے سے  
انکار کیا تھا۔

”اف!“ ڈاکٹر رجا نے زچ ہوتے ہوئے قہقہہ  
کھڑے ڈاکٹر ارب کی جانب دیکھا جو دونوں ہاتھوں کو  
اپنے سینے پر باندھے خاموش کھڑا مسکرا رہا تھا۔

”دیکھ رہے ہیں نا ڈاکٹر آپ! بنی کتنا خدی ہو رہا  
ہے؟“

”دس ازناٹس میسر پیٹا اگر آپ دوا نہیں پییں گے  
تو پھر ٹھیک کیسے ہوں گے؟“ بنی تیسری کے مریض کا  
حال دریافت کرنے کے بعد ڈاکٹر زرارہ نے مسکراتے  
ہوئے بنی سے کہا۔ وہ کل شام ہی پیر دن ملک سے  
واپس لوٹے تھے اور اس وقت دار الشفاء کے راولپنڈر  
نکلے ہوئے تھے ڈاکٹر رجا اور ڈاکٹر ارب دونوں ہی اس  
کے ساتھ تھے۔

”نو ڈاکٹر۔ مجھے ڈاکٹر رجا کے ہاتھ سے دوائی نہیں  
چینی۔ یہ بہت کڑوی دوا چلاتی ہیں۔“ منہ بسورتے  
ہوئے بنی نے کہا تو ڈاکٹر ارب مسکرا دیا۔

”پھر کس کے ہاتھ سے چینی ہے؟“ ڈاکٹر رجا کے  
نجل ہوتے چہرے کو اپنی شوخ نگاہوں کی گرفت میں



کھڑی کافی دلکش لگ رہی تھی۔

”یس ڈاکٹر! آپ بٹنی کو دو پلاویں۔۔۔ پلیر۔۔۔ زرار نے اس سے کہا تھا۔“

”جی سر۔۔۔“ مشارب سن کر قدرے حیران ہوئی تھی۔

”ہاؤ آر یو لفل فرینڈ۔۔۔؟“ مشارب نے بٹنی کے چہرے پر ایک بار بھری نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”آئی ایم فائن! بٹ آج آپ نے اتنی دیر کیوں کر دی۔ میں کب سے آپ کا ویٹ کر رہا تھا۔“ بٹنی اس کو دیکھ کر کھل اٹھا تھا۔

”ڈیر سوئیٹ فرینڈ! آپ کو تو پتا ہے کہ آپ کی دوست بٹنی اچھی ہے۔ سب ہی لوگ اس کے ہاتھ سے دو الیمپا پسند کرتے ہیں۔ ابھی میں مسز شاہان کو دو پلاویں تھی اس لیے تھوڑی سی دیر ہو گئی۔“

پھر جب وہ بٹنی کو دو پلاویں کے بعد وارڈ سے باہر نکل رہی تھی زرار ارسلان کے اچانک اسے پکار لیا۔

”یس سر۔۔۔“ غلافی آنکھوں میں آنسو والی استعجاب کی لہر سے بے ہوش تھیں۔ وہ ان آنکھوں میں حیرت کے رنگ دیکھ کر مسکرائے اور ان کے لب ہنسنے سے بے ہوش تھے۔

”ویل! دن ڈاکٹر مشارب! آپ کو ایک ذمہ دار ڈاکٹر کے روپ میں دیکھ کر بہت اچھا لگتا ہو رہا ہے۔ امید ہے آئندہ بھی آپ اس طرح سے اپنے پیشے سے متعلق ہونے کا ثبوت دیں گی۔ نرم لہجے میں اپنی بات مکمل کرنے کے بعد وہ اس کے پاس سے گزر کر باہر نکل گئے تھے۔

مگر وہ بیت بنی ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے کیا سنا تھا!

\*\*\*

”مشارب! تم ہمارے ساتھ چل رہی ہو بس۔“ اسری نے دونوں لہجے میں کہتے ہوئے اس کے اوپر سے گھبراہٹ لیا تھا۔

”اف او کیا مصیبت ہے یار۔۔۔؟“ مشارب نے

خیند بھری آنکھوں کو بڑی مشکل سے داکرتے ہوئے بیزارگی سے پوچھا۔

”ایڈیٹ لڑکی! کبھی تو ہمارے ساتھ بھی وقت گزار لیا کرو؟“ دونوں نے اس کی کھنجالی کی۔

”ایک دن ہی ملتا ہے چھٹی کا! اس دن بھی آرام نہیں کرنے دیتیں۔۔۔“ وہ غصے سے بوتلی بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ دونوں اس کی حالت دیکھ کر ہنس دیں۔

اور پھر قینوں آوٹھے گھٹنے میں مارکیٹ میں تھیں۔ کپڑے اور جیولری وغیرہ خریدنے کے بعد مثال اور اسری کو کاسٹیکس کی شاپ پر مصروف چھوڑ کر وہ فریج بیک اسٹال کی طرف آگئی تھی۔

یہ ہمیشہ سے اس کا معمول رہا تھا کہ شاپنگ کے بعد وہ اپنے لیے ایک کتاب ضرور خرید ا کرتی۔ اس وقت بھی اس نے اعتبار ساجد کی کتاب ”یہ تمہاری مجھے دے دو“ خرید لی تھی۔ پھر کالڈیو پل بے کرنے کے بعد بٹنی ہی تھی کہ گلاس ڈور کھول کر ڈاکٹر اریب کے ساتھ ڈاکٹر جالور ڈاکٹر آصفہ شاپ میں داخل ہوئیں۔

”ارے ڈاکٹر مشارب! آپ یہاں پر؟“ اس پر نظر پڑتے ہی ڈاکٹر جالور نے خوش گوار لہجے میں استفسار کیا تھا۔ ڈاکٹر اریب اور ڈاکٹر آصفہ بھی اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی تھیں۔

”ہینا! آپ بھی زرار کے لیے برتھ ڈے پریزنٹ خریدنے آئی ہوں گی مارکیٹ۔۔۔؟“

”برتھ ڈے پریزنٹ؟ زرار سر کے لیے؟“ مشارب نے تعجب کے ساتھ ڈاکٹر اریب کی بات دہرائی تھی۔ پھر قدرے حیران ہوتے ہوئے ان تینوں کی طرف دیکھا۔

”کل ڈاکٹر زرار کا برتھ ڈے ہے“ آپ کو نہیں معلوم؟“ ڈاکٹر کے کہنے پر وہ شیٹا کر رہ گئی۔

”نہیں دہیہ۔۔۔ دراصل مجھے معلوم تو تھا مگر شاید میں میں بھول گئی تھی۔“ کچھ نروس سے انداز میں اس نے کہا۔

پھر ڈاکٹر اریب اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے بولے۔



مشارب کے اندر تسکے مجا دیا تھا۔ غلامی آنکھوں کی گہری ہوتی نمی کو چھپانے کی خاطر وہ غزل ختم ہونے سے پہلے ہی دارالشفاء سے اٹھ آئی تھی۔



رات گیارہ بجے کے قریب پارٹی ختم ہونے کے بعد زرارہ کی واپسی ہوئی تھی۔ اپنے کمرے میں آتے ہی حسب عادت انہوں نے ریموٹ اٹھا کر میوزک سسٹم آن کر دیا تھا۔ یکایک کمرے کی خاموش فضا میں نصرت فتح علی خان کی آواز رقص کرنے لگی۔

رات کو چاندنی جب کھلے دل کو ناشاد کرتا ہوں میں۔

ایک بھولی بولی خوشی کے لیے لاکھ غم یاد کرتا ہوں میں۔

غزل کے بول ان کی سماعتوں سے ٹکرائے تو وہ تلخی سے مسکرانے لگے۔

مجھ سے نظرس بدسنے کے بعد کچھ تو ہو گی نہامت تجھے جا وفاؤں کی زنجیر سے تجھ کو آزاد کرتا ہوں میں

خان صاحب نے تان لگائی تھی۔ زرارہ ارسلان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

پھر میوزک سسٹم آف کرنے کے ارادے سے انہوں نے سائٹ ٹیمبل پر پزار ریموٹ اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو ان کی نظر گفٹ پیپر میں لپٹے بکس پر آ کے

رک گئی تھی۔ ذرا سا جھک کر وہ پیکٹ اٹھا لیا۔ کچھ حیرت سے وہ نچلا بکس بچھتے ہوئے کارڈ کھول کر پڑھنے لگے۔

”آسوئیٹ گفٹ فار گرلز فل سر۔

فرام مشارب سلطان۔“

کارڈ کے اندر لکھا مشارب کا نام پڑھ کر زرارہ حقیقتاً حیران ہوئے تھے۔ اسپتال میں اس نے انہیں

دش تک نہیں کیا تھا اور اب یہ گفٹ؟ وہ گفٹ کھولنے لگے۔ نفاست کے ساتھ ٹیپ اور پیپر کی گرفت سے

پیکٹ کو آزاد کرنے کے بعد انہوں نے بہت ہی احتیاط کے ساتھ بکس کے اندر موجود گفٹ کو باہر نکالا تھا اور

”ٹھیک ہے“ آپ آج بھول گئی ہیں تو کوئی بات نہیں، مگر پلیر کل مت بھولیے گا کیونکہ ہم لوگوں نے کل دارالشفاء میں ایک چھوٹی سی پارٹی کا انتظام کر رکھا ہے۔ سو آپ ایک عدد گفٹ کے ساتھ کچھ تیار سیار ہو کر ضرور آئیے گا۔“

ا۔ بنے روگرام سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے مشارب کو پارٹی میں آنے کی دعوت دی تو وہ مسکرا کر سر ہلا گئی۔



وہ ایک بہت ہی اہم آپریشن کرنے کے بعد آپریشن ٹیمپل سے باہر نکلے تھے۔

کھلے کھلے انداز میں کامیڈور کراس کرنے کے بعد جو نئی انہوں نے ریمپشن ہال میں قدم رکھا۔ دارالشفاء کے تمام اسٹاف کو وہاں پا کر حیران رہ گئے۔ تب وہ سب

ایک زباں ہو کر گنگناٹے لگے۔

”ابھی برتھ ڈے ٹویو۔“

ابھی برتھ ڈے ٹویو سر۔“ ڈاکٹر ارب نے آگے بڑھ کر انہیں گلے لگایا۔

”میں بہت بہت مبارک ہو میرے دوست۔“

”تھینکس ڈار“ ڈاکٹر ارب کے گرد اپنا حصار جگ کرتے ہوئے انہوں نے دھیسے لہجے میں شکریہ ادا کیا تھا۔

پھر اس کے بعد ڈاکٹر فید، ڈاکٹر آصفہ اور ڈاکٹر رجا نے بھی باری باری اسے خوش لیا تھا۔

بس صرف ایک وہ ہی تھی جو اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پھنسائے کچھ فاصلے پر خاموش کھڑی دیکھ رہی تھی۔

زرارہ ارسلان کے ہونٹوں کی مسکراہٹ مشارب سلطان کے لیے کتنی قیمتی تھی یہ بات فقط وہی جانتی تھی۔

کریک کانٹے کے بعد وہ لوگ دارالشفاء کے لان میں آ بیٹھے تھے۔ تب ڈاکٹر زرارہ شاہ نے ڈاکٹر ارب کے بے

حد مجبور کرنے پر وہ غزل چھیڑی تھی۔ جس نے



جیسے دنگ رہ گئے۔

لوں گا۔“

”رو میل۔!“ مشارب کے قریب دھماکہ سا ہوا۔  
”کیوں ہو گئیں نا سربراہ۔؟“ وہ اس کی خاموشی  
کو کوئی اور ہی رنگ دے کر ہنسا۔

”اسٹاپ اٹ رو میل، میری نظر میں یہ اک نہایت  
گھنیا مذاق ہے۔“ رو میل ارسلان کی خوش فہمیوں کو  
ختم کرنے کی خاطر وہ بہت تیز انداز میں چیخی۔  
”مذاق؟“ رو میل کی ہنسی کو بریک لگا تھا۔

”مذاق۔؟ کیسا مذاق مشارب سلطان؟ تم میری  
نزدیکی کی سب سے بڑی سچائی کو مذاق کہہ کر میری  
ہمت شکنی تو بین کر رہی ہو۔ تمہیں اندازہ ہے  
تمہارے یہ الفاظ مجھے کتنا دکھ پہنچا گئے ہیں۔“  
”دکھ۔؟ دکھ تو مجھے پہنچا ہے رو میل تمہاری بات  
سن کر۔“

”میں نے ایسا کیا کہہ دیا مشارب، کہہ تم دکھی ہو گئی  
ہو؟“ رو میل مشتعل ہو پتے گویا ہوا۔ ”میں تم سے  
محبت کرتا ہوں مشارب، اونٹن شادی کرنا چاہتا ہوں۔  
اس میں برا کیا ہے؟“

”میرا یہ ہے رو میل، کہ میں تمہیں اس نظر سے  
دیکھتی ہوں۔ تم، تم میرے ایک بہت ہی اچھے  
دوست ہو اور بس۔“ مشارب نے جو کہا تھا، سچ تھا۔  
وہ رو میل کو صرف ایک دوست کی حیثیت سے ہی  
دیکھتی تھی۔ اس کے حوالے سے کبھی کوئی جذبہ اس  
کے دل میں نہیں جانا تھا، مگر یہ بات اس وقت رو میل  
کو سمجھانا ایک دشوار ترین عمل تھا۔

ایک لمحے کو وہ مشارب کی بات سن کر چپ سا رہ گیا  
تھا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے اک ٹھنڈی سانس کھینچ کر  
مضبوط لہجے میں کہنے لگا۔

”تم مجھے کیا سمجھتی ہو مشارب! مجھے اس سے کوئی  
فرق نہیں پڑتا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میرے  
لیے اس کا کافی ہے اور رہا تمہارا سوال تو شادی کے بعد  
تمہیں بھی مجھ سے محبت ہو ہی جائے گی۔ اور دیکھنا  
رو میل ارسلان تمہیں خود سے محبت کرنے پر مجبور کر  
دے گا۔ یہ اس کا تم سے وعدہ ہے۔“ ایک ایک لفظ کو

ثقافت کے تمام زلوٹیوں کو اجاگر کر تا وہ تارنخ کے  
سنہری کردار سوچتی کا مجسمہ تھا۔ کرشل کا نازک گھڑا کر  
پہ اٹھائے وہ سر سے لے کر پاؤں تک جگمگا رہی تھی۔  
”مائی گاڈ اتنا مکمل حسن!“

زرار ارسلان نے بے اختیار اس شاہکار کو سراہا  
تھا۔



”یا وحشت“ مشارب نے لمبی سانس کھینچتے ہوئے  
اپنے اندر چھتری جنگ سے دامن بچانا چاہا تھا۔  
قصر سلطان کے تمام کمین اس وقت شعیب سلطان  
کی دلہن کی طرف ماہوں کا منگن لے کر گئے ہوئے  
تھے۔ اور وہ جو دہلہا کی اگلوئی، سن بھی طبیعت کی خرابی  
کی وجہ سے نہ جاسکی تھی۔ دراصل اس رات زرار کی  
پارٹی سے آنے کے بعد مشارب کو شدید بخار ہو گیا  
تھا۔ تین دن مسلسل بخار میں پھنستے رہنے کے بعد جس  
دن اس کی طبیعت کچھ سنبھلی تھی اس دن صبح ہی  
رو میل ارسلان کا فون آگیا تھا۔

”ہیلو لڑکی! کیا کر رہی تھیں؟“ رو میل نے بڑی  
دلکشی سے استفسار کیا تھا، مگر وہ اس کے لہجے کی دلکشی کو  
نظر انداز کرتے ہوئے تھکے تھکے سے لہجے میں گویا  
ہوئی تھی۔

”کچھ خاص نہیں۔“ وہ اس کا جواب سن کر ہنسا  
تھا۔

”کتنی ظالم لڑکی ہو مٹی قسم سے تم! تم از کم میرا دل  
رکھتے کو ہی کہہ دیتیں کہ مجھے یاد کر رہی تھیں۔“  
”تم جانتے ہو رو میل! میں یونہی دل نہیں رکھا  
کرتی۔“ اس نے صاف گولی کا منظر ہرہ کیا۔

”آئی نو! میں تمہارے مزاج کے ہر رنگ سے  
واقف ہوں تم ایک بہت ہی سچی اور کھری لڑکی ہو اور  
تمہاری سچی ادالت مجھے اپیل کرتی ہے۔ اس لیے تو میں  
نے سوچا ہے، واپس آنے کے بعد منگنی شنگھنی کے  
جھنجوٹ میں پڑنے کے بجائے ڈائریکٹ تم سے نکاح کر



ٹھوس لمحے میں ادا کرنے کے بعد وہ سلسلہ منقطع کر گیا تھا۔

مشارب نے ہاتھ میں پکڑا سیل فون پینڈ پر اچھال دیا اور دونوں ہاتھوں میں چروچھپا کر رو پڑی تھی۔  
”رو میل ارسلان! میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ مشارب سلطان تم سے کبھی محبت نہیں کر سکتی۔۔۔“ وہ کیونکہ اسے کسی اور ہی لگن نے گھیر رکھا ہے۔۔۔“ وہ زیر لب رو میل کے تصور سے مخاطب ہوتے بڑبڑاتی تھی۔

پھر اس دن کے بعد مشارب سلطان کے روز و شب عجیب طرح کے اضطراب میں گھر گئے تھے۔ اس کا دل ہر بل اندیشوں میں گھرا رہتا، وہ ہر وقت بولائی بولائی رہنے لگی۔ پھر ان ہی دنوں قصر سلطان میں شعیب شاہ کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے تھے سارا قصر شاہ مسلمانوں سے بھر گیا۔

حارشاہ اور معاذ شاہ بھی کنیڈا سے آچکے تھے جس دن ان لوگوں کی آمد تھی اس روز زرارہ سلطان کو کسی سینار کے سلسلے میں آؤٹ آف کنٹری جانا تھا۔ وہ داوی جان کے کمرے میں آگئی تھی۔ داوی جان کو کچھ سے ٹیک لگائے قہقہے پڑھنے میں مصروف تھیں اسے دیکھ کر مسکرائیں۔

”چاند کا لگ رہا ہے میری بیٹی۔ کہیں نظر نہ لگ جائے میری بچی کو کسی کی۔“ انہوں نے دعا میں پڑھ کر اس کے اوپر پھونکیں۔

”تھینک یو داوی جان۔“ مشارب ان کے منہ سے اپنی تعریف سن کر مکھل اٹھی۔ اور پھر واقعی اس رات ہر کسی نے اسے سراہا تھا سوائے ایک شخص کے اس نے تو شاید ایک نظر بھی اس پر نہ ڈالی تھی۔

”مشارب صاحبہ! جلدی کرو۔“ درنہ میں جا رہی ہوں۔“ معاذ شاہ کے تیسری بار بارن دینے پر منال نے غصے میں آکر مشارب کے کمرے کا دروازہ پیٹ ڈالا تھا۔

”یار! کیا مصیبت ہے تم ڈھنگ سے تیار بھی نہیں ہونے دے رہیں۔“ مشارب کی جھنجھالی آواز پر

منال کا بارہائی ہو گیا تھا۔

”ٹھیک ہے تم ہوتی رہو تیار میں جا رہی ہوں۔۔۔“ سب لوگ ہوٹل روانہ ہو چکے ہیں میں نے تمہاری وجہ سے معاذ لالہ کو روک رکھا تھا مگر تمہاری تیاری تو ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی ہے اور معاذ لالہ کی ڈانٹ سننے کا مجھ میں حوصلہ نہیں اس لیے میں تو چلی۔“ یہ کہنے کے ساتھ ہی منال نے اپنے قدم میڑھیوں کی جانب بڑھائے تھے۔

منال پلینر۔۔۔ میں بس پانچ منٹ میں آرہی ہوں۔“ مشارب نے تیز آواز میں کہا۔

”سوری اس نے با آواز بلند کہا پھر میڑھیاں ملے کرتی پورج میں کھڑی معاذ شاہ کی گاڑی میں جا بیٹھی تھی۔ گیٹ کھلنے اور بند ہونے کی آواز مشارب تک بھی آئی تھی۔

”خدا ارٹھ کی۔“ اس نے کھولتے دماغ کے ساتھ کہا پھر یہ سوچ کر مطمئن ہو گئی کہ تیار ہونے کے بعد شعیب لالہ کو مسیح کر کے وہاں سے گاڑی منگوا لے گی۔

”ٹائٹ بڈ۔“ تیار ہونے کے بعد قد آدم آئیے میں اپنا کمر دیکھتے ہوئے مسکرا اٹھی تھی۔ نفاست کے ساتھ کیے گئے میک اپ نے اس کی شخصیت کو جیسے چونکا دیئے والا نکھار بخش ڈالا تھا۔

دوپٹے کے بل سیٹ کرتی وہ پلٹنے لگی تھی کہ اچانک نگاہ چوڑیوں کے ریک تک گئی اور پھر فوراً سوٹ کی ہم رنگ چوڑیوں کا سیٹ نکال کر اپنی کلائی میں سجایا پھر پلٹ کر بیڈ پر رکھا اپنا سیل فون اٹھایا۔

میڑھیاں اترنے کے ساتھ ساتھ وہ شعیب لالہ کے نمبر پر مسیح ٹائپ کر رہی تھی۔ تب۔۔۔ اچانک شاید اونچی میل کی وجہ سے اس کا پاؤں پھسلا تھا اور سنبھلتے سنبھلتے اس کا بازو ریڈنگ سے جا ٹکرایا اور اس کی ساری چوڑیاں ٹوٹ کر میڑھیوں پر بکھر گئی تھیں۔ تکلیف کی شدت سے اس کی چیخ نکل گئی تھی۔

وہ جو اپنا سیل فون اور والٹ بھول گئے تھے اس



لیے ہوئل سے واپس قصر سلطان آتا پڑا تھا اپنا والٹ اور سیل اٹھاتے ہوئے وہ پلٹ ہی رہے تھے جب کسی نسوانی چیخ نے انہیں چونکا دیا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے اپنے کمرے سے باہر آئے مشارب گھنٹوں کے بل بیڑھیوں پر بیٹھی رو رہی تھی۔

”کیا ہوا؟“ زرارہ سلطان تیز قدم اٹھاتے اس کے قریب پہنچے۔

مشارب نے بھگی پلکیں اٹھا کر کچھ حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ پھر بنا کچھ کہے اپنی زخمی کلائی سامنے کردی تھی۔

”لوہ! یہ جوت کسے لگ گئی؟“ مشارب کی خون میں تر ہر کلائی دیکھ کر متحقر لہجے میں کہتے وہ اس کے قریب ہی بیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔

زرارہ شاہ کو اپنے قریب بٹھا دیکھ کر وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ آنسو اب بھی اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

”مجھے دیکھنے دو۔“ وہ اس کی کلائی تھام کر زخم کا جائزہ لینے لگے پھر قدرے برہم لہجے میں اس کو ڈانٹتا تھا۔

”کیا آنکھیں بند کر کے چل رہی تھیں۔“ کم از کم بیڑھیاں اٹھاتے وقت تو آنکھوں کو کھلا رکھتیں۔۔۔؟“ شکل سے تو بے وقوف ہیں ہی عادتیں بھی ساری بے وقوفوں والی ہیں۔“ اس کی کلائی سے کالج کے ٹکڑے نکالتے ہوئے وہ مسلسل ڈانٹ رہے تھے۔

وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی انہیں بولتا ہوا سن رہی تھی۔ اپنے لیے اس شخص کا یہ اپنائیت بھرا انداز اسے اچھا لگ رہا تھا۔

انہوں نے اپنے کمرے سے فرسٹ ایڈ باکس منگوایا تھا۔

کائٹن کو ڈیوئل میں بھگو کر وہ اس کا زخم صاف کرنے لگے۔ مشارب نے کن اکھیوں سے ان کی طرف دیکھا تھا۔ سفید رنگ کے کلف شدہ کائٹن کے کڑکڑاتے شلوار قیص میں کف فولڈ کے ساتھ خوشبو میں بے وہ اس لہجے بہت پسند سم لگ رہے تھے۔

خود پر مرکوز مشارب شاہ کی نگاہوں کی تپش کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے اپنا جھکا سر اٹھایا تھا اور اس پر نظر پڑتے ہی ایک دم ہنس پڑے۔ رونے کی وجہ سے آنکھوں پر لگا مسکارا اور کاجل پھیل چکا تھا۔ جس کے نتیجے میں مشارب کے گلابی رخساروں پر سیاہ لکیریں سی بن گئی تھیں۔

”کیا بات ہے سر؟ آپ ہنس کیوں رہے ہیں؟“ انہیں ہنستا دیکھ کر مشارب نے معصومیت سے استفسار کیا تھا۔

”نتھنگ!“ اس کے استفسار پر بمشکل اپنی ہنسی روکتے ابھی وہ اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ دفعنا ”ان کا سیل فون بج اٹھا۔“

”ایکسی کیوزی!“ مشارب سے معذرت کر کے وہ کل سننے لگے۔

”ہیلو! ہاں یار۔“  
”قصر شاہ میں ہوں۔ وہ میں اپنا سیل اور والٹ لینا بھول گیا تھا! ہاں بس وہی لینے کے لیے آیا تھا۔۔۔ اوکے ابھی نکل رہا ہوں۔“

”شعب کا فون تھا نکاح ہونے والا ہے؟“  
”نہیں! ہمیں بھی اب نکلتا چلا ہے۔“

شعب سلطان سے بات کرتے کے بعد وہ اپنا سیل آف کر کے بیڑھیوں سے اٹھتے ہوئے بولے۔

اس کے چہرے پر ابھرنے والے تکلیف کے آثار اتنے نمایاں اور واضح تھے کہ انہوں نے سہارا دینے کے لیے بے اختیار ہی اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا جسے جھکی نگاہ سمیت مشارب سلطان نے تھام لیا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی زرارہ سلطان کے پرفیوم کی مرکب نے ماحول کو اپنے دھار میں لے لیا تھا۔ مشارب نے لرزتی پلکیں اٹھا کر ان کی جانب دیکھا تو وہ اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

”ظہروں کے تصادم پر زرارہ شاہ نے مسکرا کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔“

”لیڈیز فرسٹ!“ گھنے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے انہوں نے کہا تھا اور تب مشارب سلطان نے



غیر محسوس انداز میں اپنے قدم آگے بڑھانے کے بجائے زرارہ ارسلان کے قدموں کے ساتھ ملا لیے تھے۔

\*\*\*

شعیب شاہ کے شادی کے ہنگامے سرو بڑنے کے ساتھ ہی قصر سلطان کے مکینوں کی زندگی معمول پہ لوٹ آئی۔

شادی کے تیسرے روز ہی شعیب سلطان اپنی نئی نویلی دلہن کو ساتھ لیے ہتی مون منانے کے لیے سونٹنر رینڈ چلے گئے۔ حرا اور معاذ شاہ بھی واپس کینڈا لوٹ گئے تو مشارب نے بھی اپنی تمام توجہ و محبت دارالشفاء کے مریضوں کی طرف مبذول کر لی۔ وہ خود کو بے حد مصروف رکھنے لگی تھی مگر باوجود اس قدر مصروفیت کے اس کا دھیان بھی بھار رو میل کی گفتگو کی طرف چلا جاتا تو اندیشوں کے سائب اس کے دل میں سر اٹھانے لگتے۔

اسی روز وہ اپنے آپ کو بہت بکھرا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ مسلسل ذہنی انتشار نے اسے تھکاؤ لگا تھا۔ اس دن کے بعد رو میل کا فون دوبارہ نہیں آیا تھا۔ مگر اس کی جانب سے خاموشی کے طویل وقفے نے مشارب کو چونکا دیا تھا وہ رو میل ارسلان کو بہت ہی اچھی طرح سے جانتی تھی۔ وہ پیچھے ہٹنے والوں میں سے ہرگز نہیں تھا اور اس روز اس نے جو کچھ فون پر مشارب سے کہا تھا۔ وہ اس کے ارادوں کی پختگی کا پتا دے رہا تھا۔ ایسے میں رو میل ارسلان کی خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ لگ رہی تھی۔

ڈیوٹی آور ز ختم ہونے کے بعد وہ اسی بارے میں سوچتی اپنے کمرے سے گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکلتی۔  
”اےکس کمپوزی مشارب... ست قدموں کے باہر نکلتی مشارب زرارہ ارسلان کی پکار پر رک گئی۔  
”یس سر“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا تھا۔

جو اس سے دس گیارہ قدموں کے فاصلے پہ کھڑے

بڑی عجلت میں دکھائی دے رہے تھے اپنے قریب کھڑی نرس کو کچھ ہدایت دے کر فاسع کرنے کے بعد وہ اس کی جانب متوجہ ہوئے۔

”مشارب! اور اصل ایمر جنسی میں مجھے فوری طور پر آپریشن کرنا پڑ رہا ہے۔ یونو ڈاکٹر ارباب اس وقت اسپتال میں موجود نہیں ہیں اور ڈاکٹر فید اور ڈاکٹر رجا بھی چھٹی پر ہیں۔ سو آپ میرے ساتھ آئیے پلیز۔“  
تھکسا نہ انداز میں اسے حکم دینے کے بعد وہ پلٹ گئے۔

ذہنی تھکن اس قدر تھی کہ بس گھر جا کر آرام کرنے کو ہی چاہ رہا تھا۔ مگر فرض تو آخر فرض ہوتا ہے تا اس سے روگردانی نہیں کی جاسکتی۔ کسی کی زندگی سے زیادہ قیمتی اس کا آرام نہیں تھا۔ سو اس نے گھر جانے کا ارادہ ترک کیا اور اپنی چیزیں واپس روم میں رکھ کر آپریشن تھیٹر میں آئی۔  
دو گھنٹے کے آپریشن کے بعد وہ دونوں تھکے قدموں کے ساتھ آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئے تھے۔

تب وہ سندر چمرے والی کانٹیکسی ٹائزک لائی تقریباً دوڑتی ہوئی زرارہ کے قریب آئی تھی۔  
”ہوا کڑھ... ڈاکٹر کیسی طبیعت ہے اب میرے شوہر کی؟ ڈاکٹر پلیز آپ... آپ اسے بچا دیجئے۔ میں اس سے بہت محبت کرتی ہوں... میں اس کے بغیر مر جاؤں گی۔“  
وہ ان کے پاؤں پکڑ کر رونے لگی۔

زرارہ شاہ کو اس کی اس حرکت پر جیسے کرنٹ لگا تھا۔  
”دیکھیں بسن پلیز آپ اس طرح مت کریں۔ ہم لوگ بھی آپ ہی کی طرح کے انسان ہیں اور اللہ کے فیصلوں کے آگے بے بس بھی... اس لیے ہم صرف کوشش کر سکتے ہیں۔ میں نے پوری کوشش کی ہے انہیں بچانے کی، خون بہت بہہ چکا ہے“ آپ بس دعا کریں کہ جو ہیں گھنٹوں کے اندر اندر انہیں ہوش آجائے۔“

سنجیدہ لہجے میں تسلی دینے کے بعد انہوں نے اپنا



تھی۔ جیسے اس دنیا میں صرف ہسکتس کھانے کے لیے ہی آئی ہو۔ خود پر مرکوز کسی کی گہری نگاہوں کی قہقہہ کا احساس ہوا تو آہستگی سے گھنیری پلکیں اٹھا کر سامنے دیکھا۔ اور جیسے منہ کے اندر موجود بسکٹ اس کے حلق میں پھنس گیا تھا۔

”سورہ۔ ری۔ ایم۔ سورہ۔“ اٹک اٹک کر اس نے معذرت کی تھی۔

”ارے غضب کر رہی ہیں آپ‘ سورہ تو مجھے کرنا چاہیے آخر میں نے آپ کو کھانے میں ڈسٹرب کیا ہے۔“ ہونٹوں کی تراش میں ابھرنے والی بے ساختہ مسکراہٹ کو دباتے ہوئے وہ نرمی سے گویا ہوئے پھر سامنے رکھے دھول میں سے آخری بسکٹ اٹھا کر چائے میں ڈبوئے۔

مشارب سلطان ابی مسکراہٹ پھپھانے کی خاطر سر جھکا گئی تھی۔



وہی ہوا تھا جس کا اسے ڈر تھا۔ دیر میں بیٹھے رو میل ارسلان نے اپنا پرپوزل بھیج کر اس کی زندگی میں طوفان کھڑا کر دیا تھا۔ ارسلان شاہ نے بڑی چالاکی کے ساتھ سلطان صاحب سے مشارب کا رشتہ مانگا تھا۔ انہیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ بھائی کی خواہش سن کر محل اٹھے۔

یوں بھی ذاتی طور پر انہیں رو میل بہت پسند تھا۔ بیٹی کے روشن مستقبل کو دیکھتے ہوئے انہوں نے فوراً ارسلان شاہ کے سامنے اپنی رنج مندگی ظاہر کر دی تھی اور مطمئن ہو گئے تھے۔ مگر ان کا اطمینان اس وقت بکھر کر رہ گیا۔

جب رافعہ بیگم ان کی شریک حیات نے مشارب کے انکار کی خبر انہیں سنائی تھی۔

”یہ کیا بکواس ہے رافعہ بیگم؟ مشارب کا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟ رو میل میں کیا کمی ہے جو وہ شادی سے انکار کر رہی ہے۔“ بے حد غضب ناک ہوتے ہوئے انہوں نے اپنی شریک سفر کی جانب دیکھا

ہاتھ لڑکی کے سر پر رکھا تھا اور پھر وہاں سے ہٹ گئے۔ مشارب، بھیگی پلکیں جھپک کر ڈاکٹر زرار کی پشت کو تکنے لگی تھی جو شستہ قدموں سے چلتے اپنے کمرے کی طرف ہٹ رہے تھے۔



”ڈاکٹر پلیز اسے بچا لیجئے۔“ میں اس سے بہت محبت کرتی ہوں“ میں اس کے بغیر مرجاؤں گی۔“ اس لڑکی کا سسکتا لہجہ سماعتوں میں گونجا تو اک تلخ مسکراہٹ نے ڈاکٹر زرار کے چہرے کا احاطہ کر لیا۔

”واہ ارے محبت تیرے ڈھونگ۔!“

”سر! چائے لے لیجئے۔“

جانے اور کتنی دیر وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے اپنے اندر چھتری سوچوں سے جنگ کرتے رہتے۔ اگر ان کے قریب وہ مانوس سی آواز ابھری ہوتی۔ لہجے بالوں کی چولی پشت پر ڈالے معصومیت سے ان کا چہرہ نکلتی دونوں ہاتھوں میں یک تھا۔ وہ ان کی کرسی سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑی تھی۔

”اوہ تھینک یو مشارب۔“ لمبے کے ہزاروں میں اپنے آپ کو کمبوز کرتے وہ سیدھے ہو بیٹھے پھر مسکراتے ہوئے شکر یہ ادا کیا اور اس کے ہاتھ سے چائے کا کپڑا اڑاتا ہوا ٹمک تھام لیا تھا۔

”ہاں گئے مسٹر زرار ارسلان آپ کو یہ خود کو چھپانا تو کوئی آپ سے سیکھے۔“ ان کی جلتی آنکھوں کو تلکتے ہوئے مشارب نے دل میں سوچا تھا۔ پھر زرار کو اپنا ٹمک تھامنے کے بعد ان کی اجازت کی پروا کیے بغیر میز کی دوسری طرف رکھی کرسی پر براجمان ہو گئی تھی۔ جبکہ اس بے تکلفی پر وہ چونک کر رہ گئے تھے۔

اس نے آرام سے چائے کا ٹمک نیبل پر رکھا پھر اوور آل کی پاکٹ میں سے لیمن سینڈویچ کا ہاف رول نکالا اور سامنے بیٹھے شخص کے تاثرات کی پروا کیے بغیر بسکٹ چائے میں ڈبو ڈبو کر کھانے لگی۔ زرار شاہ حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

جو اس طرح ہسکتس کے ساتھ انصاف کر رہی



تھا۔ جوان کے سامنے شرمندگی سے سر جھکائے کھڑی تھیں۔

”سلطان! میں کیا کہہ سکتی ہوں، میں تو خود حیران ہوں۔ مشارب نے زندگی میں ہمیشہ ہماری چھوٹی سے چھوٹی خواہش کا بھرپور احترام کیا ہے۔ مگر اس معاملے میں اس کی ضد میری سمجھ سے باہر ہے اس کا کہنا ہے وہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔“

”تو کیا میں اسے ساری زندگی بٹھائے رکھوں گا۔“ وہ بھڑک کر بولے تھے۔

”وہ ایک زرارہ کیا ہمارے لیے کم تھا جو یہ بھی اس کے نقش قدم پر چل نکلی ہے۔ میں آج رات اس سے خود بات کروں گا۔“

\*\*\*

”بابا آپ؟“ وہ سونے کی تاری کر رہی تھی جب ہلکی سی دستک کے بعد بابا اس کے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

مشارب ان کو اس وقت اپنے کمرے میں دیکھ کر حیران رہ گئی۔

”ہاں میں! کیا آپ کو اعتراض ہے میرے یہاں آنے پر؟“

”نہ نہیں بابا۔ ایسی کوئی بات نہیں۔“ ان کے سنجیدہ چہرے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے اس نے دھیمے لہجے میں کہا تھا۔

تب سلطان صاحب نے آگے بڑھ کر اسے دونوں شانوں سے تھام لیا تھا پھر آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے۔

”آپ نے اپنی ماما سے کیا کہا ہے؟“ ان کے استفسار میں چھپی سرد مہری نے مشارب کے جسم میں سنسنی سی دوڑا دی۔ چہرے کا رنگ اڑ گیا اور ہتھیلیاں سینے سے بھپک نکلیں۔ اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ زندگی کے کسی موڑ پر اسے یوں بابا کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا۔

”میں اس خاموشی سے مطمئن نہیں ہوں مشارب

۔ میں آپ کے منہ سے سنتا چاہتا ہوں وہی سب جو آپ نے اپنی ماما کے سامنے کہا تھا۔“ وہ شرم سے سر جھکا گئی تھی۔

”بابا میں۔۔۔ میں وہ۔۔۔“ بمشکل اتنا ہی کہہ پائی پھر جھجک کر خاموش ہو گئی۔

”آپ شادی نہیں کرنا چاہتیں فقط یہ کہنا چاہ رہی ہیں ناں؟“

”بابا۔۔۔ آپ پلیز مجھے سمجھنے کی کوشش کریں۔“ ایک دم ہی جانے اسے کیا ہوا کہ آگے بڑھ کر ان کے سینے سے سر نکا کر رو پڑی تھی۔

اس کے اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے پر وہ نہ چاہتے ہوئے ہی نرم پڑ گئے تھے پھر مشارب کے سر کو سہلاتے ہوئے خود ان کی آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔

”کیوں کر رہی ہیں ایسا بابا کی جان؟“ سلطان صاحب نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے نرمی سے پوچھا تھا۔ مشارب نے اپنے لب و لہجہ سے پچلتے ہوئے سر جھکا لیا اور جب بولی تو بے بسی کا رنگ اس کے لہجے سے پھٹک رہا تھا۔

”بابا! مجھے لگتا ہے۔ میں آپ پر ماما پر اور شعیب لالہ پر بوجھ بن چکی ہوں۔ جسے آپ جلد سے جلد اپنے کندھوں سے اتار کر پھینک دینا چاہتے ہیں۔“ بلیک میلنگ کے اس انداز پر وہ اسے دیکھ کر رہ گئے تھے۔

”لیکن اگر آپ نے بروستی اپنے اس فیصلے کو میرے اوپر مسلط کرنے کی کوشش کی تو یقیناً مافیہ بابا! آپ کی مشارب بکھر کر رہ جائے گی۔۔۔ وہ مرجائے گی بابا۔۔۔ مرجائے گی۔“ ڈوبتے لہجے میں اپنی بات مکمل کر کے وہ ایک بار پھر ان کے سینے سے جا لگی تھی اور اس بار ایسا تڑپ کر روئی کہ مجبوراً ”سلطان شاہ کو ہتھیار چھیننے پڑے تھے“ وہ اس کے کمرے سے نکلتے خورون سے لوٹ آئے۔

\*\*\*

اس کے بعد منال سے لے کر وادی جان شعیب



بھل گیا تھا۔ ارسلان شاہ مزاجاً راج جو واضح ہوئے تھے اس لیے اس وقت بھی بجائے اس معاملے کو اٹا کا مسئلہ بنانے کے انہوں نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ مگر یہ انکار سن کر رو میل شاہ خاموش نہیں رہ سکا تھا۔ ”بابا! مشارب سلطان نے مجھے رہجیکٹ کر کے اچھا نہیں کیا۔ اس نے شادی سے انکار کر کے جو طمانچہ میرے منہ پر مارا ہے۔ اس کی جلن میں زندگی بھر محسوس کرتا رہوں گا۔ آپ اسے جتا دیجئے گا رو میل ارسلان واپس آ رہا ہے۔“

یہ کہہ کر رو میل سلسلہ منقطع کر گیا تھا۔ جبکہ ارسلان شاہ سنانے میں آکر ریسپورہا تھوں میں لیے وہیں بیٹھے رہ گئے تھے۔ قصر سلطان کی فضا میں ان دنوں عجیب سی بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ گھر کے تمام فرد ہی اس مسئلے کو لے کر بے حد ڈسٹرب ہو رہے تھے۔ صرف ایک زرار ارسلان ہی تھے جو قصر سلطان میں رونما ہونے والے ان تمام واقعات و معاملات سے یکسر بے خبر تھے ان کو تو اب بھی پتا اگر وہ ویک اینڈ والے روز کلب میں شعیب سلطان کی خاموشی اور مسلسل غائب دماغی کو محسوس کرتے ہوئے پوچھ رہے گئے ہوتے۔

”کیا بات ہے یار شعیب! تم کچھ ڈسٹرب سے دکھائی دے رہے ہو؟“ سگریٹ سلگاتے ہوئے زرار نے استفسار کیا تھا۔

تب لمبے بھر کے تذبذب کے بعد شعیب ان سے اپنا مسئلہ شیئر کر کے لگا۔

رو میل کے پوپزل کے بارے میں سن کر وہ حیران رہ گئے ایک ہی گھر میں رہنے کے باوجود وہ ان تمام معاملات سے کس قدر لاعلم تھے۔ مکمل ان کا بھائی تھا؟ اور کسی نے انہیں بتانے کی زحمت بھی گوارا نہ کی تھی۔

”یہی ہے۔ اسے شادی میں لینی۔ پیار سے سمجھا کر دیکھ لیا، مگر سختی سے سمجھا کر دیکھ لیا پر جیسے کوئی اثر نہیں ہوتا۔ بجائے ہماری بات ماننے کے انہوں نے بیٹھ جاتی ہے۔“ افسرہ لہجے میں وہ یہ سب کہتا چلا گیا تو زرار اپنے ہونٹ کانٹے لگے۔ پھر انگلیوں کے بیچ دبے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے بولے۔

”نیک اسٹ ایزی یار۔ تمہیں حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے مشارب کو وقت کے ساتھ اپنا فیصلہ بدلتا رہے۔“

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ ورنہ تو وہ بھی تمہاری ہی کزن ہے اتنا وقت گزر جانے کے بعد تم سدھرے ہو۔“ وہ سدھرے گی۔؟“ شعیب نے خاصے چٹکھے انداز میں کہا تھا اس کی بات زرار کے چہرے پر اک سایہ سا لہرا گیا۔ وہ خانہ ازمیں مسکراتے آنکھوں میں ادا آنے والی کمی کو چھپانے کی خاطر وہ سرے ہی لمحے سر جھکا گئے تھے۔

”یار زرار! ویسے ایک بات ہے۔“ شعیب جوان کی آنکھوں میں چمکتی کمی نہ دکھ پایا تھا۔ اپنے کسی خیال کے تحت بولا۔

”میں نے نوٹ کیا ہے مشارب تمہاری بہت عزت کرتی ہے۔ تم اسے سمجھا کر دیکھ لو۔ کیا پتا وہ مان جائے۔ آخر تم اس کے سر بھی تو ہو۔“ شعیب نے لفظ ”کو کچھ“ کہتے ہوئے ادا کیا تو زرار ارسلان نم آنکھوں کے ساتھ مسکرا کر رہ گئے۔

\*\*\*

کئی دن مسلسل ٹینشن میں گزارنے کے بعد مشارب آج خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ ورنہ تو رو میل ارسلان کے اس پوپزل کی وجہ سے اس کی نیندیں اڑی ہوئی تھیں۔ مگر آج جیسے ہی ممانے یہ گند



نیوز سنائی تھی کہ بابا نے بڑے بابا کو انکار کر دیا ہے۔ وہ جھوم ابھی بھی دل پر سے اور اسی کا بوجھ سر کا تو وہ گزرے دن کے واقعات کو قلم بند کرنے کی خاطر اپنی ڈائری لے کر بیٹھ گئی۔

گو لندن کو روالی یہ ڈائری مشارب کے دل کی تمام باتیں جانتی تھی۔ کئی سالوں سے وہ اپنے دل کی تمام باتیں تمام راز اسی ڈائری کو سونپتی آ رہی تھی۔ اس وقت بھی اپنے دل کا سارا غبار ڈائری کے اوراق پر رقم کرنے کے بعد وہ شاور لینے کے ارادے سے واش روم میں گھس گئی تھی۔

آدھے گھنٹے کے بعد کا ہی رنگ کے دیدہ زیب سوٹ میں وہ بھگے بالوں کو تولیے سے رگڑتی واش روم سے باہر نکلی تھی، ٹھیک اسی وقت بیڈ پر رکھا اس کا سیل جگمگا اٹھا۔ ذرا سا جھک کر موبائل ہاتھ میں اٹھا لیا تھا۔

”مشارب! کیا آپ کچھ دیر کے لیے میرے بیڈ روم میں آ سکتی ہیں! زرارہ میر۔“

وہ ساکت چلوں سے اسکرین پر روشن زرارہ کے نام کو تک رہی تھی۔ پھر اچانک ہی اس کے چہرے پر پھیلی حیرت کی جگہ طنز پر مسکراہٹ نے لے لی۔

”تو زرارہ صاحب نے مجھے اپنے کمرے میں سمجھانے کی خاطر بلایا ہے؟ اگر یہ بات ہے تو میں بھی آج اپنے تمام حساب بے باق کر کے لوٹوں گی۔“ اس کا دکتا چہرہ ایک ٹانچے کو بچھ رہا تھا۔

نازک پھلی کی پشت سے غلابی آنکھوں میں المہ آنے والی نمی کو رگڑتے ہوئے اس نے درعوم انداز میں سوچا تھا پھر بالوں کے گیلے آبشار کو تولیے کی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے پشت پر کھلا چھوڑ دیا اور صوفے پر رکھا سوٹ کا ہم رنگ روپہ اٹھا کر زرارہ شاہ کے بیڈ روم کی طرف آگئی تھی۔ انگلیوں کی مدد سے دروازے پر ہلکی آواز سے دستک دی اور پھر اجازت ملنے پر دوسرے ہی پل کمرے کے اندر داخل ہو گئی۔

سامنے ہی بلیو کمر کی جینز پنٹ اینڈ وائٹ شرٹ میں ملبوس وہ جمازی سائز بیڈ پر لیٹے تھے اسے دیکھ کر ہاتھ میں پکڑی کتاب سائیڈ پر رکھ کر اور خود اٹھ کر بیٹھ

گئے۔

”مشارب! آپ جانتی ہیں میں نے آپ کو اس وقت اپنے کمرے میں کیوں بلایا ہے؟“ کمرے کی خاموشی کو زرارہ کی دلکش و بھاری آواز نے توڑا تھا۔

”تمہید باندھنے کی کیا ضرورت ہے سر! آپ مجھے ڈائریکٹ۔۔۔ وہ بات کہہ سکتے ہیں جسے کہنے کے لیے آپ نے اس وقت مجھے اپنے کمرے میں بلایا ہے۔“ نہایت جرات مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سیدہ نے کہا۔ یہ سب کہتی وہ زرارہ ارسلان کو حیران کر گئی تھی۔

”آپ نے رو میل اور سلمان کے پروپوزل کو رد کیا کیوں کیا؟“

”یو آر رائٹ مشارب سلطان! مجھے کسی تمہید کی ضرورت نہیں ہے اور میں تمہید باندھوں گا بھی نہیں۔ نہایت ہی سیدھے انداز سے پوچھ رہا ہوں؟“

”آپ نے رو میل اور سلمان کے پروپوزل کو رد کیا کیوں کیا؟“

”آپ نے غلط خبر سنی ہے سر! میں نے رو میل اور سلمان کے پروپوزل کو رد نہیں کیا بلکہ شادی کرنے سے انکار کیا ہے۔“ زرارہ شاہ کے تپے تپے چہرے کو مظلوم نظروں سے دیکھتی وہ ایک اور جرات کا مظاہرہ کر گئی تھی۔

”لیکن کیوں؟ آپ انکار کیوں کر رہی ہیں۔ شادی کیوں نہیں کرنا چاہتیں؟“ ایک ایک لفظ کو بھیج کر اوپر کرنے کے بعد وہ سامنے کھڑی مشارب کو دیکھنے لگی۔

”ایک لخت ہی مشارب کی ہتھیالیاں پسینے میں تر ہو گئیں۔ اس نے اس وقت خود کو بڑی مشکل میں محسوس کیا۔ وہ سامنے کھڑے شخص کی آنکھوں میں زیادہ دیر نہیں دیکھ پائی تھی۔

”آپ خاموش کیوں ہیں مشارب؟ میں وجہ جاننا چاہتا ہوں؟ آپ کے انکار کی وجہ کیا ہے؟“ اک لمحے کو اس کا دل چاہا تھا کہ (وجہ کیا ہے) انہیں بتا دے مگر پھر دوسرے ہی لمحے عزت نفس آڑے آگئی تھی۔ وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔

اسے خاموش دیکھ کر قدرے ترش انداز میں گویا

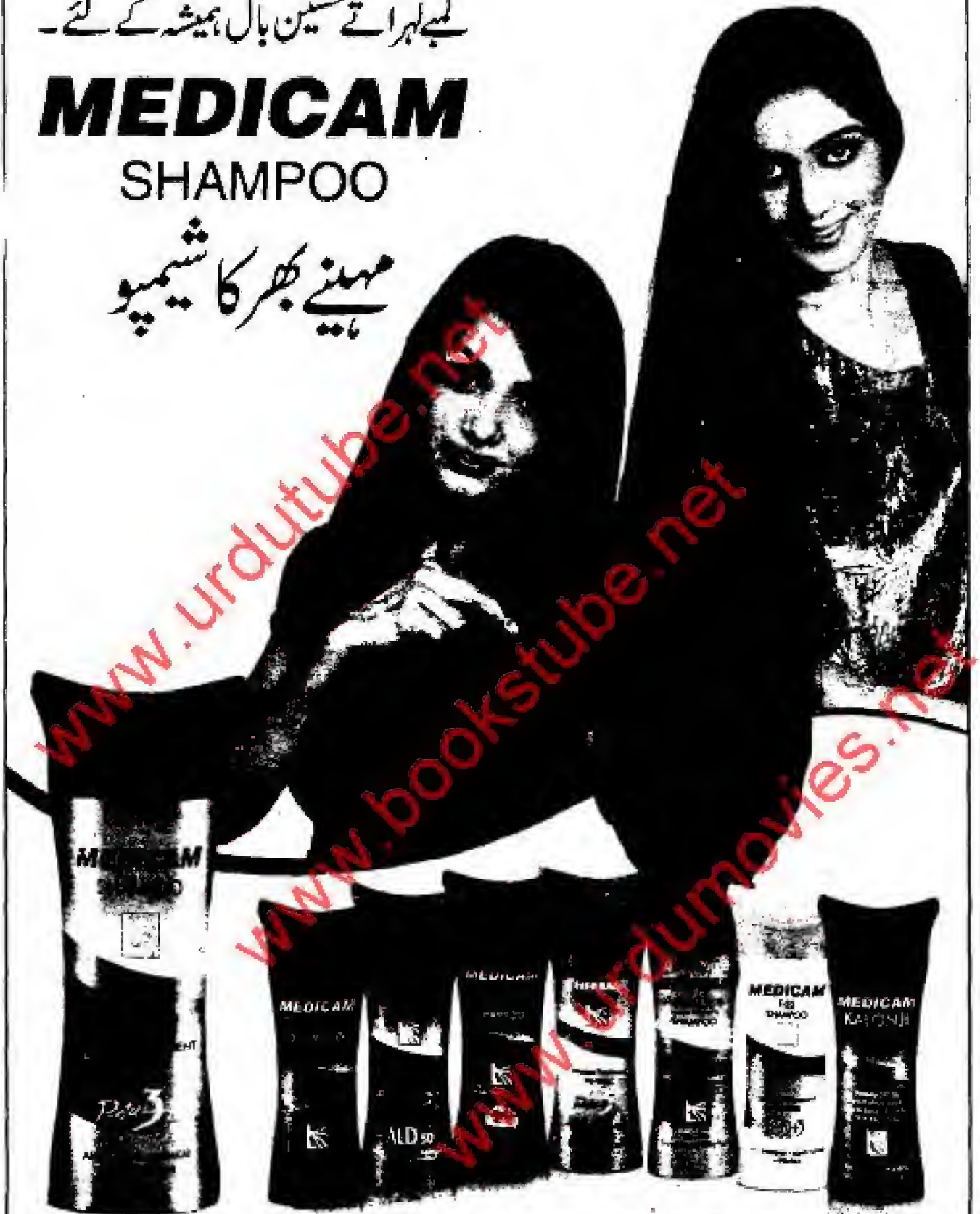


لمبے لہراتے حسین بال ہمیشہ کے لئے۔

# MEDICAM

## SHAMPOO

مہینے بھر کا شیمپو



3 Plus SHAMPOO

SHIKAKAI

ANTI  
DANDRUFF

AMLA

HERBAL

ANTI-LICE

EGG

KALONJI



آخری وار بر زرار شاہ کا دل کسی زخمی پرندے کی طرح  
پھر پھر کر رہ گیا تھا۔ بھگتی پلکیں جھپک کر وہ بند کے  
سائیڈ میبل پر سچے سوہنی کے مجسمے کو دیکھتے رہ گئے۔

وقف حمال و پاس رہتا ہے  
دل ہے کہ اکثر اداس رہتا ہے  
تم تو غم دے کر بھول جاتے ہو  
مجھ کو احساس کا پاس رہتا ہے



”مشارب بی بی! یہ کارڈ زرار صاحب نے آپ کے  
لیے دیا ہے۔“ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی ایف ایم سن  
رہی تھی جب کارڈ ہاتھوں میں تھا۔ عابدہ وہاں چلی  
آئی۔

مشارب نے استغناء نگاہوں سے عابدہ کی طرف  
دیکھتے ہوئے کارڈ اس کے ہاتھ سے لیا پھر عابدہ کو جانے  
کا کہہ کر وہ کارڈ کھول کر دیکھنے لگی۔ کارڈ پر لکھی  
عبارت پڑھ کر اس نے بے اختیار اپنی خوش فہمی کو  
ملاست کی۔ وہ سمجھی تھی کہ شاید زرار نے اس دن کے  
روپے پر شرمندگی محسوس کرتے ہوئے اس کی طرف  
سری کا کارڈ بھیجا ہے۔ جبکہ یہ کارڈ تو ڈاکٹر ارباب اور  
ڈاکٹر مہر کی شادی کا دعوت نامہ تھا۔

”میں دن سا شادی پر جاؤں گی جو موصوف زرار  
صاحب نے اسے میری طرف بھجوانے کی زحمت کی  
ہے!“ بے زاری سے کارڈ کو ایک طرف ڈالتے ہوئے  
اس نے دل میں سوچا تھا پھر اپنے گرد لپٹی شاں کو  
درست کرتے ہوئے اس نے خود کو جیسے سردی کی  
شدت سے بچانے کی کوشش کی تھی اور پھر دوبارہ اپنی  
توجہ کالوں میں لگی بینڈ زفری سے ابھرتی پرینٹنگ  
دلکش آواز کی جانب مبذول کر لی تھی۔ جو پروین شاکر کا  
شعر گنگنا رہا تھا۔

”کچھ تو ہوا بھی سرد تھی، کچھ تھا تیرا خیال بھی!  
دل کو خوشی کے ساتھ ساتھ، ہوتا رہا ملال بھی



وہ دمبر کی ایک سردرات تھی۔ چاند پوری آبد

ہوئے۔  
”میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے ڈاکٹر مشارب  
! مجھے اس کا جواب دیں۔“

”آپ کے انکار کی وجہ کیا ہے زرار سر؟“ زرار کی  
بات کا جواب دینے کے بجائے وہ الثالن سے سوال کر  
گئی تھی۔

اس چھوٹی سی لڑکی کی اس درجہ جرات پر وہ حیران  
کھڑے اسے دیکھ کر رہ گئے۔

”آپ نے بتایا نہیں آپ کے انکار کی وجہ کیا ہے؟  
اور آپ بھی شادی کیوں نہیں کرنا چاہتے؟“ مشارب  
نے لفظ ”آپ بھی“ کو کھینچ کر اوا کیا تو اس کے انداز پر  
وہ غصہ ضبط کر کے بولے۔

”میں خود کو مشارب سلطان کے کسی بھی سوال کا  
جواب دینے کا پابند نہیں۔“ لہجہ برف کی طرح  
سرد تھا۔

”آپ بھلے نہ بتائیں سر، میں آپ کے بغیر بتائے  
بھی جانتی ہوں۔ آپ کے انکار کی وجہ یہی ہے تا ستر  
زرار شاہ کہ آپ اب تک حراشاہ سے محبت کرتے  
ہیں۔ اسی لیے شادی نہیں کرنا چاہتے۔“

”مشارب! زرار سلطان کا ہاتھ بہت اچانک  
اٹھا تھا اور اس کے چہرے پر نشان چھوڑ گیا۔  
باقی کے الفاظ مشارب کے منہ میں ہی رہ گئے تھے۔  
گال پر ہاتھ رکھے وہ سانس کھڑی رہ گئی تھی۔

”جبکہ اس بند کرو اور نکل جاؤ میرے کمرے سے۔“  
اسے ٹھیکر مارنے کے بعد زرار نے بائیں ہاتھ میں تھاما  
سیل فون دیوار پر دے مارا تھا۔ مشارب بھیکی ہنسی ہنس  
دی۔

”شاید سب لوگ آپ کی طرح ہی رہی ہوں  
کرتے ہوں گے جب ان کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا  
جاتا ہو گا؟“ زرار کے سرخ پڑتے چہرے کو لکھ بھر کے  
لیے اپنی جیبتی نگاہوں کے حصار میں لیتے ہوئے اس  
نے طنز کا آخری تیر چلایا تھا اور پھر وہاں کی نہیں تھی۔  
الفاظ کیا تھے، زہر میں کچھ تیر تھے جو ان کی مدح  
میں پیوست ہو کر رہ گئے۔ مشارب سلطان کے اس



تاب کے ساتھ آسمان پر جھک رہا تھا، کمرے کے گلاس  
وندو سے جھانکتی چاندنی کی میٹھی میٹھی روشنی بھی ان کی  
طبیعت پر چھائی اور اسی کو دور نہیں کر پائی تھی۔

جیبتی ہے قلب و جاں کو ستاروں کی روشنی  
اے چاند ڈوب جا کہ طبیعت اداس ہے  
کسل شانوں تک آنے تکہ پہلو میں لیے وہ کروٹ  
کے بل کیئے نیند کو منانے کی کوشش کر رہے تھے جو کئی  
راتوں سے زرار ارسلان کی آنکھوں سے روشنی ہوئی  
تھی۔

چاند پر سے نگاہ ہٹا کر وہ سامنے والی دیوار پر لگے وال  
کلاک کی طرف دیکھنے لگے۔ جہاں رات کے ڈھائی بج  
رہے تھے۔ رت جگموں سے سو جی آنکھیں وال  
کلاک سے ہٹ کر اب بیڈ کے بائیں طرف سائیڈ  
نیمبل پر سجے سوہنی کے تختے پر آکر ٹک گئی تھیں۔

لب بھینچ کر وہ مشارب کے بارے میں سوچنے  
لگے۔ اس رات اس پر ہاتھ اٹھانے کے بعد زرار اس  
سے سخت شرمندہ تھے اور وہ معذرت کرتا جاتے تھے مگر  
مشارب نے تو جیسے ان کے سامنے نہ آنے کی قسم کھا  
رکھی تھی۔ ان دنوں اس نے دارالشفا جانا بھی چھوڑ  
رکھا تھا۔ وہ جب شام کو اسپتال سے لوٹے مشارب  
اپنے روم میں بند ہو جاتی۔ صبح کو جب زرار دوبارہ  
ہاسپٹل جانے لگتے تو وہ ناشتے کی نیمبل پر موجود نہ ہوتی۔  
زرار ارسلان زچ ہو کر رہ جاتے۔ کل شام ڈاکٹر ارب  
اور ڈاکٹر چاکا وینک کارڈ لے کر وہ اس کے کمرے  
تک گئے تھے مگر پھر اک عجیب سی جھجک نے پلٹنے پر  
مجبور کر دیا۔ انہوں نے وہ کارڈ ملازمہ کے ہاتھوں  
مشارب کے کمرے میں پھنسا دیا تھا اور خود مضطرب سے  
ہو کر واپس اپنے کمرے میں آگئے تھے اس وقت بھی  
بے نام سے اضطراب نے انہیں گھیر رکھا تھا۔ سوچوں  
کے جال میں جکڑے وہ جانے کتنی دیر سے نیند کو  
منانے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ تھی کہ ان کی  
آنکھوں سے کوسوں دور کھڑی تھی۔

”رت جگے تمہارا مقدر ہیں زرار ارسلان یوں  
روٹھی نیند کو منانے کی کوشش میں خود کو مزید مضطرب

نہ کرو۔“ زیر لب خود کو باور کراتے ہوئے انہوں نے  
بستر چھوڑ دیا تھا۔ پھر جانے دل میں کیا سہمی کہ صوفہ پر  
رکھی شال اٹھائی اور کندھوں پہ ڈال کر باہر آگئے۔

باہر سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ وہ بے آواز قدموں سے چلتے  
ہوئے باہر لان میں نکل آئے تھے اور لان میں آتے ہی  
زرار کے قدم جم کے رہ گئے تھے۔ بلیک شال اوڑھے وہ  
لان کی سیڑھیوں پر بیٹھی رو رہی تھی۔ وقفہ وقفے سے  
اس کی سسکیاں لان کی خاموش فضا میں ابھرتی اور  
مدھم ہو جاتی تھیں۔

مشارب کی دلی دلی سسکیوں کی آواز سن کر وہ بے  
چین سے ہو کر آگے بڑھ آئے پھر آہستگی سے اس کے  
قرب آکر سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔

وہ ان کی موجودگی سے بے خبر سر جھکائے بیٹھی آنسو  
ہمائے جا رہی تھی دفعتاً ”ہوا کے سرد جھوکے نے  
جہاں مشارب کے بالوں کی چند لٹوں کو چرے کے  
آگے کر دیا تھا وہیں زرار کے وجود سے پھوٹی  
(Hugoboss) پر ٹیوم کی دلفریب مک نے اسے  
ساکت کر دیا۔ سانس روک کر اس نے سراٹھایا تھا۔

سیاہ رنگ کی جینز پیٹ اور لیسن کلر کی شرٹ میں  
گرے شال کاندھوں پہ ڈالے اس سے کچھ فاصلے پر  
بیٹھے وہ اداس نگاہوں سے اس کو دیکھ رہے تھے۔  
زرار کو اس وقت وہاں پا کر کچھ بھر کے لیے مشارب  
کی آنکھوں میں استعجاب جاگا تھا۔ مگر دوسرے ہی پل  
وہ ہونٹ کانٹے ہوئے سر جھکا گئی تھی۔

تب افق کی آغوش میں جھگڑاتے چاند کی بھرپور  
روشنی میں بھیگی پلکوں والی اس لڑکی کو دیکھ کر زرار شاہ کا  
دل چاہا، ہاتھ بڑھا کر وہ اس کی آنکھوں کے سارے  
آنسو سمیٹ لیں، جو خود ان کی وجہ سے اس کی آنکھوں  
میں آئے تھے۔ مگر اس وقت اپنی اس خواہش کو دبا کر  
انہوں نے اپنا ہاتھ مشارب کے سر پر رکھ دیا تھا۔

زرار ارسلان کے ہاتھ کا بھاری لمس اپنے سر پہ  
محسوس کرتے اس کے آنسوؤں میں کچھ اور بھی تیزی  
آگئی تھی تب اپنا ہاتھ اس کے سر سے ہٹاتے ہوئے وہ  
نہایت نادم کبجے میں گویا ہوئے۔



تھی پھر جانے اس کے من میں کیا سہلی کہ اپنا ہاتھ ان کے سامنے کر دیا۔

”فرینڈز؟“ زرار چند لمحوں کے لیے حیرت بھری نظروں سے اپنے سامنے پھیلی گلابی ہتھیلی کو دیکھتے رہے پھر اگلے ہی پل مسکراتے ہوئے اس کا نازک ہاتھ تھام لیا۔

”تھینک یو۔“ زرار ارسلان کے مضبوط ہاتھ کا لمس محسوس کرتے وہ دلکشی سے مسکرا دی تھی۔ اور تب بھی نکھری چاندنی میں مشارب سلطان کے مسکراتے چہرے کو اپنی نظروں کی گرفت میں لے کر وہ بھی مسکرا دیے تھے۔



مکمل تیار ہونے کے بعد وہ قد آدم آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس کا روپ آج غضب ڈھا رہا تھا۔ بے اختیار ایک فائنڈم مسکراہٹ نے مشارب کے لبوں کو چھو لیا۔ ٹھیک اس وقت اس کے سیل پر مہیج ٹولنا لگی تھی۔ دائیں کان میں بڑے جھکے کو درست کرتی وہ جھٹکے سے صوفے پر رگھے سیل کی طرف پلٹی تو اس کے بے اسٹپ کٹ بال بکھر کر رہ گئے۔

عجلت میں سیل اٹھایا اور مہیج پڑھنے لگی۔ زرار ارسلان کا مہیج تھا۔ وہ نیچے گاڑی کے پاس کھڑے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ان دونوں کو آج ڈاکٹر رجا اور ڈاکٹر ارب کی شادی میں جانا تھا۔

ایک مرتبہ پھر خود کو آئینے میں بھر پور نظروں سے دیکھنے کے بعد وہ ساڑھی کا پلو سنبھالتی اونچی ہیل کی سینڈل کے ساتھ احتیاط سے چلتی نیچے آگئی تھی۔

بلیک ڈز سوٹ میں سلیقے سے بال ایک طرف جمائے وہ اپنی بلیک پراڈو کے قریب کھڑے کسی کے ساتھ فون پر بات کر رہے تھے جو نئی لینڈر پر فون کی دل فریب منک سانسوں سے ٹکرائی تھی وہ چونک کر پلٹے۔

اور جیسے ہی اس پر نظر پڑی پلک جھپکنا بھول گئے۔

”مشارب! اس رات آپ کے ساتھ جو مس لی ہو کیا۔ اس کے لیے اگر اس وقت معذرت کروں تو؟“

”تو میں یہ معذرت قبول نہیں کروں گی۔“ ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر اس نے کہا تو وہ مشارب کے نیچے کی سبے رگھی محسوس کر کے خفت سے مسکرا دیے۔ مشارب نے کن اکھیوں سے اس کو آنکھوں کے ساتھ مسکراتے اس شخص کی جانب دیکھا تھا۔ پھر قدرے نزوٹھے پن سے بولی تھی۔

”مجھے باسی معذرت نہیں چاہیے۔“ تھینڈر چار روز پہلے مارا تھا اور سو رہی اب کر رہے ہیں؟“ زرار پہلے تو سمجھ ہی نہ پائے کہ وہ کیا کہہ گئی ہے مگر جو نہی سمجھ میں آیا تھا وہ کھل کر فہم دینے لگے۔

انہیں ہنستا دیکھ کر مشارب کے چہرے پر روشنی بکھر گئی تھی۔ بہر حال کچھ بھی تھا مشارب کو سامنے بیٹھے شخص کی ہنسی بہت عزیز تھی۔ چند لمحے ہنستے رہنے کے بعد وہ مسکراتے لہجے میں گویا ہوئے۔

”مشارب سلطان! تم ایک بہت مشکل لڑی ہو۔“

”تھینک یو سر۔“ اس بھرے پر اس نے کہا۔

”مشارب! اور کیا اور جب بولی تو لہجہ شوخ تھا۔“

”وہ ایک بات ہے سر! آپ بھی کچھ کم مشکل نہیں ہیں۔“ اس دن میرے معصوم گل پر اپنی زور سے پھینکا ہوا تھا کہ مجھے مسکین کے چوہہ طبق روشن ہو گئے تھے۔“ مشارب کے ”معصوم گل“ کہنے پر وہ خاصے محفوظ ہوئے پھر سنجیدہ لہجے میں کہا تھا۔

”دراصل اس رات غصے کی شدت نے مجھے پاگل بنا دیا تھا بہر حال جو کچھ ہوا اس کے لیے میں سخت شرمندہ ہوں۔“

”ارے نہیں۔“ وہ ایک دم سے ان کی بات کاٹ گئی۔ ”اس طرح تو آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔“ سو رہی تو مجھے کتنا چاہیے میں نے آپ کو مرٹ کیا تھا۔“ وہ دھیرے سے اپنے دل کی بات کہہ گئی۔ تب زرار اس کی بات پر سر جھکا کر رہ گئے تھے۔ مشارب نے ایک بے چین نگاہ ان کے جھکے ہوئے سر پر ڈالی



”خود کو جانے کیا سمجھتے ہیں؟“ مشارب نے ان کی بے نیازی پر جھنجھلا کر سوچا تھا۔ ٹھیک اس وقت ہوا کی شرارت سے اڑتے بالوں کو ہاتھ سے پیچھے جھٹکتے ہوئے اس کی کلائی میں پڑی کالج کی سلور چوڑیاں بج اٹھیں۔

اس جلت رنگ پہ زرار چونک سے گئے۔ وندا اسکرین سے نگاہ ہٹا کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ نظروں کے تصادم پر مشارب دلکشی سے مسکرا دی تھی۔ ”جولیا“ ایک لمبا سا تبسم اس کی جانب اچھال کر وہ دوبارہ زرار ٹنگ کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

مشارب خواہواہ ہی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ گاڑی سگنل پر رکی تو زرار نے میوزک سسٹم بھی آف کر دیا۔

”جل کھڑے ہیں پورے! خود تو ایک لفظ بھی تعریف نہیں کی۔۔۔ دوسرا کر رہا تھا اس کی بھی بولتی بند کر دی۔“ ان کے میوزک پلیئر آف کرنے پر مشارب نے جل کر سوچا تھا۔

”صاحب! لے لیجئے نا۔ تازہ پھول کے گہے ہیں!“ وہ چھوٹا سا بچہ ہاتھوں میں پھولوں کے کنگن اٹھائے زرار شاہ سے اصرار کر رہا تھا۔ مشارب سچ پھیر کر بچے کی طرف دیکھنے لگی۔

”صاحب! لے لیجئے نا؟“ اس بچے نے پھر اصرار کیا۔

”یار! کہنا نہیں چاہتا۔ میں کیا کروں گا ان کا؟“ ”صاحب! بیگم صاحبہ کو بے دبیجے گا نا وہ خوش ہو جائیں گی۔“

”سو سوئیٹ۔“ مشارب کو بے اختیار اس بچے پر پیار آنے لگا۔

”کتنے کے ہیں؟“ لہبا سانس کھینچتے ہوئے زرار نے آخر جان چھڑانے کی خاطر کنگن خریدنے کا فیصلہ کر لیا۔ بچہ ایک دم کھل اٹھا اور خوشی خوشی کنگنوں کی قیمت بتانے لگا۔ زرار شاہ نے مطلوبہ رقم اسے تھمائی اور کنگن اس کے ہاتھ سے لے لیے۔ مشارب کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں تھیں۔

بلیک کمر کی سلک کی ساڑھی جس کے باڈریہ وائٹ اینڈ پریل موتیوں کا بے حد نفیس سا کام کیا گیا تھا۔ اسٹیپ ٹکٹ کمر سے نیچے آتے بالوں کے ساتھ آنکھوں میں ہیروں کی سی چمک والے لمبو لینس لگائے، نفاست کے ساتھ کیے گئے میک اپ اور نازک سی چوہری میں مشارب سلطان اس وقت زرار ارسلان کے ہوش اڑا گئی تھی۔

سبل فون کان سے لگائے وہ بنا پلک جھپکے ساکت کھڑے اسے تک رہے تھے۔

اور تب وہ ان کی ساکت نگاہوں کی زد میں پڑے ہی فاتحانہ انداز سے مسکرائی تھی اور اس مسکراہٹ کی دلکشی نے بت بنے کھڑے زرار کو جیسے کسی خواب سے جگا ڈالا تھا۔

”لہبیس گو“ حواسوں میں لوٹنے کے فوراً بعد زرار نے سبل فون کان سے ہٹائے ہوئے اس سے کہا تھا اور پھر آگے بڑھ کر اس کے لیے فرنٹ ڈور کھولا وہ سبج سبج قدم اٹھاتی بڑی نزاکت کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر آکر بیٹھ گئی تھی۔

مشارب کے بیٹھنے کے بعد انہوں نے فرنٹ ڈور بند کیا اور خود بھی آگے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئے۔ یوں کچھ ہی دیر بعد اسات کے اس سپر میں ان کی بلیک پراڈو سیاہ تارکول کی جوت پر بھاگ نکلی تھی۔

مردانہ کٹون اور لیڈر ریٹوم کی ملی جلی منک نے گاڑی کی اندرونی فضا کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ پراڈو کے اندر چھائی معنی خیز خاموشی کو توڑنے کی خاطر زرار نے ہاتھ بڑھا کر میوزک پلیئر ان کر دیا اور اس کے ساتھ ہی جیسے نصرت فتح علی خان گنگنا گئے تھے۔

فیصلہ ہے یہی بات ہے یہ اہل۔۔۔ حسن والوں میں تیرا نہیں ہے بہل۔

”ارے خان صاحب تو میری تعریف کرنے لگے۔۔۔!“ وہ خواہواہ خوش فہم ہوئی اور کن اکھیوں سے اپنے برابر بیٹھے شخص کی طرف دیکھا تھا۔ جو وندا اسکرین پر نظریں جمائے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اس سے خامسے بے نیاز نظر آرہے تھے۔



سلطان! تم بھولنے والی چیز ہرگز نہیں ہو۔“ وہ والمانہ انداز میں اس کا چہرہ نکلتے ہوئے مسکرایا تھا۔

اور مشارب سلطان چھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے یوں دیکھ رہی تھی جیسے کوئی برا سپنا دیکھ رہی ہو۔  
”رو میل۔ تم کب آئے؟“ وہ تھوک نکلتے ہوئے بمشکل اتنا کہہ پائی تھی جب کہ وہ ہنس پڑا تھا۔

”صبح ہی پہنچا ہوں جب قہر سلطان میں قدم رکھا تھا تو منال اور اسری بھی مجھے دیکھ کر تمہاری طرح اسٹپو بن گئی تھیں۔“

”لیکن رو میل! یوں اچانک۔۔۔ آئی میں تم نے بتایا ہوتا کہ تم آرہے ہو۔“ اپنی حیرت چھپا کر سنہلے ہوئے اس نے کہا تو وہ گہری نظروں سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

”میں ضدی لڑکی کو سر پرانہ نہ چاہتا تھا۔ کو کیسا لگا میرا سر پرانہ۔“  
”ناٹس!“ اس کے استفسار پر وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔

”تمہارے انکار نے اس قدر بے چین کیا مشارب سلطان کہ میں اپنی ہائر اسٹڈیز کی خواہش کو لات مار کر لندن کی فضاؤں کو خیر باد کہہ آیا۔“

”مگر لگتا ہے جیسے تمہیں میرے آنے کی خوشی نہیں ہوئی۔“ اپنی اچانک آمد کی وجہ بتانے کے بعد رو میل نے آخر چبھتے لہجے میں کہا تو وہ شرمندہ ہو گئی۔

”ارے۔۔۔ رو میل! تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ تمہاری آمد پر مجھے خوشی نہیں ہوگی۔“

”اویار! یہ ہوئی ناول خوش کرنے والی بات۔ ورنہ تو تمہارا یہ زرد زرد سا چہرہ دیکھ کر‘ میرا دل زخم زخم ہوا‘ جا رہا تھا۔“ کھلے کھلے لہجے میں کہتا وہ اچانک رک سا گیا تھا پھر جیسے کچھ یاد آنے پر سر پر ہاتھ مارتے ہوئے سرخ گلابوں کا بو کے اس کی جانب بڑھایا۔

”یہ لو مشارب سلطان اس اونٹنی فاریو۔۔۔“ تانہ گلابوں کے گلہستے پر نظرس جھائے مشارب نے اس وقت خود کو خاصا بے بس محسوس کیا تھا پھر بدقت ہاتھ

”یہ لو۔“ زرار نے کنگن اس کی طرف بڑھائے تھے تب مشارب نے کنگن ان کے ہاتھ سے لینے کے بجائے اپنی سنہری کلائی ان کے آگے کر دی تھی۔

اس کی اس حرکت پر لمحہ بھر ٹھٹھکنے کے بعد زرار نے مشارب کا نازک ہاتھ تھام کر دونوں کنگن دھیرے سے اس کی کلائی میں پسانا دیے۔

”تھنکس سین۔“ شکریہ ادا کرتے مشارب سلطان کی پلکیں لرز گئی تھیں۔

”یو آرو۔ ٹم۔“ دھیسے لہجے میں کہنے کے بعد انہوں نے گاڑی اشارت کر دی تھی۔

ہوٹل پہنچنے پر ڈاکٹر ارب نے بے اختیار ان دونوں کے کپل کو سراہا تھا۔

”تھنک یو یار!“ زرار نے سادہ سے لہجے میں شکریہ ادا کیا تھا۔

”میرے ساتھ رہیں گے تو ایسی ہی تعریفیں سننے کو ملیں گی۔“ ڈاکٹر ارب کے کس اور کی طرف متوجہ ہونے کے بعد مشارب نے ان کے قریب ہو کر سرگوشی کی تو وہ اس کی اس درجہ خود اعتمادی پر اپنی بے ساختہ اندلی مسکراہٹ چھپانے کے خاطر سر جھکا گئے۔

\*\*\*

وہ وارد الشفا کے آئی سی یو سے نکل رہی تھی جب سامنے سے آتے شخص پر نظر پڑتے ہی دست دین گئی۔ بلیو کلر کی، نیئر پیٹ اور ریڈ شرٹ میں لمبوس تازہ سرخ گلابوں کا بو کے ماحول میں تھا۔ وہ سیدھا اس کی جانب آ رہا تھا۔

دیار غیر میں کیسے تجھے صدا دیتے تو مل بھی جاتا تو آخر تجھے گناہ دیتے تمہیں بھولنا ہی اول تو میری دسترس میں نہیں جو یہ اختیار بھی ہوتا تو کیا بھلا دیتے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ دلکش مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوا۔

”تم کیا سمجھی تھیں‘ تمہارے انکار کے بعد میں تمہیں بھول کر وہاں بیٹھ جاؤں گا۔؟ نہیں مشارب



برہا کر رو میل سے وہ گلابوں کا گلہ دستہ لے لیا۔  
 ”ڈش ہٹو“ اب چلو، تمہیں ایک بڑھیا سالنچ  
 کراتا ہوں۔“ پھول مشارب کے ہاتھ میں تھمانے  
 کے بعد رو میل نے اسے لٹچ کی آفری تو وہ متذبذب  
 سی ہو گئی۔

”مگر رو میل! یہ میرے ڈیوٹی آورز ہیں۔ اور پہلے  
 سے دارالشفاء کے دو ڈاکٹر زیور ہیں۔ سو ایسے میں  
 میں تمہارے ساتھ کیسے چل سکتی ہوں۔“ اس کے  
 انکار پر رو میل کے چہرے کا رنگ تیزی سے بدلا تھا اور  
 پھر دوسرے ہی لمحے وہ اس کا ہاتھ تھام کر گھسیٹا ہوا باہر  
 لے آیا۔

”رو میل! برائی ٹوانڈر اسٹینڈی۔ میرا اس وقت  
 ڈیوٹی پو ہوتا ہے حد ضروری ہے۔“ وہ چلا کر رہ گئی۔  
 ”اوں ہوں! اس وقت تمہارا صرف میرے ساتھ  
 رہنا ہے حد ضروری ہے۔“ وہ اس کے انکار کو خاطر  
 میں نہ لاتے ہوئے بولا تھا۔ پھر گاڑی کا دروازہ کھول کر  
 اس کو فرنٹ سیٹ پر دھکیل دیا۔ مشارب ہاتھ مسل کر  
 رہ گئی۔

اور یوں چند لمحوں بعد ہی دارالشفاء کی حدوں سے  
 نکلیں کہ رو میل کی گاڑی سیاہ مارکول کی سڑک پر فل  
 اسپید سے بھاگنے لگی۔

”اب تم خودی لڑکی۔! تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“  
 گاڑی کے اندر بھائی خاموشی کو رو میل کی بھاری ٹواڑ  
 نے توڑا تھا اس کے سوال پر وہ طنزیہ انداز میں مسکرائی  
 تھی۔ وہ اچھی طرح سے جانتی تھی کہ وہ کس فیصلے کے  
 بارے میں استفسار کر رہا تھا مگر قصداً خاموش رہی۔  
 ”میں نے کچھ پوچھا ہے تم سے۔ مشارب! تم  
 نے میرے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟“ اسے  
 خاموش دیکھ کر اس نے دوبارہ استفسار کیا تو وہ تپ کر  
 بولی۔

”فیصلہ تو ہو چکا ہے رو میل۔ شاید تم جانتے نہیں  
 ہو میرے بابا۔ بڑے بابا کو انکار کر چکے ہیں۔“ مشارب  
 کے الفاظ رو میل کے چہرے پر پتھر کی طرح پڑے  
 تھے وہ ایک دم بھڑک اٹھا۔

”اوہ مشارب سلطان سلی گرل۔ بہتر تھا تم اپنا  
 فیصلہ بدل لیتیں۔ کچھ اور نہیں تو مجھے کم از کم یہ یقین  
 ہو جاتا کہ میں نے تمہیں خود سے محبت کرنے پر مجبور  
 کر دیا ہے۔ مگر خیر اب مجھے اس بات سے کوئی فرق  
 نہیں پڑتا کہ تم مجھے چاہتی ہو یا نہیں۔ تمہارا فیصلہ میں  
 سن چکا ہوں۔ اور اپنا فیصلہ میں تمہیں سن رہا ہوں  
 ۔“ اتنا کہہ کر رو میل نے ایک ساعت کے لیے  
 مشارب کے چہرے کی طرف دیکھا تھا جو زرد ہو رہا تھا۔  
 پھر اسی طرح اس کے چہرے کو اپنی نگاہوں کے حصار  
 میں لیے وہ مزید بولا تھا۔

”میں لندن سے پاکستان صرف اور صرف تمہارے  
 حصول کے لیے آیا ہوں۔ اور یہاں سے میں تمہیں  
 حاصل کرنے کے بعد ہی جاؤں گا۔“ وہ رو میل کے  
 ضدی لہجے پر خاموش رہ رہ سکی تھی۔

”رو میل! رو میل! اس وقت تم مجھے ایک نفسیاتی  
 کیس لگ رہے ہو۔“

”ہا۔ ہا۔ ہا!“ وہ اس کی بات پر قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔  
 ”لگ رہا ہوں کیا جان میں تو نفسیاتی کیس ہوں۔ اور  
 ابھی تم نے میری نفسیات کے کرشمے دیکھے ہی کہاں  
 نہیں۔ اس کے انداز میں کچھ تو ایسا تھا کہ مشارب لڑکے  
 اچھل گئے۔ بے ساختہ گردن موڑ کر کھڑکی سے باہر  
 سڑک کی طرف دیکھا پھر ہر اس انداز میں رو میل  
 ارسلان کی جانب دیکھنے لگی۔ جو کار ڈرائیو کرتے  
 ہوئے عجیب سے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اس کی  
 مسکراہٹ پر مشارب کا دل کسی خزاں رسیدہ پتے کی  
 طرح لرز اٹھا۔

”رو میل! ہم کہاں جا رہے ہیں۔“ اپنے اندر  
 اٹھتے والے اندیشے سے گھبرا کر وہ اس سے پوچھ گئی  
 تھی۔ مشارب کے لہجے میں چھپے خوف کو محسوس کر  
 کے رو میل کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

”رو میل۔ جواب دو؟“ اس کی خاموشی پر وہ چیخ  
 ہی تو پڑی۔

”جانم! اجلاؤ مت۔ جہاں بھی لے جا رہا ہوں۔  
 محبت کرنے کے لیے لے کر جا رہا ہوں۔“



”سٹ اپ ٹان سینس۔۔۔“ وہ اس کی بے ہودہ گفتگو سن کر دھیس انداز میں پہنچتی تھی۔

رومیل اس کے تھے تھے چہرے کو اپنی مسکراتی نظروں کے حصار میں لے کر غمیں گر بولا۔

”سوئیٹ بارٹ۔ اس وقت اس ڈرے سے روپ میں بھی اتنی خوب صورت لگ رہی ہو۔ اگر گالیاں بھی دوگی مجھے ہرگز برا نہیں لگے گا۔“

”تم اس حد تک گر سکتے ہو۔ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ کم از کم مجھے کڈنپ کرنے سے پہلے ایک لمحے کے لیے یہی سوچ لیا ہوتا کہ میں تمہارے ہی خاندان کی عزت ہوں۔“ وہ شاک کی کیفیت میں بولتی چلی گئی تھی مگر جب رکی تو رومیل نے ایک زبردست طمانچہ اس کے منہ پر دے مارا تھا۔

”اس پھپھر کو یاد رکھنا۔ اور آئندہ مجھ سے اس لمحے میں بات مت کرنا۔ کیونکہ جب تک تم میری محبت تمہیں۔ تب تک تو ٹھیک تھا۔ مگر اب اپنی اوقات میں رہا کرو۔ کیونکہ اب تم فقط رومیل ارسلان کی ضد ہو جسے حاصل کرنے کا عہد وہ خود سے کر چکا ہے۔ اور ماں زیادہ خوش فہم نہ ہونا مشارب سلطان ایک بار تمہارا زور توڑ دوں پھر میں یہ تک بھول جاؤں گا کہ تم میری زندگی میں کہاں پر ہو۔“ وہ تہایت ہی ٹھنڈے لہجے میں کہتے ہوئے اسے اپنی اوقات بتا گیا تھا۔

اور مشارب اپنے غل پر ہاتھ رکھے ساکت نظروں سے اپنے سامنے بیٹھے شخص کا چہرہ تک رہی تھی جو اس رومیل ارسلان سے لفظاً مختلف لگ رہا تھا جسے آج سے قبل وہ جانتی تھی۔

”رومیل پلیز مجھے معاف کر دو۔“ اس منٹ بعد اس کے ساکت وجود میں حرکت پیدا ہوئی تھی وہ اپنے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو بڑی۔ ہچکیوں سے روتے ہوئے وہ اس شخص کی منتیں کرنے لگی۔ جو اس کے بے بس روپ سے حفظ اٹھاتے ہوئے مسلسل قہقہے لگائے جا رہا تھا۔ بے تحاشا ہنسنے کی وجہ سے رومیل کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے جنہیں ڈیش بورڈ پر رکھے نشو بکس میں سے ایک نشو نکال کر وہ

بوپچھنے لگا۔ پھر بولا تو اس کا لہجہ طنز کی گرمی لیے ہوئے تھا۔

”کیوں ستارہی ہو یا ر۔۔۔ تمہارا یہ منت بھرا روپ مجھے برٹ کر رہا ہے۔ تم تو بس ضد کرتی آ کر دکھاتی ہی اچھی لگتی ہو۔ سو پلیز۔ یہ نازک سے ہاتھ جوڑ کر اپنے رومیل کو شرمندہ مت کرو۔“

”رومیل! تم پچھتاؤ گے۔ اور بہت پچھتاؤ گے۔“ رومیل کی اس درجہ کمینگی پر وہ بھڑک کر بولی تھی۔ ہونٹوں میں دبے سگریٹ کو آگ کا شعلہ دکھاتے ہوئے وہ اس کی بات پر زور سے ہنسا تھا۔

”تمہیں چاہ کر پچھتا رہا ہوں۔ اس کو تم کا کوئی مرہم نہیں ہے!“

”مشارب صاحبہ آپ کو چاہ کر جتنا پچھتا چکا ہوں وہی عمر بھر کے لیے کافی ہے۔“ سگریٹ کا کش لیتے ہوئے وہ بولا تو مشارب کے آنسو اور بھی تیزی سے بہنے لگے۔ مگر یہ اٹک اس وقت خشک ہو گئے تھے جب رومیل کی گاڑی ایک برے سے جنگلے گے گیٹ کے اندر داخل ہونے کے بعد رک گئی تھی۔

”چلو سوئیٹ اب شرماؤ نہیں باہر نکلو۔“ وہ اپنی سٹاپ چھوڑ کر اس کی طرف آیا تھا۔ پھر فرنٹ ڈور کھول کر اسے باہر کھینچا اور اسی طرح گھسیٹتے ہوئے وہ اسے ایک ہال نما کمرے میں لے آیا تھا۔ جہاں پر رومیل کے چار دوستوں کے ساتھ ساتھ قاضی صاحب بھی موجود تھے۔ اندر آنے کے بعد رومیل نے مشارب کو صوفہ پر دکھیل دیا اور پلٹ کر قاضی سے مخاطب ہوا۔

”بسم اللہ کیجئے قاضی صاحب۔“ رومیل کے منہ سے الفاظ کیا ادا ہوئے۔ مشارب کو اپنے پاؤں تلے زمین کھسکتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ سن ہوتے دماغ کے ساتھ ٹکر ٹکر رومیل شاہ کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ جہاں فاتحانہ مسکراہٹ کا رقص جاری تھا۔



گولڈن اینڈ میوون کلر کے کمبیشن والے



یاد آ رہا تھا جس کی مسکراہٹ مشارب کو بے حد عزیز تھی اور جو بھیگی آنکھوں کے ساتھ مسکراتے ہوئے بہت دلکش نظر آتا تھا۔

اس رات ڈاکٹر ایب کی شادی ایڈنڈ کرنے کے بعد رات چار بجے کی فلائٹ سے زرار کو ایک سیمینار کے سلسلے میں شہر سے باہر جانا پڑا تھا۔ اس لیے مشارب پر گزرنے والی اس قیامت سے وہ بے خبر تھے۔

گمراہیوں والی رات منزل نے بتایا تھا کہ پورے ایک ماہ کے بعد وہ شخص قصر سلطان لوٹ آیا ہے۔

یہ خبر سن کر وہ منال کا چہرہ ٹکنے لگی۔ مشارب ہمیشہ ایب کے لیے کسی اور کی ہونے جاری تھی یہ اطلاع سننے کے بعد زرار کے تاثرات کیا تھے۔ وہ یہ جاننا چاہتی تھی مگر اس شخص کے دل کی بات جاننا اتنا آسان کہاں تھا یہ ہی سوچتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگ کر رہ گئی تھیں۔



”ایڈنڈ اینڈ جینٹل مین پلیز دلسن فوہنر۔“  
تمام رسومات اور فوٹو سیشن سے فارغ ہونے کے بعد جب دلسن کے سچے سچے وجود کو لا کر رو میل کے پہلو میں بٹھایا گیا۔ تب بھاری آواز میں کی گئی دولہائی کاؤس منٹ نے اس وقت وہاں پر موجود تمام افراد کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ ان سب کو اپنی طرف دیکھا گیا۔  
گروہ مشارب کے پہلو سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔  
رو میل کے چہرے پر کھیلتی مسکراہٹ میں کچھ ایسا تھا کہ سب لوگ چونک کر رہ گئے۔

”اس سے پہلے کہ آپ سب اپنے اپنے کمروں میں چلے جائیں، میں اس رات کو یادگار بنانے کی خاطر اپنی نئی نویلی دلسن کو آپ سب کی موجودگی میں رونمائی کا گفت پیش کرنا چاہوں گا۔“ اس کی بات سن کر جہاں سب ہی کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی وہیں مشارب نے بھی شکر کا سانس لیا تھا پھر جھکی پلکیں ذرا سی اوپر کواٹھا میں اور رو میل کی جانب دیکھنے لگی۔  
جو آگے بڑھ کر سامنے میبل پر رکھا وہ پیکٹ اٹھا رہا

راجستھانی شرارہ سوٹ میں ڈھیر ساری بھاری جیولری اور فل میک اپ کے ساتھ دلسن بنی وہ نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت لگ رہی تھی۔ منال اور اسری تیار کرنے کے بعد ابھی کچھ دیر قبل ہی اسے اکیلا چھوڑ کر گئی تھیں۔

آج رو میل کے ساتھ اس کا دوبارہ نکاح ہونے جا رہا تھا۔ مشارب کی روح بین کر رہی تھی۔ اس کے دل میں نوے چل رہے تھے۔ مگر قصر سلطان کے لان میں ڈھولک بج رہی تھی۔ تیز تیز تالیاں پیٹتے ہوئے اس کی ساری کزنز شوخ گیت گارہی تھیں۔

سکستے لبوں کے سنگ دونوں ہتھیلیاں پھیلا کر اس نے جھٹ کی طرف دیکھا۔ وہ بے آواز انداز میں دعا مانگنے لگی۔

دعا مانگتے ہوئے اس نے رو میل شاہ کو بد دعا نہیں دی تھی مگر اپنے لیے روشنی کا استعارہ ضرور مانگ لیا۔ اس پاک ذات سے جہاں بھر کے سلطان سے مدد ضرور مانگ لی تھی۔ اس دن زبردستی نکاح نہ ہونے کے بعد رو میل اسے واپس قصر سلطان لے آیا تھا۔ وہ اپنے خیال میں مشارب کو قصر سلطان واپس لے آیا تھا مگر یہ رو میل کی بھول تھی۔ اس دن اس کے ساتھ مشارب کی لاش آئی تھی اور پھر اس کے بعد سب کچھ رو میل اور سلطان کی مرضی کے مطابق طے پایا تھا۔  
ارسلان صاحب نے اس کے بے حد اصرار کرنے پر سلطان شاہ سے دوبارہ مشارب کا رشتہ مانگا تھا اور ایک بار پھر رافعہ بیگم سلطان صاحب کے کہنے پر مشارب سے اس کی مرضی پوچھنے آئیں تو مشارب نے اس بار فرماں برداری سے اپنا سر جھکا دیا تھا۔ کیونکہ اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ مشارب کے ہاں کی دیر تھی قصر سلطان کے دروازے جیسے کھل گئے۔  
رو میل ایک ماہ کے اندر شادی کر کے واپس لندن جانا چاہتا تھا۔ اس وجہ سے سب کچھ بہت جلد طے پایا تھا۔ غلبت بھرے انداز میں شادی کی تمام تیاریاں مکمل کی گئی تھیں اور آج وہ دن آگیا تھا۔  
مگر آج جانے کیوں اسے وہ شخص بڑی شدت سے



تھا جو ابھی کچھ دیر قبل ہی اس نے اپنے بند روم سے منگوا یا تھا۔

”اس گفٹ کو اپنی کیوٹ سی دلہن کی خدمت میں پیش کرنے سے پہلے میں اسے آپ سب کے سامنے کھولنا چاہوں گا۔“ یہ کہہ کر روئیل نے ہاتھ میں موجود پیکٹ پر اپنا گفٹ پیر پھاڑ ڈالا تھا۔

اس کے ساتھ ہی کاؤچ پر دلہن بنی بیٹھی مشارب سلطان کی آنکھیں بھی پھٹ گئی تھیں۔ وہ سہکت نظروں سے روئیل کے ہاتھ میں موجود اپنی گولڈن کور والی ڈائری کو دیکھ رہی تھی۔

جس میں اس نے اپنے دل کی وہ تمام باتیں لکھ ڈالی تھیں جو آج تک کبھی کسی کے ساتھ سیر نہیں کی تھیں۔ اس نے تو اس حقیقت کو خود سے بھی چھپا کر رکھا تھا اور آج کیا ہو گیا تھا۔ روئیل کی آنکھوں سے نکلتے شعلوں کی پیش نے مشارب کا چہرہ زرد کر دیا تھا۔ آگے کیا ہونے والا تھا وہ اس کے لیے خود کو تیار کرنے لگی۔

”ارے ہماری مزے کے چہرے کا رنگ تو رونمائی کا گفٹ دیکھتے ہی اڑ گیا۔ کہیں آپ اس ڈائری کو پہچان نہیں گئیں؟“ اس کے چہرے کا رنگ اڑتا دیکھ کر وہ بڑے ہی استہزائیہ انداز میں ہنسا تھا پھر سب کے سوالیہ چہروں پر ایک سرسری نگاہ ڈال کر بولا۔

”خواتین و حضرات! آپ کو یہ جان کر یقیناً حیرت ہوگی کہ یہ ڈائری جو اس وقت میں مشارب کو گفٹ کر رہا ہوں یہ انہیں کی ہے۔“ روئیل نے ڈائری مشارب کی گود میں پھینکی تھی۔

”روئیل! یہ کیا بد تمیزی ہے؟“ اس کی اس حرکت پر ارسلان شاہ خاموش نہ رہ سکے تھے۔

”تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟“ انہوں نے اسے ہاتھ ہوئے انداز میں استفسار کیا تو وہ سرد لہجے میں یہ کہنا انہیں حیران کر گیا۔

”بابا! میں اپنا حساب برابر کر رہا ہوں۔ اور پلیز مجھے ڈسٹرب مت کیجئے۔“ اس کے اس جملے نے ارسلان صاحب کے ساتھ ساتھ شعیب اور سلطان

شاہ کے چہرے بھی سرخ کر ڈالے تھے۔ ضبط کی کوشش میں مٹھیاں بچھتے شعیب سلطان تلملا کر رہ گیا تھا۔

تب شعیب سلطان کی نظر سیاہ جینز شرٹ میں سیاہ شال کاندھوں پر ڈالے میڑھیوں کی رنگ تھامے کھڑے زرار پر پڑی تھی۔

وہ اس وقت روئیل کے تیز تیز بولنے کی آوازیں سن کر اپنے کمرے سے اٹھ کر نیچے آئے تھے۔ اور اب یہ تمام صورت حال دیکھ کر شدید کھڑے تھے۔

”ارے اچھا ہوا مسٹر زرار ارسلان! آپ آگئے، میں بھی بس آپ کو بلانے ہی والا تھا۔“ زرار کو میڑھیوں پر کھڑا دیکھ کر روئیل بڑے ڈرامائی انداز میں گویا ہوا تھا۔

اس کی بات پر سب کی طرح مشارب کی نظریں بھی زرار کی طرف اٹھی تھیں جو روئیل کی بات سن کر چونک گئے تھے۔

”کیا خیال ہے مسز اسب کو بتا دوں؟“ زرار شاہ کی طرف سے توجہ ہٹا کر وہ مشارب کی سمت پلٹا۔

جس کی حالت کا تو تو لہو نہیں جیسی تھی۔ وہ گھٹیا شخص آگے کیا کہنے والا تھا۔ وہ اچھی طرح سے جانتی تھی۔ سندی سے سچے اپنے مخروطی انگلیوں والے ہاتھ ملے ہوئے وہ اس پل شدت سے اپنی موت کی دعائیں مانگنے لگی۔

مگر نہ موت کو اس پر ترس آیا نہ ہی اس شخص کو وہ اس کے ہوائیاں اڑتے چہرے کو دیکھ کر اپنے دل میں عجیب سی تسکین اترتی محسوس کر رہا تھا۔ مگر جب بولا تو لہجہ کاٹ لیے ہوئے تھا۔

”ارے میں بھی کتنا پاگل ہوں۔ تم سے پوچھ رہا ہوں۔ بھلا تم کیسے کہو گی کہ میں یہ سب کچھ ان لوگوں کو بتا دوں۔ تمہیں تو شرم آئے گی نا۔ آخر تم دلہن ہو۔۔۔ چلو میں خود ہی سب کو بتا دیتا ہوں۔ لو کے۔؟“

یہ کہہ کر وہ لہجے بھر کے لیے رکا تھا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے اس نے وہ دھماکا کر دیا جس نے مشارب سلطان کے ساتھ زرار ارسلان کی ذات کے بھی پرچے اڑا



رومیل کے لب مسکرائے تھے۔ تب ساکت کھڑے  
ارسلان شاہ نے آگے بڑھ کر ایک زوردار تھپڑ اس  
کے منہ پر دے مارا تھا۔

”اگر تم نے ایک لفظ بھی اور کہا تو میں تمہیں شوٹ  
کردوں گا۔ ابھی اور اسی وقت قصر سلطان سے نکل  
جاؤ۔“ ان کا لہجہ بے لچک تھا۔ وہ بغیر چونکے ہنس پڑا۔  
پھر اسی طرح ہنستے ہوئے زہر خند لہجے میں بولا تھا۔

”چلا جاؤں گا۔“ چلا جاؤں گا قصر سلطان سے تو کیا  
میں یہ شہر یہ ملک بھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ مگر اپنا حساب  
چکنا کرنے کے بعد۔“ یہ کہتے ہوئے وہ ایک جھٹکے  
کے ساتھ پلٹا تھا اور مشارب کے دروہ جاکھڑا ہوا۔  
تب عوسی لباس میں کسی گڑیا کی طرح دکھتی مشارب  
سلطان کا دل سوکھے پتے کی مانند لرزاتا تھا۔ اس نے جھکی  
پلکیں اٹھا کر کہے ہوئے انداز سے سامنے کھڑے  
فخّص کی جانب دیکھا تھا۔ اور اس شخص کے بے تاثر  
چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کو اپنی سانسیں رکتی ہوئی  
محسوس ہوئی تھیں۔

”مشارب سلطان! تم نے مجھے بھینک کر کے جو  
تھپڑ میرے منہ پر مارا تھا۔ آج اسے ان میں الفاظ کی  
صورت میں تمہیں لوٹا رہا ہوں۔ میں رومیل  
ارسلان بقا کی ہوش و حواس مشارب سلطان کو۔“  
”رومیل۔۔۔ پلیزی۔۔۔ پلیزی ظلم مت کرو۔ میری  
ہن مرتا ہے۔“ باقی کے الفاظ ابھی رومیل کے منہ  
میں ہی تھے جب شعیب سلطان نے آگے بڑھ کر اس  
کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

قصر سلطان کے تمام افراد اس وقت ساکت کھڑے  
رومیل کو دیکھ رہے تھے جو شعیب شاہ کی اس حرکت پر  
لجھ بھر کے لیے تھم سا گیا تھا۔

مگر پھر دوسرے ہی بل وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے  
ذرا سا پیچھے ہٹا۔ مسکرایا اور بڑی سفاکی کے ساتھ  
الفاظ کھل کر گیا۔

”مشارب سلطان میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔  
طلاق دیتا ہوں۔“

”رومیل خبردار ایک اور لفظ آگے مت کہنا۔“

”آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ یہ ڈائری جو اس  
وقت ہماری مسز کی گود میں رکھی ہے اس میں انہوں  
نے لو اس آنکھوں والے جس شخص کی محبت کے  
راگ لاپے ہیں۔ وہ شخص میں یعنی رومیل ارسلان  
ہرگز نہیں۔“

”رومیل! گھٹیا انسان تمہاری یہ جرات کیسے ہوئی  
کہ تم مشارب جیسی معصوم لڑکی کے کردار پر کچھڑ  
اچھاؤ۔“

زرار پھرے انداز میں سیڑھیوں سے اتر کر اس  
تک پہنچے تھے اور اپنے دونوں ہاتھوں میں رومیل کا  
گریبان تھام لیا۔

”کام ڈاکن، بگ برادر کام ڈاکن۔“ رومیل اپنا  
گریبان دن کے ہاتھوں سے چھڑاتے ہوئے طنزیہ  
انداز میں ہنسا تھا۔ پھر زرار شاہ کے چہرے کو اپنی چبھتی  
نگاہوں کے حصار میں لیتے ہوئے بولا۔

”میں جانتا تھا آپ اپنے تعارف کے لیے خود ہی  
آگے بڑھیں گے۔ مجھے آپ کا نام لینے کی ضرورت  
نہیں پڑے گی۔ اشارہ ہی کافی ہے۔“ وہ منطقی سے  
ہنسا۔

”تلی ہوپ آپ سب لوگ جان گئے ہوں گے کہ  
میں تھوڑی دیر پہلے جس او اس آنکھوں والے شخص کا  
ذکر کر رہا تھا“ وہ کون ہے۔“ نارمل انداز میں اوا کیے گئے  
رومیل کے وہ الفاظ سی ایٹم بم کی طرح زرار ارسلان  
کی سماعتوں کے قریب پہنچے تھے۔

وہ اس انکشاف پر پتھی پتھی آنکھوں سے سرخ موڑ  
کر مشارب کی طرف دیکھنے لگے۔ آنسو بھری آنکھوں  
کے ساتھ وہ بھی ان کی طرف دیکھ رہی تھی نظریں  
ملنے پر مشارب کا بل چاہا تھا زمین پھٹے اور وہ اس میں  
سما جائے۔ اسے نظر میں جھکاتے دیکھ کر زرار کی  
آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں وہ بے یقین انداز میں  
سر ہلانے لگے۔

”کیا ہوا؟“ شائد ہو گئے یا خوشی کی وجہ سے قوت  
گویائی سلب ہو گئی مسر زرار صاحب۔۔۔؟“ تلخی سے



سے اس کا ہنسنا بولنا سب چھین لیا تھا وہ اپنے کمرے کی چار دیواری میں مقید ہو کر رہ گئی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے دارلشفا جانا تک چھوڑ رکھا تھا۔

بابا، بڑے بابا، ماما، شعیب لالہ، منال اور اسری سب ہی اس کا خیال رکھ رہے تھے، مگر ان سب کی محبتوں کے باوجود وہ خود کو سنبھال نہیں پا رہی تھی۔ رومیئل نے جس طرح اس کا ترشٹا بنایا تھا وہ دکھ اس کے اندر کو مار رہا تھا۔ مشارب حیران ہو کر سوچتی کیا محبت کرنے کی اتنی بڑی سزا ملنا کرتی ہے؟ جتنی بڑی سزا رومیئل شاہ نے اسے دی تھی۔

مشارب سلطان نے تو زرارہ ارسلان سے بہت پاکیزہ محبت کی تھی۔ جس کی خوشبو کو اس نے ہمیشہ اپنے سینے میں پھپھائے رکھا تھا۔ مگر ہوا کیا۔ اس کی محبت کی نیلامی سربازدار ہو گئی تھی۔ مشارب کو ابھی طرح یاد تھا۔

رومیئل کے انکشاف پر زرارہ شاہ نے کیسی نظموں سے اس کی جانب دیکھا تھا مشارب سلطان اس بل کٹ کر رہ گئی تھی۔ کتنی حیرت اور کیسا شاک بھرا تاثر تھا اس وقت اس شخص کی نگاہوں میں جیسے اسے اس بات پر یقین ہی نہ آیا ہو۔ اس دن کے بعد وہ زرارہ کے سامنے نہیں آئی تھی شاید اس میں اس شخص کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ مگر اس وقت وہ تڑپ کر رہ گئی جب اس واقعے کے صرف پانچ ماہ بعد ممانے اسے زرارہ ارسلان کے پیروزل کے بارے میں بتایا تھا۔ تب اس نے ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر انکار کر ڈالا تھا۔

”وہ شخص شاید ترس کھا کر مجھے اپنا نا چاہتا ہے۔ پر ماما! آپ اس کو بتا دیجئے گا کہ مشارب سلطان کو زرارہ ارسلان کی یہ بھیک نہیں چاہیے، ماما اس کا جواب سن کر رو پڑیں۔“

”نہیں میری جان تم غلط سمجھ رہی ہو۔ وہ تو اپنی خوشی سے تمہارا ہاتھ مانگ رہا ہے۔ اس نے خود ہی ارسلان بھائی سے کہا تھا ہم سے تمہارا رشتہ مانگنے کے لیے۔“

”ماما! میں دوبارہ کوئی رسک نہیں لینا چاہتی۔“

دور نہ میں تمہیں اپنی جائیداد سے عاق کر دوں گا۔“ ارسلان شاہ نے آخری حربے کے طور پر آگے بڑھ کر اسے دھمکی دی تھی۔

پر وہ ذرا بھی نہ گھبرایا تھا اور بڑی آسانی سے تیسری بار بھی وہ الفاظ ادا کر دیے تھے۔ جس نے مشارب سلطان کے نسوانی وقار کے پر خچے اڑا ڈالے تھے۔

”میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔ مشارب سلطان۔“ وہ بے یقینی میں گھری گھری رہ گئی تھی۔ وہاں موجود تمام نفوس کو سانپ سوکھ گیا تھا۔ جبکہ اپنا حساب بے باق کرنے کے بعد رومیئل ارسلان وہاں رکا نہیں تھا۔ پلٹ کر زرارہ شاہ کی ساکت نگاہوں میں جھانکتے ہوئے زہریلے انداز میں مسکرایا اور قصر سلطان کی حدوں سے نکلتا چلا گیا۔

اس کے وہاں سے جانے کے بعد چند ٹانھے وہ بت بنی کھڑی رہی تھی پھر جب دوبارہ اس کے وجود نے حرکت کی تھی۔ اس سے قبل کہ وہ چکر کر گرتی قریب کھڑے شعیب سلطان نے آنسو برسائی آنکھوں سمیت آگے بڑھ کر اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا تھا۔ کتنے ہی ان گنت موتی رافیعہ بیگم کی آنکھوں سے ٹوٹ گئے تھے۔ جبکہ سلطان صاحب دل پر ہاتھ رکھتے دوبارہ سے جا لگے تھے اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔

\*\*\*

کہتے ہیں وقت ہر زخم کا علاج ہوا کرتا ہے۔ مگر یہ وقت مشارب سلطان کے زخموں کا علاج نہ بن سکا تھا۔ اس حادثے کو گزرے آٹھ ماہ سے زائد عرصہ ہونے کو آیا تھا۔ مگر اب تک مشارب کے وہ زخم مندمل نہ ہو پائے تھے، جو رومیئل ارسلان اس کی روح پر سجا چکا تھا۔ اس رات اس کی زندگی میں تاریکیوں کی سیاہی گھول کر وہ خود ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لندن روانہ ہو گیا تھا۔

مشارب ماتھے پر طلاق کا کٹک سبائے قصر سلطان میں تھرا رہ گئی تھی۔ اس رات کی بد صورتی نے اس



رجنگل گارہا تھا۔ نیرس کی رینگ تھام کر وہ نیچے جھانکنے لگی۔

پورے لان کو چاندنی کی دل آویز روشنی نے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ مشارب نے سیل فون میں وقت دیکھا۔ رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ قصر سلطان کے مکین اس وقت نیند کی آغوش میں نحو خواب تھے۔

کچھ سوچ کر اس نے شعیب لالہ کا نمبر ڈائل کیا پھر ان سے بات کر کے بابا کی طبیعت کے بارے میں پوچھنے کے بعد مطمئن سی ہو کر وہ نظر اٹھا کر چاند کو جھنکنے لگی۔

ہو اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا ”بوا“ ایک اداس مسکراہٹ چمکتے چاند کی جانب اچھال کر وہ زرار شاہ کے بارے میں سوچنے لگی۔

اپنے اور ان کے بائین نکاح کے بندھن کا خیال آتے ہی مشارب کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ بمشکل بے ترتیب ہوتی دھڑکنوں کو سمجھاتی وہ چاند سے نظر ہٹا کر کارپورج پر نظرس دوڑانے لگی۔

دفعۃً ”بڑے بابا کی گاڑی کے پیچھے کھڑی زرار ارسلان کی بلیک پرائڈ پر نگاہ پڑتے ہی وہ حیران رہ گئی تھی۔

”ارے۔۔۔ یہ کب آئے دارالشفاء؟“ کچھ حیران سا ہو کر اس نے خود سے استفسار کیا تھا۔

ٹھیک اس وقت اس کے موبائل پر مسیج ٹون ہوئی تھی۔ مسیج دیکھ کر اس کے بعد وہ پڑھنے لگی۔

”آپ کو شادی کی بہت بہت مبارک ہو مسز

مشارب زرار! مٹھائی کب کھلا رہی ہیں۔ زرار ہیٹھو۔۔۔“

”ہونہ! بڑے آئے مبارک باد دینے والے“ مسیج پڑھ کر وہ بری طرح سے تپ گئی ”جانے خود کو کیا سمجھتے ہیں؟“ دھیرے سے بوڑھالی مشارب اس وقت چونک گئی تھی جب Hogo boss کی دلفریب ملک نے اس کے حواسوں کو جھکنا شروع کیا تھا۔

ہوا سے منتشر ہوتے بالوں کو ہاتھوں سے پیچھے کی طرف دھکیلاتی وہ سرعت سے چلی تھی اور اس کو شش

آپ پلیز بڑے بابا کو انکار کر دیجئے گا۔“ رافعہ شاہ کو اپنا آخری فیصلہ سناتے ہوئے کوئی چمک لگتی گنجائش اس کے کپے میں موجود نہیں تھی۔ رافعہ شاہ تب ناکام لوٹ گئی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد مشارب ایک طویل سانس کھینچتے ہوئے خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی تھی مگر شاید اطمینان و سکون نام کی کوئی چیز اس کے مقدر میں نہیں تھی۔

تب ہی تو اچانک وہ کچھ ہو گیا تھا جس نے اس کے سکون کو ایک بار پھر منتشر کر ڈالا تھا۔ ”مشارب نے زرار کے پرپوزل سے انکار کر دیا ہے یہ خبر سننے کے بعد سلطان شاہ کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ زرار انہیں اندھیرے میں روشنی کی کرن محسوس ہوا تھا۔ اور ایسے میں مشارب کا انکار سن کر وہ بری طرح سے ٹوٹ گئے تھے۔

\*\*\*

بابا کے ہارٹ اٹیک کی خبر مشارب پر چلی بن کر لگتی تھی۔ اس وقت بابا آئی سی یو میں تھے اور وہ شعیب لالہ کے سینے سے لگی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ دارالشفاء کے در و دیوار اس کی سسکیوں سے گونج اٹھے تھے اور پھر دسویں بج ہی بابا کے ہوش میں آنے کے بعد ان کی خواہش پر دارالشفاء کے لان میں سادگی کے ساتھ اس نے اپنے تمام حقوق زرار شاہ کے نام کر دیے تھے۔ نکاح نامے پر سائن کرنے کے بعد وہ روٹی سسکتی قصر سلطان واپس آ گئی تھی۔

شعیب لالہ اسے قصر سلطان پھونانے کے بعد خود واپس دارالشفاء لوٹ گئے تھے۔

مسلسل ذہنی تناؤ کے باعث وہ خود کو بہت تھکا سا محسوس کر رہی تھی۔ ذہنی انتشار کو کم کرنے کے لیے واش روم میں گھس گئی۔ گھنٹہ بھر ٹھنڈے پانی سے شاور لینے کے بعد بیڈ روم میں واپس آ کر ٹیلی بال سلجھائے پھر روپشہ شانوں پر پھیلا کر اپنا سیل اٹھایا اور نیرس پر آ گئی۔

چودھویں کا چاند پورے آب و تاب کے ساتھ افق



میں اس کے خوب صورت لمبے اسٹیمپ کٹ ہال جھٹکا کھا کر نازک سی پشت پر بکھر کر رہ گئے تھے۔

”یوٹی فل ....“ سٹائش کی زیادتی سے زرار ارسلان کے لب ہلے تھے۔ سفید رنگ کے کڑکڑاتے شلوار قمیص میں وہ دونوں بازو اپنے سینے پر باندھے اس سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑے مسکراتے تھے۔ ایک بل کو مشارب کی دھڑکنیں اس شخص کو اپنے رویہ رویہ کر چھم سی گئی تھیں۔ لڑتی پلکیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔

نظروں کے تصادم پر وہ مشارب کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دلکشی سے گویا ہوا۔

آنکھوں میں آؤں گا میں چاندنی لیے .... اس انتظار میں رات بھر جاگا تو مت کرو کہتے ہیں لوگ مجھ سے، تم ہو بھی بھیجی۔ یہ کیا غضب ہے عشق کو رسوا تو مت کرو۔ زرار ارسلان کی دلکش و بھاری آواز نے اسے ساکت کر دیا تھا۔ مگر جیسے ہی وہ شعر مکمل کر کے خاموش ہوئے مشارب نے وہاں سے جا بے کا قصد کیا اور قدم آگے کی جانب بڑھا دیے۔

”جیسٹ آمنٹ!“ وہ ان کے پاس سے گزر کر جانے لگی تھی جب زرار نے اس کی کلائی تھام لی۔ ”پلیز۔ مجھے جانے دیں۔“ ان کی جرات پر وہ دبے دبے انداز میں جی جی تھی۔

”اس طرح نہیں بلے مجھے مبارکباد دیں۔ آخر آپ کی طرح میرا بھی آج نکاح ہوا ہے۔“ وہ شوخ انداز میں فرمائش کر رہے تھے۔ مشارب ان کے شوخ انداز پر لہجہ بھر کے لیے ٹھنک گئی تھی۔ مگر پھر اگلے ہی لمحوں میں آکر زرار کی گرفت سے اپنی کلائی بچانے لگی۔

”چھوڑ دیں میرا ہاتھ ورنہ۔“ اپنی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد وہ پھر کر بولی تو وہ ہنس پڑے۔

”ورنہ کیا؟ اگر میں نے ہاتھ نہیں چھوڑا تو کیا شور مچا دو گی۔؟“ اس کے تپے تپے چہرے کو اپنی محفوظ نگاہوں کے حصار میں لیے وہ اس کی حالت سے حظ

اٹھاتے ہوئے بولے۔

وہ سر جھکا کر اپنے لب کاٹنے لگی اور اس ادا پر زرار کو اتنا پیار آیا کہ دھیرے سے مسکراتے انہوں نے مشارب کا ہاتھ اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔

تب گھنیر کی پلکیں جھپک کر وہ استعجابیہ انداز میں ان کی طرف دیکھنے لگی۔ اس معصوم سی لڑکی کو اپنی طرف دیکھتا پا کر زرار کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

ان کو مسکراتا دیکھ کر مشارب کی آنکھیں خواہ مخواہ جھپک گئیں۔

”آپ بہت خراب ہیں!“ وہ نروٹھے پن سے بولی تھی۔

”آئی ٹو!“ زرار نے جھٹ سے اعتراف کر لیا۔ وہ ان کے یوں فوراً ”مان جانے پر مطمئن نہ ہوئی تھی تب ہی اپنے دل کی بجائے بھڑاس نکالنے کی خاطر ایک دم بھڑک کر بولی۔

”خراب ہیں تو پھر یہاں کیوں آ گئے میرے پاس۔۔۔ جائیں جا کر اپنے کمرے میں چرا اپنی کو یاد کریں۔“ ”اومالی گڈ نیس۔“ مشارب کی بات پر زرار کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ انہیں اس کی خفگی کی وجہ اب سمجھ میں آئی تھی۔

”اوہ تو ڈاکٹر مشارب جیلس۔۔۔ بھی ہوتی ہیں؟“ اس کو چھیڑنے کی خاطر زرار نے لفظ جیلس کو خاصا کھینچا تھا۔ جس پر وہ حسب توقع چپ گئی تھی اور جب بولی تو کچھ غصے کی وجہ سے لرز رہا تھا۔

”فار یور کانڈ انفارمیشن مسٹر زرار ارسلان۔۔۔ میں معمولی لوگوں سے ہرگز جیلس نہیں ہوا کرتی۔“ بڑی صاف گوئی کے ساتھ وہ انہیں حیران کر گئی تھی۔

اور اس وقت زرار کا دل بے اختیار ہی نکاح کی طاقت پر ایمان لے آیا تھا۔ جس نے مختص چند گھنٹوں میں ان کے سامنے ہمیشہ ”سرسر“ کی رشتہ گائے رکھنے والی نروس سی لڑکی کو ایک دم سے شیرنی بنا ڈالا تھا۔ بہر حال جو بھی تھا مشارب کا یہ نیا روپ زرار شاہ کو اس وقت بہت اچھا لگ رہا تھا۔



# سوہنی ہیراں

## SOHNI HAIR OIL

- کرتے دے ہاتھوں کو روکتا ہے
- ۷۰ سال کا ہے
- ہاتھوں کو خشک اور چھلکا ہوا کرتا ہے
- مردوں، عورتوں، بچوں کے لئے
- یکساں منہ
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے



قیمت: 120/- روپے

سوہنی ہیراں 12 جی بوتلوں کا مرکب ہے جو اس کی بیماری کے مراحل بہت مشکل ہیں۔ یہ بخوبی مقدار میں تیار ہوتا ہے۔ یہ بازار میں یا کسی دوسرے شریعتی مندرجہ ذیل دکان میں بھی خرید جاسکتا ہے۔ ایک بوتل کی قیمت صرف 120/- روپے ہے۔ دوسرے شہروں کے لئے آؤر بھی کرر جنرل پارسل سے منگوائیں اور چٹری سے منگوائے والے لٹری آؤر اس حساب سے بھجوائیں۔

- 2 بوتلوں کے لئے 300/- روپے
- 3 بوتلوں کے لئے 400/- روپے
- 5 بوتلوں کے لئے 800/- روپے

نوٹ: اس میں ایک فری اور بیکٹک پارچ شامل ہیں۔

مٹی آلا بھیجے کے لئے ہمارا پتہ:

پوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، پیکٹور ہاؤس، ۱۷-۱۷ جٹا روڈ، کراچی

دعوتی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیراں آف ان جگہوں

سے حاصل کریں

پوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، پیکٹور ہاؤس، ۱۷-۱۷ جٹا روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی

فون نمبر: 32735021

عصہ کرتے ہوئے ہمارا یہ روپ زیادہ اپیل کر رہا ہے۔ ان کے گھبرہ لہجے پر وہ سر جھٹکا گئی تھی۔ اور اس کے بعد بڑی ہی معنی خیز خاموشی ان دونوں کے درمیان چھا گئی۔ رات کی رانی اور Hugo کی ملی جلی مک کو اپنی سانسوں میں اتارتے ہوئے وہ ایک نلک کھڑے اسے دیکھے جارہے تھے۔

وہ جو فرش پر گھنیری پلکیں جھکائے جانے کیا ڈھونڈ رہی تھی اس کی ناک میں بڑی ہنسی سی لوٹک رات کی چاندنی میں کچھ زیادہ ہی نکھر کر چمک رہی تھی۔ اور مشارب کی ناک میں بھی وہ لوٹک ہی تو تھی جو زرار کی توجہ کا مرکز بن گئی تھی۔

”میں کتاب زیست تمہارے سامنے کھول تو دوں مگر اسے کہاں سے پڑھنا شروع کروں...؟“ درمیان میں چھائی خاموشی کو زرار کی بھاری آواز نے توڑا تھا۔ وہ سر اٹھا کر ان کا چہرہ دیکھنے لگی جہاں اداسی ڈیر اڈال چکی تھی اسے اپنی جانب متلکا ہوا کہ وہ لمحہ بھر کو رک کر مسکرائے تھے پھر مزید گویا ہوئے۔

”وہاں سے جہاں حرا نے مجھے ٹھکرا دیا تھا۔ اور میں ٹوٹ کر رہ گیا تھا...؟ یا پھر وہاں سے سونے کی گائے جس نے حرا شاہ کے انکار کا دکھ اپنے سینے سے لگائے۔ میں اندر چلا گیا تھا۔ یا پھر وہاں سے؟ جس رات میں نے تمہیں پھینک مارا تھا اور تمام رات تمہارے آنسوؤں نے مجھے سونے نہیں دیا تھا۔ یا پھر وہاں سے جب۔ ڈاکٹر ادیب کی شاوی پر جانے سے قبل تم بلیک ساڑھی میں ملبوس، آنکھوں میں بلیو لہنسوز لگائے میرے سامنے آئی تھیں؟“

اس رات مشارب... میں تمام رات مضطرب رہا تھا۔ مجھے کیا چیز مضطرب کر رہی تھی میں جان نہیں پایا تھا بہر حال میں یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ وہ رات میری زندگی میں آنے والی پہلی رات تھی جب میں حرا شاہ کے علاوہ کسی دوسری لڑکی کو سوچ رہا تھا۔



ان انکشافات پر مشارب کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

یہ شخص بھی اسیر محبت تھا وہ اس سفر میں تشریف لے گئی تھی۔ اس پر شادی مرگ جیسی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ جبکہ وہ اس کی حالت سے بے نیاز کئے جا رہے تھے۔

”اس رات مشارب۔۔۔ اس رات میں نے آپ کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ پر جانے کیوں اس پل میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ رومیل ارسلان کو رجحکٹ کرنے والی ضدی لڑکی کے میرے بارے میں کیا خیالات ہوں گے۔“

اسی رات چار بجے کی فلائٹ سے مجھے ایک سپینار کے سلسلے میں ملک سے باہر جانا پڑا تھا۔۔۔ اور وہیں شعیب نے فون کر کے تمہاری اور رومیل کی شادی کی اطلاع دی تھی۔ اور اس دن میرا زبردست قسم کا نروس بریک ڈاؤن ہوتے ہوئے تھا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ مجھے دینار غیر میں ایک ماہ لٹ گیا تھا۔“

ان کی طبیعت کی نام سازی کا سن کر وہ متحیر ہو گئی تھی اور جانے اسے کیا ہوا کہ ایک دم سے رو پڑی۔  
”ارے“ اسے یوں زار و قطار روتے دیکھ کر وہ بوکھلا کر خاموش ہو گئے تھے۔

”آپ نے بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا ہم میں سے کسی کو۔ دینار غیر میں تشریف لے گئے تھے۔“ اس نے روتے ہوئے شکوہ کیا تو وہ اس کے انداز پر ہنس پڑے۔ انہیں ہنستے دیکھ کر مجھے سے گھورنے لگی۔

”آپ کتنے خراب بچے ہیں مجھے رو تا دیکھ کر ہنس رہے ہیں؟“ اس کی بات سن کر زرارہ کی ہنسی کو بریک لگے تھے۔ وہ فوراً اپنے کان پکڑ کر بولے۔

”سوری مسز اعلیٰ ہو گئی آج کے بعد آپ جناب کو روتے دیکھ کر میں بھی رونے لگوں گا۔ ٹھیک ہے؟“ وہ ان کے مسز کہنے پر پہلے ہی سرخ پڑ چکی تھی۔ اس لیے ان کی تائید لینے پر جھٹ سے سر ہلادیا تھا۔

اس کے پیچھے ہوئے انداز پر وہ مزہ لے کر مسکرائے پھر اپنی کڑکڑانی قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈال

کر انہوں نے وہ سونے کا برسلیٹ نکال لیا تھا جو آج شام کو ہی خریدا تھا۔

چھوٹے سے گلابی کیس کو کھول کر انہوں نے ڈائمنڈز سے مزین جگمگاتا برسلیٹ نکالتے ہوئے اجازت طلب نظروں سے مشارب کی جانب دیکھا تھا۔ وہ بھی اس وقت ان ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

نگاہوں کے تصادم پر ایک بہت ہی دلکش مسکراہٹ نے زرارہ ارسلان کے لبوں کو چھو لیا اور پھر بڑے ہی احتیاط کے ساتھ انہوں نے ہاتھ میں تھا برسلیٹ مشارب سلطان کی سنہری وناڈرک کلائی میں پکڑا دیا تھا۔

”اسے فی الحال میری طرف سے رونمائی کا تحفہ سمجھیں۔“ برسلیٹ پہنانے کے بعد زرارہ نے دھیمے سے سرکشی کی تو مشارب ان کی بات پر چھوٹے موٹے سے انداز میں مسکرا کر رہ گئی۔

تب اس کی پلکوں پہ نمی دیکھ کر زرارہ کو یاد آیا تھا کہ آج سے پہلے ایک ایسی ہی چاندنی رات میں ان کے دل نے اس لڑکی کے سارے آسوس و پیس کی خواہش کی تھی۔ مگر تب وہ اس خواہش کو اپنے دل میں دبا گئے تھے کیونکہ اس وقت زرارہ ارسلان ایسا کوئی حق نہیں رکھتے تھے۔

”لیکن آج وہ یہ خواہش دل میں دبا نہیں پائے تھے اور بڑے ہی اشتقاق کے ساتھ ہاتھ بڑھا کر انہوں نے مشارب سلطان کی پلکوں پہ چمکتے تمام آنسو اپنی انگلیوں کی پوروں میں سمیٹ لیے تھے۔ کیونکہ یہ وہ لڑکی تھی جو زرارہ ارسلان کے دل کے ٹوٹے شیشے جوڑنے کی خاطر اپنے ہاتھ زخمی کر رہی تھی۔“

مشارب اس پل کھل کر ہنس پڑی تھی اور وہ کیوں نہ ہنستی اس کا چاند اس کی چوکھٹ پر جو کھڑا تھا۔







## نوشین ناز اختر

### دوست

عاطف ہمارے گروپ فرینڈ نے گٹار پر ”منوارے“ کے گیت پر مزے کی دھن بجائی۔ لڑکوں نے باقاعدہ اٹھ کر ڈانس کیا۔ ہم لڑکیوں نے خوب ہونٹ کی۔ ایک یادگار بارلی کیو پارٹی کا اختتام ہوا۔ جاتے ہی سب نے اپنی اپنی تصاویر قمیص پک پر اپ لوڈ کیں۔ راتوں رات ایک دو سرے کی تصاویر سیر ہوئیں اور لائیک کی گئیں۔

\*\*\*

جنوری 2011ء

”مانو یا ر! بارلی کیو کا سوڈ ہو رہا ہے۔“  
”تم اپنی مصروفیت بتاؤ اسی ویک اینڈ پر کر لیں؟“  
”ہا جی کا فون آیا تھا اور باجی کا فنکشن ہو یا پارٹی میرے بغیر کیسے ہو سکتی تھی؟“  
”یاد رہی! آپ لیکسٹ ویک پر رکھ لیں۔ اس ویک اینڈ پر تو میری فرینڈ طوبی کی طرف بارلی کیو ہے۔“  
”جیسے ہی بقرعید گزری جس طرف سے بارلی کیو کی دعوت تھی۔ پھر بارلی کا ٹھہم بھی ضرور رکھتے تھے ہم لوگ۔ زیادہ تر جینز اور ٹاپ پہنتے تھے، ہم لوگ اس بار تو سردی بھی تھی تو لونگ کوٹ اور جینز کا ڈریس کوڈ طے ہوا تھا۔ ہم نے اس رات ٹھیک ٹھاک مڑا کیا۔ لڑکوں نے کباب سٹخ پر لگائے تھے جینڈ فین کے ذریعے آگ سلگائی جا رہی تھی۔ کئی بار آگ سلگانے میں آنکھوں سے پانی نکل پڑا، لیکن ہم اینڈو سٹخ کے شوق میں لگے ہی رہے۔ بہت بھوک بھی لگی، ہمیں ہم نے صبر کیا۔ بالآخر جب بارلی کیو تیار ہو گیا تو سب نے خوب مزے سے ڈنر کیا۔“



”کمال ہے باجی! پکنک پر تو ایسے ہی ہوتا ہے کھانا کھانے میں در سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔ ہم سب پکنک پر گئے ہوئے تھے۔ پروگرام تھا کہ سارا کھانا لکڑیوں پر پکایا جائے۔ آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ موسم بھی گرم تھا۔ اچھی خاصی کھانسی اور گرمی لگی، لیکن ہم سارے میز پر ان میز پر بن بھالی پکنک پر تھے اور مزا کر رہے تھے۔“

\*\*\*

مئی 2011ء

دیرائے کنارے کنارے ٹھنڈے پانی میں پاؤں ڈالے فریز ہونا بہت اچھا لگا۔ ہم نے وہاں لفٹنگ بھی کی تھی۔ وہیں لکڑیاں جمع کر کے ہم نے مچھلی کو مسالا لگا کر گرلڈ کیا۔ کچی پیٹن کھا کر بھی ہم سب خوش تھے۔ حالانکہ اس میں کچھ کچھ ہکے بھی تھے، لیکن اس کی بھی کس کو پروا تھی۔ ہم سیر کے لیے ٹاورن ایریاز آئے تھے۔ بچہ کے قریب نہ کر کھانا کھانے کا مزہ لیا اور تھا۔

\*\*\*

دسمبر 2011ء

ہماری یونیورسٹی کا ٹرپ تھا۔ تھر کے علاقوں میں جا کر ہم نے وہاں کے سائیکل پر ایک ڈاکو منڑی بھی بٹائی تھی۔ اپنی اسائنمنٹ کی ذمہ داری الگ، لیکن وہ جو ہم سب میں ایک ”پارٹی آل ٹائم“ کا فضا تھا۔ وہ ہر بار سامنے آکر ہم سے ویسے ہی کام کر داتا تھا۔ ڈاکو منڑی بھی بنتی رہی۔ ہم نے تھر کی ریلی ٹائٹ میں جون فار کیا۔ وہاں بھی کچے کچے کھانے کھائے، لیکن ”فن ٹائم“ تھا۔ کوئی پروا نہیں تھی۔ بہت مزا آیا۔ بہت ایڈونچر کیا لکڑیوں پر کچے کھانے کھا کر۔

\*\*\*

نمبر 2014ء

میری شادی کو تقریباً ”تین سال ہو چکے ہیں۔ بولی ورٹی اور کنوارے پن کی لائف ایک یادیں گر رہ گئی ہے۔ میری شادی باجی کے دیور سے ہوئی ہے۔ یہ ہماری لوپس اینج میسج ہے۔ حامد مجھ پر جان چھڑکتے ہیں۔ میرا پیارا سا ڈیڑھ سال کا بیٹا ہے۔ زندگی میں بس پیار ہے، کوئی مسئلہ نہیں ہے، لیکن ہمارے گھر کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ آج کل بہت اذیت

پکڑ چکا ہے۔

جیسے ہی سردی کا آغاز ہوا۔ گھر کے چولہوں سے گیس غائب ہو گئی تھی۔

”بھابھی چائے۔“ حامد کھانے کی میز پر بیٹھے چلا رہے تھے۔

”کہاں سے؟“ ”گیس ہی نہیں ہے۔“ باجی بولی تھیں۔

شاہان کے لیے دودھ گرم کرنا تھا۔ گیس غائب۔ ”کیا مصیبت ہے۔“ میں رو رہی ہو گئی تھی۔

”اف اللہ اتنی سردی ہے۔ کمینڈ نہیں چل رہا۔ مجھے نہا کر جانا ہے۔ میں آٹس سے لیٹ ہو رہا ہوں۔“

باجی کے میاں بے زاری سے بولے تھے۔

\*\*\*

کہتے ہی دن میری منہ جو بالینڈ سے آئی تھیں۔ سب کو غصہ کرتے، حکومت کو گالیاں دیتے دیکھتی اور سنتی رہی تھیں۔ وہ ہماری مائیں ماتھے پر ہل ڈال کر سنتی تھیں۔

”پاکستان میں رہنا کسی عذاب سے کم نہیں ہے۔ نہ بجلی ہے اور نہ ہی پانی اور اب گیس کا مسئلہ۔“ باجی غصے سے بڑبڑا رہی تھیں۔

دونوں وقت کھانا باہر سے آرہا تھا۔ کبھی کڑاہی آرڈر ہو رہی تھیں۔ کبھی رات میں پڑا برگر آرڈر ہو رہے تھے۔ ملازموں کو بھی یہ ہی کچھ کھانے کو ملتا تھا۔

میری سانس ٹن بڑے بڑے منہ بنا کر کھاتیں۔ ان کو ہانسنے کا مسئلہ ہوتا تھا۔ گھر کی کچی چپاتی کی کمی



شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔  
اول تو گیس آئی نہیں، اگر آجاتی تو شعلہ اس قدر کم  
ہوتا تھا کہ روٹی تو بے پراکڑ جاتی تھی۔ ہم سب بہت  
تنگ تھے۔ حکومت اور ملک کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔

\*\*\*

”میرا بس چلے تو ان سب حکمرانوں کو لائن میں کھڑا  
کر کے شوٹ کروں۔“ حامد کو ایک بار پھر کافی نہ ملنے کا  
دکھ غصے میں نکلا تھا۔

میری بڑی سہ جویاس بیٹھی تھیں۔ ایک دم میری  
جانب متوجہ ہوئی تھیں۔ غصے میں حامد تھے۔ الٹا  
سیدھا وہ بول رہے تھے اور جواب باجی نے مجھے دیکھ کر  
دیا تھا۔

”تم دونوں بے حد ناشکرے لوگ ہو۔ اللہ کو  
ناراض کرو گے۔“ وہ بولی تھیں۔  
”کیا ناشکری کی ہے ہم نے؟“ حامد بھی ان کے ہی  
بھائی تھے نا۔

”تم لوگوں نے ایک دن بھی ایسا گزارا جس دن ملک  
اور ملکی حالات کو برا بھلا نہ کہا ہو۔ یہ تمہارا ملک ہے نا۔  
تمہاری مٹی ہے اس کو برا بھلا کیسے کہتے ہو تم۔“ باجی  
نے بے حد زاری سے کہا تھا۔

”باجی! میں اس ملک کے سسٹم کو برا کہہ رہا ہوں۔“  
حامد نے اپنی صفائی پیش کی تھی۔

”سسٹم؟“ باجی بڑبڑاتی تھیں۔  
”سسٹم کیا؟ کیا تم اس سسٹم کا حصہ نہیں ہو؟ پاکستان  
برا ہے تو ہم ہی برے ہوئے نا؟“ باجی نے حق سے  
کہا۔

”بچو ایک اور قائد اعظم آگئے۔“ حامد نے ان کا  
مذاق اڑایا تھا۔

”حامد۔ قائد اعظم کا مقام کیا تھا اور کیا ہے تم کبھی  
محسوس نہ کر سکو گے، کیونکہ ہمیں بتانے اور سکھانے  
والوں نے ہمیں قربانی کی کہانی سنانے کے بجائے بس  
”لینے کی کہانی“ سنائی اور بتائی ہے۔“ باجی بے حد  
افسردہ تھیں۔

حامد کچھ شرمندہ سے ہو گئے تھے اور یہ شرمندگی  
پاکستان اور اس کے سسٹم کو برا کہنے پر نہ تھی بلکہ ان کی  
پروسیس باجی افسردہ ہو گئی تھیں۔ اس بات پر۔  
میں نے گہری سانس بھر کر دونوں بہن بھائی کو دیکھا  
تھا۔ ماحول میں ناراضی تھی۔

آج پھر دھوپ نہ نکلی تھی۔ میں بمشکل اپنے پیچے کو  
سلا کر باہر آئی۔ اخبار پکڑے پکڑے میں ڈاکنگ ٹیبل  
پر آئی تھی تھی۔ آج پھر ماہر سے ہاشتا آیا تھا۔ کیونکہ

حلوہ پوری باٹ باٹ میں نظر آ رہی تھی۔ یعنی گیس  
نہ تھی نہ تھی۔

”ہم چاند برہتے ہیں۔ بجلی پانی گیس سب غائب  
۔“ میرے دل میں حامد کا جملہ کھوتا تھا۔

”کیا چاند پر روزِ حلوہ پوری کا ناشتا مل جاتا ہے؟“  
اپنے دوسرے خیال پر خود ہی میرے چہرے پر  
مسکراہٹ در آئی تھی۔

اخبار کے پہلے صفحہ پر نظر ڈالتے ہی میری نظر جس  
خبر پر پڑی، میری ساری بھوک بھاپ بن کر اڑ گئی تھی۔  
تھر میں آج پھر آٹھ بچے بھوک سے مر گئے تھے۔

”بھوک“ وہ احساس ہے جو ہر انسان کو جانور بناتا  
ہے۔ اس لیے اس بھوک کو بھوکا نہ رکھو ورنہ کرائے  
کے جریمہ اس معاشرے میں اور بڑھ جائیں گے۔“  
مجھے برسوں پہلے اپنے استاد کی بات یاد آئی، جب  
ہم ڈاکو منڈی کے لیے شہر کے علاقوں میں وزٹ پر گئے  
تھے۔

یا اللہ معاف کر دے۔ اپنے ہی ملک میں لوگ  
بھوک سے مر رہے ہیں۔

میں نے گہری سانس بھری تھی۔ ایک نظر ٹیبل  
ڈال لی تھی۔ بریڈ، مکھن، جیم، شہد، سیب، مالٹے، جوس  
کھانا پھر باٹ باٹ میں حلوہ پوری رہی ہوئی تھی۔

اور میں جانتی تھی سب ناشتا کر کے نکلے تھے۔  
اپنی ”مرضی“ کا کھا کر لیکن ”شکر الحمد للہ“ کہہ کر اپنے  
نگے بجائے سب ”گیس کی عدم فراہمی“ اور ملک کو  
بھلا کہہ کر نکلے ہوں گے۔ گیس نہ ہونا ایسا تو تھا یا



خوراک کی قلت بڑا ایشو تھا؟ بھرے پیٹ جینا اور خالی پیٹ جینا۔ گھر کے کچے کھانے سے خالی پیٹ بھرنا بڑا مسئلہ یا پھر خالی پیٹ مرنا بڑا پر اہم تھا؟  
”پر اہم کہاں ہے؟“ جیسے ہی یہ سوچ آئی میرا دل ڈر گیا۔

آج پہلی بار میرا شکر اول اپنی ناشکری پر ڈرا تھا۔

\*\*\*

اتنے دن سے سورج نہ اٹھا تھا، مامی کپڑے دھوتی، ڈرائیو میں سکھا کر پھر اوپر والے پورشن میں صوفوں پر کرسیوں پر جگہ جگہ ڈال کر سکھائی۔ جراثیم سکھانا اور بھی مشکل ہو رہا تھا۔ جراثیم کی روز ضرورت ہوتی تھی اور جراثیم دنوں نہ سوکھتی تھیں۔ بہت مسئلہ ہوا تھا۔ کپڑے یہاں وہاں رلتے سوکھتے تھے۔

میں اپنے بیٹے کی جہاں لینے اور آئی تھی۔ ایک ایک کپڑا ماسی الٹ پلٹ کر رکھ رہی تھی۔ اس کی بیٹی کم نمی والے کپڑے کھڑی استری کر رہی تھی۔  
”کیسی ہو رشیدہ بی بی!“ میں نے ویسے ہی پوچھ لیا تھا۔

”اللہ وا بڑا شکر اے بابی جی!“ رشیدہ بی بی نے بڑے دل سے کہا تھا۔

اس کا اتنے دل سے شکر ادا کرنا مجھے متوجہ کر گیا تھا۔ شاید میری شرمندگی ابھی تازہ تھی اپنی ناشکری پر۔  
”رشیدہ تمہارے گھر گیس آتی ہے؟“ یہ بھی میں نے ایسے ہی پوچھ لیا۔

”بابی اسی گھر تھے میں دن جو گئے! آپ کے گھر کے لان سے سوکھی لکڑیاں لے کر جاتی ہوں درختوں کی وہ ہی جلاتے ہیں۔“

مجھے یاد آیا۔ واقعی رشیدہ تو بہت باقاعدگی سے لکڑیاں چن کر یا کاٹ کر لے جاتی تھی۔ ”تو تمہارے لکڑیوں پر کھانا پکا لیتی ہو روز؟“ میں نے بہت حیرت سے کہا۔

جولبا ”رشیدہ فہم کر بولی۔“ جیسے تنسی بار بی کیوں کر لہندے ہو۔

چلو بھربائی ہو تا تو میں ڈوب جاتی۔ رشیدہ جیسی ان پڑھ نے مجھے ایک آئینہ دکھا دیا تھا اور ایک نئی سوچ کا دروازہ کھول دیا تھا۔

ایڈوینچر۔۔۔ فن۔۔۔ پارٹی۔۔۔ موسم۔۔۔ پکنک کے نام پر ہم بست بار لکڑیاں جلا کر کھانا پکا لیتے ہیں۔ مڑا کرتے ہیں۔ اس مزے میں مرضی شامل ہوتی ہے۔ کبھی گلہ نہ کیا ہم نے اور آج۔ ہم ایک مسئلے، ایک پر اہم، ایک قوم بن کر فہم کرنے کے بجائے بس اپنا اپنا رونا لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ تیرے گھر کی گیس، میرے گھر کی گیس۔ تیرے علاقے کی بجلی، میرے علاقے کی بجلی۔ میرا درد، میری تکلیف۔ میرا مسئلہ ہے، ہم ایک قوم نہیں رہے۔ ہمیں بس اپنے مسائل نظر آتے ہیں۔ کہاں ہیں، کیسے ہیں۔ جائیں بھاڑ میں۔ ہم اپنی زبانوں کو ”ناشکری“ کے وار سے آلودہ کر چکے ہیں۔

تصور کاروشن پسند ہی کبھی دیکھ لینا چاہیے گھروں میں گیس کی قلت ہے، لیکن کارخانوں کو جو نہیں گھنٹے گیس مہیا کی جا رہی ہے۔ لوگوں کو روزگار مہیا ہے۔ جس دن سورج نہ نکلے اس دن ہمیں بڑی تکلیف ہوتی۔ زبان ناشکری سے آلودہ ہو جاتی ہے اور ہر دن سورج نکلتا ہے۔ روز دھوپ روشنی کے در آتا ہے۔ ہم نے کب اور کس دن شکر ادا کیا ہے؟ روز کپڑے کیسے سوکھ جاتے ہیں۔

اس روشنی کی حدت سے کتنا اناج ملتا ہے اور کتنے جراثیم مرتے ہیں، کتنی غذائیت حاصل ہوتی ہے، کتنے وٹامن ملتے ہیں۔ کبھی نہیں سوچا، نہ شکر ادا کیا۔ لیکن چند دن سورج نہ نکلے، کپڑے نہ سوکھیں۔ سردی نے حال بے حال کر دیا۔ تواف اف۔۔۔ ہائے ہائے۔ ہوئی ہوئی بڑا نکلتا ہے منہ سے۔

میرا دل شرمندگی کے بوجھ تلے دب کر رہ گیا ہے۔

\*\*\*

آج کا دن بہت اٹو کھا اور روشن ہے۔ حالانکہ دھند ابھی بھی باہر ہے۔ نیا سال، نیا جذبہ بھی لایا ہے میرے



ایسے

”میں نے سب کو بلا کر آج گھر میں کھانا بنایا ہے۔  
لکڑیوں پر روٹیاں رشیدہ نے بنا کر دی ہیں۔“  
کھانا بھی ایڈو سخر کی طرح پکایا گیا۔ بنا کسی کو محسوس  
کرائے میں نے باجی کے بچوں اور منڈ کے بچوں کو بھی  
انوالو کر لیا تھا۔ آج کی کوئنگ میں سب نے انجوائے کیا  
تھا اور آج گھر کا پکا کھا کر کوئی ناراض بھی نہیں تھا۔

\*\*\*

ہاسٹل میں اکثر میں مائیکرو ویو میں چائے بناتی تھی۔

کچھ دن تک جب تک گیمس کی فراہمی ممکن نہیں  
تھی۔ ہم آج کل پلنگ پر ہیں۔ میں نے کھلے دودھ کی  
چائے کے بجائے لی بیگ والی پی سب کو بنا کر دینی شروع  
کر دی۔ حامد کو چائے ملنے لگی ہے اب وہ کڑوے  
کڑوے بیان نہیں دیتے۔

”تم تو صبح رات کو کھڑی کپڑے کیوں استری کر رہی  
ہو۔ یہ کام ماسی کا ہے۔“ حامد نے مجھے اپنی بیگ استری  
کرتے دیکھ کر کہا۔ وہی دی پر کوئی فلم دیکھ رہے تھے۔  
”صبح ماسی کے آنے تک لائٹ نہیں ہوگی اور  
آپ کو صبح صبح جانا ہو گا تو مشکل ہو جائے گی۔“ میں  
نے رسالت سے کہا۔

”ایسے نہیں مشکل ہوگی؟“ حامد نے ماتھے پر ہل  
ڈال کر کہا۔

”کیسی مشکل حامد! ساری زندگی نہ تو لائٹ کا یہ  
شیڈول رہنا ہے اور نہ اتنی قلت کبھی تو وقت ٹھیک  
ہو گا نا۔ کبھی تو صبح سات بجے لائٹ آئے گی۔“ میں  
وقت بھر لگا کر ہسی۔

حامد نے مجھے ایسے دیکھا کہ جیسے میری ذہنی حالت  
خراب ہو گئی ہے۔

”تم رات کے بارہ بجے کپڑے استری کرنے پر  
خوش ہو؟“ حامد نے کڑے تیوروں سے کہا۔

”ہست۔۔۔“ میں نے جواباً ”بہت کو کھینچ کر کہا تھا۔  
تھوڑا سا لائڈ جسٹ تو کرنا پڑتا ہی ہے۔“

میرے اطمینان میں کوئی کمی نہ تھی۔  
”چلو۔“ ایک اور قائد اعظم آگئے ہمارے گھر۔  
حامد بڑبڑاتے باہر چلے گئے تھے۔

صبح جب میں انھی تو غیر معمولی چہل پہل تھی باہر۔  
آج اتوار کا دن تھا۔ عموماً ”سب لیٹ اٹھتے تھے لیکن  
باہر سب کی آوازوں کے ساتھ حامد کی آواز بھی نمایاں  
تھی۔“

میں اپنے بیٹے کو لیے باہر نکلی تو حیران کن منظر

دیکھنے لگا۔ حامد لکڑیوں پر چائے بنا رہے تھے۔ سب کو  
اندھے لٹ کر دیے جارہے تھے۔ ہر کوئی پاس  
کرسیاں، اسٹول ڈالے بائیں کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ  
ناشتا ہو رہا تھا۔

سب کے چہروں پر اکٹھے بیٹھنے کی خوشی تھی۔ سب  
بنا کسی دھویں کی تکلیف محسوس کیے قریب بیٹھے  
تھے۔

ہالینڈ سے آئے بچے ماہر شیٹ کی طرح بار بار  
لکڑیاں سلگا رہے تھے۔ مزہ تھا۔ خوشی تھی۔  
”حامد ایہ کیا ہے۔“ میں نے سوال کیا تھا۔  
”تم نے ہی تو کہا تھا۔ دو چار دن ایڈو سخر اور فن میں  
کر رہے ہیں۔“ حامد ہنس پڑے۔

”ہیں۔۔۔“ میں نے حیرت اور خوشی سے ان کو  
دیکھا۔

”ہاں بھئی۔“ وہ ہنس پڑے۔ ”اور بارہ پی کیو کرتے  
ہیں دوپہر میں تم قیہ کو مسالا لگاؤ۔“ حامد ہل مزے  
میں تھے۔

”کیا ایک اور قائد اعظم پیدا ہو گیا گھر میں؟“ میں  
نے مسکرا کر پوچھا۔

”پہلے ایک قوم تو بن جائیں۔ قائد بھی بن جائیں  
گے۔“ باجی میری منڈ بنے اگر لقمہ دیا تھا جواباً۔

ہم مینیوں کی ہسی گونج اٹھی۔

میں نے آسمان کی طرف دیکھا، آج بھی سورج  
نہیں نکلا تھا۔

لگتا ہے کچھ دنوں میں دھند چھٹ جائے گی۔  
کبھی دھند بھی سدا رہنے کے لیے پڑی ہے؟



میں کیوں کسی کا نہ ہو سکا

نگاہ میں ہے یہ منظر جو شام ہونے کا  
اشارہ ہے یہ سفر کے تمام ہونے کا

وہی فریب سا ہے صبح و شام ہونے کا

یہاں تو مجھ سے نہیں اب قیام ہونے کا

پھر ایک پل میں سب ہی کچھ لپیٹ میں آیا  
کیا گیا تھا بڑا اہتمام ہونے کا

نہیں ہے اس کے سوا کچھ حقیقتِ ہستی  
دیا گیا ہے نہ ہونے کو نام ہونے کا

مجھے تمام کی جانب سفر میں رکھا ہے  
خیال ہے جو مرے ناتمام ہونے کا

شکست دی ہے رخِ یار کی دکنے اسے  
جو دعوے دار تھا ماہِ تمام ہونے کا

نسیم آج کوئی یاد آ رہا ہے بہت  
سو آج مجھ سے نہیں کوئی کام ہونے کا  
نسیم سحر

میں یہ سوچتا ہوں کبھی کبھی  
کوئی خواب میں نے بنا نہیں  
کوئی چہرہ میں نے چنا نہیں  
کسی کی یاد کا کوئی پھول مجھ میں کھلا نہیں  
جسے ڈھونڈنا تھا وہ ہم نشین  
کسی انجس میں ملا نہیں  
میں یہ سوچتا ہوں کبھی کبھی

یہی میر و مہر، یہی کھکشاں، صدف دوستاں  
وہی گشتاں، وہی جانِ جاناں وہی دشمنوں کے  
میں درمیاں

وہی رستے وہی فاصلے، وہی زخمِ دل وہی نارسا  
میری زندگی، میری زندگی، میرے ساتھ ایسی زندگی  
جو ہوا ہے ساتھ میرے یہاں  
گردل کس کے ساتھ ہیں بیاں  
کوئی ہے یہاں

جو میری محبتوں کا قریب ہے  
میں کہوں بھی کیا

کہ وہی جو میرا حبیب ہے

مرے دل کے اتنا قریب ہے

کہ میں یہ سوچتا ہوں کبھی کبھی

سبھی زخمِ دل، سبھی دردِ جاں کو بھلا کے میں

کہ اپنی انا کو ملنے کے میں

آئے ڈھونڈوں

کبھی یہ میں کبھی خواب میں

کسی رستے کسی یاد میں

وہ ملے تو اس سے کہوں گا میں

مرے دوست میرے حبیب تو

ہے مری دعا

راہیں کر عطا مرا سوزِ غم، مری چشمِ دل

تو جو میرے دل کے قریب ہے

انہیں بخش دے

انہیں آہ دے انہیں راہ دے

انہیں دردِ غم کی پناہ دے

میرے دوست میرے حبیب تو

یہ بنا بھی دے

کہ میں کیوں کسی کا نہ ہو سکا

ڈاکٹر طاہر مسعود





یہ ڈر رہا ہوں کہ ایسے میں وہ نہ یاد آجائیں  
یہ کالی کالی گھٹائیں یہ اودی اودی ہوائیں

ہیں گرچہ اہل نظر کو بڑے بڑے دعوے  
کہیں وہ جلوہ نما ہو تو دیکھتے رہ جائیں  
اشعار مرے یوں تو زلمنے کے لیے ہیں  
کچھ شعر فقط ان کو سنانے کے لیے ہیں

وصال و ہجر کا ایسوں کے کچھ ٹکنا ہے  
کہ جا کے بھی جو نہ جائیں ادا کے بھی جو نہ آئیں  
اب یہ بھی نہیں ٹھیک کہ ہر درد مٹا دیں  
کچھ درد یکے سے لگانے کے لیے ہیں

کر میں تو کس سے کریں شوقِ نارسا کا گلہ  
رکیں تو پاؤں نہ مائیں، چلیں تو منہ کی کھائیں  
آنکھوں میں جو بھر لو گے تو کانٹے سے چھیں گے  
یہ خواب تو لوگوں پہ سجانے کے لیے ہیں

کچھ آدمی کو ہیں مجبوریاں بھی دنیا میں  
ارے وہ درد محبت سہی، تو کیا مر جائیں  
دیکھوں ترے ہاتھوں کو تو لگتا ہے ترے ہاتھ  
دل میں فقط دیپ جلانے کے لیے ہیں

نہ ختم ہو جو کبھی، وہ بھی داستاں ہوئی ختم  
چپک رہی ہیں ستاروں کی آنکھیں اب سو جائیں  
یہ علم کا سودا، یہ رسالے، یہ کتابیں  
اک شخص کی یادوں کو بھلانے کے لیے ہیں

خانشار اختر

فراق گودکپوری

## پڑھا کو

نئے نئے کالج میں داخل ہونے اور پڑھائی کے شوقین بننے والے بیٹے سے باپ نے پوچھا۔  
”رات تم کتنی دیر تک پڑھتے رہے؟“  
”میں نے رات دو بجے تک اسٹڈی کی۔“ بیٹے نے

شواری۔

”لیکن رات گیارہ بجے تو بجلی چلی گئی تھی۔“ باپ نے حیرت سے کہا۔  
”میں پڑھائی میں اتنا مگن تھا کہ مجھے بجلی کے آنے جانے کا پتا ہی نہیں چلا۔“ بیٹے نے جواب دیا۔

نمرہ جاوید: ہم اللہ پور

## پسند

ایک شخص اپنے دوست کو بتا رہا تھا کہ  
”مجھے ایک ایسی لڑکی مل گئی تھی جو بالکل میری ہی کی طرح تھی۔ شکل و صورت، عادات و اطوار بالکل وہی جتنی کہ کھانا بھی اسی کی طرح پکاتی تھی۔ اسی نے اسے پسند کیا اور کہا کہ۔“

”اے اتنی اچھی لڑکی ہاتھ سے نہ جانے پائے۔“

”گویا تم نے چپ چاپ شادی کر لی، مجھے بتایا تک نہیں۔“ دوست نے شکوہ کیا۔  
”نہیں یار! اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔“  
”وہ کیوں؟“

”یہاں نے کہا ایسی بد صورت، بد سلیقہ اور بد تمیز لڑکی سے شادی کرو گے تو میری طرح تمہاری بھی زندگی جہنم بن جائے گی۔“

سیدہ نسبت زہرا۔ کمبوڑپکا

## جنت کا ٹکٹ

ایک دھوکے باز شخص نے یہ مشہور کر دیا کہ جو شخص اسے ایک ہزار دے گا وہ اسے جنت کا ٹکٹ دے گا۔ جواب میں لوگوں نے اس سے بے تحاشا ٹکٹ خریدے۔

ایک دن وہ اپنے کمرے میں نوٹ سجائے اپنی دولت کا حساب کر رہا تھا کہ کھڑکی سے ایک شخص اندر داخل ہوا اور ریو الوور نکال کر بولا۔

”خبردار! ساری دولت میرے حوالے کر دو ورنہ۔“

”اگر تم نے مجھے لوٹا تو یاد رکھو، سیدہ جہنم میں جاؤ گے۔“

دھوکے باز نے چلا کر کہا۔  
”ناممکن۔“ وہ شخص مسکرا کر بولا۔ ”میں پہلے ہی تم سے جنت کا ٹکٹ خرید رکھا ہے۔“

نسبت سفید۔ کمبوڑپکا

## دونوں کے صنم خاکی

صابر کرایہ دار کرایہ ادا نہ کرتا تھا۔ مالک مکان مرزا اسد نے بہت زور مارا، مگر صابر ٹس سے مس نہ ہوا۔  
مالک مکان مرزا اسد صاحب نے عاجز آ کر ایک ترکیب سوچی، بند لٹافے میں اپنی چھوٹی پکی کی ایک تصویر بھیجی جس پر لکھا تھا۔

”رہم کیوں چاہیے اس کی وجہ؟“

تیسرے دن مرزا اسد کو ایک خط کرایہ دار صابر کا ملا جس میں ایک حسین اداکارہ کی تصویر تھی نیچے لکھا تھا۔

”رہم کیوں نہیں ملتی اس کی وجہ؟“



سیدہ نسبت زہرا۔ کروڑپکا

### فوج اور عورت

ایک فرانسیسی جرنیل کی ملاقات پیرس کی ایک مشہور اداکارہ سے ہوئی۔ جرنیل نے بڑے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”کیا آپ کو خبر ہے کہ جتنا فرانسیسی فوج کا خرچ ہے اس سے دگنا فرانس کی عورتوں کا ہے۔“

اداکارہ بولی۔  
”یہ تو ایسی تعجب کی بات نہیں، جتنے فرانسیسی فوج کے کارنامے ہیں اس سے دگنے فرانس کی عورتوں کے کارنامے ہیں۔“

گزیا شاہ۔ کروڑپکا

### ذوق تماشا

چرچل کے ایک مداح نے ایک بار بڑی عقیدت سے پوچھا۔

”آپ یہ دیکھ کر خوش تو بہت ہوتے ہوں گے کہ جب بھی آپ تقریر کرنے کھڑے ہوتے ہیں تو ہال کچھ بھرج رہا ہے۔“

”ہاں سرت تو ہوتی ہے، مگر ہمیشہ ہی خیال آتا ہے کہ اگر تقریر کے بجائے پھانسی پر لٹکایا جا رہا ہو تا تو خلقت تین گنا زیادہ ہوتی۔“

سیدہ نسبت زہرا۔ کروڑپکا

### قابل دید

دو رہنماؤں دوستوں کا قریبی شہر میں صبح سویرے انٹرویو تھا۔ شہر سے تقریباً ایک کلومیٹر پہلے ہی گاڑی خراب

ہو گئی۔ دونوں شہر کی طرف پیدل چلنے لگے اتفاق سے دونوں کے پاس گھڑیاں نہیں تھیں کہ ٹائم معلوم کر سکیں انھوں نے سائیکل پر سوار ایک اویٹر عمر گوالے پر نظر پڑی جو سرودھ بچ کر واپس گاؤں آ رہے تھے دونوں نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

”بزرگوار! ٹائم کیا ہوا ہے؟“

بزرگوار سائیکل سے نیچے اترے پھر اپنے دونوں بازو نیچے کی طرف کرتے ہوئے جھنجھوڑنے لگے۔  
دونوں دست حیرانی سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے ان کے دونوں بازوؤں میں گھڑیاں تھیں جنہیں موصوف نیچے لانے کی کوشش کر رہے تھے جب گھڑیاں نکلیں تو آگئیں تو پھر انہوں نے اپنا چشمہ آنکھوں پر لگایا اور ٹائم جاننے لگے پہلے انہوں نے اپنے دائیں ہاتھ والی گھڑی کی طرف دیکھا اور بولے۔

”بیٹا! چھ سات آٹھ آٹھ چار بیٹا آٹھ بج کر آٹھ بج کر۔“

پھر بائیں ہاتھ والی گھڑی پر نظر دوڑائی اور کہا۔  
”بیٹا آٹھ بج کر چالیس پینتالیس پچاس ہاں بیٹا! آٹھ بج کر پچاس منٹ ہو گئے ہیں۔ بیٹا! آٹھ ذرا جلدی ہے میں اجازت چاہتا ہوں۔“

”مگر بزرگوار! مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ نے گھنٹہ دائیں ہاتھ والی گھڑی اور منٹ بائیں ہاتھ والی گھڑی سے کیوں جانے ہیں؟“

”بیٹا! کیا بتاؤں؟ دائیں ہاتھ والی گھڑی پر منٹوں کی اور بائیں ہاتھ والی گھڑی پر گھنٹے کی سوئی نہیں ہے۔“



### دعائے صحت

نبیلہ عزیز کی پھوپھی جو ان کے لیے ماں کی طرح ہیں۔ شہید علالت کا شکار ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے ان کی صحت کاملہ کے لیے دعا گو ہیں۔

قارئین سے بھی دعا کی درخواست ہے

# شاہ شہزادہ آلہ خوار

تیسرے بیٹے نے ان دونوں سے اختلاف کیا۔  
 ”وہ درخت تو بھولوں سے بھرا ہوا تھا اور اس کی  
 ایک دور دور تک آدھی تھی اور یہ کہ اس سے  
 طبعی منظر میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔“  
 سب سے جھوٹے بیٹے نے اپنے سب بڑے  
 بھائیوں سے اتفاق ظاہر کیا کہ ”وہ ناشپاتی کا  
 درخت تو پھل سے لدا ہوا تھا اور اس پھل کے بونہ  
 سے درخت زمین سے لگا زندگی سے بھرپور نظر  
 آ رہا تھا۔“

یہ سب بیٹوں کے بعد اس آدمی نے مسکرا کر اپنے  
 چاروں بیٹوں کی جانب دیکھا اور کہا ”تم چاروں  
 میں سے کوئی بھی غلط نہیں کہہ رہا۔ سب اپنی اپنی  
 جگہ درست ہیں۔“

بیٹے باپ کا جواب سن کر بہت حیران ہوئے  
 کہ اس کی طرح ممکن ہے۔ باپ نے اپنی بات  
 جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”تم کسی بھی درخت کو یا شخص کو صرف ایک موسم  
 یا حالت میں دیکھ کر کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ انسان  
 کبھی کسی کیفیت میں ہوتا ہے کبھی کسی کیفیت میں۔  
 اگر درخت کو تم نے جڑ سے کے موسم میں بے رونق  
 دیکھا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس پر کبھی  
 پھل نہیں آئے گا۔ اسی طرح اگر کسی شخص کو تم لوگ  
 غصے کی حالت میں دیکھ رہے ہو تو اس کا مطلب یہ  
 ہے کہ وہ برا ہی ہوگا۔ کبھی بھی جلد بازی میں  
 کوئی فیصلہ نہ کرو۔ جب تک اچھی طرح کسی کو جانچ  
 نہ لو۔“

قوموں کی ترقی،

نادر شاہ نے جب دلی پر قبضہ کیا تو اسے باغی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عامرؓ سے روایت ہے  
 کہ ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں  
 حاضر ہوا اور عرض کیا ”میرے والد نے طیرا سارا مال لے  
 لیا ہے تو آپ نے فرمایا۔“

”اور طیرا مال تیرے باپ کا ہے اور۔“  
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے۔  
 ”تمہاری اولاد تمہاری بہترین کمائی میں  
 ہے اس لیے ان کے مال سے کھالیا کرو۔“  
 (مسند احمد)

ہر گز کر فیصلہ کرو،

ایک آدمی کے چار بیٹے تھے۔ اس نے اپنے  
 بیٹوں کو سفر بردار کرنے کا فیصلہ کیا اور دو درواز  
 علاقے میں ناشپاتی کا ایک درخت دیکھنے کے لیے  
 بھیجا۔

باری بادی سب کا سفر شروع ہوا۔  
 پہلا بیٹا سردی کے موسم میں گیا۔ دوسرا بہار  
 میں آئسٹرا گرمی کے موسم میں اور سب سے چھوٹا بیٹا  
 خزاں کے موسم میں گیا۔ جب سب بیٹے اپنا اپنا  
 سفر ختم کر کے واپس لوٹ آئے تو اس آدمی نے  
 اپنے چاروں بیٹوں کو ایک ساتھ طلب کیا اور  
 سب سے ان کے سفر کی الگ الگ تفصیل لے لی۔

پہلا بیٹا جو جڑ سے کے موسم میں اس درخت  
 کو دیکھنے گیا، اس نے کہا ”وہ درخت بہت بد صورت  
 جھکا ہوا اور ٹھیک سا تھا۔“

دوسرے بیٹے نے کہا ”نہیں وہ درخت تو بہت  
 برا بھرا تھا۔ ہرے ہرے پتوں سے بھرا ہوا۔“



ہے۔  
حجاج: ”بھئی! یہ بڑا ہی لذیذ اور اچھا کھانا ہے۔“  
اعرابی: ”تو تو رتے کھانا اچھا بنایا ہے اور نہ“

ہی یہ باورچی کے ہاتھوں کا کمال ہے، بلکہ صحت و  
عافیت نے اس کی لذت کو دو بالا کیا ہے۔ اگر صحت و  
عافیت نہ ہو تو پھر کوئی لذیذ سے لذیذ کھانا بھی اچھا  
نہیں لگتا۔ اے حجاج! میں تجھے اور تیرے کھانے  
کو چھوڑتا ہوں، تو مجھے میرے رب کے ساتھ چھوڑ  
دے۔“

یہ کہہ کر اعرابی چل پڑا اور حجاج کے ساتھ کھانا  
سنادل نہ کیا۔

(سُنبرے اوراق سے انتخاب)  
صدف عمران - کراچی

### ردِ عمل

ہم اپنی زندگی اپنے خود ساختہ خیالات اور  
رجحانات سے خرمیتے ہیں۔ اور باقی کے دکھ  
ان سب کا ردِ عمل ہیں۔

### یلوم

کوئی لمحہ واپس نہیں آتا۔ کوئی دن دوبارہ نہیں  
آتا۔ یلوم بیدارش یلوم دھمال دوبارہ آتا ہے  
پھر کسی یوم کو منانے کا قصود غنود طلب ہے۔  
(واصف علی واصف)

### کامیاب

جس شخص کے یوی نہجے اُس سے راضی ہوں اُس  
کی دُنیا کامیاب ہے اور جس کے ماں باپ راضی  
ہوں اُس کا دین کامیاب ہے۔  
مددِ یحیٰ نو دینِ جہک - برنالی

### راہ کے دیپ

طویل دوستی کا ایک ہی راز ہے۔ دوست کی  
خامیوں کو نظر انداز کرتے رہیے۔ کیونکہ آپ  
کے حوالے سے وہ بھی تو ایسا کر رہا ہے۔

کی سواری پیش کی گئی۔ ہاتھی پر بیٹھ کر اس نے مہادت  
سے کہا: ”اس کی لگام میرے ہاتھ میں دے دو۔“  
مہادت نے عرض کی: ”حضور! اس کی لگام نہیں ہوتی“

بلکہ یہ میرے اشارے پر چلتا ہے۔“ نادر شاہ یہ سن کر  
ہاتھی سے اترا آیا اور کہنے لگا۔  
”میں ایسی سواری پر نہیں بیٹھتا جس کی لگام کسی  
اور کے ہاتھ میں ہو۔“

### حجاج اور اعرابی کا مکالمہ

سید بن عروہ کا بیان ہے۔  
حجاج بن یوسف ایک مرتبہ مکہ مکرمہ جا رہا تھا۔  
راستے میں پڑاؤ ڈالا۔ اس نے اپنے دربان سے کہا۔  
”دیکھو! اگر کوئی اعرابی (بدو) نظر آئے تو اسے لاؤ  
تاکہ وہ میرے ساتھ کھانے میں شریک ہو سکے۔“  
حجاج کی یہ عادت تھی کہ جب کھانے پر بیٹھتا تو  
لاڈلا کسی دوسرے شخص کو بھی دسترخوان پر ساتھ بٹھاتا۔  
دربان کی نگاہ ایک اعرابی پر پڑی جو دو چلوں  
پیٹھے ہوئے تھا۔ اس نے اعرابی کو مخاطب کر کے کہا۔  
”گورنر کی دعوت قبول کرو۔“

جب اعرابی حجاج کے پاس آیا تو حجاج نے کہا۔  
”غریب آؤ اور میرے ساتھ کھانا تناول کرو۔“  
اعرابی: ”مجھے اس بستی نے دعوت دے رکھی  
ہے جو تجھ سے بہتر ہے۔“

حجاج: ”کوئی ہے وہ بستی؟“  
اعرابی: ”اللہ عزوجل نے مجھے روزہ رکھنے کی  
دعوت دی ہے۔ سو میں روزے سے ہوں۔“

حجاج: ”اس شدید گرمی میں روزہ؟“  
اعرابی: ”جی ہاں، میں نے اُس دن کے لیے روزہ  
رکھا ہوا ہے جو اس سے کئی گنا زیادہ گرم ہوگا۔“

حجاج: ”چلو آج کھاؤ، کل روزہ رکھ لینا۔“  
اعرابی: ”نہجہ بر تعجب ہے اے حجاج! کیا کل  
تک میری زندگی کا تو صائم ہو سکتا ہے؟“

حجاج: ”یہ تو میرے بس میں نہیں ہے۔“  
اعرابی: ”پھر تو کیوں آج کا عمل کل پر ڈالنے کی  
بات کر رہا ہے جس کا اختیار ہی تیرے پاس نہیں

نا بیٹا ہو چکے تھے۔ غماز کے لیے گھر سے نکل رہے تھے۔  
دو غلاموں کے کندھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے آستہ آستہ  
چلتے ہوئے مسجد کی طرف جا رہے تھے۔ اس آدمی  
نے کہا۔

”میں مسافر ہوں اور زادراہ ختم ہو گیا ہے۔ مدد  
کا طالب ہوں۔“  
عرب نے اپنے دونوں ہاتھ غلاموں کے کندھوں  
سے ملے اور بائیں ہاتھ کو دائیں ہاتھ پر زور سے  
مار کر کہنے لگے۔

”عرب نے اپنا تمام مال و دولت تو خرچ کر دیا  
ہے مگر یہ دونوں غلام باقی ہیں۔ تم ان کو لے جاؤ۔“  
کہنے کے بعد آہستہ دیوار کا سہارا لے کر لے  
ٹولے ہوئے مسجد کی طرف چل دیے۔

### پیاری باتیں

انسان پریشانیوں کی گنتی کرنے کا ماہر ہے۔  
لیکن نعمتوں کا حساب رکھنا بھول جاتا ہے۔  
دنیا کے ہر میدان میں ہرجیت ہوتی ہے لیکن  
اخلاق میں کبھی کبھار اولئیکریٹس بھی جیت نہیں  
ہوتی۔

اچھے انسان کی نشانی یہ ہے کہ وہ اس شخص سے  
بھی اچھا سلوک کرتا ہے جس سے اسے کسی قسم  
کا فائدہ پہنچنے کی امید نہیں ہوتی۔  
زندگی صرف کا ایک ٹکڑا ہے جو ہر لمحے پگھل  
رہی ہے۔

ایمان کا کمال جی خلق ہے۔  
نور عبد السلام۔ نواب شاہ



رشتے غلوں کے ہوں یا محنت کے، بالآخر  
لوٹ جلتے ہیں۔ خواہ کتنے ہی مضبوط ہوں  
ہمیشہ ذرا سے شک یا معمولی بدگمانی انہیں

نفرت میں بدل دیتی ہے۔ پھر اعتماد، محراب

مان کیسا؟  
سو طرح کے بھول چو، سو طرح کے رنگ دیکھو،  
خوشبو و ہی عادی ہوگی جو بہتر ہے، رنگ  
نہی غالب آئے گا جو حقیقی ہے۔

رومان زندگی کی کتاب کا ایک ورق ہو  
سکتا ہے مگر پوری کتاب نہیں اور یہ سیاہ  
ورق۔ پوری زندگی کی کتاب بن جاتا ہے  
جسے نہ بھاڑنا ممکن ہوتا ہے نہ چھپانا۔  
گزشتہ شاہ۔ کھر وڑپکا

### سچ یہ بھی کہ...

انسان بھول کی مانند ہے جسے توڑا جاسکتا  
ہے، ٹونگھا جاسکتا ہے، مسکایا جاسکتا ہے  
مگر سمجھا نہیں جاسکتا۔

زندگی کے سفر میں کہیں بھی جانے سے پہلے اس  
دفتر سے جگہ نہ سچ راستے سے پلٹنا کوشش ہے  
بہت کم۔

انسان جو گفت گویاں لیے بھی رہتا جاتا ہے  
تاکہ سنا لے جیسے مذاق کو درد گزرد کر سکے۔  
انسان کے بارے میں غم اور ساری مہیتیں صرف  
خواہشوں کے باعث ظہور میں آتی ہیں۔

آپ کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ آپ کی شخصیت  
کو ظاہر کرتا ہے۔  
سیدہ نسبت نہرا۔ کھر وڑپکا

### سخاوت

عرب اسی کی سخاوت مشہور تھی۔ اس بات  
کو ثابت کرنے کے لیے ان کا ایک عقیدت مند ان  
کے پاس پہنچا اور سوال کیا۔  
نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ عرب بوڑھے تھے۔



# نکالت کی کہیں سے نکال کا مکتبہ

مدد بخدا خان لاہور —————  
 ذرا سی بات کرنے کا سلیقہ سیکھ لو تم بھی  
 ادھر تم بات کرتے ہو، اصرار لوٹ جاتا ہے  
 صنوبر رنگ راولپنڈی —————  
 ہم پرندے ہیں نہ مقتول ہوا میں پھر بھی لے دوست  
 کسی روز، کسی دکھ پہ اکٹھے روئیں  
 شمرہ کاظمی کراچی —————  
 چاہیے اک نگاہ شوق ورنہ بسا طوہر ہر برا  
 میری غلش کے زرخ کیا، میری زرب کے دام کیا  
 زینب خان کراچی —————  
 میری ہر شے درد کا سن کر وہ لفظ لفظ  
 گویا ہونے لگے یہ شام و سحر کے ہیں  
 امیر اکرم حیدر آباد —————  
 لفظ کہنے والوں کا کچھ نہیں جاتا  
 لفظ سننے والے کمال کرتے ہیں  
 یسری علی چکوال —————  
 داستان غم ہونے والی ہے  
 تم میسری آخری محبت ہو  
 فریال منصور پشاور —————  
 صبح کے تخت نشیں شام کے غم بھرنے  
 ہم نے ہل بھر میں نصیحوں کو بد لے دیکھا  
 مریم اکبر ملتان —————  
 عمر رواں پھر کبھی نہ مسکرائی بچپن کی طرح  
 میں نے گریا بھی خریدی، کھلونے بھی لے کے دیکھے  
 حنی بیگ کراچی —————  
 ہم اپنے عہد میں جس بانگین سے زندہ ہیں  
 اسے ہم اہل محبت کا حوصلہ کہتے

علیہ معدہ کراچی —————  
 عکس بے نقش ہو گئے امجد  
 لوگ پھر آئینوں کے ڈر میں ہیں  
 سندھ آصف شیخوپورہ —————  
 گزر گیا کبھی ایسا بھی وقت مجھ جی  
 کہ ہم بھی روز کے وہ بھی مسکرائے گئے  
 رخسانہ جمیل لیاری —————  
 ہر چوٹ ابھری جاتی ہے ہر زخم برا ہو جاتا ہے  
 تدت میں جب کوئی ملتا ہے غم اور سوا ہو جاتا ہے  
 علینہ احمد نواب شاہ —————  
 دامن ملے کسی کا تو جی بھر کے روئے  
 مٹی میں آنسوؤں کو ملانا گناہ ہے  
 سعدیہ کفیل راولپنڈی —————  
 وہی روشنی کے نقیب ہیں وہی تیرگی کے دقیب ہیں  
 شب آگئی تیری راہ میں جو جراح ہم نے جلا دیے  
 بینش اسد گوجرانوالہ —————  
 نہیں پتھر نہیں محمد پر دیکھتے انگارے برساؤ  
 میرا جرم یہ ہے کہ میں دوشی کا ساتھ دیتا ہوں  
 روبینہ حنیف کراچی —————  
 کئی اودا ہل طلب ملے مجھے راہ شوق میں غم قدم  
 جنہیں کر رہا تھا تلاش میں وہی لوگ مجھ کو ملے ہیں  
 عالیہ وحید پشاور —————  
 شاید کبھی تو دیکھے گا وہ تم کو جھانک کر  
 اس کی نگاہ میں روز تماشا کیا کرو  
 اسامہ شفیق پٹنہ دہلی —————  
 ایک تم غریب نے صبح طرب کے نام پر  
 اپنا دیا بچا لیا، سب کے دیے بچا دیے

نادیہ سرور  
گم صم سی رہتی ہوں اب اُسے کہنا  
وہ کشادگی سی لڑکی اب لوٹ گئی ہے  
ملاقات

عراق ریشی  
سودا بے عمر بھرکا، کوئی کھیل تو نہیں  
اے چشم مارا مجھ کو ذرا سوچنے تو دے  
اُس حرف "تکن" کی ایک امانت ہے میری پاس  
لیکن یہ کائنات تجھے بولنے تو دے

سعدیہ حسام طود  
قیامت چنیز منظر گو ہزاروں ہم نے دیکھے ہیں  
جودل پہ لڑتی ہے وہ قیامت اور ہوتی ہے  
آمنہ حسین

شہزاد پور  
وہ محبتوں کی کہانیاں جو غبار بن کے بکھر گئیں  
انہیں بالیکاں نہ سمجھا انہی سے جہان غم کا حال ہے  
نورہ اقرا  
نہ چھڑاے نہکت باد بھاری راہ نگ اپنی  
تجھے آنکھیں لیاں سوچیں ہیں ہم بے ناز بنے ہیں  
شنا عبد القیوم

شب غم کی سحر نہیں ہوتی  
ہو بھی تو میرے گھر نہیں ہوتی  
زندگی تو بھی مختصر ہو جا  
شب غم مختصر نہیں ہوتی  
نورہ عزیز

پھر یوں ہوا کہ کسی کی تلاش میں  
پھر یوں ہوا کہ خود کو بھی نہ پائے تمام عمر  
پھر یوں ہوا کہ اور نہ کسی کے ہوسکے  
پھر یوں ہوا کہ وعدے نبھائے تمام عمر  
نورین مسکان سرور

سلیقہ عشق میں میرا، کمال کا تھا  
کہ اختیار بھی دل پر عجیب مثال کا تھا  
محبتوں میں، میں قائل تھی لب نہ کھٹنے کی  
جواب درد مرے پاس ہر سوال کا تھا



# دکن

ماہنامہ  
مئی 2015 کا شمارہ شائع ہو گیا

- "بیاد محمود ریاض"
- "ماں تراض ہو جائے تو" شاہین رشید کا
- "ماں" کے حوالے سے خصوصی مردے
- اداکارہ "ماہنامہ جہانگیر" سے شاہین رشید کی
- ملاقات
- اداکارہ "ماروا" کہتی ہیں "میری بھی سنیہ"
- "آواز کی دنیا سے" اس ماہمہان میں "لہنا شاہ"
- اس ماہ "سکروہ امین کومل" کے "مقابلہ ہے آئینہ"
- "ایک ساغر سے زندہ گئی" فیر سید کا ناول اپنے انداز میں
- "دہائے وفا" فرحمن اختر کا سلسلے وار ناول
- "سب گمان نہیں یقین ہوں" نیلا بریدی کا ناول
- "خام مسکراتے رنگ" مریم عزیز کا ناول
- "شید" فاخر کی کا ناول
- "خالا، صالا اور اوپر والا" فاخر کی دلچسپ حوا میں تحریر
- صدف آصف، راشدہ رفعت، عزہ خالد، آجے کول، نگار فاخر اور
- طوبی حسن کے افسانے اور مستقل سلسلے

اس شمارے کے ساتھ دکن کتاب

اپار، چٹائی، ملاوا اور دکن کی ترقی پزیر شمشیر کرن کتاب

"جشن خاریہ"

کرن کے ہر شمارے کے ساتھ ملجھ دے مفت پیش خدمت ہے





## فیصل قریشی

”کیسے ہیں جی۔۔۔ بڑی مشکل سے ہاتھ آتے ہیں؟“

”جی الحمد للہ۔ بس کیا کریں۔۔۔ مصروفیات ہی ماشاء اللہ کسی سے بات کرنے کا وقت نہیں دیتیں۔“

”حال ہی میں آپ کا سیریل ”قرار“ ختم ہوا۔ ”عشق پرست“ آف آیر ہے اور جیت کا دم بھی۔ سب سے زیادہ کیا پسند کیا جا رہا ہے؟“

”یہ مجھے پر اللہ کا خاص کرم ہے کہ میں نے جس کام میں بھی ہاتھ ڈالا اس نے مجھے کامیابیاں عطا کیں۔۔۔ اداکاری میں سنجیدہ اداکاری ہو یا کامیڈی۔ مارننگ شو یا کوئز ٹائپ کے پروگرام۔۔۔ تو اللہ کا شکر ہے کہ جس روپ میں چھٹی اسکرین پر کامیاب رہا اور میرے

## دستک دستک دستک

### شایین رشید

یونہی لاہور کی کئی ایسی چیزیں ہیں جو یہاں کراچی میں نہیں ملتیں تو پھر انہیں ضرور کھانا ہوں اور ہاں ابھی کبھار سالوں میں ایک آدھ بار ایسا کروار مل جائے جس میں مجھے مونا نظر آتا ہو تو پھر کردار کی خاطر تھوڑی بے اعتیاطی کر لیتا ہوں۔“

”گو یا ایسی کھانے پسند ہیں؟“

”جی۔۔۔ ایسی کھانوں کا بہت شوقین ہوں۔“

”مارننگ شو کا تجربہ کیسا رہا۔ کافی مقبول رہا آپ کا مارننگ شو؟“

”بہت اچھا۔۔۔ بہت سیکھا ہے میں نے اور اگر آپ نے میرے مارننگ شو دیکھے ہوں تو آپ کو خود بھی اندازہ ہوا ہو گا کہ میرا مارننگ شو دیگر شووز سے کافی مختلف ہوتا تھا اور اسی لیے کافی پسند کیا جاتا تھا۔“

چاہے والے کا طریقہ نے مجھے پسند کیا۔“

”ماشاء اللہ جسے کئی سال ہو گئے“ آپ کو اس فیلڈ میں میرے خیال سے تینیس چوبیس سال تو ہو ہی گئے ہوں گے۔ فریش اور نو جوان نظر آنے کا کیا راز ہے؟“

”بستے ہوئے۔۔۔“ اپنے آپ کو اچھا دیکھنے کے لیے اور فیلڈ میں ”ان“ رہنے کے لیے بہت ضروری ہے کہ آپ اسمارٹ ہوں۔ اس لیے میں ڈانٹنگ بھی کرتا ہوں اور ایکسرسائز بھی۔ ڈانٹنگ کا طریقہ یہ ہے کہ پانی اور جو سز کا استعمال زیادہ کرتا ہوں۔ ڈائٹ بھی ہو جاتی ہے اور فریش بھی رہتا ہوں۔“

”اتنا خیال رکھتے ہیں اپنا۔۔۔ کبھی بے احتیاطی کرنے کو بھی تو دل چاہتا ہو گا یا مار دیا ہے اپنے دل کو؟“

”ارے نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ جب لاہور جاتا ہوں تو تھوڑی بے احتیاطی کرنے کو دل چاہتا ہے“

سے باہر بہت تعریف سننے کو ملتی ہے مگر گھر میں میری بیگم اور میری ماں تنقید کرتی رہتی ہیں، چونکہ انی خود اس فیلڈ سے وابستہ ہیں تو وہ بہترین تنقید کرتی ہیں اور ان سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ جب انی شوق سے میرا ڈراما دیکھتی ہیں تو مجھے اندازہ ہو جاتا ہے کہ میں نے اچھا پروگرام کیا ہے۔

”ہوں۔ اب تو خیر آپ خود بھی بہت اچھی ڈائریکشن کر سکتے ہیں تو کیا فیوچر میں اس جانب آنے کا کوئی ارادہ ہے۔“

”ہاں تو بہت چاہتا ہے، مگر میرے مخلص لوگوں کا مشورہ ہے کہ میں اداکاری تک محدود رہوں۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ اگر میں ڈائریکشن کی طرف آ گیا تو پھر وہ مجھے اسکرین پر نہیں دیکھ سکیں گے۔“

”اوہ اچھا۔ فارغ اوقات میں کیا کرتے ہیں؟“  
”فلمیں دیکھنا اور ان پر ٹیسٹس کرنا میرا فارغ وقت کا مشغلہ ہے۔“

”ہوں۔ چلیں پھر بات کریں گے۔“

\*\*\*

### بلال قریشی

”کیسے ہیں بلال قریشی؟“

”جی۔ آپ سنا میں۔“

”شادی مبارک ہو، کب ہوئی؟“

”خیر مبارک 14 فروری 2015ء کو ہوئی

ہے شادی، ہم نے شادی اور ریلیشنش ڈے ایک ساتھ منایا۔“

”اور میرے خیال میں ہمیشہ ایک ساتھ ہی منائیں گے؟“

”یقیناً۔ خیال کیا۔ سچ میں منائیں گے۔“

”ان شاء اللہ۔ ”بندھن“ کے لیے آپ کا انٹرویو

چاہیے ہو گا تو میں گے؟“

”یقیناً تو دینے کو تیار ہوں، مگر ہماری بیگم نہیں دیں

گی۔“

”جی جی۔ بالکل ناچ گانا اور شادی بیاہ سے محفوظ تھا اور گانوں میں بھی آپ نے نئی آوازوں کے درمیان مقابلے کرائے۔“

”میں نے جب مارننگ شو کرنے کی ہامی بھری تھی تو یہ بات واضح کر دی تھی کہ نہ شادی بیاہ کے پروگرام ہوں گے۔ نہ ناچ گانا ہو گا اور نہ ہی انڈین فلموں اور اداکاروں کا بہت زیادہ ذکر ہو گا اور الحمد للہ میں نے زیادہ سے زیادہ اپنے پاکستان کی بات کی تو پروگرام بہت پسند کیا جاتا تھا اور ہمیں بہت اچھا فیڈ بیک بھی ملتا۔ ایسے پروگرام جو ساری دنیا میں دیکھے جاتے ہیں، ان میں ہمیں اپنے پاکستان کی بات کرنی چاہیے۔“

”ویسے مارننگ شو کرنا آسان کام ہے یا مشکل؟“  
”ہر وہ کام آسان ہوتا ہے جس کو آپ دل سے کریں اور نئے نئے پروگرام کرنے سے نئے نئے تجربات میں اضافہ ہوتا ہے اور مجھے مارننگ شو کر کے بہت اچھا لگا اور بہت کچھ سیکھنے کا موقع بھی ملا۔ بہت سے نئے لوگوں سے ملاقات ہوئی، کچھ ملکی مسائل، کچھ ممبر شری مسائل پر بات ہوتی تھی، تھوڑی تفریح۔ تو اچھا تجربہ ہمارا مارننگ شو کرنے کا۔“

”مارننگ شو کرنے کی وجہ سے آپ اداکاری سے تھوڑے دور ہو گئے تھے۔ شاید وقت کی کمی کی وجہ سے؟“

”ہو لوگ مجھے اداکاری میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے اس بات کو بہت محسوس کیا اور تھوڑا احساس مجھے بھی ہوا۔ لیکن یہ بات سب جانتے ہیں کہ میں تھوڑا چوڑی ہوں۔ اچھے کام کو اچھے رول کو ترجیح دیتا ہوں اور اپنے پسندیدہ کردار کے لیے وقت بھی

نکال ہی لیتا ہوں۔ جیسے ”بشر مومن“ کا کردار بہت مختلف تھا میرے اب تک کیے گئے کرداروں میں۔“  
”آپ کو تعریف سننے کی اتنی عادت ہو گئی ہو گی کہ شاید اب آپ تنقید برداشت نہیں کر پاتے ہوں گے؟“

”ارے نہیں، ایسا کچھ نہیں اور یہ سچ ہے کہ گھر



”کیوں؟“  
”میں شاید انٹرویو دینے میں دلچسپی نہیں ہے، بس اسی لیے نہیں دیں گی، سو رہی۔“  
بلال قریشی کی بیگم بھی معروف فنکار ہیں۔ ”عروسہ قریشی“ ان کا نام ہے۔ ان شاء اللہ دیگر سلسلوں کے لیے ان کا انٹرویو ضرور کریں گے۔

”ڈراما۔ مکمل ہونے کے بعد اس کے تین ایرے آنے کا انتظار کرتے ہیں کیا؟“

”بالکل کرتا ہوں، ایسا نہیں ہے کہ ڈراما مکمل ہوا اور مجھے اطمینان ہو گیا کہ چٹو میرا کام تو ہو گیا، اب جب بھی آن ایرے میں نہ صرف آن ایرے ہونے کا انتظار کرتا ہوں، بلکہ آخری قسط تک اپنا کام دیکھتا ہوں۔“

”فیڈ بیک کس طرح ملتا ہے، پریس کے ذریعے یا میل ملاقات سے؟“

”اب فیڈ بیک کا ذریعہ ملنا تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اس کے لیے پریس تو ہے ہی، مگر اب فیس بک اور انٹرنیٹ نے بھی کام آسان کر دیا ہے اور اب تو لوگ بھی بہت صاف گو ہو گئے ہیں، جو چیز نا اچھی لگتی ہے اس کو کھلے دل سے بیان کر دیتے ہیں اور جو چیز بری لگے اس کے بارے میں بھی بتا دیتے ہیں۔“

”ٹھکانی کی صورت میں الزام کس کو دیتے ہیں؟“

”کسی کو نہیں۔ سب کا حصہ ہوتا ہے ڈراما ایک میم ورک ہو رہا ہے، کسی ایک کی وجہ سے کبھی سیریل ناکام نہیں ہوتا۔“

”اسکرپٹ دیکھتے ہیں یا صرف اپنا کردار دیکھتے ہیں۔“

”میں پورے اسکرپٹ کا مطالعہ کرتا ہوں اور جب تک پورا اسکرپٹ پڑھ نہ لوں مجھے اطمینان حاصل نہیں ہوتا، پھر اپنے کردار کا مطالعہ کرتا ہوں جو خود کو اچھا لگتا ہے، کچھ کرنے کی گنجائش ہوتی ہے تو پھر ہائی بھرنا ہوں، ورنہ انکار کر دیتا ہوں۔“

”ایک اداکار کا پڑھا لکھا ہونا کتنا ضروری ہے؟“

”کتنا ضروری ہے؟ میں تو کہتا ہوں کہ بہت ضروری

ہے۔ ایک پڑھا لکھا انسان ہی ہر بات کو بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے۔ اب ہماری ڈراما انڈسٹری ترقی ہی اسی وجہ سے کر رہی ہے کہ اس فیلڈ میں پڑھے لکھے لوگ آگئے ہیں۔“

”صرف اداکاری کا شوق ہے یا کچھ اور بھی کرنے کا شوق اور ارادہ ہے؟“

”کرنے کا ارادہ تو بہت کچھ ہے، مگر اب تک جو کر چکا ہوں اس میں اداکاری کے علاوہ ہوسٹنگ بھی ہے، میں پی ٹی وی کے لیے اور اے ٹی وی کے لیے ہوسٹنگ کر چکا ہوں۔“

”گھر والے خوش ہیں آپ کے اس فیلڈ میں آنے سے؟“

”بہت خوش ہیں اور میرے گھر والوں نے ہمیشہ سے ہمیں فری ہینڈ دیا ہے کہ اپنا فیوچر خود بناؤ اور ایسی تربیت کی کہ ہم سب سیلف میڈ ہیں اور میرے خیال میں جو سیلف میڈ ہوتے ہیں پھر وہی ترقی بھی کرتے ہیں اور جب میں اس فیلڈ میں آیا تو گھر والوں نے مجھے سپورٹ کیا اور بھرپور طریقے سے کیا۔“

”فنکار کتنے بھی کردار کر لیں، پھر بھی کسی ایک کردار کو کرنے کی خواہش رہتی ہی ہے تو؟“

”بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ واقعی میری بھی ایک کردار کرنے کی خواہش ہے اور وہ کردار فوجی اور سپاہی کا ہے بہت خواہش ہے کہ یہ رول ملے۔“

”اور کس کردار کو کرنے میں بہت ایزنی فیل کرتے ہیں؟“

”تمہارے۔“ آپ نہیں کی۔ مجھے رومینٹک رول کرنے میں بہت مزہ آتا ہے کیونکہ یہ ہی کردار تو انسان کی شخصیت کے قریب ہوتا ہے۔“

”اچھا۔ پھر تو آج کل۔۔۔ چلیں چھوڑیں۔۔۔ ان شاء اللہ آپ کے نئے سیریلز آنے پر بات کریں گے۔“

”لو کے جی۔۔۔“



اتنی روانی مسلسل پرستی اور شائستگی بھری ہوتی ہے آپ کی کہانی میں کہ ایک بار شروع کر کے چھوڑنے کو دل نہیں کرتا "کلی بار" پڑھتے پڑھتے کل کھانا لیت بنایا میں نے۔ اتنا مزہ آتا ہے نا آپ کو پڑھتے ہوئے یوں جیسے کوئی جھڑاگر رہا ہے الفاظ کا اور میں بھی بھے چلی جا رہی ہوں اور آخر میں یہ سوچ "ارے! ختم بھی ہو گیا" اس ناول کی سب سے مزے کی چیز وہ گائے تھیں جو بالیماں نے سنائے۔ خصوصاً

"میں نے رات کو خواب سنا ہے" نے ایسا گد گد لایا کہ مزا آئی۔ فجر کا کروار بہت اچھا لگا۔ جنگ مگر حساس، آسید جی! آپ کے کرداروں کی یہی خاصیت بہت بھاتی ہے کہ وہ بچے کے بے اور جنگ کردار کے مالک ہوتے ہیں۔ فجر اور لاڈلی جنگ کی تمہارے بہت مزہ دیا اور اثر کیسا گھٹا لگا۔ اسی ہی۔ زمین پر زمین کی "مسکرائی ہے زندگی" تھوڑی روایتی، ہلکی پھلکی کہانی اچھی تھی۔ زمین! کیا آپ کے بال آپ بھی پہلے جیسے موئے ہیں؟ میں نے آپ کی تصویر دیکھی تھی۔ دو چوٹیاں، لمبے بال۔

مازیہ کنول نازی! سب سے پہلے آپ کو شادی کی مبارکباد۔ "شہر خواب" اچھا ناول تھا۔ افسانے اس بار سب ٹھیک ٹھیک ہی لگے۔

آپ کو پتا ہے آج کیم اپریل ہے اور آج پورا تیرہ ماہ میں دنوں بعد میرا دن خوشیوں سے بھرپور گزرا۔ بہت سے خوشگوار اور انزوائے۔ آج کل دل سے فنی نہیں میری۔ جب ساگر کے منہ سے۔ لیکن آج اتنے ماہ بعد مجھے خوش دیکھ کر وہ بھی مسکرائے لگا۔ آپ پلیز ٹائیپ سعید کا تفصیلی انٹرویو شائع کریں۔ میری ہوسٹ فوٹ اوکارہ ہیں۔ اور آپ مجھ سے ملنے کب آ رہی ہیں۔

بیاری صائمہ! 26 مئی کو آپ کی سالگرہ ہے۔ ہماری جانب سے مبارک باد قبول کیجیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی زندگی کا ہر دن خوشیوں سے بھر دے۔ دل کے ساتھ ہمیشہ دوستی رہے۔ آپ خوش تو وہ بھی خوش۔ شعلہ پر تفصیلی بصرے کے لیے شکریہ! بہت اچھا بصرہ کیا ہے آپ نے۔

میرپور خاص سے ماہم حمید شریک محفل ہیں لکھا ہے اس ماہ ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ سب سے پہلے ایک تھی مثال "پڑھا اور سچ کہوں تو یہ ناول بہت سولو لگا اور میری سمجھ



خط بھجوانے کے لیے پتا  
ماہنامہ شعلہ - 37 - از دو بازار کراچی  
Email: info@khawateendigest.com  
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں آپ کی عنایت 'سلامتی اور دائمی خوشیوں کے لیے دعا کریں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو ہم کو تمہارے پیارے وطن کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین

پہلا خط حافظ آباد سے صائمہ بھٹان کا ہے لکھتی ہیں۔ صائمہ اکرم اور نگہت سیما کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئی۔ پہلی قسط تو تعارفی ہی تھی۔ پھر بھی مزا آیا۔ عید اللہ کا کردار بہت اچھا لگا۔ مجھے لگتا ہے پہلے منظر میں دونوں کردار عید اللہ اور عید نہ کے ہیں۔ یا ہو سکتا ہے علامتی کردار ہوں اور کہانی میں موجود سب کرداروں کے حالات کی جھلک دکھا رہے ہوں "خواب تھا کوئی"۔ عبد الرحمن حبیب کے کردار نے بہت مایوس کیا۔ ایسا بھی بیوی کی باتوں میں کیا آتا کہ سگی ٹولا کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کیا جائے۔ آسید جی! آپ تو جانیں ہیں شعلہ کی بھی اور میری بھی۔



آسیہ رزاقی نام رکھتے ہی مزا آگیا۔ نبجائے کیا جاوے (ہے ہماری راکٹرز کے پاس) آسیہ رزاقی کے اس قدر سادہ جملہ اور بڑی بڑی باتیں پڑھیں۔ صائمہ اکرم جوہر ری "سیاہ حاشیہ" بلاشیہ ان کی یہ تحریر بھی زبردست ہوگی۔ (ان شاء اللہ) میں نے تو تینہ اندازے لگا بھی لیے ہیں۔

"شہر خواب" نازیہ کنول نازی نے بھی قلم کا حق ادا کر دیا (ہمیشہ کی طرح) افسانوں کے بارے میں کچھ الٹا سیدھا نہیں کہہ سکتی۔ سب ہی اپنی جگہ پر پرفیکٹ تھے۔ "مسکرائی ہے زندگی" زمین آرزو شاید نئی راکٹر ہیں انہوں نے خوب لکھا۔

سید امجد سائرہ رضا، نگت سیما، صائمہ اکرم، نازیہ کنول نازی، خسانہ نگار، آسیہ رزاقی، قلب کے کلم گشتہ کوٹے سے میرا لکھی۔ واقعی 'ایک وقت' اتنے نام اکٹھے۔

اردو ہے جس کا نام سائرہ رضا نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ہماری آنکھیں کھول دیں۔ (ہمارے تعلیمی نظام میں اردو کی اتنی اہمیت) روہڑ میں میرا امجد کو دیکھ کر دل بیوں اچھل پڑا۔

عابدہ! فرحین انظر کے ناول کے بارے میں آپ کا اندازہ درست تھا اور ہم نے اس کے بارے میں کسی خط کے جواب میں لکھا بھی تھا۔ شاید وہ خط شائع نہ ہو سکا۔ صائمہ اکرم کے ناول کے بارے میں آپ کے اندازے درست ہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ افسانہ ابھی پڑھا نہیں۔ آپ نے اپنا توں نمبر لکھا ہے۔ ہم آپ کو فون کر کے بتا دیں گے۔

### اقرا لیاقت شاہ کوٹ پٹھان چک 51

میراجی! ایک بات سمجھ میں نہیں آئی، ذرا کے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہوا امرت کے ساتھ وہ کتنا مخلص تھی ہر موڑ اس کی مدد کی کارل خوبز کروتا تو اچھا لگتا۔ بہر حال آپ شہر جاتی ہیں "معریف" جتنی بھی کی جائے کم ہے "ایک سچی مثال" کہیں یہ لگتا ہے بہت اچھا ہونے لگا ہے اور پھر کہانی الگ موڑ پر رک جاتی ہے "رقص بزل" نیلہ جی آپ ہم سے کس بات ناراض ہیں۔ پلیز کوئی توراز کھولے اور ذرا رفتار بھی بڑھائیے۔ ہالی پور اور سالہ بیسٹ ہے۔ انٹرویوز

میں ہمیں آیا کہ آپ کے ساتھ کیا مسئلہ ہے کبھی رخصانہ جی کو نائب کر دیتی ہیں اور کبھی نیلہ جی کو! خیر اس ماہ صائمہ اکرم کا اضافہ بہت اچھا لگا۔ نازیہ کنول کا ٹائٹ بس ٹھیک لگا۔ اس ماہ سب سے اچھا افسانہ ساڑھ سٹی تھا۔ نگت سیما کا مکمل ناول "خواب تھا کوئی" کے ساتھ واپس ہے حد اچھی لگی آخر میں ایک فرمائش سائرہ رضا اور شہر بخاری کو بھی واپس بلا لیں۔ سچ میں بہت کمی محسوس ہوتی ہے دونوں کی!

پیاری ماہم! سائرہ رضا کو تو ہم شامل کرتے رہتے ہیں۔ آئندہ ماہ جون کے شمارے میں سائرہ رضا کا مکمل ناول شامل ہو گا۔

البتہ شہر نے کافی عرصے سے نہیں لکھا، ان کی کمی ہمیں بھی محسوس ہوتی ہے۔ قسط غائب ہوتی ہے تو میں بھی اچھا نہیں لگتا، لیکن مجبوری ناول ہے نیلہ عزیز کی چھوٹی چھوٹی جنموں نے انہیں ماں کی طرح ملا ہے۔ شدید بیمار ہیں۔ اس لیے وہ لکھ نہیں پاتیں۔ اس ماہ بھی قسط مختصر ہے۔ لکھ نہیں پاتیں تو قسط شامل نہیں ہوتی۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ردا اشیر، وہی ڈگری ضلع، میرپور خاص سے لکھتی ہے شعاع اور خواتین میرے موسٹ فوریٹ رسالے ہیں، میرا نمبر کی تحریر "یارم" ناقابل فراموش۔ اس ماہ "صائمہ اکرم" کو دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ باقی

سب سلیطے بھی بہت اچھے تھے۔ افسانوں میں میر کا شرف کا "چابی" ضمیر کو چابی دے کیا۔

پیاری ردا! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

### حمیرا قریشی۔ حیدر آباد

ہمیشہ کی طرح شعاع بیسٹ رہا بہت مزا آیا اور ہمیں بھی تپلی کیا شعاع میں نئے لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے؟

پیاری حمیرا! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ عابد بشیر عالی احمد نے سکریالی تحویل کھاریاں سے لکھا ہے

شعلات سے قلعہ بہت پرانا ہے۔ میں 3rd میں تھی  
 جب میری چھوٹی چھوٹی چھوٹی تھیں۔ تب وہاں لفظوں  
 کے مفہوم سے نا آشنا تھا۔۔۔ میں پھر شعلات اور خواتین ایسے  
 ہی وہاں پر حاوی ہوئے کہ آج تک بہت میں چار عدد بچوں  
 کی اماں جان ہوں۔ میرے ساتھ ساتھ ہیں۔ بچوں کی  
 مصروفیات بہت تھا شاعری سے بے وقت نکالتی ہوں یہ میرا  
 موضوع ہوں جانتا ہے۔۔۔ آج مجھے ویسے جس افسانے نے قلم  
 اٹھانے پر مجبور کیا وہ نور عین صاحب کا تھک ہے۔ اتنا خوب  
 صورت خیال اخلاقی تصویراتی کا اضافی ضعف ہے۔ "فراق  
 حیات" ٹیوٹ بھی بہت اچھا رہا۔

پہاڑی روپوش! بہت شکر یہ ایک طویل مدت شعاع کا  
ساتھ بنائے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ مصروفیت لاکھ سہی شوق اپنی  
راہ ہٹاتی ہے۔  
شعاع کی یہ خبر دی گئی ہے شکر ہے۔

فوزیہ شمرٹ اور اسماعیلیہ عمران گجرات سے شریک  
محفل ہیں۔

پیاری سی مسکراہٹ لیے غلامِ منیر اچھی لگ رہی  
تھیں۔ سرورق میں پہلی شعلہ اور نصرت رحمت پر مقبول حمد  
باری تعالیٰ ہمیشہ کی طرح دل و جان کو معظم کرنے والا سلسلہ۔  
یارِ بے غری کی پیاری باتیں اس پر موضوع بیان جبرِ قضا

بندھن میں اگر شاہین صاحب ذرا مہرے لگا گاہ جس میں  
اداکاروں سے ملنے اور تعلیم دینے ہیں۔ آئندہ ماہ دونوں کا باری  
باری انتہائی کریں۔ جتنے دیر میں تمہارا امید کے جوابات  
اچھے لگے، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میرا صاحب تھوڑا سا  
اپنے بارے میں بتا دیں۔ بے شک روبرو سلسلہ ٹائٹل کے  
مطابق ہی بات کرنے کا تھا۔ مجھے تو یہ ملاقات اور حوری  
اور حوری سی لگی "ایک تھی مثال" اس بار بھی قسط سلسلو  
پر ہی۔ یری کاواٹھن کے لیے انتہائی پوانہ میں ذرا بھی اچھا نہیں

مکمل ٹاول تینوں کے تینوں اچھے تھے، آسیر رزاقی کا ٹاول پہلی بار رشتوں سے جڑے لوگوں کی کہانی۔ ایک خاندان، ایک نسل جہاں اچھے برے طے بٹے انسان جو اپنی مختلف طبیعتوں، امزاجوں کے باوجود ایک دوسرے کی



۔ ہاں... صاحب کمرہ رہتے ہیں کہ 9 سہ ماہیوں میں اور نصف  
بہت ارشاد فرما رہی ہیں کہ ہم 7 بہن بھائی ہیں۔ بھئی عاون  
صاحب حد درجہ بھلا پن ہے یہ تو... مگر خیر سائہ یوسف  
سے ملاقات اچھی رہی۔ سب سے پہلے افسانوں پر ہاتھ  
سرف کیے۔ سرف سٹی "ابعل رضا صاحبہ۔ اس قدر  
کرب "الیت میرے خدا اکمل سے لکھ لیا آپ نے کاش  
میں بھی آپ جیسا لکھ پاؤں" کام کی چیز "میر نور علی نصیرت  
کی یہ بات ہماری مائیں سمجھ جائیں تو پھر کس چیز کا ردنا ہے؟  
"چانی "خیر کاشف بہت اچھا اور جامع افسانہ تھا۔ نازیہ  
میں نازی شعاع میں آپ کا نام دیکھ کر مت خوش ہوئی۔  
میں نے کہا۔ میری بہن ندا غوری (لاہور) نے سمیرا حمید  
اور میرا احمد کے انداز تحریر بہت انداز میں تنقید کی تھی تو  
میرے کئی دوستوں نے بھی۔ مگر آپ کے ٹھنڈے ٹھار  
ادب پر میں بھی بخوبی محنتی ہوتی۔ باقی مستقل سلسلے  
بھی عمدہ رہے۔ انی کوثر (الوٹر خالد جڑانوالہ) آپ کا  
بسمہ "خط آپ کے" میں لکھا گیا ہے۔ کہاں مائیں ہیں  
آپ؟ کیا آپ میری انی نہیں کی؟ "ابو سے نام جس کا"  
سازدہنی الفاظ نہیں مل رہے۔ واہ... کیا لکھ گلی ڈالا آپ  
نے۔

فرح ناز اور گلشن اپنے تو یہ بتائیں کہ 13 مئی کو جس  
کا سا لکھ رہے کیونکہ خط آپ تینوں کا نام لکھا ہے  
اب بتا رہا خیال ہے کہ یہ خط فرح ناز نے لکھا ہے اس  
سے کہہ سکتی ہوں گی ہوگی۔ ہماری طرف سے دلی  
مبارک باد اور تحفہ؟ میر ساری دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو  
بیش خوش و خرم رکھے آمین۔ آپ نے ہمیں خط لکھا  
بہت شکر ہے اور یہ حقیقت ہے کہ شعاع آپ کے بغیر کچھ  
بھی نہیں۔ ہماری قارئین اس میں بنو ہماری محنت کو  
پڑھ لیتی ہیں۔

سمیرا خان نے لکھا ہے مکتان سے

ماٹھل خوب صورت تھا باتوں سے خوشبو آئے۔ اس  
بھئی مسکرائیں پیارے نبی کی پیاری باتیں بھی بہت اچھی  
رہیں۔ "ایک بھی مثال" اب پوریت کا شکار ہونا چاہا  
ہے۔ پلیز اسے جلد ختم کریں۔ شکر ہے سمیرا حمید کا یارم  
اپنے اختتام کو پہنچا دیے آج کل کے اتنے فاسٹ دور میں  
اس طرح کی عجیب سی محبتیں کچھ عجیب لگتی ہیں اس نفسا  
نفسی کے دور میں ایسی محبتوں کے لیے ناہم نہیں ہے۔

ضرورت ہوتے ہیں۔ اثر فخریہ دونوں کر اربے مثال۔  
نگہت سیمہ خواب تھا کوئی۔ ابتدا تو اچھی رہی۔ تمام تحریر  
زلف اور دلچسپی کا باعث بنی رہی۔ مجھے لگتا ہے غلام  
مظطف ای عبدالمادی ہے۔

شیر خواب علیزہ کی ثابت قدمی اس کی زندگی کو گل  
گلزار بنائی۔ وہ بھی اگر احرار کی طرح وقتی اغوش کا شکار ہو  
جاتی تو احرار بھی بھی اس کے دامن پہ لگائے ورنہ مٹا مٹا  
افسانے سب ہی اٹھے اور کوئی نہ کوئی پیغام سیے ہوئے  
تھے۔

مارچ کا شعاع تقریباً "تقریباً" اچھا ہی تھا۔ مگر تحریروں  
میں مزاج بالکل نظر نہیں آیا۔  
مستقل سلسلے ایک تو صفحات کی کمی نظر آئی۔ دوسرا ہم تو  
کیس نظر بھی نہیں آئے آپ نے خود ہی میری بات  
(بھابھیاں والی) کی نصیب کر دی۔ میں نے کب کہا کہ  
پانچوں انگلیاں برابر ہیں۔

پیاری فوزیہ! آپ کی بھابھی اچھی طرح جانتی ہیں کہ  
آپ نے کچھلے ماہ بھابیوں والی بات ان کے لیے نہیں  
لکھی تھی کیونکہ اگر آپ جج بھابیوں کی باتیں تو  
کبھی بھی یہ نہ لکھتیں۔ ہمیں تو لگتا ہے کہ آپ کی ان  
بھابی کے ساتھ بہت اچھی انداز سینڈنگ ہے اور شعاع  
کی قارئین کی کسی سے لڑائی ہو بھی نہیں سکتی۔ آخر اتنے  
عرصے کی دوستی عزیت ہے (شعاع کی پسندیدگی کے لیے  
شکریہ۔

فرح ناز، قمران، انیس گل مسکینہ تحصیل و خلع  
تحریرات سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

یقین مائیں اتنی مسروریت میں ہیں کہ آپ سے  
توجہ ملاقات کی کوشش کی۔ مگر آپ کے شاید ہمیں اس

قابل بنی نہ جانا۔ مگر خیر ہم جانتے ہیں کہ اگر ہم شعاع کے  
بغیر کچھ نہیں تو شعاع بھی ہمارے بغیر ایسے ہے جیسے  
چینی کے چائے کیوں؟ باہا با۔ یاد ہے نا شعاع والوں کو کہ  
13 مئی کو ہمارا جنم دن ہے۔ ہاں ہاں... ہاں ہی... وہی  
ہی۔ آپ کی دعائیں بھی یہی ہیں ہم نے اور کوئی اچھا سا  
تختہ بھی۔ اب آتے ہیں بھرے کی طرف مسروریت بہت  
عمدہ تھا "بند حسن" میں عادل مراد اور ان کی شریک سفر مریم  
مراد کے بند حسن کی "شہو طلی دیکھنے کے لیے پڑھنا شروع کیا

شعاع کے سب سلسلے پہلی شعاع سے خوب صورت بننے تک بہت اچھے تھے۔ آپ کے شعاع میں ایک کالم کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ آپ شعاع میں اسلامی تاریخ یعنی اسلامی عمارتوں کی تاریخ کے حوالہ سے کوئی سلسلہ ضرور شروع کریں۔

ایک اور واقعہ نو دس محرم کے حوالہ سے آج تک امام حسن رضی اللہ عنہ اور امام حسین رضی اللہ عنہ کے واقعہ کے بارے میں صحیح معلومات شروع سے لے کر آخر تک شائع کریں تاکہ ہم لوگ جان سکیں کہ اصل کوئی تھی کیا اس لیے کہ ”میں پڑھنے میں آتا ہے کہ حق اور باطل کی لڑائی تھی حق کے بارے میں ہمیں علم ہے اور وہ باطل کیا تھا مزید چاہتا کیا تھا؟ وغیرہ وغیرہ۔

ہم نے سنا ہے کہ حضرت نوح کی کشتی دریافت ہوئی ہے کب کیسے اور کس طرح اس کی تصویر کے ساتھ معلومات دیں۔ نیز فرعون کی کشتی جو مصر کے غلاب گھر میں موجود ہے۔ ننگینس کی ترکیب بھی شائع کریں اور ہمیں برائی آسمان ترکیب لکھیں نیز گھر میں بغیر نور کے ٹکڑے ٹکڑے تار کرنے کی آسمان ترکیب لکھیں آپ ہمیں کریم والا ٹیک۔ چاکلیٹ ٹیک۔ آئس ٹیک کی ترکیب بھی بتائیں۔

پجاری ممیرا ادنیٰ کتنی بھی فاسٹ ہو جائے زمانہ کتنا ہی کیوں نہ ہو چل جائے۔ محبت کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہو گا یہ کائنات محبت کے دم سے ہی قائم ہے۔ محبت کی کوئی ایک شکل نہیں ہوتی۔ ہر اکو امرہ سے جو محبت تھی کارل کو عالیان سے جو لگاؤ تھا انا جان جو امرہ کو اپنی جان بنائے ہوئے تھے۔ یہ سب محبت کی شکلیں تھیں جن کی ممیرا نے بڑی خوب صورتی سے تصویر کشی کی۔ عالیان اور امرہ تو مرکزی کردار تھے۔ اس لیے وہ آپ کی توجہ کا مرکز بنے اور آپ نے لکھا کہ اس فاسٹ دور میں اس طرح کی محبتیں نہیں ہوتیں۔ محبتیں تو ہوتی ہیں عالیان اور امرہ

بھی ہوتے ہیں لیکن ہم اس فاسٹ دور میں ان کو دیکھ نہیں پاتے ہیں۔ ممیرا نے ہمیں انہیں دکھایا۔

آپ کی تمام تجاویز نوٹ کر لی ہیں۔ بہت اچھی تجاویز ہیں۔ واقعہ کرل پر ہم پہلے مضمون دے چکے ہیں۔ آپ کی فرمائش پر دوبارہ شائع کر دیں گے۔

ملاہ اسلم نے خانیوال سے لکھا ہے

میں نے مختلف میگزین خصوصاً ”بچوں کے میگزین“ میں بھی لکھواتی۔ ایک تحریر لکھی ہے پھر سوچا شعاع والے میرا خط ہی شامل نہیں کرتے تو تحریر کیوں کریں گے۔ آپ! جو آپ سے محبت کرتے ہیں ان کا اتنا حق بنتا ہے کہ آپ محبت سے جواب بھی دیں۔ میرے کمپیوٹر کے سرو قاص کی بیٹی میری کلاس فیلو ہے اور سر خود اپنی بیٹی کو شعاع اور خواتین لا کر دیتے ہیں اور مناف مجھے ہر ماہ خواتین لادیتی ہے۔ شعاع کا ٹائٹل اچھا لگا۔ پہلی شعاع کے بعد حمد و نعت اور نبی کی باتوں سے دن و رات کو منور کیا۔ روڑہ میں میرا آپ سے مل کر اچھا لگا ”ایک نئی مثال“ اب تو بڑھ کر اب اس فرسودہ ہو جاتا ہے۔ نازی آپ کی تصویک یو سوچ۔ مچی دل خوش کر لیا۔ علیزہ کا کردار پسند آیا۔ احراز کا مطلب بھی بتا دیں۔ سنا کا ناول بیست تھا۔ ہادی کے بارے میں بڑھ کر دیکھ لیا۔ اگلی قسط کاشدات سے انتظار ہے۔ نیر کاشف نے اپنی دانش کے ذریعے بہت اچھا مہیج دیا۔ صائمہ اکرم جو بد پرستی کی طرح اس بار بھی بازی لے گئیں۔ آسیہ رزاقی کے ناول میں ہادی کے گیت دل کو بھائے۔ ”مسکراتی ہے زندگی“ اچھا لگا۔ پلیز آپی نمو اور میرا شریف طور کو بھی شعاع میں شامل کریں۔

پجاری مثال! آپ کا ہمارے اوپر پورا حق ہے تب کی تحریر شامل نہ ہو سکی۔ اس کا ہمیں دلی افسوس ہے۔ آخری دو موصول ہونے کی بنا پر بھی کچھ خط شامل نہیں ہو پائے۔ آپ کی کہانی ضرور بھجواؤں

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے شکریہ۔ اللہ تعالیٰ آپ کے والد صاحب کو صحت و تندرستی عطا فرمائے اور آپ ہمیشہ خوش رہیں۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے شکریہ۔

سعدیہ طور نے مردان سے لکھا ہے

شعاع اور خواتین ڈائجسٹ چھ سات سال سے باقاعدگی سے پڑھ رہی ہوں۔ سب سے پہلے تو میرا حمید کو شاکر ناول ”یارم“ تخلیق کرنے پر ڈھیر ساری مبارکباد۔ میرا آپ کی قلم سے الفاظ کی صورت قیمتی موتی جھڑتے ہیں۔ ”یارم“ کے ایک ایک لفظ ایک ایک جملے اور ایک ایک کردار نے نو مہینے ہمیں اپنے حیرتیں جکڑے رکھا۔ بندھن میں غافل مراد اور مریم مراد سے ملاقات اچھی



تھی۔ ”ایک تھی مثال“ ناول تو اچھا ہے لیکن بہت ہی آہستہ جا رہا ہے اور یہ کیا... رقص شکل میں تو ابھی انٹرسٹ لگا تھا۔ ایک مہینہ پھر انتظار... ہائی دونوں مکمل ناول اور ناولٹ بھی پسند آئے۔ ”سیاہ حاشیہ“ بہت ہی دلچسپ لگا۔ اب دیکھیں گے آگے کیا ہوتا ہے۔ افسانے چاروں اچھے تھے۔ ابدل رضا کا یہ جملہ بہت پسند آیا۔ ”عمورت پر ساڑھ ستی کا ستارہ تو پچھلے سات قرون سے چمک رہا ہے۔ پھر وہ ساحلوں کے رقص کیسے دیکھ سکتی ہے۔ اور محبت کے گیت کیسے سن سکتی ہے؟“

باقی سارے سلسلے بھی اچھے تھے۔ مجھے ”تاریخ کے جھروکوں سے“ کا سلسلہ بہت پسند ہے۔

بیاری سعید! شعل کی تحفل میں خوش آمدید ہمیں احساس ہے کہ آپ کو خط پوسٹ کرنے میں کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہو گا۔ پھر بھی ہم یہی کہیں گے کہ آپ ہمیں خط ضرور لکھیں تاکہ تحفہ آپ کی رائے جان سکیں۔

تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ آپ کی بڑھنے کی رفتار جتنی تیز ہے تبصرہ بھی اتنا ہی اچھا کیا ہے۔ محمد امجد اور دیگر مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

خانقاہ سراپہ تلکوکراں سے اپنی ارحام تلکوکراں سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

شعل کی شوق اور آنکھوں سے بڑھتی ہوں۔ ناول بھی سوچنی تھی اور تنگ بھی دلکش۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیاری باتیں عیش کی طرح بیاری۔ رویہ میں سمیرا سے مل کر راحت اور تنگ ہی شادمانی ملی۔ ”پہلی بار“ بہت چٹنی لگی۔ ایک تھی مثال اور خواب تھا کوئی زبردست ناولٹ دونوں اچھے تھے۔ افسانے بھی بہترین تھے مگر ”کام کی چیز اہی چاہا من چاہا“ نے دل لوٹ لیا۔

ج۔ بیاری لکھنی شعل کی تحفل میں۔ خوش آمدید۔ آپ کے گاؤں سے پہلی بار خط ملا ہے۔ جب کسی ایسے دور از علاقہ سے خط ملتا ہے جس کا نام بھی ہم نے نہیں سنا ہو تو ہمیں بے حد خوشی ہوتی ہے۔ خوب صورت لکھائی میں لکھے ہوئے آپ کے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب گاؤں میں بھی لڑکیاں تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔

ایسا ہمسگان سعید، قلعہ دیدار سنگھ

میرے تین خط آپ نے ردی کی نوکری کی نظر کیے ہیں۔ میرے دل کے بے شمار ٹکڑے ادھر ادھر پکھرے اور اب پھر سے ٹکڑوں کو ٹکھا کر کے دل مکمل کیا اور خط لکھتے بیٹھ گئی۔ کچھ باتیں آپ سے شیئر کرنی ہیں۔ پہلے آپ نے ارادہ بتا دیا۔ ”کیا خوش ہو تم“ کے لیے آپ کی کیا رائے ہے۔ اگر از تم میرا طویل انتظار تو ختم ہو، میں نے جب سے لکھنا شروع کیا ہے مجھے کامیابی کی دعا نہیں ملی۔ جانے والے کہتے ہیں بغیر استاؤ کے تم کیسے کامیاب ہو سکتی ہو۔ آپ نے کہا تھا آپ مصنفین کا انٹرویو خواتین میں دیں گی۔ پلیز خواتین میں نہیں شعل میں دیں۔ پلیز پلیز اور یہ خواہش صرف میری ہی نہیں، ان سب قارئین کی ہے جو صرف شعل بڑھتی ہیں۔

ج۔ بیاری ایسا! آپ نے واقعی کافی ناول، ناولٹ، نچوائے ہیں۔ ہم نے بڑھے بھی ہیں۔ اچھا لکھتی ہیں آپ، لیکن تھوڑی اصلاح کی ضرورت ہے۔ دراصل ہمیں اصلاح کے لیے دلت نہیں مل رہا لیکن آپ سے وعدہ ہے کہ وقت نکال کر اصلاح کریں گے اور آپ کی کوئی نہ کوئی تحریر ضرور شائع ہوگی۔

شعل میں مصنفین سے کوئی سلسلہ جلد شروع کریں گے۔ فی الحال ہم نے خواتین ڈائجسٹ میں مصنفین سے سوال و جواب کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔

ملانکہ کوثر بسم اللہ پور سے تشریف لائیں ہیں، لکھا ہے گزشتہ مہینہ حال سے اس سہمی میں ہوں کہ آپ کو خط لکھوں۔ پانچ سالہ ملتا ہے تو اسے بڑھنے میں مہینہ ختم۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ دیہی زندگی کی رو میں خاصی لفٹ ہوئی ہے۔ پھر یہ ڈالائف کی ذمہ داریاں۔ ”پہلی شعل“ سے پرچار دھنا شروع کرتی ہوں۔ اس کے خوب صورت احساس مند حروف جیسے دل میں گھر کر جاتے ہیں۔ پھر ”حمد و نعمت“ اور ”پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں“ سے قلب و نظر کو منور کرتے ہیں۔ ”ایک تھی مثال“ رخصانہ نگار اور رقص لیل، نبیلہ عزیز کا یہ دونوں ناول زبردست ہیں۔ مگر اتنی مختصر قسط ہوتی ہے کہ ادھر شروع ادھر ختم ”شام خزاں طویل سہی“ فرح بخاری کی 70 صفحوں کی طویل ترین کہانی، پہلے طوالت کی وجہ سے چھوڑ دی۔ کہانی میں بچوں کا ذکر تھا جس کی وجہ سے

نماز کے بعد مغرب تک نوافل پڑھنا جائز نہیں ہے۔  
شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

کراچی سے عائشہ رباب نے لکھا ہے

سرورق اچھا لگا۔ حسب عادت ”پہلی شعاع“ سے  
پڑھنے کا آغاز کیا۔ ”حمد اور نعمت“ دونوں ہی بہترین تھے۔  
پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اچھی  
لگیں۔ عائد مراد سے ملاقات بھی اچھی رہی اور پھر درود  
پڑھ کر مزہ آگیا۔ لفظ لفظ مدلل، اتنا جامع جواب، اتنے  
حماسی جیسے ”بالکل“ ”یاد رکھ“ ”رسک“ ”بھی اچھا  
تھا۔“ ”شعاع کے ساتھ ساتھ“ ”طلعت کے جواب اچھے  
لگے۔ اب آتے ہیں کمائیوں کی طرف۔“ ”ایک نئی مثال“  
”بہاں عام سی ہے، لیکن رفتار اتنی کم کہ پڑھنے کا دل ہی نہیں  
چاہتا ہے۔ افسانوں میں ”کام کی چیز“ ”ان چاہا“ ”من چاہا“  
”بس ٹھیک تھا“ ”چالی“ ”اچھی لگی۔“ ”ساڑھ سٹی“ ”دھل کا  
منگوس“ ”دور سات“ ”حال کا لبا عرصہ“ ”اف“ ”کمائی کا موضوع  
بست ہی دکھی تھا اور نیچا“ ”یوں سن۔“ ”ایڈا اس طرح نہیں  
ہونا چاہیے تھا۔ ایک وقت میرے نھیال میں گزرا تھا۔

نورث فاقوں پر آگئی تھی۔ لیکن اس میں جو صلہ تھا۔ آگے  
پڑھنے کا جذبہ تھا وقت کو بدل دینے کا۔ میری تھی خوشحالی کی  
آج الحمد للہ سب خوش حال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آج  
بھی نہ جانے کتنی ہی قارئین اس دور سے گزر رہی ہوں  
کی، لیکن اس جملے نے ”فرضی کمائیوں کے ایڈ تو بیسی  
ہو جائیں، لیکن اصل زندگی ویسی ہی دکھی رہے گی۔“ ”ان  
کے خوشی بہشت کسے لے لے ہوں گے۔ امید کے ٹمٹماتے  
دیے بھجوا دیے ہوں گے۔ افسانے کا بہترین جملہ مسٹر  
اکرام نے کہا۔ ”ماہی سمندر پر دکھائیے چمٹ لڈی کرتے  
ہوئے۔ ایک نئے عزم کے ساتھ۔“ آپ ہمیں کیا سبق  
دے رہی ہیں۔ زینب اتنی بھی بد قسمت نہیں تھی۔ پڑھی  
لکھی، باشعور، برسر روزگار اور جب ایک بار محبت سے  
دھتکار مل جائے تو سمجھنا چاہیے، بجائے محبت پر آنسو  
بہانے نہ کے۔ شاید بہت ہو گیا۔ میں بس ایک اپنا نقطہ نظر  
واضح کرنا چاہ رہی تھی۔ مکمل ناول میں ”پہلی بار“ ”اچھی  
تھی۔“ ”آسیہ رزائی سے پوچھنا تھا، ان کی ہیروئن ایک جگہ  
لکھی کیوں نہیں، بس ادھر ادھر بھانسی کیوں رہتی ہے۔  
”سکرانی ہے زندگی“ ”اچھی نہیں لگی۔ بالکل ایسی ہی کمائی

پڑھنا شروع کی۔ جب پڑھنی شروع کی مگر تے چوں کا موسم  
تھا جب ختم کی اور ختموں پوچوں نے اپنی بند مٹھیاں کھول  
دی۔ گویا بھری بہار پڑھنے کے دوران ہمارے اندر کتنے  
موسم بدلے، اس کا تو نہ ہی پوچھیں، ایک بات یقینی ہے۔  
ان میں ہر بات کا کوئی رنگ اور موسم نہیں تھا۔ ایک بات  
خاص طور پر پوچھنا چاہوں گی۔ اس ناول کے حوالے سے  
جہاں تک میری مانج ہے، فجر عصر کی نماز کے ساتھ کسی قسم  
کے نوافل نہیں پڑھتے۔ بلکہ صبح فرمادیں۔ میرا حمید کی  
”یاد رکھ“ نے شروع سے ہی کسی سحر طراز حسینہ کی طرح  
ہمیں اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا۔ البتہ آخری دو اقساط میں  
فلسفہ خاصا گاڑھا تھا۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ سمجھ میں آئی کہ  
مجھ جیسی انارڈی کو۔ بہت سارے جملے میں بس سرورق  
جاتی ہوں۔

”محبت آسانی فرمان ہے، نافرمانی کی اجازت نہیں۔“  
”محبت پرندہ پرست ہے، پاتال اس کا نشیمن نہیں۔“  
”محبت پر فرمان غالب ہے، دلہا اور فراق کو رخصت کی  
اجازت دے دی گئی۔“ ”یوں کہ ختمشان مگر نے“ ”محبت“ کو

”من“ ”نر کے محرم بنایا۔“  
”علم وہ روشنی ہے جس پر کوئی اندھیرا غالب نہیں۔“  
زبردست، اگر میں اپنی پسند کے سارے جملے لکھتے نہیں کی  
تو نہ جانے کتنے سفید برلق کاغذوں کے قلب روشتالی سے  
منہ بول گئے۔ ”ج میں“ میں تو گریدہ ہو گئی۔ افسوس۔ حمید  
افسوس میں روہد میں شریک نہیں ہو سکی۔ زندگی کے  
کچھ بے باج پانچ کو زنجیر کر دیتے ہیں۔ ”غریق رحمت“  
سحر ساجد کی ”خاتون کی کھنٹی مٹھی چائنی ہے۔“ اللہ اپنے  
بندے کو کبھی نہیں چھوڑتا۔ یہ بندہ ہوتا ہے جو اللہ کا راستہ  
چھوڑ دیتا ہے۔ ان کتنے فقرے، جملوں نے ذہن کے بند  
دریچوں پر رشک دے ڈالے۔ ”پارہے کو چومنا“ یہ بات تو کبھی  
میرے دماغ میں کہ یہ اتباع رسول نہیں ہے۔

ج۔ چارمی مانکبہ نہیں احساس ہے کہ مجھ نے شعروں  
اور گاؤں میں رہ چاہت لیٹ پڑتا ہے۔ پھر گاؤں میں رہنے  
والی قارئین کے لیے خط پوسٹ کر لانا بھی ایک مرحلہ ہوتا  
ہے۔ یہ بنی وجہ ہے کہ خط ہم تک بہت تاخیر سے پہنچتے  
ہیں۔ فرح بخاری کے ناول کے حوالے سے آپ نے غلطی  
کی نشان دہی کی، بہت شکریہ۔ ہم پچھلے شمارے میں تصحیح  
کر چکے ہیں۔ فجر کی نماز کے بعد سورج نکلنے تک اور عصر کی





# خواتین ڈائجسٹ

مئی 2015ء  
کے شمارے کی ایک جھلک

- ”حرف سادہ کو دنیا اعجاز کا رنگ“ مصنفین سے سروے ،
- عمیرہ احمد کا ناول ”آپ حیات“ ،
- عفت محمد طاہر کا ناول ”بن مانگی دُعا“ ،
- نرہ احمد کا ناول ”نعل“ ،
- تنزیلہ ریاض کا ناول ”عہد الست“ ،
- نیلہ ابرار ربیعہ اور حیات بخاری کے ناول ،
- ام ایمان قاضی اور عزیزین وی کے ناول ،
- قرۃ العین خرم ہاشمی، علیہ احمد، غزالہ روشن اور ازکی اخلاق بٹ کے افسانے ،
- ٹی وی فنکارہ ”صباح بخاری“ سے ملاقات ،
- نوجوان نسل کے نمایاں فنکار ”آغا وحید قریشی“ سے باتیں ،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ ”دستک“ ،
- کرن کرن روشنی، انفسیاتی ازدواجی الجھنیں عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں ،

خواتین ڈائجسٹ کا مئی 2015 کا شمارہ آج ہی خرید لیں۔

دیتی ہے۔ خواہ محبت ہو یا نفرت۔ زینب محبت میں ناکامی کے بعد زندگی سے سمجھوتا نہیں کر پار ہی تھی۔ انسان ٹوٹ جائے، مایوس ہو جائے تو ہمت اور حوصلہ خواب دے جاتا ہے اور یہ تو آپ مائیں گی تاکہ کمائیوں میں جو اینڈ ہوتے ہیں وہ حقیقی زندگی میں نہیں ہوتے۔ انصاف کے لیے تبدیلی کے لیے خوش حالی کے لیے جدوجہد کرتے سلیس گزر جاتی ہیں۔ قدرت انصاف کرتی ہے، لیکن ہمت انتظار کے بعد جبکہ کمائیوں میں تو چالیس پچاس صفحات میں سارے کرداروں کو انجام تک پہنچانا ہوتا ہے۔

مریم بنت ارشاد، رحیم یار خان سے تشریف لائی ہیں، لکھا ہے

خط شائع نہ ہوا، سوچا ادارے والوں نے تو ناراضی بنتی ہے، سو گھر بیٹھ کر خود ہی سے ناراض رہنے سے بہتر ہے کہ خط لکھ کر ناراضی کا اظہار کیا جائے۔ لیکن اگر اب بھی میرا خط شائع نہ ہوا تو پھر میں بھی کوشش نہیں کرتی ہوں۔ میرا حیدر اللہ تعالیٰ نے آپ کو سترین تخلیقی ذہن سے نوازا۔ لفظ موتیوں کی صورت اور ان پر کتنے گئے۔ قصہ گوئی، واقعات کا تسلسل، کرداروں کی خوبیاں، منظر کشی، پر جستگی، دارا، بیوی کی بے مثال محبت، اردو ادب پر بہترین گرفت، منظر نگاری کا آثار چڑھاؤ، محبت کا درس دیتی ہوئی۔

ج۔ پیاری مریم! آپ کی ناراضی سر آنگھوں پر ناراضی کے شکوے اپنوں سے ہی ہوتے ہیں۔ آپ سو بار ناراض ہوں ہم آپ کو سو بار منائیں گے۔ میرا حیدر تک آپ کی تعریف پہنچا رہا ہے۔

### سرواق کی شخصیت

ماڈل ----- نیہا علی  
میک اپ ----- روز بیوٹی پارلر  
فوٹو گرافر ----- سوئی رضا

میں پڑھ چکی ہوں کسی اور ڈائجسٹ میں "خواب تھا کوئی" بہترین کہانی ہے۔ میں نے اندازہ لگایا ہے۔ جو زمین، مشاغل ہے اور غلام مصطفیٰ ہادی ٹالٹ میں "شہر خواب" اچھی کاوش تھی۔ موجودہ دور کی آزادانہ سوچ کی حامل لڑکیوں کے لیے بہت ہی سبق آموز۔

ج۔ چارہ عاشر! آپ کا خط پڑھا۔ بہت اچھا خط لکھا آپ نے، تفصیلی تبصرہ پڑھ کر مزہ آیا۔ "سازہ سنی" آپ کا اعتراض بجا ہے۔ زینب کو بہت کچھ حاصل تھا جس کے سارے وہ زندہ رہ سکتی تھی۔ لیکن بات حوصلہ اور ہمت کی ہوتی ہے اور یہ بھی کہ آپ جذبات کے کس مقام پر ہیں۔ کسی بھی جذبے کی شدت انسان کو تکلیف

### قارئین متوجہ ہوں!

- 1- ماہنامہ شعاع کے لیے تمام سلسلے ایک ہی الفاظ میں بھجوائے جاسکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔
- 2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔
- 3- ایک ستر پھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پست پستی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔
- 4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنے نام کے ساتھ تحریر کریں اور نمبر ضرور لکھیں۔
- 5- ہر سلسلے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، تا قاتل اشاعت کی صورت میں تحریر واپس نہیں ہوگی۔
- 6- تحریر روانہ کر کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔
- 7- ماہنامہ شعاع کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر بھیج دیں۔

ماہنامہ شعاع

37- اردو بازار کراچی

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رچن بہت سے شعاع اور بہت سے کن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقائق طبع و نقل میں ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی نئی جگہ پر ڈراما، ڈرامائی تھیل اور سلسلہ وار قطع کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے بلاشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ صورت دیگر ادارہ کا نقل چاہے جلی کاغذ رکھتا ہے۔





### پریشانی

لیجئے جناب! اب خواتین کے لیے ایک نئی فکر۔ ایک برطانوی ریسرچ کے مطابق خواتین کے ہینڈ بیگز میں کسی نواٹکٹ کے مقابلے میں زیادہ بیکٹیریا پرورش پاتے ہیں۔ (ہائیں۔ ارے جلدی سے اپنا بیگ۔) اور ہرپاچ میں سے ایک ہینڈ بیگ میں اتنے بیکٹیریا موجود ہوتے ہیں جو انسانی صحت کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔ (پھوڑیں۔ یہ تو طائلوں کے چوٹھے ہیں ہمارے یہاں تو) انٹیلیجنٹ ہائی جین کے ٹیکنیکل مینجریچر بیرٹ کے مطابق خواتین کے ہینڈ بیگ میں موجود ہینڈ کریم میں سب سے زیادہ بیکٹیریا موجود ہوتے ہیں اور اگر خواتین اپنے چہرے کے ہینڈ بیگز کو دھونا معمول نہ بنائیں تو انہیں صحت کے خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔

### انکشاف

سوئڈن کے سائنس دانوں نے ایک تحقیق میں انکشاف کیا ہے کہ پالک کے استعمال سے وزن کم ہو جاتا ہے۔ اگر اس کا جوس ایک مخصوص مقدار میں روزانہ نمائندہ پیا جائے تو یہ بھوک کی انتہا کو کم کر دیتا ہے اور یوں وزن کم کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ ایک نئی تحقیق کے مطابق پالک کھانے سے دماغ بھی تیز ہوتا ہے۔ امریکی ریسرچ کے مطابق ہرے چوہوں والی مینیاں زیادہ سے زیادہ کھانے سے الزائمر کی شکایت کو بھی تاخیر روکا جاسکتا ہے۔

### اعزاز

یوں تو دنیا بھر میں فنکاروں کو بہت سے اعزازات اور ایوارڈ سے نوازا جاتا ہے، لیکن ایک پاکستانی گلوکار

کو امریکا کے ایک قانون نافذ کرنے والے ادارے کا رکن بنایا گیا ہے۔ مزے کی بات ہے کہ اس گلوکار نے اس کی کوئی ٹریننگ حاصل نہیں کی ہے۔ اہم بات کر رہے ہیں عدنان سمیع خان کی امریکی ریاست ٹیکساس کے شہر ہوشٹن میں پر فارم کرنے پر ٹیکساس

پولیس ڈیپارٹمنٹ نے انہیں ٹیکساس کا اعزازی ڈبئی شرف بنادیا ہے۔ (نو جی!) یہ اعزاز بھی حاصل ہو گیا عدنان کو؟ جبکہ ٹیکساس کا ڈیفنڈیشنل شرف کو انتخابات کے ذریعے منتخب کیا جاتا ہے، لیکن عدنان کو یہ عمدہ اعزازی طور پر دیا گیا ہے۔ ٹیکساس میں کسی بھی ایشیائی اور پاکستانی کو اعزازی طور پر ڈبئی شرف بنانے کا یہ پہلا موقع ہے۔ عدنان سمیع خان نے اس موقع پر ٹیکساس پولیس ڈیپارٹمنٹ اور ریاست کے موجودہ شرف مسٹرائڈ رین گارٹیا کا بھی شکریہ ادا کیا۔

### انکار

پاکستان میں شوہر کی دنیا کا ہر فنکار بھارتی انڈسٹری میں کام ملنے کے لیے تڑپ رہا ہے۔ ہر کوئی یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح اس کا چہرہ (کام تو بعد میں دکھایا جاتا ہے)

امید ہے کہ نرگس کی محنت رنگ لائے گی۔ (ہائے یہ  
تیرے ہدایت کار اور ان کی امید۔؟ جب ہی تو یہ  
اندھری۔؟)

### کچھ اوھر اوھرے

چوہدری سرور "تاریخ ساز" گورنر تھے گورنر  
صوبے میں وفاق کا نمائندہ ہوتا ہے، لیکن آپ صوبے  
میں ایک مولانا صاحب (طاہر القادری) کے نمائندے  
تھے۔ یوں انہوں نے تاریخ بنائی۔ مزید "تاریخ" نہ بن  
سکی کہ دھرنے سمٹ گئے اور آپ کی گورنری پٹ



(عبداللہ طارق سیل۔ نئی بات)

شیخ رشید صاحب کے بارے میں نجومیوں نے  
پیش گوئی کی ہے کہ اس سال ان کی شادی ہو جائے گی۔  
کئی لوگ اس پیش گوئی کا مذاق نہیں کر رہے۔ ان کا  
کہنا ہے کہ شیخ صاحب کی ساری کم سنیں، بلکہ ان کے  
دور کی کم سنیں بھی داؤی تانی بن چکیں، کچھ تو جہاں سے  
کوچ بھی کر گئیں۔ اب شیخ رشید بٹ کے لیے "تو  
دیکھیںسی" والا ماجرا ہے۔



کسی بھارتی ڈائریکٹر کی نظر میں آجائے تو اس کی نیا پار  
لگ جائے ایسے میں علی ظفر نے (ہوبالی ووڈ میں اپنا لوہا  
منوا چکے ہیں) تین مشہور فلم ساز اداروں کوئی الحال  
منع کر دیا۔ (حیرت ہے ناک۔) علی ظفر اس سال خود  
فلم بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں وہ مختلف  
اسکرپٹ پر غور کر رہے ہیں۔ (بچنے جناب اب رولز  
کسی نہ کسی طرح علی ظفر تک اپنا اسکرپٹ پہنچانے کی  
کوشش کریں گی۔ زور کس پر ہوا کریں گی "پیس")

### بالی عمریا

اسٹیج اور فلم کی اداکارہ نرگس شوبر کو خدا حافظ کہہ کر  
کینڈا چلی گئی تھیں مگر ظاہر یہ کیا تھا کہ وہ تائب ہو گئی  
ہیں (مگر چھٹی نہیں منہ کہ یہ کافر لگی ہوئی) اب نرگس  
نے شوبر میں واپسی کا اعلان کر دیا ہے۔ (کیونکہ اب  
انہیں اندھری میں جان پڑتی محسوس ہو رہی ہے "نی  
وی والوں کی وجہ سے۔) اور ان کی واپسی ہدایت کار  
پرویز رانا کی فلم "دشمن رانی" کے ذریعے ہو رہی ہے۔  
نرگس اس فلم میں سولہ سالہ لڑکی کا کردار کر رہی ہیں۔  
(دھڑا۔۔۔ دھڑا۔۔۔) جو اندھری اب ذرا اچھی  
بھی اس فلم کے بعد تھیں۔ نرگس نے اس فلم کے لیے  
باقاعدہ ورزش شروع کر دی ہے۔ پرویز رانا کو پوری





# موسم کے پکوان

خالہ جیلانی

## آلو کا راستہ

جز ۱ :	دو عدد (اگلے ہوئے)	چار چار ٹکڑوں میں تقسیم کر لیں۔
آلو	ایک گٹھی	سو گرام
ہر اوٹھیا	ایک گٹھی	ایک سو پچیس گرام
پودینہ	تین سے چار	سو گرام میں لیں
ہری مرچ	ایک ساؤ	ایک سو پچیس گرام
(باریک کٹی ہوئی)	بگھار کے لئے	ایک سو پچیس گرام
دہی	حسب ذائقہ	سو گرام
زیرہ، کزئی پتا		دو سو پچیس گرام
کئی مرچ، کالی مرچ		تین سے چار ٹکڑوں

## ترکیب :

آلو ایل کر میش کر لیں پھر اس میں حسب ذائقہ نمک، کٹی مرچ، کالی مرچ، ہر اوٹھیا، پودینہ اور تھوڑی سی کٹی ہوئی پیاز ملا کر ان کو چھوٹی چھوٹی بانڑکی شکل دے دیں۔ ایک پیالے میں دہی ڈال کر پھینٹ لیں پھر اس میں آلو کی بانڑ ملا لیں۔ ہر اوٹھیا، ہری مرچ اور پودینہ پیس کر کے پیسٹ بنالیں۔ اب فراٹنگ پین میں تیل گرم کر کے پہلے زیرہ گول اور کزئی پتا ڈالیں پھر احتیاط کے ساتھ پیسٹ ڈال دیں اور پھر اس بگھار کو دہی کے اوپر ڈال دیں۔ مزید آلو کا رائیہ بچاؤں تو روٹی یا پھر چاول کے ساتھ تناول فرمائیں۔

## کیری کا اچار

جز ۱ :	چار ٹکڑوں
کیری (کچے آم)	

## آم کا مرہ

کیر یوں کو دیکھنی میں ڈال کر ساتھ میں چینی ڈال کر ہلکی آنچ میں پکا ئیں۔ جب چینی گل جائے تو اتار لیں۔ ٹھنڈا ہو جائے تو لیموں کا رس ڈال دیں اور کالا نمک چھڑک دیں اور بوتل میں ڈال کر فریج میں رکھ دیں۔ جب پیش کرنا ہو تو دو کھانے کے چمچے گلاس میں ڈال کر ٹھنڈا پانی ملا کر پودینے کے پتے لوپر سے سجا کر پیش کریں۔

دو کلو  
چار کھانے کے چمچے  
ڈیڑھ کلو  
آدھا کپ

اجزا :  
کچے آم  
لیموں کا رس  
چینی  
عرق گلاب  
ترکیب :

## کیری کی چٹنی

اجزا :

کیریاں

ہماہت لال مرچ

سفید سرکہ

کلو گھی

نمک

لیموں

سرخ سرکہ

چینی یا لکڑ

اورک

ترکیب :

کیریاں چھیل کر کدو کش کر لیں۔ اسٹیل کے پین میں کیری، ہماہت لال مرچیں، سرکہ، چینی یا لکڑ کلو گھی، نمک اور اورک ڈال کر ہلکی آنچ پر ڈھک کر پکا ئیں۔ جب چینی یا لکڑ کا شیرہ بن جائے تو چولہے سے اتار کر ٹھنڈا کر لیں۔ جب چٹنی ٹھنڈی ہو جائے تو لیموں کا جوس شامل کر کے اچھی طرح ملا لیں۔ کسی صاف جار میں ڈال کر محفوظ کر لیں۔ لیموں سے چٹنی کبھی خراب نہیں ہوگی۔ چٹنی پکاتے ہوئے لکڑی کا چمچ استعمال کریں۔

آدھا کلو

دس عدد

آدھا کپ

ایک چائے کا چمچ

حسب ذائقہ

دو عدد

بارہ عدد

ڈیڑھ کپ

ڈیڑھ کھانے کا چمچ (باریک کٹی ہوئی)

آم دھو کر چھیل لیں۔ خشکی نکال کر آدھ آنچ موٹی قاشیں کاٹ لیں اب ان کو ایک برتن میں رکھ دیں اور اتنا پانی ڈالیں کہ قاشیں ڈوب جائیں لیموں کا رس شامل کر کے دو سے تین گھنٹے تک ڈوبارئے دیں۔ اس کے بعد ایک دیکھی میں ساڑھ پانی ڈال کر قاشیں اس میں ابل لیں۔ خیال رہے یہاں گھسنے نہ پائیں۔ ابل جانے پر پانی پھینک دیں۔ اب الگ سے چار گلاس پانی میں چٹنی ملا کر شیرہ تیار کر لیں۔ اب اس میں آم کی قاشیں ملا کر پکا ئیں۔ جب شیرے میں تار بننے لگے تو چولہا بند کر دیں اور عرق گلاب شامل کرنے کے بعد ٹھنڈا ہونے پر جار میں محفوظ کر لیں۔

## کیری کا شربت

اجزا :

کیری

لیموں

پانی

چینی

کالا نمک

پود

ترکیب :

ایک کلو

چار عدد

دو لیٹر

ایک کلو

چٹنی

چند پتے

سب سے پہلے کیریاں چھیل کر ایک آم چٹنی یا اسٹیل میں اسٹیل کی دیکھی میں پانی کے ساتھ اچھی طرح ابل لیں۔ جب کیریاں گل جائیں تو اتار کر ٹھنڈا کر لیں۔ اسی پانی میں کیر یوں کا گودا بنائیں اندر کی خشکی نکال دیں پھر لینڈر میں ڈال کر پیس لیں۔ لینڈر ہوئی







## ہاتھوں اور پیروں کی خوشنمائی کے لیے

خوب صورتی میں جس قدر اہمیت چہرے کو حاصل ہے۔ اتنے ہی اہم ہمارے ہاتھ اور پاؤں بھی ہوتے ہیں۔ مجنسیں ہم محض لاپرواہی کی بنا پر نظر انداز کر دیتے ہیں۔

ہم آپ کو نہایت آسان اور کم وقت طلب چند گھریلو ٹوٹکے بتاتے ہیں جو آپ کے ہاتھوں اور پیروں کو خوب صورت بنا سکتے ہیں۔

### آپ کے ہاتھ

اپنے برتن دھونے کی جگہ پر ہلکے سے دھوئیں کی ایسی شیشی یا جار میں ایک لوشن بنا کر رکھ لیں جو برتن دھونے کے بعد آسانی سے انگلیاں ڈبو کر لگایا جاسکے۔ بہترین اسکن ٹانک و موچر انڈیز ہے جو آپ گھر پر بنا سکتے ہیں۔

لیموں کا رس ————— آدھا کپ  
گلیسرین ————— آدھا کپ  
گلاب کا عرق ————— ایک کپ  
وٹامن ای کیپسول ————— تین عدد

### ترکیب :

ان تمام اشیاء کو ملا کر ایک مخلول تیار کر لیں اور شیشی میں بھر لیں اور برتن دھونے کے بعد ہاتھوں پر ملائیں۔ یہ ایک بہترین لوشن ہے جو نہ صرف خشک اور چھٹی ہوئی جلد کی مرمت کرتا ہے، بلکہ رنگت کو نکھارتا اور ملائم بناتا ہے۔

ہر روز جب آپ کام سے فارغ ہوں عموماً رات کے وقت عشاء کے دھو سے قبل صرف دس منٹ

اپنے ہاتھوں اور پیروں کو دیتے۔

### آپ کے ہاتھ پیر

#### اجزا :

سرسوں کا تیل ————— دو چائے کے چمچ  
لیموں کا رس ————— ایک چائے کا چمچ  
چینی ————— آدھا چائے کا چمچ  
مینھا سوڈا ————— ایک چٹکی  
سرکہ ————— چند قطرے

### ترکیب :

ایک پیالی میں یہ چیزیں ملا کر ایک اسکرپ بنا لیں۔ اب اس سے اپنے ہاتھوں پر ہلکا ہلکا مساج کریں اور ٹھیک اسی طرح پیروں پر دونوں طرف رگڑیں۔ جب چینی گھس کر ختم ہو جائے (ایسا پانچ منٹ کے مساج سے ہو جائے گا۔) (خیال رہے چینی زیادہ موٹی نہ ہو) تو ایک جالی کے کپڑے کا گولا سا بنا کر اسی کام کے لیے مخصوص کر لیں۔ اب اس جالی پر کوئی سایہ بولی سوپ پانی کے ساتھ لگائیں اور ذرا مسل کر خوب جھاگ بنائیں۔ اب اس گولے سے اپنے ہاتھ اور پاؤں رگڑ کر صاف کر لیں۔ خصوصاً ناخن کے اطراف، پھر نیم گرم پانی سے دھو لیں اور جو لوشن آپ نے بنا کر رکھا ہوا ہے، اسے ہاتھوں، پیروں پر سونے سے قبل لگائیں، آپ کے ہاتھ اور پیر سدا جوان اور حسین رہیں گے۔

### ہاتھوں کی روزانہ کی ورزش

صبح نماز فجر کے بعد اپنے ہاتھوں پر یشو ویم جیلی مل کر نرم کر لیں۔ پھر ایک میز پر انہیں کھول کر رکھیں اور انگلیاں خوب کھول کر پورا پنجہ پھیلا دیں۔ ایک سے دس تک گنتیں، پھر انگلیاں سیکڑ لیں، پھر بند

## چھوٹی چھوٹی باتیں

☆ ہر رات سونے سے پہلے اپنے ہاتھوں پر کوئی کریم یا لوشن لگا کر مساج ضرور کریں۔

☆ ہفتے میں کم از کم ایک بار ضرور ہاتھوں کا فیشل کریں اور ان پر ماسک بھی لگائیں۔

☆ اپنے ناخن صاف رکھیں، ان کے اطراف کو پرانے ٹوتھ برش کے ساتھ ہلکی رگڑ کے ساتھ صاف ضرور کریں۔

## ہاتھوں اور پیروں کا فیشل

اجزاء :  
سروں کا تیل \_\_\_\_\_ آدھا چمچہ  
زیتون کا تیل \_\_\_\_\_ آدھا چمچہ  
گلیسرین \_\_\_\_\_ آدھا چمچہ  
بالائی \_\_\_\_\_ ایک چمچہ

ترکیب :

انہیں آپس میں مکس کر کے اپنے ہاتھوں اور پیروں پر پانچ منٹ تک مساج کریں، اب ایک کھلے ٹب میں گرم پانی ڈالیں اور اس میں چند قطرے لیموں کا رس، چند قطرے برتن دھونے کا لیکوسینڈ اور چند قطرے کوئی شیمپو ڈالیں۔ ڈیزھ چیمپہ نمک اور چٹکی بھر بیٹھاسوڈا بھی ڈال دیں۔ اب اس گرم پانی میں اپنے ہاتھ اور پیر ڈبوئیں۔ تقریباً "پانچ منٹ کے بعد ہاتھوں کو جالی دار کپڑے سے رگڑیں اور پیروں کی ایڑیوں کو جھانویں یا پھر ایک استعمال شدہ پرانے اسکاچ برائٹ سے رگڑیں تاکہ مڑھ کھال اتر جائے۔ پرانے ٹوتھ برش سے انگلیوں کے درمیان اور اطراف کو صاف کریں اور دھو لیں۔ بعد ازاں ایک لیموں کا استعمال شدہ چھلکا لے کر ہاتھوں پر خصوصاً اس کی انگلیوں کے پچھلے پوروں پر رگڑیں اور چھوڑ دیں۔ یہی عمل پیروں کے ٹخنوں اور ایڑیوں پر کریں۔



کریں، پھر کھولیں، یہ عمل کم از کم پانچ بار کریں۔ آپ کے کھلے ہوئے ہاتھ کا بوجھ میز پر پورا رہنا چاہیے۔ جیسے آپ میز کو دبا رہی ہوں۔ پھر اپنے ہاتھ ڈھیلے کر کے نیچے کو لٹکائیں، دس تک گنتی گنیں اور ایک دم اوپر کو

سیدھے اٹھالیں۔ دس تک گنیں اور جھٹک کر نیچے گرا لیں، یہ عمل بھی کم از کم پانچ بار کریں اور دن میں دو، تین بار کام سے فراغت کے دوران اپنے ہاتھوں کو پہلے ذرا اکڑائیں، پھر انگلیوں کو کبھی کھولیں، کبھی بند کریں۔ کبھی نیچے جھٹکیں، کبھی اوپر اٹھائیں۔ ایسا کرتے رہنے سے ایک تو آپ کی انگلیاں سٹول رہیں گی، دوسرا کبھی ہاتھ جھٹکن کا شکار نہیں ہوں گے۔ تیسرا آپ کے کندھے اور بازو نہیں دکھیں گے۔

## آپ کے پیروں کی ورزش

اسی طرح صبح ہاتھوں کی ورزش کے بعد پیروں کے بل بالکل سیدھی کھڑی ہوں اور چھپائی ایڑیاں اوپر اٹھالیں اور پنچوں کے بل چلنا شروع کریں، دس قدم لے کر رکھیں اور پاؤں دھیرے سے زمین پر رکھ دیں۔ پانچ بار یہ عمل کریں۔ اس کے بعد پیٹھ کراچی کر لیں، بالکل سیدھی کر لیں، یہاں تک کہ آپ کے پیچھٹلے محسوس کرنے لگیں، اب ان پر توجہ مرکوز کر کے انہیں اسی حالت میں دائیں بائیں حرکت دیں اور سامنے کر کے پاؤں کی انگلیوں کو حرکت کریں۔ کھولیں، بند کریں، نیچے اوپر کریں۔ پانچ بار یہ عمل دہرائیں، پھر دھیرے سے انہیں ڈھیلے کریں اور اٹھ کھڑی ہوں۔ ایک ٹانگ پر کھڑی ہو کر تین بار دائیں بائیں جھٹکیں۔ پھر تین بار بائیں۔ اب آپ دن بھر کے کام کاج کے لیے اپنے پیروں اور ٹانگوں میں ایک قدرتی طاقت اور پک محسوس کرنے اور تازہ دم رہنے کے لیے تیار ہیں۔ یہ ورزشیں آپ کے ہاتھوں اور پیروں کے پھول کو پک دار اور مضبوط بنانے کے ساتھ ساتھ ان میں دوران خون کو متحرک رکھتی ہیں جو خوب صورتی اور تازگی کا باعث ہوتی ہیں۔